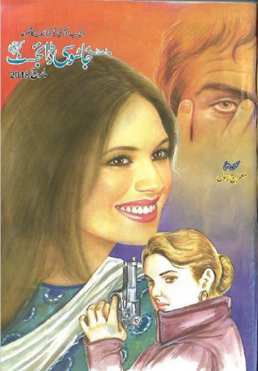
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
مارچ 2018
معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ جمال
نائب مدیر : ڈاکٹر فہیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ — 07
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

قفس شکن — زویا اعجاز — 14
چلتے چلتے اچانک ہی ایک نیا رخ
اختیار کرنے والی داستان

قیافہ شناس — تنویر واسطی — 79
اچانک رونما ہونے والی ایک واردات کا ماجرا...
قیافہ شناس نے اپنے اندازوں کی انتہا کردی

کچھ اور... — منظر امام — 89
خطرناک لمحوں کو آواز دینے کے بلانے والوں کا
خوفناک انجام... دہشت و وحشت کا سنگین امتزاج

انگارے — طاہر جاوید مغل — 94
سطر سطر رنگ بدلتی...
ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

لالچ — تنویر ریاض — 131
زیادہ اور زیادہ کی دلدل میں الجھ کر گر
جانے والوں کا دردناک احوال...

تصویر کی تلاش — نسرین منصور — 143
جستجو و لالچ کا طویل ہوتا سفر...
ایک تصویر کی تلاش کا ذکر

جلد 48 • شمارہ 03 • مارچ 2018 • زرِ سالانہ 900 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 70 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بڑا کھلاڑی — اعتزاز سلیم وصلی — 155
کرکٹ کے کھلاڑیوں کے پیمان...
ذہانت و خیانت کے وجدان

آوارہ گرد — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی — 162
تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

منہ زور — محمد ذوالقرنین خان — 195
قانون شکن اور قانون کے محافظوں
کے درمیان چھڑنے والی جنگ...

بلیک میلر — انجم فاروق ساحلی — 218
شاطر ذہن کی شاندار منصوبہ
بندی کا دلچسپ احوال...

عذر شناس — مظہر سلیم ہاشمی — 225
ایک ہی نشست میں رونما
ہونے والی ڈرامائی انداز کی واردات

حصار — سید شکیل کاظمی — 231
معصوم چہروں کے پیچھے چھپے سفاک درندے
کی عکس در عکس پھیلی داستانِ عبرت

چاہ کن را... — اسما قادری — 265
چاہ کن را چاہ درپیش کی عملی تفسیر...
نفرت و محبت کا تیکھا رنگ

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیز از جان…… السلام علیکم!

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں آزادی کی چھتری تھما دی گئی ہے، اسے اپنی مرضی کے مطابق گھمائیں، کھولیں، بند کریں یا گھمائیں مگر یہ خیال رہے کہ یہ کسی دوسرے کی چھتری یا آنکھ ناک سے نہ ٹکرائے اور یہی جمہوریت کی روح ہے۔ آزادی مگر دوسروں کی آزادی کو مجروح کیے بغیر…… اچھے اور گہرے الفاظ ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہو رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ لوگ اپنی چھتری کے کونوں کناروں سے دوسروں کو مطعون و معذور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کردار کشی اور الزام تراشیوں کا ایک طوفان سا آیا ہوا ہے اور اس خود ساختہ طوفان میں ہمارے اور آپ کے یعنی عوام کے بنیادی مسائل یکسر فراموش کر دیے گئے ہیں۔ دو اور تین باریاں لینے والے ماضی میں عوام کے لیے کچھ نہ کر سکے اور اب دعوے دار ہیں کہ اگلی باری میں عوامی فلاح کے سارے کام کر گزریں گے اور عوام بے چارے ایسے سادہ لوح ہیں کہ ان وعدوں کے اعتبار میں بے حال ہوئے جا رہے ہیں۔ رہی وہ جماعتیں جنہیں کوئی باری نہیں مل سکی تو وہاں بھی بیشتر گھاگ شکاری الیکشن کی گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمیں مخلص اور بے لوث قیادت میسر نہیں آ سکی۔ ہماری دعا ہے کہ اگلے انتخابات میں ہم سب اپنے ووٹوں کی بے مثال طاقت سے ایسے لوگوں کو اسمبلیوں میں پہنچائیں جو ہم میں سے ہوں اور ہمارے مسائل کا مکمل ادراک رکھتے ہوں۔ اس دعا کے ساتھ چلتے ہیں اپنی محفل میں…… جہاں ہر شخص کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہے۔

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی افسردہ و شگفتہ باتیں ”جواں مرگ بیٹوں کے دکھ کی ماری میری ماں ابدی جدائی کا دکھ دے گئیں۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر افضل خان اور بھائی عزیز محمد کی جواں مرگ نے میری ماں کو نہ صرف ذہنی طور پر پریشان کیا بلکہ ان کا جسم بھی قوتِ مدافعت کھو بیٹھا۔ دسمبر 2017ء کو نمازِ فجر کے وقت معصوم بچوں کی طرح سانس لیتے جب جان جانِ آفریں کے سپرد کی تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ ان کے آخری سانس ہیں۔ زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تو وہ میری اپنی ماں تھیں۔ ماں باپ کی موت کا دکھ کیا ہوتا ہے؟ اس کا احساس صرف وہی کر سکتے ہیں جو خود اس کرب سے گزر چکے ہیں۔ میں سوچتی ہوں، بم دھماکوں، سڑک ایکسیڈنٹ اور گولیوں سے چھلنی ہونے والے بدنصیبوں کی ماؤں کا حال بھی میری ماں جیسا ہوتا ہوگا۔ (یقینا…… صدقِ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو قرار و صبر سے سرشار کر دے اور مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے) اطلاع لکھنے کا محرک مظہر سلیم ہاشمی کا سالانہ تجزیہ ہے۔ ان کا ہماری محفل میں آنا ہی بڑے اعزاز کی بات ہے ہر چند کہ مظہر سلیم ہماری محفل کے ساتھی رہ چکے ہیں لیکن رائٹر کہلانے کے بعد اگر کسی نے ادھر آنے کی اور اپنے پرستاروں کی عزت افزائی کی ہو تو کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ اس لیے میں مظہر صاحب کی بے حد مشکور ہوں اور درخواست گزار ہوں کہ کبھی کبھار یاد فرما لیا کریں۔ رہی ان کی سالانہ تجزیاتی رپورٹ۔ اس نے تو چکرا کے رکھ دیا۔ مجھے تو دو ماہ پرانا سرورق بھی یاد نہیں رہتا یہی حال تحاریر کا ہے سوائے چند ایک کے سب بھول جاتی ہوں۔ اب ذرا ہماری پیاری طاہرہ گلزار بتائیں کہ ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ اتنا تبصرہ لکھنے والی کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم نے بھی دعائیں سعید، وہاب اور تفسیر عباس بابر اور رضوان تنولی کی طرح ہمیں داغِ مفارقت دینے کا سوچ لیا۔ ایم اقبال! یہ تو بتا دو میانوالی والوں کو میانوالی کی سینٹرل جیل ہی کیوں بھاتی ہے؟ آپ کو جاسوسی 125 کا پڑتا ہے کاش کوئی اس کا تدارک کر سکے۔ عام سوچ والی عام سی عائشہ خان کا تبصرہ بڑا ہی خاص تھا۔ تاک تاک کے نشانے لگانے خان گرل نے۔ ویلس پیارا ہے طلعت مسعود کی آمد خوش کن ہوتی ہے۔ مان بڑھ جاتے ہیں برادر۔ سدا خوش رہیں۔ ہری پور کے ذوالفقار عبد الودود کی عالمانہ باتیں، کوئٹہ سے خان کا حسبِ معمول لمبا سا تبصرہ، اشفاق شاہین، فراز حسین کے اختصاریے، عائشہ مرزا، ایمانے زہرا، شاہ اور ڈاکٹر حبا نے خوب رونق لگائی۔ آغاز سویٹ ہارٹ طاہر جاوید مغل کے انگارے سے کیا۔ روتی بسورتی تاجور یا گوہر شاہ زیب کے گلے پڑ گئی۔ ویسے تو اپنے دیس میں سب کچھ ہو سکتا ہے مگر سرزمینِ پاکستان پر فیکساری گینگ کی موجودگی حقیقت سے ہٹ کر لگتی ہے۔ غیر ملکی الگ سے پہچانے جاتے ہیں نا اس لیے۔ بہرحال خدا ان کا تختہ کر دے! اشتیاق، شاہ زیب اور سجاول کے ہاتھوں تو مزہ ہی آ جائے۔ اب بات کروں آوارہ گرد کی، لگتا ہے اسٹار ٹیک ایجنٹ تھکی شہزی کو امریکا پہنچا کر ہی رہے گی۔ ملی اور اس کے خاندان کی خیر ہو۔ پہلے صفحات پر زویا اعجاز کی کنفس شکن وہ افسانہ پر مشتمل تھی اس لیے چھوڑ دیا۔ اب ایک ساتھ ہی پڑھوں گی۔ زویا اعجاز کے لیے اتنا کہوں گی کہ اب تک انہوں نے جتنا بھی لکھا ہے کمال لکھا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم میں اور نکھار پیدا ہو۔ دشمن، دہشت ناک کر گئی۔ جنگ و جدال، ظلم اور خوف میں آدمی کو پتا نہیں چلتا کہ مد مقابل کون ہے؟ عمران قریشی نے ناگزیدہ کی صورت میں زبردست تحریر پڑھنے کو دی۔ ڈاکٹر مہرو اور انسپکٹر شیراز کا کردار شرمناک تھا۔ بزدل کے بزدل نے اچھی ہمت دکھا کر ثابت کیا کہ کبھی کبھی ہاتھ کا زور چابی کا توڑ دیتی ہے۔ پہلا رنگ امجد جاوید کمیل کے قرم نے سا بھے اور ساتھ ہی اکرم چوہدری اور نگہ انسانیت ہمارے کو یاد کر کے دل خوش کیا۔ دوسرا رنگ وحید رشید کا ابھی نہیں پڑھا۔ کترنیں خوب ہوتی ہیں۔ سرورق پر موٹے ہونٹوں اور نیلے پیلے دانتوں والی لڑکی زہر لگی۔ ساتھ میں کم عمر لڑکے کے ہاتھ میں گن دے کر یہ باور کرایا جا رہا ہے شاید کہ ہم لوگ روز بروز خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔“

قصور سے عبدالجبار رومی انصاری کی انکساری ”دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کے مجموعے کا سرورق اس دفعہ خوب صورت مگر پکے سے اداس چہرے کے ساتھ تقریباً پورے سرورق پر اپنی خوب صورتی بکھیر رہا تھا اور گن تھامے چھوٹا ڈان تو سلمان خان ہی لگا۔ محفلِ صدارت پر مظہر سلیم ہاشمی کا سالانہ تجزیہ زبردست رہا۔ ایم اقبال نے بھی اچھا لکھا۔ اللہ کرے آپ کا مشکل وقت جلدی دور ہو۔ عبدالودود عامر کی عاشقانہ باتیں بھی خوب رہیں۔ عمدہ تبصرہ۔ عائشہ خان کی پہلی جسارت الجھنوں میں ہی گم رہی۔ شکر ہے ردی کی نوکری میں گم نہیں ہو گئی؟ تبصرہ اچھا کیا ہے ویلکم آئندہ بھی آتی رہو۔ ذوالفقار کی درخواست تو واقعی دردناک رہی۔ ایک تو انہیں حسینہ کا چشمہ تیز حالانکہ اوپر سے اندر داخل ہونے پر انگلش کہانی سامنے آ گئی۔ بھئی غصہ تو آنا ہی تھا جب مزاج کے برخلاف کچھ ہو ہاہاہا ویسے تبصرہ عمدہ رہا۔ طلعت مسعود کی مداحی نے بھی خوب رنگ جمایا اور سیف خان کو ایمانے زارا پر تلملاتے ہوئے پایا، یہ تو اچھا ہوا بادِ نسیم چل رہی تھی اور تبصرہ بھی زبردست ہو گیا۔ فراز حسین سومرو اور اشفاق شاہین نے بھی اچھا لکھا۔ آخر میں ڈاکٹر سبا کی تباہ کن بمباری متاثر کن رہی۔ عمدہ تبصرہ کیا ہے اور پلیز یہ چاقو چھریاں مت لانا ورنہ محفل میں قینچی کی جگہ ان کا استعمال شروع ہو جائے گا۔ کوئی شخص دوسرے انسان کو بے وقوف نہیں بنا سکتا، دھوکا تو ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں، خود فریبی ہی ناکامی کا پہلا زینہ ہوتی ہے۔ داستان قفس شکن عمدہ رہی۔ منظر امام نے چھوٹے لوگوں سے بڑا کام کروایا۔ سلطانہ ڈاکو بننے چلے تھے اور پولیس سے چھترول کروا بیٹھے اور پھر عدالت میں جا کر پولیس کو پھنسا دیا، واہ زبردست اسٹوری تھی، مزہ آ گیا۔ انگارے میں اس دفعہ تاجور ہیر کو شاہ زیب نے اٹھا تو لیا پر اسے ہاں کروانے کے لیے بھی کچھ دہشت گردی کی ضرورت پڑ گئی بس اس نے تاجور کا سر پکڑ کر ہاں نہیں کروائی باقی تاجور کی طرف سے تو کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ شکر ہے اس نے ہاں کر دی۔ اب شاہی اور تاجور کی شادی کس رنگ میں ہوتی ہے کیونکہ آس پاس انگارے بھی بہت دہک رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے شہزی تھائی لینڈ سے نکلا تو آگے پھر اسپیکٹرم کے کارندوں سے سامنا ہو گیا جہاں وہ اپنے دوست روڈلف کے ساتھ کیٹ اور بروجیٹ کو زخمی کر کے بھاگ نکلا۔ بڑی مشکل سے ایک جائے پناہ ملی مگر یہاں بھی بوڑھے اور اس کی ناصف بیٹی کی وجہ سے بدمزگی پیدا ہو گئی اور بے چارہ پولیس مین خواہ مخواہ جان سے گیا۔ اب یہاں لیڈی پولیس کی مدد سے نکلنا ہے شہزی آنے والوں کو خوب مزہ چکھائے گا اور اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے کہیں نا کہیں سے اپنے لیے ہمدردیاں بھی حاصل کرے گا۔ موسم بھی عجیب شے ہے کسی کے لیے زندگی کی نوید تو کسی کے لیے موت کا پروانہ ثابت ہوتا ہے۔ ایسے ہی راجر اور الفرڈ کے ساتھ ہوا دونوں ہی موسم کی وجہ سے پھنسے واقعی موسم بھی انسان کے مزاج سے ملتا جلتا ہے اس میں کب بدلاؤ آ جائے کوئی پتا نہیں۔ موسم دلچسپ اور عمدہ کہانی، اچھی لگی باقی کہانیوں میں صید و صیاد، کامیاب واردات اور پرانا حساب بھی اچھی لگیں۔“

سینٹرل جیل سے ایم اقبال کے اعتراضات ”29 جنوری کو جاسوسی کا شمارہ 1 بجے کے قریب ملا جو کہ کسی سرپرائز سے کم نہ تھا کیونکہ فروری کا شمارہ 8 یا 10 کو ملتا تھا۔ یہاں ہمیں جاسوسی 8 سے 10 تاریخ تک ملتا ہے اس دفعہ گیارہ دن پہلے مل گیا بہت خوشی ہوئی اور اسی خوشی سے لبریز دل کے ساتھ ٹائٹل پر نظر ڈالی تو آج حسینہ کی تعریف کرنے کو جی چاہا جو سنہری زلفوں کے بادل میں ایک آنکھ چھپائے اور یاقوتی ہونٹ کھولے موتیوں جیسے سفید دانت دکھا رہی ہے اور ساتھ میں بالی ووڈ کے ہیرو بوبی دیول بھی گن تھامے حسینہ کو ڈرانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اور جناب گن تھام کے ایسے خوشگوار موڈ میں کھڑے ہیں جیسے گٹار اٹھا کے پوز دے رہے ہوں۔ ٹائٹل سے نظر ہٹا کر آگے بڑھے جہاں اپنا خط دیکھ کر ایسے خوشی ہوئی جیسے قید میں رہائی کا پروانہ مل جائے اسی خوشی میں کرسیِ صدارت پر نظر ڈالی جہاں بہاولپور سے مظہر سلیم ہاشمی صاحب سالانہ تبصرہ لیے حاضر تھے۔ تبصرہ پڑھ کر ایسا لگا جیسے قائداعظم کا مضمون پڑھ رہا ہوں۔ فیصل آباد سے عائشہ مرزا کا معصومانہ اور ذرا ذرا سا تبصرہ پسند آیا۔ راولپنڈی سے عائشہ خان جو بابا آدم کے زمانے سے پڑھ رہی ہیں پھر بھی پتا نہیں چل رہا کہ ہیرو ہیروئن کے مسائل سلجھانے اور ہیروئن کو اپنانے کے علاوہ کہانی میں اور کیا ہو۔ کراچی سے ڈاکٹر سبا جو کہ زخمی دل کہانی کا پوسٹ مارٹم کرتی نظر آئیں اور زخمی دل کو مزید زخمی کر دیا، ابھی تو مداوا کا بھی پوسٹ مارٹم ہوتا اگر ڈاکٹر صاحبہ کی چھری زخمی دل کے پیٹ میں نہ رہ جاتی۔ جیسا کہ آج کل عام ڈاکٹروں سے ہو رہا ہے، تبصرہ اچھا تھا۔ عبدالودود عامر، طلعت مسعود، ایمانے زارا شاہ اور باقی بھی سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی جو کہ بے حد اچھی لگی۔ شاہ زیب اور تاجور اب ایک ہونے جا رہے ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے، اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی جس میں شہزی کا کا ایکشن ہی ایکشن میں نظر آ رہا ہے۔“

کراچی سے اویس احمد خان کا پُرخلوص انداز ”سرورق جاسوسی ڈائجسٹ کمال ہے جس کا سہرا ڈاکٹر صاحب کے سر جاتا ہے۔ اندر نکتہ چینی میں مظہر سلیم ہاشمی نظر آ رہے ہیں۔ خطوط کی محفل میں بہت سے دوست حاضر ہیں جبکہ دیگر سینئر ساتھی شاملِ محفل نہیں ہیں۔ تو کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا۔ حالتِ زمانہ پل پل بدلتے جا رہے ہیں، مظلوموں پر ظلم و ستم پے در پے جاری و ساری ہیں مگر بااختیار لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ مجبور عوام کا استحصال جاری ہے کیونکہ اس کا جرم اس کی غربت ہے غرض وہ غربت کی چکی میں پس رہا ہے۔ غرض مند دنیا بس تماشا دیکھ رہی ہے۔ آگے بڑھ کر تحریروں پر آتے ہیں۔ سب سے پہلے زویا اعجاز کی قفس شکن بڑے اچھے انداز میں لکھی گئی تحریر ہے۔ ماشاء اللہ! زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ امید ہے دوسرا حصہ بھی متاثر کن ہوگا۔ نام اور پرانا حساب تحریریں پُراثر لگیں۔ ناگزیدہ اور منظر امام کی بڑے لوگ دونوں تحریریں بھی اچھی لگیں۔ بڑے لوگ مزاح کا رنگ لیے ایک چبھتی ہوئی تحریر تھی۔ اس کے بعد انگارے شروع کی جو تمام تر محویت سے پڑھی جاتی ہے۔ کامیابی سے جاری و ساری ہے۔ آخری شکار نے بھی متاثر کیا۔ کامیاب واردات بھی اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد آوارہ گرد کی باری آئی جس کی پسندیدگی میں کوئی شبہ نہیں۔ گریہ شناس، بزدل، ستم ایجاد، موسم بھی اچھی لگیں۔ آخری دو تحریریں بھی اپنے نام کی مناسبت سے بہتر تحریریں تھیں۔“

دہاڑی سے منشی محمد عزیز مے کا احوالِ یہاں ”2017ء میں ترسٹھ حضرات کے ایک سو پچاس اور بائیس خواتین کے اکیاون خطوط شائع ہوئے۔ اویس احمد خان دس خطوط کے ساتھ ٹاپ پر رہے۔ فروری اور ستمبر میں ان کا نام لیٹ کمرز میں شامل رہا۔ خطوط کی محفل میں خواتین تبصرہ نگاروں میں ایمانے زارا شاہ نو خطوط کے ساتھ ٹاپ پر رہیں۔ مبارک باد قبول فرمائیں اویس احمد خان اور زارا شاہ جی۔ مرد مصنفین میں محترم سلیم انور چودہ کہانیوں کے ساتھ ٹاپ پر رہے۔ اپریل اور مئی میں ان کی ڈبل تحریریں شائع ہوئیں۔ خواتین رائٹرز میں محترمہ تمکین رضا دس کہانیوں کے ساتھ پہلے نمبر پر رہیں۔ اس مرتبہ کا سرورق تو بہت زبردست رہا۔ بس ذرا حسینہ کے ہونٹ کچھ زیادہ ہی سوجے ہوئے تھے اور دانت بھی ..... لگتا ہے پیسٹ نہیں کرتی بلکہ بس میں سوار منجن بیچنے والوں کا تیار کردہ دو نمبر منجن استعمال کرتی ہیں۔ دوسری جانب ہیرو ٹائپ کا ایک ینگ سائز کا اسلحے کی نمائش کرتا نظر آیا۔ ویسے اس کی شکل و صورت اور اسلحہ والی بات آپس میں ”میچ“ نہیں کر رہی۔ خیر جی ہمیں کیا۔ ہم تو سیدھے نکتہ چینی کی محفل میں پہنچے جہاں محترم مظہر سلیم ہاشمی سال بھر کے تجزیے کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت زبردست رہا۔ یقیناً بہت مشقت طلب کام ہے یہ..... مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ایمانے زارا شاہ کا سرد و گرم خط حسبِ معمول بڑا نٹ کھٹ سا لگ رہا تھا۔ عبدالودود عامر کا تبصرہ بھی بھرپور تھا۔ آخری سیٹ پر محترمہ ڈاکٹر سبا تشریف فرما تھیں۔ لگتا ہے مریضوں سے بمشکل جان چھڑا کر بھاگتی ہوئی نکتہ چینی کی محفل میں پہنچی ہیں۔ سب سے پہلے انگارے کا مطالعہ کیا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ نکاح ہو ہی جائے گا لیکن افسوس ..... دل دھک دھک کر رہا ہے۔ شاید ابھی تاجور اور شاہ زیب کا ملن نہ ہو سکے۔ انگارے کے بعد نگے ہاتھوں احتراز سلیم وصلی کا آخری شکار بھی کر ڈالا میرا مطلب ہے پڑھ لی۔ دانیہ نے خود پر ڈھائے جانے والے مظالم کا بدلہ خوب لیا اور اس کا بہنوئی حیدر کتنا کم ظرف اور گھٹیا سوچ کا مالک تھا، تف ہے ایسے مردوں پر۔ ستم ایجاد میں سراغ رساں ایلی نے نکل بولنے کے انداز سے قاتل کو گرفتار کر ہی لیا، بہت خوب۔ دشمن کا انجام خلافِ توقع تھا۔ کیا بیتی ہوگی ڈینی پر، جب اس نے اپنے بھائی کو اپنے ہاتھوں دشمن سمجھ کر ہلاک کر ڈالا۔ پہلا رنگ میرے ہمسایہ لکھاری محترم امجد جاوید کے قلم کا شاہکار تھا۔ سائرہ کا کردار حیرت انگیز تھا جس نے بدنامِ زمانہ بازار سے تعلق رکھنے کے باوجود محض اپنی محبت کی خاطر خرم کی اتنی مدد کی۔“

عائشہ مرزا کا فیصل آباد سے چلبلا پن ”ٹائٹل پسند آیا۔ اداریہ پڑھا۔ چوہا کہانی ٹرمپ کے علاوہ مودی پر بھی صادق آتی ہے۔ بہرحال ساری بلیاں اور سارے چوہے بھی اکٹھے ہو کر آ جائیں تو بھی اس مملکتِ خداداد پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ پیارا وطن قیامت تک شاد و آباد رہے گا، انشاء اللہ۔ مظہر سلیم ہاشمی طویل عرصے بعد، طویل تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ گزرے سال کی سیر کراتے ہوئے۔ دماغ کو اچھا خاصا مشقت میں ڈالے رکھا۔ اوف ..... تبصرہ برا نہیں تھا ویسے۔ ایم اقبال صاحب کسی کی تعریف کرنے میں کنجوسی کیوں؟ عائشہ خان کا تبصرہ یوں لگا کسی ناول کا خلاصہ پڑھ رہی ہوں۔ ذوالفقار صاحب اور طلعت مسعود صاحب آپ کا شکریہ پیچھے میں پھر سے آ گئی۔ باقی سب کے تبصرے اچھے تھے لیکن سیف خان صاحب اور ڈاکٹر سبا صاحبہ کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ غضب کا موسم تھا جس دن جاسوسی ملا۔ سو، سب سے پہلی تحریر موسم پڑھی۔ الفرڈ اور راجر دونوں کے لیے موسم کی تبدیلی وبالِ جان ثابت ہوئی۔ بہت مزے کی تحریر رہی۔ پہلا رنگ دیکھا تو امجد جاوید صاحب کو اپنا کھیل کھیلتے پایا۔ مجرموں کی پشت پناہی کرنے والے طاقتور یقیناً ہمارے معاشرے میں بھی موجود ہیں مگر پولیس مجبور و بے بس۔ اچھی تحریر تھی۔ لیکن انسپکٹر صارم کی دو بیویاں کیسی کیا؟ دوسرے رنگ میں جھانکا تو روبینہ رشید صاحبہ نے خوف زدہ کرنے میں کسر کوئی نہیں چھوڑی، پُراثر تحریر تھی مگر اتنی جلدی میں اختتام ہوا، وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ آخری شکار بہت زبردست رہی۔ میرے خیال میں عثمان کے گھر کی بربادی میں سارا قصور اسما کا تھا۔ وہ عثمان کو مجبور نہ کرتی خود سے شادی کے لیے تو یہ سب نہ ہوتا۔ بہرحال دانیہ کی زندگی تو ویسے بھی برباد ہو ہی چکی تھی پھر اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کر کے اس نے اپنی اور گھر والوں کی بربادی کا بدلہ بھی لے ڈالا۔ کمال کی تحریر تھی۔ قفس شکن کمالِ مہارت سے معاشرے میں پھیلے جرائم اور ان کے بھیانک انداز پر روشنی ڈالی گئی۔ واجد کے خاندان کا حال پڑھتے ہوئے کئی دفعہ آنکھیں نم ہوئیں۔ اردگرد سے بے خبر ہو کر پڑھتی گئی اور آخری صفحے پر جا کر ہوش آیا جہاں لکھا تھا ”آخری حصہ اگلے ماہ“ یوں لگا دانتوں تلے اچانک سے کڑوا بادام آ گیا ہو۔ شاندار تحریر کا آئندہ ماہ تک بے چینی سے انتظار ہے۔ گریہ شناس بس گزارے لائق تھی۔ نام اور بڑے لوگ لبوں پر تبسم بکھیرنے میں کامیاب رہیں۔“

ازکھاریاں سے تفسیر عباس کی رائے، مشورے، تنقید ”جاسوسی کا نیا شمارہ جو کہ ماہ فروری کی شکل میں تھا 27 جنوری کو ملا۔ سرورق کچھ غیر جاسوسی اور غیر فطری لگا۔ جبکہ سرورق کا بچہ شاید نقلی گن پکڑے سنڈویا اعجاز کو ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سنڈویا اعجاز تو زویا اعجاز ہی ہے کسی سے نہیں ڈرتی کیوں زویا جی؟ (ڈرنا ہی نہیں چاہیے سنا نہیں ہے آپ نے جو ڈر گیا وہ مر گیا) اس بار اپنے طولانی تبصرے کے ساتھ اپنی اننگز کا آغاز کر رہے تھے مظہر سلیم ہاشمی صاحب، زبردست واہ واہ کیا شاندار اننگز کھیلی ہے سیدھی سیدھی ڈبل سنچری مار دی ہے۔ ایم اقبال صاحب جناب آپ کس جرمِ بے گناہی میں جیل کے اندر ہیں خدا آپ کو اس اذیت ناک جگہ سے رہائی دلائے اور آپ ایک بار پھر آزاد فضاؤں میں سانس لیں چمن ماہی میں نے بھی کچھ عرصہ پہلے 41 دن جیل میں گزارے ہیں، مجھے پتا ہے جیل کے دن کتنے اذیت ناک ہوتے ہیں جیل میں ہر چیز مہنگی ملتی ہے۔ عائشہ مرزا صاحبہ آپ جاسوسی کے سرورق میں کھو گئی تھیں تو یہ بھی گانا تھا ہم کھو گئے تیرے پیار میں ہم اب ہوش میں آنا مشکل ہے۔ ویسے بھی میرے ساتھ میرے بھائی بہن میرے بچے ہوتے ہیں حسنین عباس، کمیل عباس تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ایمانے زارا شاہ صاحبہ آپ اس ٹرین کی طرح ہیں جو پہلے آہستہ آہستہ چلتی ہے پھر رفتار پکڑتی اور پھر بہت اہم اسٹیشن چھوڑ دیتی ہے۔ آپ خود عقل مند ہیں میری بات سمجھ گئی ہوں گی آپ کو مشورہ ہے رات کو بادام کھا کر سویا کریں۔ عبدالودود عامر بھایا آج آپ نے کیا پکایا؟ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عائشہ خان گگلی صاحبہ آپ کیوں بھلا اتنی بڑی

جسارت کررہی ہیں خدارا اپنی ننھی سی جان پر رحم کریں آپ پی ٹی آئی میں ہی ٹھیک ہیں۔ وہاں آپ کی بات سنی جائے گی چٹکی کٹ چٹکی کے قارئین پر رحم کریں باقی ایک میسی ہی دوسری میسی کو پہچان سکتی ہے۔ ذوالفقار صاحب بات دراصل یہ ہے کہ ایک بولا ہی دوسرے بونگے کو پہچان سکتا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی انگاروں بھری زبردست تحریر پڑھی۔ انگارے اپنی رفتار کے لحاظ سے مکمل طور پر ٹھیک جارہی ہے۔ سرور اکرام کی نام بھی اپنے خوب صورت پلاٹ کی وجہ سے پسند آئی۔ اعتزاز سلیم وصلی صاحب کی آخری شکار بالکل ٹھیک ٹاپ کی تھی۔ ایسا لگا کوئی فلم دیکھ رہا ہوں۔ بہرکیف مجموعی طور پر یہ اعتزاز صاحب کی ایک اچھی کاوش تھی۔ محمد لطیف صاحب کی کامیاب واردات ایک کامیاب واردات ثابت ہوئی، بہت اچھے محمد لطیف صاحب۔ کہانی پسند آئی۔ امجد جاوید کا پہلا رنگ انجانا کھیل جس میں غالباً سرورق کے رنگ کا ذکر تک نہیں تھا کچھ مزہ نہیں دیا سرجی خدا کے لیے.... روبینہ رشید کا تحریر کردہ رنگ صید وصیاد قدرے بہتر اور اپنے تیز لہجے کی وجہ سے اچھا لگا مگر اینڈ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر قاتل قتل کیوں کررہا تھا۔ روبینہ رشید صاحبہ کچھ وضاحت کردیتیں تو بہتر تھا۔"

لاہور سے اشفاق شاہین کا پُربہار تبصرہ "جاسوسی تو بروقت مل گیا۔ سرورق اس مرتبہ لاجواب تھا۔ لگتا ہے ادارے نے بھی کمپیوٹر سے استفادہ شروع کردیا ہے۔ چٹکی کٹ چٹکی پہنچے۔ مظہر سلیم ہاشمی صاحب ڈگری اسٹینڈ پر سالانہ تجزیے کے ساتھ موجود تھے۔ سال بھر کے تبصرہ نگاروں اور رائٹرز کی کارگزاری پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ایمانے طلعت، عبدالودود سیف خان اور ڈاکٹر سبا کے خوب صورت تبصرے محفل کا خاصہ ٹھہرے۔ عائشہ خان اور ذوالفقار کے خطوط بہت دلچسپ تھے۔ فراز سومرو، اقبال اور عائشہ مرزا بھی محفل کی رنگینی بڑھاتے نظر آئے۔ حسب معمول سب سے پہلے انگارے پر پہنچے۔ داراہیوں کے چنگل سے تاجور اور ٹیکساری گینگ کی قید سے انیق کی رہائی کے باوجود گیم ابھی تک مکمل طور پر شاہ زیب کے حق میں اب بھی نہیں۔ دیکھتے ہیں شادی کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ آوارہ گرد کی مشکلات بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ امریکا پہنچنا مزید مشکل ہوگیا۔ مجھے کا معاملہ انٹرپول تک جا پہنچا اور اپیکرم کے ساتھ جنگ بھی۔ امجد جاوید سرورق کی پہلی کہانی کے ساتھ جاسوسی میں رنگ ڈالتے نظر آئے، زبردست۔ دوسری کہانی روبینہ رشید کی صید وصیاد وہ بھی لاجواب تھی اس نے بھی اپنا رنگ جما دیا۔ زویا اعجاز کا قفس شکن پہلا حصہ متاثر کرگیا۔ از حد افسوسناک جو اس طرح پاکستانی باہر خوار ہوتے۔ ایک تجربہ ہمیں بھی ہوا۔ سمندر کے ذریعے غیرقانونی طور باہر جاتے چھبیس لوگوں کو پکڑ کر کراچی پولیس کے حوالے کیا تھا۔ وسیم بن اشرف کی دشمن مختصر مگر پراثر رہی۔ سرور اکرام کی نام بھی مزہ دے گئی۔ پرانا حساب متاثر نہ کرپائی۔ ناگزیدہ اور آخری شکار بلاشبہ ماہ فروری کے بہترین شاہکار ذیشان عمران اور اعتزاز وصلی۔ بڑے لوگ شاندار تھیم بہترین انجام۔ شاکر لطیف کی موسم بھی اچھی تحریر رہی۔ دلچسپی سے بھرپور۔ تمام احباب جاسوسی کو موسم بہار کا پُربہار سلام۔"

کراچی سے سعدیہ قادری کی دلچسپی "کراچی کی گرمی نما سردی میں جاسوسی ملا تو بہت اچھا لگا کیونکہ اس بار ٹائٹل گرل پر لپ اسٹک لگ رہی تھی، ساتھ ہی ربن کا پھول کسی تحفے کی نوید سناتا لگ رہا تھا۔ فوراً ہی رخ کیا چٹکی کٹ چٹکی کی جانب جہاں ایک بار پھر زینب کا پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں، آخر کب تک ہمارے بچے اس خوف کی فضا میں رہیں گے! آج کے بچے پکڑم پکڑائی، پہل دوج، برف پانی اور اونچ نیچ جیسے فزیکل گیمز کے بارے میں ایسے ہی حیرت سے سنتے ہیں جیسے ہم اپنے بچپن میں موبائل اور انٹرنیٹ کے بارے میں سنتے تھے۔ یہ خوف کی فضا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک مجرموں کو بروقت اور کھلے عام سنگسار نہ کیا جائے گا۔ محفل کی صدارت مظہر سلیم ہاشمی صاحب کے حصے میں آئی، جس محنت سے انہوں نے سالانہ تجزیہ لکھا، وہ واقعی قابلِ داد ہے۔ عائشہ خان کی الجھن مجھے بھی الجھن میں ڈال گئی، ڈاکٹر سبا کی بیماری نے تو ہنسی سے بے حال کردیا۔ بلیک لسٹ میں شامل ہونے والوں کا نام دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اتنی محنت و محبت سے لکھا تبصرہ شامل نہ ہوسکا۔ یہ تبصرے لیٹ ملنے کی وجہ سے شامل نہیں ہوتے یا صفحات کی کمی کی بنا پر؟ (دیر سے آنے کی وجہ بھی ہوتی ہے اور صفحات کی کمی) چٹکی کٹ چٹکی کے بعد سیدھی پہنچی انگارے کی جانب جہاں شاہ زیب نے بلاتاخیر تاجور سے اپنی محبت منوا ہی لی لیکن ابھی نکاح ہونا باقی ہے۔ لگتا ہے اس سے پہلے شاہ زیب کو آگ اور خون کے چند دریا اور عبور کرنے پڑیں گے، پہلوان حشمت کی شاعری کے تڑکے بھی خوب رہے۔ اس کے بعد پہلا رنگ پڑھا۔ اگر ہمارے ملک میں بھی انصاف کی بروقت فراہمی ممکن نہ بنائی گئی تو وہ دن دور نہیں جب خرم اور صارم کی طرح لوگ اپنا بدلہ اپنے ہاتھوں ہی لینے لگیں گے، اچھی تحریر تھی۔ روبینہ رشید کی صید وصیاد بھی بہت اچھی رہی، کچھ باتیں مبہم لگیں جیسے آمنہ اور سعدیہ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ ایسی کون سی نفسیاتی گرہ تھی جس نے شہباز کو جنونی قاتل بنادیا، پڑھتے ہوئے یہی محسوس ہوتا رہا کہ یہ کسی کہانی کا سیکوئل ہے، مجموعی طور پر مجھے یہ اس شمارے کی بہترین کہانی لگی۔ ناگزیدہ میں مسیحا ہی مجرم نکلی، بہتر ہوتا کہ اس کو کیفرِ کردار تک پہنچتا دکھایا جاتا۔ منظر امام اپنے مخصوص انداز میں شگفتہ سی تحریر لائے۔ اعتزاز کی تحریر میں وقت کے ساتھ پختگی آتی جارہی ہے، کامیاب واردات میں مصنف نے کامیابی سے سمجھایا کہ نصیب سے بڑھ کر کوئی کچھ نہیں پاسکتا۔ ستم ایجاد میں اتنی فیصد ترجمہ شدہ کہانیوں کی طرح ایک معمولی سی غلطی نے قاتل کو پکڑوا دیا۔ شاکر لطیف موسم کے ماروں کا احوال لے کر آئے۔ وسیم بن اشرف کی دشمن، ڈیلی کے نام کی وجہ سے پڑھنا شروع کی اور یہ اس شمارے کی سب سے اچھی ترجمہ شدہ کہانی ثابت ہوئی۔ زویا اعجاز سے امید ہے کہ قفس شکن کی صورت میں انہوں نے یقیناً ایک اور شاہکار رکھا ہوگا اس لیے اسے مکمل ہونے کے بعد پڑھوں گی۔"

پرویز احمد لانگاہ کی جدہ سے باریک بینی "جاسوسی کا شمارہ فون کرکے ملا اور میں نے شوق سے پڑھ لیا۔ جدہ واپسی کے بعد کام تو بے شمار ہوتے ہیں لیکن جاسوسی کے لیے وقت نکالنا تو ضروری ہے کیونکہ آئی لو جاسوسی ڈائجسٹ۔ ٹائٹل پر ایمانے آدھا چہرہ لیے جیلی دل چبا رہی تھیں لیکن طلعت شیلے گن پکڑ کر جوجو زو دے رہا تھا، اس نے دل جیت لیا۔ واہ کیا ٹائٹل بنایا ہے، پتا نہیں کس نے۔ ڈاکر انکل کا نام ونشان تک سب سے

کے ساتھ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا۔ لیکن پلیز ڈاکر انکل سے ہی بنوایا کریں۔ (ایسا ہی ہوگا) محفلِ دوستاں بہار کی آمد کے ساتھ دل باغ باغ کرگئی کہ بے شمار دوستوں نے مزے کی رونق لگائی ہوئی تھی۔ خود کو بہت زیادہ مس کیا۔ مظہر سلیم ہاشمی نے اپنے آنے سے بھی لمبا تبصرہ کھینچ مارا۔ پورے سال کے شماروں پر تبصرے ان کی جاسوسی سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن کہانی کدھر ہے جناب؟ ایم اقبال اور عائشہ مرزا نے کمال تبصرے لکھے جبکہ بی ایمانے پھر دھمال ڈالتی ہوئی پکڑی گئیں۔ عبدالودود کا تبصرہ نہایت شاندار رہا لیکن عائشہ خان نے تو محفل ہی لوٹ لی۔ اتنے خوبصورت الفاظ میں اپنی الجھن بیان کی، بکی سگریٹ والا مزہ آیا۔ طلعت مسعود کا تبصرہ تو مجھے سب سے اچھا لگتا ہے کیونکہ ان کی باتوں میں خلوص، محبت اور پیار جو میرے لیے ہے وہ کوئی اور محسوس کربھی نہیں سکتا۔ اشفاق شاہین کی پرواز بڑی مختصر رہی۔ ڈاکٹر سبا کا تبصرہ پڑھ کر خوب قہقہے لگائے۔ موصوفہ پتا نہیں کیوں اپنی ڈاکٹری کا رعب ہر جگہ ڈالنے بیٹھ جاتی ہیں۔ بے چارے رائٹر کا تو ستیاناس مار دیا۔ قفس شکن کا پہلا حصہ پڑھ کر مزہ نہیں آیا۔ زویا اعجاز سے بڑی توقع تھی لیکن کردار در کردار اور رنگا رنگی سی منظر نگاری کوفت میں ہی مبتلا کرگئی۔ امید ہے کہ اگلے حصے میں کہانی سمٹے گی تو ایک اچھا موڑ لے کر اختتام پذیر ہوگی۔ امجد جاوید کے رنگ نے آغاز تو بڑا ہی اچھا لیا تھا لیکن اینڈ تک تھوڑی عجیب ہوگئی۔ روبینہ رشید صید وصیاد کو شروع سے آخر تک ایک نشست میں پڑھ ڈالا اور بڑا مزہ آیا۔ سنسنی خیز قتل وغارت واہ واہ۔ انگارے میں مغل صاحب نے تو اسپیڈ پکڑ لی ہے۔ تاجور کے ارادے ختم نہیں ہورہے اور فسطینا کے لیکچر تو باقاعدہ تحریک چلانے والے ہیں کہ تاجور کو آخری قسط میں پھانسی دے دی جائے جبکہ میں کہتا کہ اگلی قسط میں ہی ماردیں۔ آوارہ گرد وہ واحد کہانی ہے جاسوسی کی جو میں کوشش کرکے بھی نہیں پڑھ پایا ہوں۔ چھوٹی کہانیوں میں، امام نے بڑا ہی ہنسایا لیکن بڑے لوگ تو اور بھی زیادہ لاجواب تھی۔ ایسی شگفتہ کہانیاں ضرور لگائیں جو دیارِ غیر میں ہم پردیسیوں کی خوشیوں کا سبب بنیں۔ اعتزاز وصلی کی آخری شکار ایک لاجواب پیشکش تھی۔ ایسی کہانیاں ہی جاسوسی کی جان ہیں۔ کامیاب واردات نے بھی میری پسندیدہ فلم آنکھیں کی یاد دلاکر خوب مزے کرائے۔ ناگزیدہ پڑھ کر بڑا ہی اچھا لگا کہ دیسی ماحول کی ایک اچھی کہانی تھی۔ ستم ایجاد اور گرپ شاس اتنی پسند نہیں آئیں لیکن موسم اور بزدل نے دل کا موسم بہار ایسا کردیا۔"

کراچی سے ماہ رخ ارباب کا گل رخ تبصرہ "انھیں کو جاسوسی کو پاکر دل باغ باغ ہونے لگا۔ سرورق کی حسینہ اپنے پُرکشش گھونگھریالی زلفوں کے ساتھ اس بار واقعی خوبصورت لگی اور ساتھ کھڑا ہوا بونا جو کھلونا گن ہاتھ میں لیے خود کو ہیرو سمجھ رہا تھا، شاید نظر بٹو کے طور پر ساتھ لگایا گیا تھا۔ چٹکی کٹ چٹکی کی مسندِ اقتدار پر اس بار مظہر سلیم ہاشمی صاحب براجمان تھے اور لائے تھے اک توشۂ خاص۔ ایک بار پھر جاسوسی کا سالانہ تجزیہ۔ بہت خوب! ایمانے زارا پھر سے اپنے برجستہ اور دلچسپ تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ ذوالفقار صاحب یہاں بھی ایمانے سے شکایتیں کرتے پائے گئے۔ عائشہ خان کی تشویش اور بے چارگی ان کے سوالات سے ظاہر تھی۔ آخر میں ڈاکٹر سبا ارشد کی مخصوص دھواں دار انٹری کرانس فس کر تبصرہ مکمل کیا۔ قفس شکن سوچ میں ڈال گئی۔ ہم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ جنگ زدہ علاقوں کے رہنے والے صرف جسمانی اور معاشی ہی نہیں بلکہ بے تحاشا نفسیاتی نقصان بھی برداشت کرتے ہیں۔ بہت خوبصورتی سے زویا اعجاز نے ان کی نفسیاتی الجھنوں اور حقیقی مسائل سے روشناس کرایا۔ کہانی میں سنجیدگی کا عنصر حاوی رہا۔ نام کچھ خاص متاثر نہیں کرپائی۔ نام بدلنا ایک بااختیار بزنس مین کے لیے اتنا مشکل ثابت ہوا۔ منظر امام صاحب کی بڑے لوگ میں آخرکار رشید سے اور اکبر نے ثابت کیا کہ چیونٹی بھی ہاتھی کے پیچھے آئے تو کاٹ لیتی ہے۔ انگارے کو بہت آرام اور سکون سے پڑھنے کا ارادہ تھا مگر شاہ زیب کے نصیب میں کاتبِ تقدیر نے آرام نہیں لکھا اور چار ہاتھ پھر سے لب بام رہ گیا۔ اعتزاز سلیم صاحب ڈائجسٹ کی دنیا میں ایک نیا نام ہیں مگر آخری شکار نے حیران کردیا۔ کہانی کی بُنت اور پختگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں ان کی طرف سے مزید عمدہ تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔ انتقام جیسے پرانے پلاٹ پر ایک دلچسپ اور پُرپیچ تحریر لکھ کر انہوں نے بھی اپنا نام ہمارے پسندیدہ مصنفین میں لکھوا لیا۔ کامیاب واردات اپنے نام کی طرح اتنی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ شاکر لطیف موسم کی صورت میں ایک عمدہ انتخاب لے کر آئے۔ ایک عام سی جرم وسزا پر مبنی تحریر ان کے عمدہ انداز بیاں کے سبب پُرلطف رہی۔ اسکاٹ نے جو اپنے دوست کے ساتھ کیا اسی انجام کا مستحق تھا۔ دشمن میں درد اور اذیت کی ایسی حقیقی تصویر کشی کہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے ایسے تراجم ہی ہیں جو ترجمہ شدہ کہانیوں کا سحر کم نہیں ہونے دیتے۔ امجد جاوید صاحب کو بہت کم پڑھا ہے اور افسوس رہا کہ کیوں کم پڑھا۔ روبینہ رشید کی تحریر صید وصیاد ایک بار جو پڑھنا شروع کی تو ایک ہی نشست میں ختم کیے بنا چین نہ آیا۔ مجرم اور پولیس کے درمیان ہوتی آنکھ مچولی میں بیوروکریسی اور سیاست کے منفی کردار کو بہت خوبی سے آشکار کیا۔ دوسرا رنگ شمارے کی جان ثابت ہوا۔"

کوئٹہ سے سیف خان کی سرگوشیاں "اس بار ٹھنڈی سرسراتی ہواؤں میں جاسوسی کی آمد نرم گرم جھونکے کی طرح محسوس ہوئی۔ مظہر سلیم ہاشمی برف کی پہلی اور اونچی سل پر بیٹھے ٹھٹھرتے نظر آئے اور تھرتھر کانپتے کپکپاتے پورے سال کا ماجرا سنا گئے۔ ویسے انہیں محفل میں دیکھ کر بے اختیار ان کے ہم عصر تبصرہ نگاروں سید شکیل حسین کاظمی، ہمایوں سعید خان، تفسیر عباس بابر، کبیر عباسی، افتخار حسین اعوان، بشریٰ افضل ودیگر کی یاد آئی اور ٹھنڈی سی سانس لے کر رہ گئے۔ ہاشمی کی دیکھا دیکھی انہیں بھی ایک آدھ انٹری مار کر برف پگھلانی چاہیے۔ ایمانے زارا شاد اتنی کڑاکے کی سردی میں بھی محفل میں قلانچیں بھررہی تھیں۔ ایم اقبال۔ تاجور اور شاہ زیب کے ملن کو لے کر ٹھنڈے ٹھنڈے آنسو بہا رہے تھے۔ عائشہ خان عرف ثمر خان کا تبصرہ پڑھا تو سردی اور زکام کے مارے بے اختیار ناک بہنے لگی۔ بیٹا اتنے آنسو تو ہم نے اپنی آنے والی سالگرہ پہ بھی نہیں بہانے جتنے آپ کا تبصرہ پڑھ کر ابھی سے بہہ گئے۔ ذوالفقار میاں اتنی سردی میں اتنی دردناک درخواست نہ کیا کریں۔ چھٹانک بھر جان ہے آپ کی۔ اسی کی نذر ہوجائے گی۔ طلعت مسعود کے تبصرے میں دہی کا نام پڑھا تو لفظوں کی حدت نے یخ بستہ ہواؤں کا مزاج ذرا شانت کردیا۔ ویسے اپنے تبصرے میں سردی کا ذکر کرکے میرے دانت پھر سے بجانے ضروری تھے کیا؟ اس کے بعد ڈاکٹر سبا ارشد کی تباہ کن بمباری نے رہی سہی سردی کو ہوا کردیا اور

عبدالودود عامر، عائشہ مرزا، اشفاق شاہین، اور فراز حسین سومرو کی مبارکباد نے احساسات گرما گرم کر دیے۔ اور ہم خراماں خراماں چلتے چلتے قفس شکن تک پہنچ گئے۔ جاسوسی کے ابتدائی صفحات تک رسائی زویا اعجاز کی بطور لکھاری بہت بڑی کامیابی ہے۔ پچھلے سال پے در پے بہترین رنگ لکھنے کے بعد اس سال انہیں قفس شکن کی صورت ابتدائی صفحات پر پڑھنا بہت اچھا لگا۔ وانیہ کے آخری شکار کے اختتام میں اعتزاز سلیم وصلی نے بالکل چونکا دیا۔ شہریار کا کردار پہلی لائن سے عجیب لگا مجھے۔ آخر میں کڑی سے کڑی مل گئی۔ سرورق کے رنگ دونوں رنگ اس بار میرے فیورٹ رائٹرز نے سجائے تھے۔ انجانا کھیل بالآخر اتفاقی کھیل ثابت ہوا۔ انسپکٹر صارم کے کردار کی پلٹی نے اختتام ذرا اسپل کر دیا ورنہ فرم، سائرہ اینڈ کمپنی کے خلاف کافی پوائنٹس بکھرے پڑے تھے۔ ایسے میں اندر کے کسی آدمی کو ملوث کرنا بہرحال ایک خوشگوار اختتام کے لیے ناگزیر تھا۔ کہانی کا بیانیہ رواں اور سلیس رہا۔ تیزی سے بدلتے مناظر قاری کی توجہ جکڑے رکھنے میں کامیاب رہے۔ دوسرا رنگ روبینہ رشید نے لکھا اور کیا خوب لکھا۔ ایک طویل عرصے بعد جاسوسی تھرل اور کرائم سے بھری کہانی پڑھنے کو ملی اور مزہ آگیا۔“

میانوالی سے محمد سجاول خان کی حاضری ”میرا رشتہ جاسوسی سے 10 سال پرانا ہے مگر چیں نکتہ چینی کی محفل میں ناچیز کو جگہ دے کر اس کا حصہ بنا ڈالا۔ اس بار جاسوسی بڑی دیر سے ملا۔ بقول ہاکر جاسوسی سردی کی وجہ سے لیٹ ہے۔ خیر جیسے ہی جاسوسی ہاتھ میں آیا فوراً کمرے کی راہ لی اور ایسٹر جما کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر دوڑائی اس بار ٹائٹل ذرا منفرد لگا۔ پیوند لگی جینز اور پرانی جیکٹ پہنے نوجوان ہاتھ میں گن اٹھائے خاصا خوش نظر آرہا ہے۔ شاید پہلی بار گن پکڑی ہے یا جاسوسی کے ٹائٹل پر آنے کی وجہ سے چہرے پر مسکان ہے۔ حسینہ بھی کچھ متاثر نہیں کر پائی۔ جب چیں نکتہ چینی کی محفل کی جانب قدم بڑھائے تو وہاں مظہر سلیم ہاشمی اپنے سالانہ تبصرے کے ساتھ کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ ادارے کے ساتھ محبت کا انوکھا انداز بہت اچھا لگا۔ سینٹر جیل سے ایم اقبال کی آمد دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ رتی سے طلعت بھی اپنے تجزیات کے ساتھ موجود تھے۔ کوئٹہ سے اپنے سیف بھی تنقید و تعریف کرتے پائے گئے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی لاجواب تھے۔ اس کے بعد کہانیوں کی فہرست کھنگالی تو وہاں بہت سے اچھے نام موجود تھے۔ قرعہ فال امجد جاوید کے انجانا کھیل کے نام نکلا۔ فرم نامی لڑکے کے گرد گھومتی کہانی کا آغاز تو روایتی قسم کا تھا مگر انجام چونکا دینے والا تھا۔ دوسرا رنگ صید و صیاد کے نام سے جگمگا رہا تھا۔ جاسوسی کے عین معیار کے مطابق تھا۔ موضوع پرانا ہونے کے باوجود روبینہ رشید صاحب نے اس کو بہت اچھے طریقے سے آگے چلایا کہ ایک ہی نشست میں ختم کیے بغیر قاری اٹھ ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد مختصر کہانیوں کو نشانہ بنایا جس کا پہلا شکار اعتزاز کا آخری شکار بنا۔ پچھلی کہانیوں کی نسبت اس میں پختگی کا عنصر نمایاں تھا۔ قاری کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ منظر امام کے بڑے لوگ، ایسی تحریر جو عام آدمی کے گرد گھومتی ہے جو بڑے لوگ بننے کی خواہش کے لیے دلچسپ حربے استعمال کرتے ہیں۔ ان بھولے لوگوں کو پولیس والے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر انجام نے لبوں پر مسکان بکھیر دی۔ شمارے کی دوسری مزاح سے بھرپور کہانی نام ہائے سرور اکرام موجود تھی۔ نام کی وجہ سے شرمندگی کا نشانہ بننے والے منگو نام کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرتے نظر آئے۔ منگو بھولا اس پروفیسر سے نام بدلوا رہا تھا جس کا خود نام بوکا ڈو تھا۔ خیر آخر میں اس کو عقل آہی گئی لٹنے کے بعد۔ ویسے میرے پاس بھی ایک چھوٹی سی مزاحیہ کہانی لکھی ہوئی پڑی ہے کہا میں وہ آپ کو بھیج سکتا ہوں۔“ (کیوں نہیں!)

اے آر بی جٹ کا فیصل آباد سے شکریہ ”ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی آدمی کی ہائٹ کچھ کم لگی ذرا غور کیا تو ہائٹ اور کم لگی۔ اب خدا جانے ہماری نظر کا دھوکا تھا یا آدمی کے پیچھے حسینہ کی خوبصورت آنکھوں اور اسٹرابری جیسے ہونٹوں کا کمال۔ بیک گراؤنڈ میں بنے جامنی کلر کے پھول کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ چیں نکتہ چینی کی صدارتی کرسی پر ہمارے ہاشمی براجمان تھے اپنے سالانہ تبصرے کے ساتھ۔ تبصرہ لاجواب تھا۔ ناظلو کو اتنی خوبی سے بیان کیا تھا کہ ہر شخص ایک دفعہ تو سارے ڈائجسٹ دوبارہ نکال کے ناظلو کا موازنہ کرے گا کہ ہاشمی سر کی فہرست درست ہے یا غلط۔ پورے سال کے رسالوں کا موازنہ ابتدائی کہانیاں آخری کہانیاں نیز ہر قسم کی کہانیوں پہ بہت ہی بہترین انداز میں تجزیہ کیا۔ ویلڈن ہاشمی سر۔ اس کے بعد باقی نکتہ چینی کی طرف نظر بڑھائی تو سارے نام جانے پہچانے لگے۔ سارے ہی تبصرے اور تجزیے لاجواب تھے۔ ابتدائی صفحات پر زویا اعجاز اور آخری صفحات پر روبینہ رشید۔ دونوں رائٹرز نے خوب لکھا جہاں روبینہ جی کے ناول میں بھرپور تھرل اور سسپنس تھا وہیں زویا آپا کے ناول میں چھپا کافی سارے تلخ معاشرتی پہلو۔ بے شک سود ہمارے معاشرے کا ناسور بن چکا ہے۔ ایک ایسا ناسور جو اپنی جڑیں اتنی مضبوط کر چکا ہے کہ اس کا خاتمہ بہت بہت مشکل ہے۔ بس اللہ ہی ہدایت دے تو ہمارے معاشرے کا بچاؤ ممکن ہے۔ دونوں ناولز کی جو بات مجھے بے حد پسند آئی، وہ تھی منظر نگاری خاص طور پر قفس شکن کی۔ وہ ٹھنڈی اور اندھیری رات میں جنگل میں پڑے وجود اور ان کی ہڈیوں میں گھستی ہوئی یخ ٹھنڈی ہوا۔ اس سین کو اتنی خوب صورتی سے لکھا گیا کہ انسان خود وہ ٹھنڈ اور اذیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ دوسرا اسکول والا سین وہ بھی اتنی کمال مہارت سے لکھا گیا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے اب آنکھوں کے سامنے چل رہا ہو، بالکل کسی فلم کی طرح۔ اس طرح روبینہ جی کے ناول میں پہلا قتل۔ اتنی سفاکی سے کیے گئے قتل کو اتنی ہی سفاکی سے بیان کیا گیا۔ الفاظ کا چناؤ بہترین تھا۔ قفس شکن میں کردار نگاری پہ بھی خوب توجہ دی گئی تھی۔ دونوں رائٹرز کو بہت مبارک۔ قفس شکن کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار۔ اعتزاز سلیم وصلی براجمان تھے آخری شکار کے ساتھ۔ کہانی پڑھتے ہوئے کہیں بھی محسوس نہیں ہوا کہ اعتزاز ایک نوآموز رائٹر ہیں۔ انہوں نے بالکل ایک منجھے ہوئے رائٹر کی طرح لکھا۔ کہانی کے آخر تک سسپنس کو برقرار رکھا اور پنچ لائن اتنی سالڈ تھی کہ مزہ دوبالا ہو گیا۔ ترجمہ شدہ کہانیاں مجھے کچھ خاص نہیں بھاتیں لیکن جس طرح وسیم نے لکھا بہت خوب لکھا۔ ان کی کہانی میں مکالمے نہیں تھے لیکن کہانی... بہت شاندار تھی۔ ستم ایجاد اور موسم کچھ خاص رنگ نہ جما سکی۔ اور انگارے طاہر جاوید مغل کا نام ہی کافی ہے اس لیے پڑھے بغیر بتا سکتا ہوں کہانی جاندار اور یہ قسط کافی تند و

تیز رہی ہوگی۔ آخر میں ہاشمی سر کا شکریہ اپنے تبصرے میں مجھے یاد رکھنے کے لیے۔“

سرگودھا سے سعدیہ ہما شیخ کی واپسی ”ساری مصروفیات کو چھوڑ چھاڑ، بال بچوں کو بھی بائے بائے کہہ کر ایک طویل مدت کے بعد جاسوسی کی محفل شگراں میں حاضر ہیں۔ پہلے ٹائٹل سے دو دو ہاتھ کر لیں تو پھر محفل بھی لوٹتے آتے ہیں۔ ٹائٹل کی حسینہ مدہ بھری آنکھ اور کھلے ہونٹوں کے ساتھ دل کو بھا گئی۔ ہیرو کی معصوم صورت اور ہاتھوں میں ہتھیار بالکل میچ نہیں کر رہے۔ اداریہ پڑھ کر دل بوجھل ہو گیا ہاں جو ہے اور ٹرمپ کی مثال بڑی فٹ ہے۔ محفل شگراں میں جانے مانے ناموں نے قبضہ کر رکھا تھا یہاں تک کہ کرسیٔ صدارت پہ بھی براجمان تھے مظہر سلیم ہاشمی کا تجزیہ اچھا لگا اور وہیں سے معلوم پڑا کہ ابلا بشریٰ افضل ابھی تک حیات ہیں۔ (الحمدللہ) عائشہ مرزا کو کھویا کھویا چھوڑ کر ایمان سے ایلو ہائے کی عامر کی باتیں واقعی ہنسنے کی تھیں۔ طلعت مسعود اور سیف خان کے تبصرے بھی بہت زبردست تھے۔ ڈاکٹر صبا اگر چھریاں چاقو لے کر آئیں گی تو ہم ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لائیں گے۔ ابتدائی صفحات پر زویا اعجاز بڑے دھڑلے سے براجمان تھیں۔ اس سنہری دلدل میں نہ جانے کتنے ہیرے دھنس گئے۔ سونیا جیسی عورتوں کی جب بساط الٹتی ہے تو پھر انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔ سرور اکرم اپنا نام بنا رہے تھے تو تنویر ریاض پرانا حساب چکتا کر رہے تھے۔ ناگزیدہ کی جو الھان تھی کہانی اس طرح نہ چلی۔ منظر امام لبوں پہ مسکراہٹ لانے میں کامیاب رہے۔ طاہر جاوید مغل کو انگارے بجھا کر ابتدائی صفحات پر مکمل داستان کے ساتھ حاضری دینی چاہیے۔ اعتزاز وصلی بہت خوب۔ حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے بہت سے معصوموں کو جرم کی راہ پر چلنا پڑتا ہے۔ تحریر واصلی کی گر بہ شناس بھی میدان مار گئی۔ مختصر تحریروں میں ستم ایجاد نے میلہ لوٹ لیا اب آتے ہیں رنگوں کی طرف۔ امجد جاوید اور روبینہ رشید میں کانٹے کا مقابلہ رہا پہلے نمبر پر امجد جاوید کا رنگ رہا۔ تھوڑا سا حقیقت سے دور مگر سرورق سے مکمل تال میل۔ نقاب والی خاتون کا پولیس آفیسر کی بیوی ہونا ہضم نہ ہوا جبکہ اس کا تعلق ایک کال گرل سے بھی ہو۔“

بہاولپور سے مومنہ کشف کی خطرناک دھمکی ”اس بار جاسوسی بڑی جلدی مل گیا۔ گرما گرم، خستہ اور تازہ تبصرہ لے کر میں حاضر ہوں۔ پکوڑے جیسے ناک والی لڑکی بڑا پیارا لپ اسٹک کا شیڈ لگائے ہوئے تھی۔ پورا بازار چھان مارا لیکن نہیں ملا۔ چھوٹی داڑھی والا ہیرو بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ ایسا لگا کسی کا منہ کاٹ کر کسی اور کی باڈی پر لگا دیا ہو۔ اداریے والے گفتہ بھی اچھے لگ رہے تھے۔ چیں نکتہ چینی اس بار بڑے مزے کی تھی کیونکہ سب نے مجھے یاد کیا تھا۔ مظہر سلیم ہاشمی کا اتنا لمبا تبصرہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ یہ تو کہانیاں بھی لمبی لمبی لکھتے ہیں لیکن بہاولپور کے ہیں جان کر شدید حیرت ہوئی۔ اگر میں اپنے بھائی کے ساتھ آپ سے ملنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ایمان نے آپی آپ کا تبصرہ تو شہد جیسا میٹھا ہوتا، آپ کو مرچی جیسا کیوں لگتا۔ عائشہ خان کی سوچیں تو ایسی تھیں کہ مجھے لگا کہ جیسے میری ہم زاد ہوں لیکن شکر ہے کہ نہیں ہیں۔ ذوالفقار ارشد کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی کہ انگریزی کہانیاں نہ ہوں۔ وہی تو سب سے اچھی ہوتی ہیں۔ طلعت مسعود میں خود بھی معصوم اور دلچسپ ہوں اس لیے میرا تبصرہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ سیف خان کوئٹہ والے ناک بہاتے ہوں گے ہم تو بہت صاف ستھرے لوگ ہیں روز نہانے والے۔ فراز سومرو مجھے بھی آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر صبا ایک بار پھر ایک کہانی کا پوسٹ مارٹم کرنے میں لگی تھی۔ خیر وہ کہانی مجھے بھی پسند نہیں آئی تھی اس لیے ان کی بیماری کا خوب مزہ لیا۔ زویا اعجاز کا نام دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی باقی آئندہ، بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ اب ایک مہینہ میں کیسے انتظار کروں؟ انگارے میری فیورٹ ہے اور اس بار بھی بہت اچھی قسط تھی۔ نگی تاجور سے خود کچھ ہوتا نہیں اور شاہ زیب کو پھنسا رہی ہے۔ اچھا کیا کہ اس کو اٹھا کر لے آیا۔ آوارہ گرد بڑی بورنگ چل رہی۔ میں نے کالج میں سیسا جہاز کا پڑھا تھا وہ تو اتنا وزن نہیں اٹھا سکتا پھر شہزری کیسے مجسمہ اٹھا کر اس میں لے گیا؟ چھوٹی کہانیاں ساری مزے کی تھیں پر مجھے ستم ایجاد سب سے زیادہ پسند آئی۔ ناگزیدہ بھی بڑی مزے کی تھی۔ گربہ شناس میں بلی کا رول تو تھوڑا سا تھا، پر مزے کا تھا۔ محمد لطیف کی کامیاب واردات بھی بہت اچھی لگی۔ امجد جاوید کی انجانا کھیل بہت اچھی تھی لیکن روبینہ رشید کی اسٹوری اس ماہ کی سب سے زیادہ اچھی لگی۔ مجھے ان کی کہانیاں بھی اب بہت اچھی لگنے لگی ہیں اور آپ پلیز میرا تبصرہ نہ کاٹا کریں ورنہ میں اور بڑے بڑے لکھنے لگ جاؤں گی۔“

ساہیوال سے عاصم جٹ کی فرمائش ”احباب ونشین کو اس پر تقصیر کا سلام عرض ہے۔ محفل نکتہ چینی سے دوری گردش ایام کے پیش نظر ہے لیکن مظہر سلیم ہاشمی نے رنجر ہوتے ہوئے بھی احقر کو یاد رکھا تو شکریہ یہ کہہ کر قرض لوٹانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کرنے آگیا ہوں۔ محترم آپ کا سالانہ تجزیہ خوب تھا لیکن ناراض نہ ہوں تو صرف اتنا کہوں گا کہ یہ محفل ہر جیسے چھوٹے موٹے لوگوں کے لیے رہنے دیں۔ آپ کہانیوں کے ذریعے ہمارا من بہلائیں کہ جو نئے رائٹرز کی کھیپ آئی ہے ان میں آپ ایک امید کی کرن کی طرح جگمگاتے نظر آئے ہیں۔ دیگر اشخاص میں ڈاکٹر صبا کے تبصرے نے اپنی جانب توجہ مبذول کرائی کہ واقعتاً دماغ کے نہاں خانوں سے یہ آواز دستک دیتی تھی کہ زخمی دل عہد رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔ اگر میرے پرانے شماروں میں بھی کچھ ایسا پڑھا ہو ضرور تھا۔ زویا اعجاز جاسوسی کے افق کا روشن ستارہ بن چکی ہیں۔ تحریر قابل تعریف ہے لیکن بھرپور تبصرہ مکمل ہونے کے بعد ہی ممکن ہے۔ انگارے اور آوارہ گرد خوبی کے ساتھ اپنی اپنی منازل طے کر رہی ہیں۔ دیگر شمارے میں صرف دوسرا رنگ پڑھ سکا ہوں اور یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ روبینہ صاحبہ خاتون ہوتے ہوئے بھی بہت سے مرد رائٹرز سے بہتر جاسوسی کہانیاں تخلیق کرتی ہیں۔ ان کو بھی ابتدائی صفحات یا سلسلے وار کا موقع دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔“ (ہم تو بارہا موقع دے چکے ہر بار دامن چھڑا کے بھاگ جاتی ہیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد اقبال، کراچی۔ آفتاب احمد، حیدرآباد۔ شہباز اقبال، کراچی۔ امتیاز احمد ہمنڈی بہاؤالدین۔ عمران ملک، ہنڈ وآدم۔ ہما انصار، کراچی۔

قفس شکن

زویا اعجاز

چیتے کی طرح چست و چالاک اور عیار مجرم کی ہنگامہ آرائیاں

ہمارے سماجی نظام کے فرسودہ قوانین خوش حالی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں... ایسی رکاوٹیں انسان سے جینے کا حق چھین لیتی ہیں... خاندان کی مشکلات... صعوبتوں نے انہیں اس قدر بے بس کر دیا تھا کہ وہ خوش حالی و نجات کی تلاش میں نکل پڑے... مگر انہیں نہیں معلوم تھا کہ جسے وہ اپنی منزل سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں سنہری دلدل ہے... ایک ایسی ہی دلدل کی فسوں خیز داستان جس میں بے شمار لوگ اپنی مرضی کے خلاف پھنس چکے تھے... کوئی ان کی دست گیری... کوئی کی ہمت نہیں رکھتا تھا... حکم سے سرتابی کی سزا صرف اور صرف موت تھی... وہ منتظر تھے کہ کوئی اٹھے اور پیش قدمی کرے... روشن مستقبل کی چاہ میں تاریکیوں کا شکار ہو جانے والے معصوم اور سادہ لوگوں کی بے بسی و لاچاری...

چلتے چلتے اچانک ہی ایک نیا رخ اختیار کرنے والی داستان......

مصطفیٰ کے ہاتھ بے اختیار اپنی گردن کی جانب بڑھے۔ وہ کھانستے ہوئے اسے سہلانے لگا۔ قمر علی تیورا کر نیچے گر چکا تھا۔ اس کے عقب میں سونیا سائلنسر لگا ایک پسٹل تھامے کھڑی تھی۔

''ریس کا گھوڑا جب ناکارہ ہو جائے تو اسے ٹھکانے لگا دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' وہ سفاکی سے کہتی اس کی لاش کو ٹھوکریں مارنے لگی۔

مصطفیٰ ایک جانب کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اسے آج شدت سے نشے اور چیزوں کے استعمال سے اپنی کھوکھلی ہوتی جسمانی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ لہو کی چھینٹیں اس کے چہرے اور ہونٹوں پر موجود تھیں۔ زبان اب بھی اسی سیال کے زیر اثر تھی۔ غیر اختیاری طور پر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بار پھر وہی نمکین ذائقہ محسوس کیا۔ جسم میں ایک راحت بخش پھریری سی دوڑ گئی۔

''اٹھو! فریش ہو جاؤ اور اسے ٹھکانے لگاؤ جلدی!'' سونیا گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔

''کیا کرنا ہے اس کا؟'' مصطفیٰ نے حسب سابق اسی سے رائے لی۔ باپ کے مرنے کا اسے رتی بھر افسوس نہ تھا۔ وہ ہر احساس سے عاری ہو چکا تھا۔

''صبح ابھی بہت دور ہے۔ ملازمین سو رہے ہیں۔ اسے عقبی لان میں گاڑ دو۔''

سونیا نے فوراً ہی جواب دیا۔

مصطفیٰ نے ٹھنڈے پانی کے شاور سے اپنا خمار دور کیا اور پھر چابکدستی سے اس کے حکم کی تعمیل میں جت گیا۔ اس نے ہانپتے کانپتے گڑھا کھودا اور قمر کو توڑ مروڑ کر وہیں پھینک دیا۔

اسی رات سونیا اپنی سیاہ شیشوں والی گاڑی میں ایک 'نادیدہ' قمر کو لنائے شہر میں ائرپورٹ پر چھوڑ آئی تاکہ وہ اپنے عارضۂ دل اور دیگر امراض کا بیرونِ ملک علاج کروا سکے۔ اس کے بعد اس نے اگلے روز سے فیکٹری کے سبھی معاملات سنبھال لیے۔

اسلحہ کی طلب و رسد کے معاملات بھی جوں کے توں چلتے رہے۔ اب انتظار تھا تو بس اس دن کا جب مصطفیٰ 'سیاسیات' کی ایک مخصوص ڈگری لے کر اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کر سکتا لیکن اس سے قبل ہی ان کی زندگیوں میں ایک اور ہولناک موڑ چلا آیا۔

☆☆☆

قمر کی زندگی اور پوزیشن انہیں بہت سی 'آفات' سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔

قدرتی امر تو یہ بھی تھا کہ اپنی بوئی گئی فصل کی کٹائی کا وقت بھی آ گیا تھا۔ بظاہر سونیا بہت خوش اسلوبی سے فیکٹری سنبھالے ہوئے تھی۔ مصطفیٰ مطلوبہ ڈگری 'حاصل' کر چکا تھا اور اب طے شدہ منصوبے کے مطابق علاقے میں اپنی 'ساکھ' بہتر بنانے میں مصروف تھا۔ کچھ ماہ بعد وہ بیرونِ ملک 'زیرِ علاج' قمر کی خبرگیری کے لیے بھی روانہ ہو جایا کرتے تھے۔ سب کچھ بہترین چل رہا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے سونی۔ اتنے تفکرات کاہے کو بھلا؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''آج کل فیکٹری میں بھتّا خوری کی ڈیمانڈ کے بہت سے فون آنے لگے ہیں۔ ان دھمکیوں کو پہلے پہل تو میں نے سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی مخالف پارٹی کے کام ہیں۔ بھتّے کی آڑ میں وہ ہمیں دباؤ میں لاکر اس علاقے پر اپنا ہولڈ قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

''اوہ تو پھر کیا حل ہے اس کا؟'' وہ بھی متفکر ہوا۔

''اس فیلڈ میں یہ سب کوئی نئی بات نہیں سوئٹ ہارٹ! بڑی مچھلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں کہ میری بیک اب بھی بہت مضبوط ہے۔ قمر نہیں تو کیا ہوا، میرے کانٹیکٹس بہت وسیع ہیں۔'' وہ تکبر سے بولی اور چند ماہ بعد ہی اپنے اس تکبر کی زد میں آکر نہ صرف جان کی بازی ہار بیٹھی بلکہ مصطفیٰ کے لیے ایک ایسا لامتناہی عذاب چھوڑ گئی جو اسے بالآخر یونانی سرزمین تک لے آیا۔

☆☆☆

تھکاوٹ، بے خوابی اور اعصابی انتشار کے باوجود نیند مصطفیٰ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

ماضی کا سفر کسی بھی انسان کو کبھی پھولوں کے مانند ہلکا پھلکا کر دیتا ہے تو کبھی صدیوں کی سی تھکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔ مصطفیٰ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ اسے آج بھی اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے قمر کے قتل کا کوئی تاسف تھا، نہ ہی سونیا سے تعلقات کا ملال۔

وہ ایک ایسے بیج کا خمیر تھا جو بے حسی اور مردہ ضمیری میں اپنی مثال آپ تھا اس لیے باپ کے قتل کے بجائے اسے وہ حسین، طرح دار اور دبنگ قاتلہ بے حد یاد آتی تھی۔ حویلی سے نکل آنے کے بعد، مختلف علاقوں میں روپوشی اختیار کرتے، خیمے کی بدترین زندگی میں بھی سونیا کا تصور کسی پل اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔

اس کے لاشعور میں ایک ہلکی سی خلش تھی جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی سہانے خواب میں مبتلا ہے اور جب آنکھ کھلے گی تو وہ پھر سے کسی خیمے کے سنگی فرش پر لیٹا اپنے اردگرد بدبودار جسم، نوحے اور استحصال کی ایک نئی لہر موجود پائے گا۔

عدنان کا تصور ذہن میں آتے ہی اس کی خلش کو سکون میسر آگیا اور اسے اپنی بے چینی کا سبب بھی سمجھ آنے لگا۔ وہ عدنان کے اسی خول سے بے یقینی، غصہ اور نفرت نما حسد کا شکار ہو رہا تھا۔

عدنان اور مصطفیٰ کی چپقلش اسی روز سے جاری تھی جب وہ ترکی کے 'سیف ہاؤس' میں رہائش پذیر تھے۔ وہ اس کی بے حسی اور سست روی سے بہت خار کھاتا تھا پھر جس روز وہ کوسٹ گارڈز کے نرغے میں آئے تو نفرت کا یہ رشتہ مزید گہرا ہو گیا۔

''ہالٹ! رک جاؤ!'' ایک افسر چلّایا لیکن اثر ندارد۔

دوسرے نے فوراً نشانہ لے کر گولی چلا دی۔

مقابل لڑکھڑایا اور وہیں زمین بوس ہو گیا۔

''انہیں اٹھا کر اس پتھر کی آڑ میں لے چلو! میں ان کی کیمپ منتقلی کا بندوبست کرتا ہوں۔'' وہ سر جھٹکتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

مصطفیٰ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ بہتے ہوئے لہو کے منظر نے اس کے وجود میں ایک تشنگی اجاگر کر دی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا زخمی کے پاس پہنچا اور پتھر کی آڑ میں لے جا کر لہو اگلتے زخم کو ندیدے پن سے دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور مہک محسوس کرتے ہوئے بے اختیار ہونٹوں سے رگڑنے لگا۔

وہ شدید سُرور و کیف سے دوچار تھا۔ اسی پل اسے بائیں پہلو پر کسی نے ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ بھناتا ہوا اٹھا لیکن اپنے سامنے عدنان کو کھڑا دیکھ کر ہڑبڑا گیا۔

''میرے اندازے سے بڑھ کر غلیظ اور درندہ نما انسان ہو تم!'' اس نے تنفر سے کہا۔

''کیوں بھڑک رہے ہو؟ کیا یہ تمہارا سگا رشتے دار ہے؟''

''یہ میرا کون ہے...... تم جیسا درندہ کبھی نہیں سمجھ سکتا...... آئندہ کوشش کرنا کہ جب تک میں یہاں موجود ہوں، میرے سامنے مت آنا...... ورنہ تمہارا ٹینٹوا دبا دوں گا۔'' عدنان نے اسے ایک اور گھونسا رسید کیا اور اپنی قمیص سے ایک پٹی پھاڑ کر اس کے زخم پر کس کے باندھ دی۔

خون بہنا اب بند ہو گیا تھا۔ عدنان نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کھا جانے والی نظروں سے مصطفیٰ کو گھورنے لگا جو مدہوشی کی سی کیفیت میں ایک اور پتھر پر بیٹھا لہروں سے کھیلنے میں یوں مگن ہو گیا جیسے کسی پکنک پر آیا ہو۔

☆☆☆

بوتل میں شراب ختم ہو چکی تھی لیکن مصطفیٰ کے وجود میں اب بھی بے سکونی تھی۔ وحشت اور بے کلی اسے اپنا ہی وجود نوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور بے مقصد کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دیوار گیر خوبصورت کلاک پر سوئیاں رات کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ وہ بے دھیانی میں کمرے کا دروازہ کھول کر برائن کو آواز دینے لگا۔

''برائن! کدھر مر گئے ہو بہرے انسان؟'' وہ حلق کے بل چلّایا۔

واجد اور عدنان اس کی وحشت، بکھرے اُلجھے بال اور لب و لہجہ دیکھ کر خاصی ناگواری محسوس کر رہے تھے۔

''یس سر! کیا کوئی مسئلہ درپیش ہے؟'' برائن نے شائستہ انداز میں پوچھا۔

''سپارٹس کہاں ہے؟ اس نے کہا تھا ڈنر پر موجود ہوں گا۔''

''وہ کسی ضروری کام میں اُلجھے ہوئے ہیں...... شاید آج رات نہ آسکیں۔'' واجد نے قومی زبان میں اسے بتایا۔

''اپنی زبان بند رکھو تم! جب دو بڑے بات کر رہے ہوں تو تو بچے درمیان میں نہیں بولتے۔'' مصطفیٰ نے جھنجلا کر اسے کہا اور پھر برائن سے تحکمانہ مخاطب ہوا۔

''ڈنر میرے کمرے میں پہنچا دینا۔ اس کے ساتھ بلیک ڈاگ کی دو بوتلیں اور نیند کی کچھ ٹیبلیٹ بھی بھجوانا۔''

''تیرے باپ کا ملازم نہیں وہ...... ذرا تمیز کے دائرے میں رہ...... یہ نہ ہو واپس اسی کیمپ میں بھیج دیا جائے تجھے۔'' عدنان نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

اس کا اعتماد اور تیور دیکھ کر وہ ہمیشہ ایک نادیدہ دباؤ محسوس کرتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتا ہوا وہ دوبارہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''عجیب سنکی انسان ہے...... لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اکثر آپ سے دب جاتا ہے۔'' واجد سادگی سے بولا۔

''سنکی نہیں...... مریض ہے۔ ذہنی مریض...... اقتدار کا گھمنڈ اب تک اس کے حواسوں پر سوار ہے...... رسّی جل چکی ہے لیکن بل اب بھی نہیں گئے۔''

''بہت تیز نگاہ ہے آپ کی......'' واجد حیران ہوا اور پھر ایک توقف سے پوچھا۔ ''میرے بارے کیا خیال ہے ویسے آپ کا؟''

''بہت معصوم اور بھولے ہو تم! ایک ایسے پرندے کی طرح جس نے اُڑان بھرنی سیکھی ہی نہیں تھی اور اسے جھکڑ آلود ہواؤں کے سپرد کر دیا گیا۔'' واجد اس کے قیافے پر ششدر رہ گیا۔

''تمہارے لیے ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ آفر قبول نہ کرنا...... کہ شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر۔'' اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

واجد اس کی اُلجھی گفتگو سے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام تھا۔ اداسی ایک دفعہ پھر اس کے دل و دماغ پر دستک دینے لگی۔ وہ بے دلی سے چمچ اور کانٹے کو پلیٹ میں گھمانے لگا۔ کھانا خوش ذائقہ اور بہترین تھا لیکن اسے اپنے چھوٹے سے آنگن میں موجود سادہ سے باورچی خانے کے کھانے کی مہک یاد آنے لگی۔

☆☆☆

سپارٹس اپنی اسٹڈی میں مخصوص راکنگ چیئر پر بیٹھا

تھا۔

اس کی کشادہ پیشانی پر شکنوں کا ایک جال تھا۔ کافی کا کپ ہاتھ میں تھامے وہ ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ کافی ختم ہونے تک وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ کپ ایک جانب رکھ کر اس نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور برائن کو طلب کیا۔ وہ چند ہی لمحوں میں اس کے سامنے موجود تھا۔

''کیا رپورٹ ہے؟''

''ایوری تھنگ اِز فائن سر!''

''کیسا دن گزرا؟''

''وہ اپنے کمروں میں ہی رہے۔ واجد سب سے زیادہ آپ کا منتظر ہے۔''

''ہمم...... کیا ریڈنگ ہے تمہاری اُن کے متعلق؟''

''میں مطمئن نہیں ہوں اُن سے۔'' برائن نے محتاط انداز میں کہا۔

''لیکن وقت کم ہے اور پراجیکٹ ہر صورت مکمل کرنا ہے۔''

''جلد بازی مناسب رہے گی کیا؟'' اس نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

''واجد کی مجھے پروا نہیں۔ جدھر چاہوں مڑ جائے گا پراجیکٹ ون کے لیے بہرحال وہ بھی مناسب نہیں۔'' سپارٹس نے پیشانی مسلی۔

''پراجیکٹ ون کے لیے مصطفیٰ کا نام ہی ذہن میں آتا ہے۔ اس کے انداز و اطوار مجھے سخت ناپسند ہیں لیکن اس کام کے لیے فی الوقت بہترین آپشن وہی ہے۔''

''ہمم! میرا بھی یہی خیال تھا''

''تیسرے شخص کی اہلیت اس پراجیکٹ کے لیے آئیڈیل تھی لیکن وہ بہت ٹیڑھا انسان ہے...... حرام و حلال کے چکر میں الجھا رہتا ہے۔'' برائن نے بھرپور تجزیہ کیا۔

سپارٹس کچھ دیر کے لیے خاموش رہا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے موبائل فون پر ایک کال ملائی۔ دوسری جانب سے جواب نہ پا کر اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ اس نے فون ایک طرف پھینکا اور برائن سے مخاطب ہوا۔

''جوانا کہاں ہے؟''

''وہ گھر پر نہیں ہیں!''

''واٹ ربش! کیا وہ رات کو گھر نہیں آئی؟''

''نو سر! وہ کل صبح سے ہی غائب ہیں۔''

''اور یہ تم مجھے اب بتا رہے ہو؟'' وہ دہاڑا۔

''آپ مصروف تھے سر! اس لیے......''

''بھاڑ میں گئی میری مصروفیت! جوانا سے بڑھ کر میرے لیے کچھ بھی نہیں...... اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو!''

''دراصل وہ چونکہ ٹریس ہو گئی تھیں اس لیے میں مطمئن تھا......''

''کہاں ہے وہ؟'' سپارٹس غرایا۔

برائن اس کے تیور دیکھ کر خائف ہونے لگا۔ ''وہ...... وہیں ہیں......''

''تو اس کا مطلب ہوا کہ میرے سمجھانے بجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا!'' اس کے استفسار پر برائن نے خاموشی میں عافیت سمجھی۔

وہ اب راکنگ چیئر سے اٹھ کر پشت پر ہاتھ باندھے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''آف کر دو اُسے بھی!'' ایک توقف کے بعد سپارٹس کی سفاک آواز نے برائن کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑا دی۔

''سر! لیکن جوانا کا ردِعمل! کہیں وہ پھر سے......''

''میں سنبھال لوں گا اسے!'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔

برائن نے اثبات میں سر ہلایا اور ہونٹ بھینچے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

سپارٹس نے اسٹڈی ٹیبل پر اوندھی رکھی کتاب تھامی اور گزشتہ روز نوٹ کیے گئے نکات پر کام شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ اپنا مطلوبہ مواد حاصل کر چکا تھا۔ اس نے طمانیت بھری سانس لی اور اپنا لیپ ٹاپ تھامے نہایت سنجیدگی سے ایک اہم 'ٹاسک' میں مشغول ہو گیا اس کا انہماک قابلِ دید تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ اسکرین آف کرتا ہوا بہت پُرسکون تھا۔ انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے کلاک کی طرف دیکھا اور ملحقہ دروازے سے اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گیا۔ نیند کی وادی میں جانے سے قبل اس کے ذہن میں آخری خیال جوانا ہی کا تھا۔

وہ اُسے راہِ راست پر لانے کے لیے ایک منصوبہ ترتیب دے چکا تھا۔ ایک بے حد پُرسکون اور گہری نیند اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح بے حد روشن تھی۔

عدنان تازہ دم ہو کے ڈائننگ ہال میں پہنچ چکا تھا۔ واجد اور مصطفیٰ کے برعکس وہ اس گھر میں صرف اپنے کمرے میں مقید نہیں رہنا چاہتا تھا۔ حرکت میں برکت ہے کے مصداق وہ اپنی بقا کے لیے کوئی نہ کوئی ٹرمپ کے پتے ہاتھ میں رکھنے کا خواہشمند تھا۔

سپارٹس کی دی گئی توجیہات تو اس کے لیے کسی قدر قابلِ قبول تھیں لیکن واجد نے گزشتہ رات اپنی سادگی اور روانی سے سپارٹس سے ملاقات کا احوال بتانے کے بعد جو باتیں اسے بتائی تھیں، عدنان کا ذہن اسے قبول نہیں کر پایا تھا۔

وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور انسان تھا۔ دورانِ تعلیم ملکی حالات و واقعات کے علاوہ بین الاقوامی منظرنامہ پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔ لہٰذا ایسے کسی بھی انسان کے لیے اس دور دراز جزیرے پر بیٹھے مخلوط نسل کے فرد کی زبانی اپنے ملک و قوم کے لیے دردمندانہ جذبات سننا متاثر کن نہیں بلکہ لمحۂ فکریہ تھا۔ وہ اس شترمرغ کی طرح بھی ہرگز نہیں تھا جو طوفان سامنے دیکھ کر اپنی گردن ریت میں دبا لیتا ہے۔ اسے علم تھا کہ بحیثیت قوم وہ ہر جانب سے ایک گرداب میں دھکیلے جا چکے ہیں۔ اب وہ اس بھنور سے نکلنے کی کوشش بھی کریں تو چاروں سمت متعین 'پہریدار' انہیں کسی صورت باہر آنے نہ دیں گے۔

ان کی غرقابی ہی مذکورہ افراد کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ ایسے میں این۔ جی۔ او کی صورت میں عالمی سطح پر آواز اٹھانا...... چہ معنی دارد۔ سو وہ صبر و تحمل سے بلی تھیلے سے باہر آنے کا خواہشمند تھا۔

اس وقت اس کی نظر برائن پر مرکوز تھی جو مستعدی سے ملازمین کو ہدایات دیتا بگولے کی طرح اِدھر اُدھر چکرا رہا تھا۔

''برائن! سب کچھ ٹھیک تو ہے ناں؟'' عدنان نے اچانک پوچھا تو ڈائننگ ٹیبل پر اخبارات رکھتے برائن نے بے ساختہ پلٹ کر اسے دیکھا۔

''یس! آل اِز ویل!''

''نروس سے دکھائی دے رہے ہو!''

''وہم ہے تمہارا!'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''ویسے ایک ذاتی سوال پوچھوں اگر برا نہ مناؤ تو؟''

''یس! شیور!''

''اس گھر میں تمہاری حیثیت ڈیفائن نہیں کر پایا! کبھی لگتا ہے کہ یہاں سرونٹ ہیڈ اور کوآرڈی نیٹر ہو اور کبھی محسوس ہوتا ہے کہ سپارٹس کے مشیرِ خاص بھی ہو۔'' عدنان اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات کو مسلسل اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔

''تمہارا قیافہ درست نہیں مسٹر! میں یہاں صرف انتظامی امور کا نگران ہوں۔ سپارٹس صاحب کی تنظیم میں ایک سے بڑھ کر ایک ذہین اور مدبر افراد ہیں۔'' وہ متانت سے بولا۔

''اوہ...... آئی سی! لیکن یہ مدبر اور ذہین افراد بیرونِ شہر سے سپارٹس کی آمد کے بعد اس کے ساتھ وقت گزاری یا مشاورت کرنے نہیں آتے بلکہ آدھی رات کے بعد نگران صاحب ایک گھنٹا اس کے کمرے میں وقت گزار کر آتا ہے...... یہ نکتہ کچھ ناقابلِ ہضم لگا مجھے...... خیر! اِٹ اِز ایزی! آپ لوگوں کا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں نے تو یونہی ازراہِ تجسس پوچھ لیا۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

برائن اسے نظرانداز کرتا ہوا اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہو گیا۔

''ویسے میں ایک اور بات بھی سوچ رہا تھا!'' عدنان نے ایک توقف سے کہا۔

''سوچنے پر پابندی نہیں کوئی، سوچتے رہو!'' برائن مسکرایا۔

''یہ جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے...... ایک کلک پر ساری دنیا آپ کے سامنے ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اخبارات...... بات کچھ جچتی نہیں۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''یہ باس کا ذاتی شوق ہے۔ قدامت کا حُسن انہیں بہت بھاتا ہے۔'' برائن نے اسے 'ادھورا سچ' بتایا۔

عدنان نے بھی مسکراتے ہوئے سر کو ہلکی جنبش دی اور سرسری انداز میں نامانوس زبان کے ان اخبارات کی تصاویر دیکھنے لگا۔ وہ مصطفیٰ اور واجد کا منتظر تھا لیکن جب دو ملازمین کو جہازی ٹرے میں ناشتا کے لوازمات ان کے کمروں کی جانب لے جاتے دیکھا تو بے اختیار غصہ آنے لگا۔

''گدھے، احمق کہیں کے۔ خود بھی مریں گے اور مجھے بھی مروائیں گے۔'' اس نے ہونٹ بھینچے۔

واجد اور مصطفیٰ کی جانب سے مایوس ایک طرف لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے دانستہ طور پر برائن سے جو 'چھیڑ چھاڑ' کی تھی، وہ یقینی طور پر کوئی مثبت نتیجہ برآمد کرے گی۔ وہ

لوگ اب اس کی ذات سے لازماً احتیاط کا مظاہرہ کریں گے اور فطری اصولوں کے مطابق اکثر اوقات احتیاط ہی بے احتیاطی کا موجب بن جایا کرتی ہے۔

عدنان اسی 'بے احتیاطی' کا بے چینی سے منتظر تھا۔

☆☆☆

سیارس بھی نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔

گزشتہ رات برائن سے گفتگو اور اپنے کام میں مشغول رہنے کے باعث وہ کافی تاخیر سے سویا تھا اس لیے جاگنگ کے لیے بھی نہ اٹھ پایا۔ بیڈٹی اس نے اپنے کمرے میں ہی منگوالی تھی۔ برائن کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں پوشیدہ نہ رہ سکیں۔

''کیا پریشانی ہے بھئی؟''

''سر! اب مزید تاخیر مناسب نہیں۔ عدنان کے سوالات اور تجزیے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اس کی ذہانت بہت خطرناک ہے۔'' اس نے تشویش زدہ انداز میں کہا۔

''ڈونٹ وری! میں آج ان سے فرداً فرداً ملاقات کروں گا۔ میں خود بھی اس معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا۔''

''جی بہتر!''

''ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت کون موجود ہے؟''

''کوئی بھی نہیں..... کچھ دیر پہلے عدنان ہی موجود تھا۔ باقی دونوں نے ناشتا کمرے میں منگوایا ہے۔''

''تمہیں گزشتہ رات ایک اور کام سونپا تھا میں نے!'' سیارس نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''جی! آج شام 'ٹارگٹ' آف کر دیا جائے گا۔''

''گڈ! میں منتظر رہوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

برائن کو کمرے سے جانے کا اشارہ کرنے کے بعد وہ مصطفیٰ سے ملاقات کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگا۔

☆☆☆

مصطفیٰ کمرے میں بنتِ انگور سے دل بہلاتا ہوا اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

اس کا لباس مسلا ہوا اور سلوٹ زدہ تھا۔ چہرے کی تمازت' آنکھوں کا خمار اور بے ربط حرکات و سکنات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ متواتر مے نوشی میں مصروف رہا ہے۔ سیارس کے لیے یہ بہت اچھی علامت تھی۔

سیارس اس سے مطلب کی بات کرنا چاہتا تھا۔

مصطفیٰ خاموشی سے نیا جام بنانے لگا۔

''اگر تم واپس ڈی پورٹ ہونا چاہتے ہو تو میں وہ انتظامات کروائے دیتا ہوں۔'' سیارس نے اسے ٹٹولا۔

''نہیں! وہاں میرے لیے کچھ نہیں رکھا اب..... وہاں پہنچتے ہی دھر لیا جاؤں گا۔ ایجنسیاں میری بُو سونگھتی پھر رہی ہوں گی۔ جس روز اُن کے ہتھے چڑھا، میرا سراغ بھی نہیں ملے گا۔ حقائق جاننے کے لیے وہ میرا ریشہ ریشہ اُدھیڑ دیں گے۔'' وہ جھرجھرا گیا۔

''کہتے تو ٹھیک ہو۔'' میرے پاس ایک اور آپشن موجود ہے..... اگر تم راضی ہو تو!'' سیارس نے لمحاتی غور و فکر کے بعد کہا۔

''ہاں بولو!''

''میں آرٹ کا شیدائی ہوں اس لیے اپنے اس شوق کی تسکین کے لیے آرٹ موویز بھی بناتا ہوں۔ یہ کمرشل موویز کی طرح ایکشن پر بالکل مبنی نہیں ہوتیں بلکہ بامقصد اور سنجیدہ نوعیت کی ہوتی ہیں..... تعلیم یافتہ اور حساس طبقہ انہیں بہت پسند کرتا ہے۔''

''کس زبان میں بناتے ہو؟'' اس نے بلوریں گلاس سے ایک گھونٹ لیا۔

''ظاہر سی بات ہے..... بین الاقوامی زبان میں.....''

''اس کی اور میری بڑی پرانی دشمنی ہے بھائی! ہم دونوں کی کبھی نبھ نہیں سکی..... اور نہ ہی کبھی نبھے گی۔'' مصطفیٰ نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

''کیا میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں؟'' سیارس نے سنجیدگی سے کہا۔

''لگتے تو نہیں تھے لیکن اب لگنے لگے ہو..... میری ٹوٹی پھوٹی زباں دانی دیکھ کر تمہاری مووی کے شائقین پہلے ہی سین کے بعد ٹماٹر اور انڈے پھینکنے لگیں گے۔ اپنی ساکھ خود داؤ پر لگا رہے ہو..... اب احمق نہ سمجھوں تمہیں تو اور کیا کروں؟'' شدید ہنسی سے اسے کھانسی ہونے لگی تھی۔

''ایک اچھا بزنس مین وہی ہوتا ہے جو اپنی پراڈکٹ کی کوئی بھی خامی، خوبی بنانے کی اہلیت رکھتا ہو..... میں تمہیں خود اسکرپٹ لکھ کر دوں گا، الفاظ سادہ اور آسان ہوں گے اس لیے تلفظ کی ادائیگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

''اور میرے چہرے کا کیا کرو گے؟ اگر یہ مووی انٹرنیٹ پر وائرل ہوئی تو اگلے ہی روز وہ میری گردن ناپ لیں گے۔''

''اگر میں کہوں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا تو.....؟'' سیارس نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''کرنا کیا چاہتے ہو تم؟ کھل کر بتاؤ.....'' مصطفیٰ جھنجلا گیا۔

''میک اَپ مائی ڈیئر! معمولی سا میک اَپ تمہارے خد و خال تبدیل کر دے گا..... اور ایک بات ابھی سے ذہن نشین کر لو! میری مووی کے شائقین بہت بااختیار اور اعلیٰ عہدیداران بھی ہیں۔ اگر مووی انہیں پسند آئی تو تمہیں سیاسی پناہ بھی بہ آسانی مل جائے گی۔ پھر تم دھڑلے سے یہاں اپنی اصل شکل و صورت کے ساتھ رہنا..... کوئی ایجنسی تمہاری گرد بھی نہ پا سکے گی۔''

''کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟'' وہ حیران ہوا۔

''سیارس کی لغت میں 'ناممکن' لفظ موجود ہی نہیں ہے۔'' اس نے باوقار انداز میں کہا۔

''آئیڈیا بُرا نہیں ہے..... مووی..... مصطفیٰ..... ہیرو..... ایکٹنگ..... واؤ۔'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''تم اس کردار کے لیے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہو بلکہ تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ قدرت نے دستِ غیبی سے میری مدد کی ہے۔''

''اوکے! میں تیار ہوں۔''

''گڈ! میں خود بھی یہ کام جلد از جلد مکمل کر لینا چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا پراجیکٹ ہے۔''

''تم فکر نہ کرو! بس دیکھتے جاؤ۔ میری ایکٹنگ دیکھ کر لوگ بڑے بڑے بین الاقوامی اسٹارز کو بھول جائیں گے۔'' مصطفیٰ نے چٹخارا لیا۔

میں بھی یہی چاہتا ہوں..... اب تم آرام کرو۔ شام کو میں تمہیں اسکرپٹ لا کر دوں گا۔ ایک گھنٹے کی اس فلم میں مکالمے ادا کرنے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔''

مصطفیٰ بے یقینی اور مزید سرشاری میں مبتلا ہو گیا۔

''تو پھر برائن سے کہنا مجھے مزید وائن بھجوا دے۔''

''شیور! ہو جائے گا یہ۔'' سیارس نے کہا۔

''میں نے ایک اور فرمائش بھی کی تھی ویسے!''

''اس کا انتظام بھی جلد ہو جائے گا..... ریلیکس!''

''جلد کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟ میں تمہاری آنے والی فلم کا ہیرو ہوں لہٰذا میرے مطالبات پورے ہونے چاہئیں۔''

''اوکے! ابھی ہو جائے گا۔ میں برائن سے کہے دیتا ہوں۔'' سیارس نے اپنی ناگواری بمشکل ضبط کی اور انٹرکام اٹھا کر برائن کو ہدایات دینے لگا۔

مصطفیٰ کی باتوں، ندیدگی اور بے ڈھنگے پن نے اس کا مزاج برہم کر دیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ وہیں کھڑے کچھ جوڑ توڑ کیا اور واجد کے پاس جانے کا ارادہ موخر کر دیا۔ وہ اس بیزاری اور چڑچڑاہٹ میں اس سے بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس اپنی اسٹڈی کی طرف چلا گیا۔ اپنی جھنجلاہٹ اور طیش اسکرپٹ پر اتارنے کا یہ بہترین موقع تھا جو بعدازاں بہت سودمند ثابت ہوا۔

☆☆☆

عدنان اپنے کمرے کی قدِ آدم کھڑکی سے نظر آنے والے سرمئی آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔

شفق کے کناروں پر چھائی سنہری دھوپ اپنے پَر سمیٹتی دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی تھی۔ آسمان اب سرمئی چادر اوڑھے کسی اداس دوشیزہ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ عدنان کو یہ منظر بہت بھاتا تھا۔ دن بھر سورج بادشاہ کی حکمرانی اور نکھری دھوپ میں چمکدار، روشن دکھائی دینے والا فلک اپنے محبوب سے جدائی کے وقت اداسی اور یاسیت میں گھر جاتا ہے کیونکہ شب کی تاریکی اسے اپنے نرغے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔

دو وقت ملنے کا یہ منظر عدنان کو بچپن ہی سے بہت پسند تھا۔

اپنا سر جھٹکتے ہوئے اس نے ایل۔ ای۔ ڈی پر دھیان مرکوز کر دیا لیکن وہاں کوئی من پسند پروگرام نہ پا کر ایک بار پھر دبے قدموں نیچے اتر گیا۔ اکیلے کمرے میں ماضی کی پرچھائیوں کے پیچھے ہلکان ہونے کے بجائے وہ حرکت اور عمل کو ترجیح دیتا تھا۔

نچلا پورشن حسبِ توقع خالی تھا۔ ویرانی اور خاموشی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ گزشتہ روز اس نے ایک میز پر کچھ بین الاقوامی جرائد اور رسالے پڑے دیکھے تھے۔ وقت گزاری کے لیے وہ انہیں تھام کر لاؤنج میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

یہ کچھ سائنسی رسالے تھے اور سائنس سے اسے بہت لگاؤ تھا۔ وہ دلچسپی اور انہماک سے ان رسائل کی ورق گردانی کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک ناگوار بُو اس کی ناک سے ٹکرائی۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ دائیں جانب اٹھارہ انیس سالہ ایک لڑکی کھڑی تھی۔

اس نے ایک تنگ ٹراؤزر اور انتہائی باریک کپڑے کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کندھوں پر جھولنے والے بال

بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ شرٹ کا گلا قابلِ اعتراض حد تک کشادہ تھا۔ عدنان کو اسے دیکھ کر کوفت ہونے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید خمار تھا۔

''شاٹریٹ مین!'' (ہیلو) وہ مخمور آواز میں بولی۔

''گھیا!'' (ہائے)۔ عدنان نے دھیرے سے کہا۔

''پوش ایشے۔'' (کیسے ہو؟)

''ایسے کالوش۔'' (میں ٹھیک ہوں) ''اکی رستو۔'' (شکریہ) عدنان جواب دیتے الجھنے لگا۔ پہلی ہی ملاقات پر اتنی بے تکلفی اسے کچھ ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

لڑکی نے ایک بار پھر بوتل سے گھونٹ بھرا اور منہ ہی منہ میں بُدبُدا کر کوئی سوال کیا۔

''سوری مادام! مجھے اس سے زیادہ آپ کی زبان نہیں آتی۔'' اس کی شستہ انگریزی اور قدرے بلند لہجہ سن کر وہ پہلی دفعہ چوکنا ہوئی اور بغور اس کی جانب دیکھا۔

''کون ہو تم؟ اور برائن کدھر ہے؟'' وہ درشتی سے بولی۔

''مجھے علم نہیں۔ ہوگا کہیں نا کہیں!''

وہ جھومتی ہوئی اب اس کے سامنے موجود صوفے کی ہتھی پر بیٹھ گئی۔ اس کی لڑکھڑاہٹ دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحہ سر کے بل گر جائے گی۔

''میرے لیے ایک لیمونیڈ اور بلیک کافی لے آؤ!'' وہ تحکمانہ بولی۔

''سوری! یہ کام میرے ذمے نہیں ہے۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''نہیں ہے تو میں لگا دیتی ہوں۔ اٹھو اور فوراً لاؤ۔''

''محترمہ! میں یہاں ملازم نہیں ہوں، مہمان ہوں...... اور مہمانوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کی روایت کسی بھی مہذب معاشرے میں نہیں ہوتی۔''

''ہاہا مہمان......'' وہ بے ساختہ ہنسی۔ ''تمہیں یقیناً سپائرس نے یہاں ٹھہرایا ہوگا۔ رائٹ؟''

عدنان نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''سپائرس جب تمہارے قبیلے کے لوگوں کو بطور مہمان یہاں ٹھہرانے لگے تو اس کا واضح مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ مستقبل قریب یا بعید میں ہمارے غلام کے عہدے پر فائز ہونے والا ہے۔'' اس کے لہجے پر عدنان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''ہے یو! اب لڑکیوں کی طرح زیادہ بلش نہ کرو۔ جاؤ اور میرے لیے جلدی کچھ لاؤ۔ ساتھ میں کچھ اسنیکس کا بھی بندوبست کر لینا۔''

عدنان اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے پاس دو قدم کے فاصلے پر رک کر کہنے لگا۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر، تمہاری فرمائش پر اور پھر تمہاری سوچ پر۔'' اس کے لہجے کی سختی پر وہ بے قابو ہو گئی اور ہاتھ میں پکڑی بوتل کا سیال اس کے چہرے پر پھینک دیا۔ ردِعمل کے طور پر عدنان کا بایاں ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔

''مجھے ایزی مت لینا بے بی! ورنہ تمہارے اس خوبصورت چہرے کو اس قدر بھیانک بنا دوں گا کہ کوئی دیکھنا تو در کنار، تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا۔''

وہ الٹ کر قالین پر جا گری تھی۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی دھار بہنے لگی۔

''دیکھ لوں گی میں تمہیں! دیکھ لوں گی اچھی طرح!'' وہ کف اُڑا رہی تھی۔

عدنان اس کے مزید قریب ہوا۔ ایک ٹانگ گھٹنے سے موڑ کر اس کے بال جکڑ لیے پھر اپنا چہرہ اس کے چہرے سے قریب لا کر دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں سے تھام کر دائیں سے بائیں گھماتے ہوئے بولا۔

''لو! دیکھ لو! اچھی طرح دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے آج کے بعد تم ایسا چہرہ کبھی دیکھو گی بھی نہیں۔'' اس نے بے رحمی سے لڑکی کے بال جھٹکتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا۔

وہ اپنے چہرے پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نظروں سے اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا کوئی آسیب نظر آ گیا ہو۔ عدنان اپنے ہونٹ بھینچے رسالہ اٹھا کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

دستک کی مدھم آواز سن کر سپائرس نے لیپ ٹاپ سے سر اٹھایا۔ وہ گزشتہ تین گھنٹوں سے اسی کام میں منہمک تھا۔

''آ جاؤ واجد!'' اس نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلتے ہی واجد کی حیران صورت اس کے سامنے تھی۔

''آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں آیا ہوں؟''

''تمہاری دستک کے انداز سے...... اس گھر میں اتنے دھیمے مزاج کے مالک بس تمہی ہو۔''

''آپ امیزنگ ہیں سر!''

''شکریہ! کسی چیز کی کمی تو نہیں یہاں؟''

''نہیں بالکل بھی نہیں!'' واجد نے زور شور سے سر

ہلایا۔ ''آپ ایک بہترین مہمان نواز ہیں...... لیکن وہ میں...... اصل میں......''

''میں نے کل ہی تمہارے گھر پیسے ٹرانسفر کر دیے تھے۔ تمہاری محنت سے میں بہت خوش ہوں اور محنت کے معاوضے کی مکمل ادائیگی کا قائل بھی ہوں۔''

''بہت شکریہ سر! میں یہی بات پوچھنا چاہتا تھا لیکن الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ مجھے حریص اور بے صبرا نہ سمجھنے لگیں۔'' وہ حقیقتاً بے حد ممنون تھا۔

''بی ایزی مائی بوائے! میں تمہارے متعلق منفی سوچ نہیں رکھتا کیونکہ جانتا ہوں وفاداری اور خلوص بہت طاقتور جذبے ہیں لیکن پیٹ کے دوزخ میں سب سے پہلے یہی جل کر بھسم ہوتے ہیں۔''

''میرے لیے مزید کیا احکامات ہیں؟''

''ابھی کچھ دن خاموشی اور تحمل سے گزارنے ہوں گے۔ مہاجر کیمپ سے تین افراد کی گمشدگی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ قانونی محافظ پوری قوت سے تم لوگوں کی تلاش میں ہوں گے۔ کچھ ہفتوں تک یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو میں تمہاری کسی دوسرے شہر کے کیمپ میں رسائی کروا دوں گا تاکہ وہاں بھی متاثرہ افراد کی مدد کی کوئی صورتِ حال پیدا کی جا سکے۔''

واجد کے چہرے پر بیک وقت اطمینان اور تذبذب کی کیفیت طاری تھی۔ سپائرس کو اس کے ذہن میں چلنے والی سوچ کا اندازہ ہو گیا۔

''اگلی مہم کے لیے میں تمہارا معاوضہ ڈبل کر دوں گا۔ لہٰذا اس بات کی فکر نہ کرنا کہ تمہاری فیملی کو اس تاخیر سے کسی تنگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

واجد یہ سن کر مکمل پُرسکون ہو گیا۔

''تھینکس آ لاٹ سر! بس ایک آخری فیور مزید کر دیجیے۔''

''شیور مائی بوائے۔ وائے ناٹ۔'' سپائرس نے اُسے پچکارا۔

''میں اپنے گھر والوں سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا احوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں وہ بھی معاملات کیسے چلا رہے ہوں گے؟''

''اوکے! نو پرابلم! یہ لو فون...... لیکن دھیان رہے انہیں اپنے ٹاسک کے بارے میں کوئی بھنک نہ پڑنے دینا۔''

''جی! میں سمجھتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔''

جمع

ایک نہایت بیزار، ادھیڑ عمر اور غیر شادی شدہ خاتون سے لفظ مرد کی جمع پوچھی گئی تو بے ساختہ جواب آیا۔ ''مردود!''

چٹکلے

☆ پھولوں کی چادر پر سو رہے ہوں تو یہ آپ کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات ہے اور پھولوں کی چادر اوپر پڑی ہو تو زندگی کی آخری رات گزر چکی ہے۔

☆ موم بتی جلا کر مرے ہوئے لوگوں کی یاد منائی جاتی ہے اور موم بتی بجھا کر سالگرہ منانے کا آغاز کیا جاتا ہے۔

☆ دنیا کی ہر عورت شب و روز دوسری عورتوں کی برائیاں کرتی ہے اور مرد اتنے فراخ دل ہوتے ہیں کہ اپنی بیوی کے سوا دوسری تمام عورتوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے... مرد زندہ باد!

☆ ایک عورت ایک گھنٹے میں دو ڈریس تیار کرتی ہے تو چار عورتیں چوبیس گھنٹوں میں کتنے ڈریس تیار کریں گی؟ سوال سیدھا لیکن جواب مشکل ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکیں گی۔ غیبت اور باتوں سے فرصت ہی نہیں ملے گی۔

محمد اقبال، کراچی

واہ سردارا

سردار ارجن سنگھ جہاز سے سفر کرنے والے تھے۔ وہ دروازے پر پہنچے تو کیبن میں قطار لگی ہوئی تھی۔ وہاں موجود ائر ہوسٹس نے ''ویٹ پلیز (WAIT PLEASE)'' کہہ کر سردار جی سے رک کر اگلی بھیڑ صاف ہونے کا انتظار کرنے کی گزارش کی۔

سردار جی نے لمحہ بھر سوچا پھر انہیں یاد آ گیا کہ ہوائی جہاز کی پرواز اور رفتار میں وزن کا بہت دخل ہوتا ہے۔ انہوں نے ''نوے کلو'' کہہ کر اپنا وزن بتایا اور ائر ہوسٹس کا ہاتھ گرا کر پھرتی سے کیبن میں گھس گئے۔

امرتسر سے سردار خشونت سنگھ کا تجربہ

سپائرس دوستانہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتا ہوا اپنی خوابگاہ کی طرف بڑھ گیا۔

واجد نے منتشر دھڑکنوں پر قابو پاتے کنٹری کوڈ کے ساتھ ساجد کا نمبر ملایا۔ اس کے ہاتھوں میں شدید ارتعاش تھا۔ حلق میں گویا کانٹے اُگ آئے تھے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ہی اس نے ساجد سے بات کی تھی لیکن اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ فاصلے صدیوں پر محیط ہو چکے ہیں۔ اس نے بے تابی سے ہونٹوں کو دانتوں تلے کچل ڈالا۔ دوسری جانب گھنٹی کی آواز سن کر اس کے وجود میں لرزش طاری ہونے لگی تھی۔

"ہیلو واجد! واجد! یہ تمہی ہو ناں؟" ساجد کی مانوس آواز نے اس کی آنکھوں میں نمی اور حلق میں ایک پھندا سا پیدا کر دیا۔

"جی لالہ! میں ہوں۔"

"اتنے دنوں بعد کیوں فون کیا لالے کی جان؟ میں روز انتظار کرتا رہا۔"

"میرے پاس فون کا بندوبست نہیں ہو سکا ہے ابھی تک۔"

"تو یہ کس کا نمبر ہے پھر؟"

"میرے باس کا۔"

"اچھا! تو میں اس نمبر پر خود ایک آدھ منٹ کی کال کر لیا کروں کیا؟ کم از کم تیری آواز سن کر ہی دل کو تسلی ہو جایا کرے گی۔" ساجد کے لہجے و انداز میں بے حد تشنگی اور تڑپ تھی۔

"نہیں لالہ! خوامخواہ اتنے پیسے ضائع ہوں گے۔"

"ہاں! ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔"

"تبریز کے بیٹوں نے دوبارہ تنگ تو نہیں کیا..... کسی بھی حوالے سے؟"

"نہیں! تو نے جو پیسے بھجوائے تھے، اس سے کئی ماہ کی اقساط پوری ہو گئی تھیں۔ گھر میں دو مہینے کا راشن ڈلوا کر بھی رقم بچ گئی تھی۔"

"اسے سنبھال لینا لالہ! اچھا بُرا وقت بتا کے تھوڑی آتا ہے۔"

"ہاں! ہم پر تو بُرا وقت جیسے ٹھہر ہی گیا ہے۔" ساجد کی نم آواز اس کے زخموں پر تیزاب کی طرح پھوار برسا گئی۔

"اچھا! زیادہ لمبی بات کرنے سے کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔ اس لیے ذرا ماہ گل سے بھی حال احوال پوچھ لے۔ وہ منہ سے بھلے کچھ نہیں کہتی لیکن میں جانتا ہوں بہت انتظار ہے اُسے تیرا۔" ساجد نے عجلت میں کہا۔

واجد اسے منع کرنا چاہتا تھا لیکن زبان الفاظ کی ادائیگی میں ساتھ ہی نہ دے رہی تھی۔

"ہیلو واجی! میں ماہی....." اگلے ہی لمحے ایک جھجکتی ہوئی آواز اس کی سماعت میں پڑی تو واجد کا وجود جیسے برف میں ڈھل گیا۔ قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔

"واجی! پلیز بات کرو ناں مجھ سے۔ کیا ابھی تک خفا ہو؟"

"نہیں۔" وہ بمشکل کہہ سکا۔ اس ایک لفظ کی ادائیگی کے لیے بھی اسے جسم و جان کی پوری قوت مجتمع کرنی پڑی تھی۔

ان دونوں کے مابین خاموشی کا ایک وقفہ حائل ہو گیا۔ صرف سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"یہاں سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں واجی! تمہاری کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔"

"سب یاد کرتے ہیں..... ان سب میں ماہ گل تو شامل نہیں ہو گی ناں؟" اس کا لہجہ شاکی تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو واجی؟ میں بھلا کیسے بھول سکتی ہوں تمہیں؟"

"بھولی ہی تھیں تو تبریز کے بیٹوں کا رذیل مطالبہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں ناں!"

"بس کرو واجی! میری اس لمحاتی غلطی کی اتنی بڑی سزا تو نہ دو، میں پاگل تھی..... نادان تھی..... ہو گئی غلطی مجھ سے۔ تم کہو تو تمہارے قدموں میں خاک بن کر بکھر جاؤں؟ پھر تمہیں یقین آجائے گا کیا؟" وہ سسکنے لگی۔

"کوشش کروں گا کہ وہ سب بھول سکوں۔"

"کیا تم لوٹ کر نہیں آسکتے؟"

"جس روز تم یاد کرو گی۔ شاید میں لوٹ ہی آؤں!"

"کیا ہر بات الفاظ میں کہنی ضروری ہوتی ہے؟ کیا مجھے اپنے بچپن کے دوست، اپنی اولین چاہت، اپنے شوہر کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ میری زندگی میں اس کی موجودگی کس قدر ضروری ہے؟"

"کس قدر ضروری ہے؟ میں کیا جانوں بھلا؟"

"جس قدر جینے کے لیے سانس لینا..... جس قدر دھرتی کے لیے سورج..... رات کے لیے چاند اور پھول کے لیے خوشبو..... اس قدر ضروری ہو کہ تمہارے بغیر ماہ گل ادھوری ہے..... بالکل ادھوری۔" وہ سسکی۔

"ماہی! میں بہت اکیلا ہوں یہاں..... یہاں

آسائشیں ہیں..... دولت ہے..... آرام و سکون ہے..... لیکن نہیں ہے تو صرف میرے دل میں قرار نہیں ہے۔ تمہارے الفاظ کے یہ جگنو میرے لیے کس قدر اہم ہیں، تم نہیں جان پاؤ گی۔" اس کے وجود کی برف پگھلنے لگی تھی۔

"بہت نفرت ہے یہاں۔ میں نے لوگوں کو جانوروں کی زندگی بسر کرتے دیکھا ہے۔ وہ لوگ کوئی غیر نہیں تھے، میرے اپنے ہیں..... میرے ہم وطن۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ بھی تو کتنے خواب سجائے یہاں آئے ہوں گے۔ ان کے والدین، اولاد، بیوی بہن بھائی سب سوچتے ہوں گے کہ وہ بہت سکھی ہیں یہاں..... لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہاں ہر روز نفرت کا بازار لگتا ہے اور انسانیت سرِعام رسوا کی جاتی ہے۔"

دوسری جانب ہزاروں میل دور بیٹھی ماہ گل اُس کے لہجے میں برسوں پرانی مہک محسوس کر کے بے ساختہ رونے لگی۔

"مجھے کئی روز سے جانے کیوں یہ وہم ستانے لگا ہے کہ تم دھیرے دھیرے کسی شکنجے میں پھنستے جا رہے ہو اور میں تمہاری آواز سننے کے لیے بھی ترس جاؤں گی۔ فاصلوں کا زہر رشتوں کو ہی نہیں بلکہ پورا وجود نیلا کر دیتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو..... میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔"

"میں منتظر ہوں کہ کب میرے جسم میں روح لوٹ آئے گی۔" اس کے جذبات کی شدت نے واجد کو حقیقتاً دنگ کر دیا۔

اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی نادیدہ آزار سے آزاد ہو گیا ہے۔ تجدیدِ محبت کے اس دورانیہ میں وہ وقت کا حساب بھی فراموش کر بیٹھا۔ کلاک پر نظر پڑی تو بے اختیار شرمندہ ہو گیا۔ سپائرس بھی اسی پل واپس اسٹڈی میں آیا تھا۔

"سوری سر! کال کچھ زیادہ طویل ہو گئی۔" وہ خفت سے بولا۔

"اٹس او کے! میں دیکھ رہا ہوں کہ اس فون کال سے تم کافی ریلیکس ہو گئے ہو۔ تمہاری ذہنی تازگی میرے لیے پیشہ ورانہ لحاظ سے بہت اہم ہے۔" واجد اس کی بات پر خود کو مزید زیرِ بار محسوس کرنے لگا۔

"انجوائے یور ٹائم! اور ہاں! عدنان کو ہمارے پلان میں تبدیلی کے بارے بتا دینا کہ اسے بھی کچھ عرصے بعد ہی منظرِ عام پر لایا جائے گا۔ ورنہ کیمپ سے فرار کے بعد فوری کانفرنس میرے لیے قانونی مسائل کھڑے کر دے گی.....

سمجھ گئے ناں؟" سپائرس نے ملائمت سے پوچھا۔

واجد نے اعتماد سے سر ہلایا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ سپائرس کی آنکھوں میں اب بے پناہ غضب اور حقارت ہلکورے لینے لگی تھی۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

سپائرس نے مصطفیٰ کو اپنی اسٹڈی میں طلب کر لیا۔ حسبِ معمول وہ شراب کے نشے میں دھت تھا تاہم اس کی چال ڈھال اور انداز میں اب بھی بے پناہ کروفر تھا۔

"اتنے بڑے جیون ساگر میں..... تو نے ہمیں سپائرس دیا..... ہو اللہ..... ہو اللہ۔" اس نے مخمور آواز میں تان لگائی۔

"تمہارے لیے اسکرپٹ تیار ہے۔" اس نے مصطفیٰ کی گائیکی نظر انداز کرتے ہوئے کہا اور چند کاغذات اُسے تھما دیے۔

"بہت خوب! میرا رول کیسا ہے اس موی میں؟" وہ کاغذات کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیڈ رول ہے..... ابھی ابتدائی مناظر کے ڈائیلاگز تھمائے ہیں..... اگر تمہاری اداکاری مناسب رہی تو باقی اسکرپٹ بھی تھما دوں گا۔" سپائرس کا انداز سپاٹ اور پیشہ ورانہ تھا۔

مصطفیٰ اس کے تیور دیکھ کر سنجیدہ ہو گیا اور مکالمے پڑھنے شروع کر دیے۔ اس کا انداز بہت زیادہ رواں تو نہ تھا لیکن پھر بھی قابلِ قبول تھا۔ ذرا سی محنت سے اس خامی پر قابو پایا جا سکتا تھا۔

"ناٹ بیڈ! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس حد تک بھی انھیں پڑھ پاؤ گے۔"

"میری ریڈنگ پر سونیا نے بہت محنت کی تھی..... ہاں مگر بات چیت میں روانی کبھی نہ آسکی اور نہ ہی گرامر کے اصول سمجھ آسکے۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔ "اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسکرپٹ پر تمہاری محنت بھی لاجواب ہے۔ مشکل الفاظ کا تلفظ میری قومی زبان میں لکھ کر بہت آسانی پیدا کر دی ہے تم نے۔"

"میرے لیے یہ پراجیکٹ بہت اہمیت کا حامل ہے اور میں اس کی کامیابی کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں..... کچھ بھی۔"

"اب جہاں اتنا کچھ کیا ہے وہیں ان کے لغوی معنی بھی اگر بتا دیتے تو مجھے اداکاری میں مزید سہولت ہو جاتی۔"

"میرا ذخیرۂ الفاظ اتنا بھی وسیع نہیں...... ہاں، اگر تم کہتے ہو تو عدنان سے مدد طلب کر لیتے ہیں...... وہ تمہیں اس کی تفصیل سمجھا دے گا۔"

"ہرگز نہیں! میں اس متکبّر انسان سے کبھی بھی بات نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی تم اسے کبھی قلم کے بارے بتاؤ گے۔"

"او کے ڈونٹ وری...... میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی اور مسائل کو بہتر سمجھتا ہوں۔" سپائرس کی بات پر اس نے سکون کا سانس لیا۔

دراصل وہ عدنان کی قابلیت اور تعلیم سے بہت خائف تھا اور اسے کہیں نہ کہیں یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ اسی قابلیت کی بنا پر یہ اہم ترین موقع وہ ہتھیا نہ لے جائے۔

"اب تم اپنے کمرے میں جاؤ اور ان ڈائیلاگز کی اچھی طرح ریہرسل کرو۔ آج رات میں تمہارا ٹرائل لوں گا۔ اگر ڈائیلاگ ڈیلیوری بہترین رہی تو ٹھیک...... ورنہ مجھے مجبوراً کسی اور کا انتخاب کرنا پڑ سکتا ہے۔" سپائرس کی یہ بات سن کر اس نے کاغذات پر گرفت سخت کر لی۔

"تمہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"یہ اصل میں ایک حکمران کا کردار ہے اور تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ حکمرانی کس طرح کی جاتی ہے؟ ایم آئی رائٹ؟" مصطفیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"سو اسی نقطے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ مکالمے بولنا...... تمہاری کارکردگی خود بخود نکھرتی جائے گی۔" وہ ملائمت سے بولا۔

"او کے ارات کو ملتے ہیں پھر۔"

مصطفیٰ کے جاتے ہی اس کے ہونٹوں پر زہرآلود مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اسے اپنی منزل قریب تر نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆

جوانا اپنے کمرے میں بھوکی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔

اُس کے رخسار پر ہلکی سی سوجن اور انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔ اُلجھے ہوئے بال اب قدرے بہتر حالت میں نظر آ رہے تھے۔ لباس بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا ہاتھ بار بار اپنے ہونٹ کی جانب بڑھتا جہاں زخم کی موجودگی اسے مزید بے کل کر دیتی۔

اپنے طیش پر قابو پائے وہ دوسرے ہاتھ میں موجود موبائل فون پر بے تابی سے ایک نمبر ملا رہی تھی۔ دوسری جانب سے فون بند ہونے کی ریکارڈنگ سن کر وہ جھنجلانے لگی۔

"حد ہوتی ہے بے پروائی کی! آج کا پروگرام فائنل کرنے کے بعد بھی یہ غیر ذمے داری!" وہ بڑبڑانے لگی۔

اس کا کمرا سجاوٹ و آرائش میں اپنی مثال آپ تھا۔ دنیا کی ہر نعمت وہاں موجود تھی لیکن وہ ان سے بے نیاز نظر آتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ملحقہ واش روم میں بہترین لباس زیبِ تن کرنے کے بعد اپنے چہرے کے نشانات چھپانے کے لیے ماہرانہ انداز میں میک اَپ کرنے لگی۔ اس کے دھیان کی ایک کڑی اپنے موبائل فون کی جانب بھی تھی جو تاحال 'خاموش' تھا۔

میک اَپ سے فارغ ہوتے ہی وہ فون تھامے ایک بار پھر کال میں مصروف ہو گئی۔ اسی پل اسے دیوار میں نصب آئینے میں ایک عکس نے بے طرح چونکا دیا۔ حیرانی، دکھ، غصہ اور طیش کے کئی رنگ پل بھر میں اس کی آنکھوں سے چہرے پر بکھر گئے۔

آئینے میں مقابل دیوار پر نصب ایل، ای، ڈی کے عکس میں اسکرین پر ایک لاش کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بے تابی سے کچھ دیر قبل 'میوٹ' کی جانے والی آواز کھول دی۔ 'اینٹ اینا' نامی اس چینل پر دو گھنٹے قبل جنگل کے قریب ایک کاٹیج سے ملنے والی لاش دکھائی جا رہی تھی۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں یکے بعد دیگرے 'میگا' 'اسکائی این اسٹار' اور کئی نیوز چینلز کھنگال ڈالے۔ ہر جگہ ایک ہی موضوع زیرِ بحث تھا۔

اس لاش کے جسم کے کئی حصے الگ الگ کرنے کے بعد مختلف درختوں پر لٹکا دیا گیا تھا۔ وہ صدمے سے ساکت تھی۔ ایک درخت پر جھولنے والے سر، نیم وا آنکھوں اور زرد چہرے کی دید نے اس کے وجود میں آتش فشاں برپا کر دیا۔ نیوز چینلز بار بار عوام سے قاتل کا سراغ بتانے کی درخواست کر رہے تھے۔

جوانا نے بغیر سوچے سمجھے فون اٹھا لیا۔ وہ پولیس کو اطلاع دینا چاہتی تھی کہ قاتل اسی کے گھر میں موجود ہے اور یہ پہلا کیس نہیں۔ وہ سفاک انسان اسی طرح کچھ عرصہ قبل ایک اور قتل بھی کر چکا ہے۔

فون اسکرین پر اپنا چہرہ نظر آتے ہی وہ یکدم ٹھٹک گئی۔

"کیا بتاؤ گی انہیں؟" اس نے اپنی ہی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا اور گہری سوچ میں غرق ہو گئی۔

انتقام کی ایک شدید لہر اُس کے وجود میں اٹھی۔ اپنے جذبات پر قابو پانا اس کے لیے اب دشوار ہونے لگا تھا۔ وہ بستر پر چت لیٹی ٹھہرے سانس لینے لگی۔

"ریلیکس جوانا! جسٹ ریلیکس! غصہ اور نفرت پر قابو پانا سیکھو۔ اس کا فوری اظہار تمہاری کمزوری اور دشمن کی طاقت بن جائے گا۔ اس بار بھی وہی ردِعمل دیا تو یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔" اس نے خودکلامی کی۔

اعصابی تناؤ اب قدرے کم ہو گیا تھا۔ اس نے مزید کچھ دیر اپنی مخصوص ورزش جاری رکھی اور پھر چہرے پر بشاشت طاری کیے لاؤنج میں چلی آئی۔ اس نے ذہن میں کچھ مخصوص ٹارگٹ سیٹ کر لیے تھے۔

☆☆☆

واجد، عدنان کے کمرے میں بہت خوشگوار موڈ میں بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے جناب؟ بڑے بدلے بدلے سے سرکار نظر آتے ہیں؟" عدنان نے اُسے ٹٹولا۔

"ایسا تو کچھ بھی نہیں لالہ!" وہ جھینپ گیا۔

"ارے میاں! جس اسکول میں تم پڑھتے تھے ناں! اسی اسکول کے ہم ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں۔ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔"

"آپ سے کوئی بھی بات پوشیدہ رکھنا ممکن ہی نہیں۔" اس کا انداز شکست خوردہ تھا۔

"لیکن پھر بھی تم کوشش کرتے رہنے سے باز نہیں آتے۔ چلو اب اچھے بچوں کی طرح بتاؤ کہ کیا لالی پاپ دیا ہے سپائرس نے تمہیں؟"

"آپ بھی ناں...... خواہ مخواہ ان پر شک کرتے رہتے ہیں...... ایسا تو کچھ بھی نہیں۔"

"تو پھر کیسا ہے؟ وہی تو پوچھ رہا ہوں۔" عدنان نے اس بار ذرا سختی سے کہا۔

"میری آج گھر والوں سے بات ہوئی تھی۔ بہت عرصے بعد...... تو اس لیے اعصابی طور پر بہت پُرسکون ہوں۔"

"مان لیتا ہوں...... لیکن تمہاری آنکھوں کی یہ چمک، بالوں میں بے دھیانی سے ہاتھ پھیرنا اور بات بے بات مسکرانا تو اشارہ کر رہا ہے کہ دال پوری ہی کالی ہے۔" وہ شگفتہ لہجے میں اسے دانستہ طور پر اپنائیت کا احساس دلا رہا تھا۔

کم عمر سا یہ لڑکا اُسے بے حد دکھی، تنہا اور اپنے وجود میں جاری کسی کشمکش میں گھرا دکھائی دیتا تھا۔ اعتبار، اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ روئے ارض پر بنی نوع کی اس نایاب قسم میں سے تھا جو کسی کے خلوص، شیریں زبان اور ظاہری وضع قطع سے فوری طور پر یہ اندازہ قائم کر لیتے ہیں کہ مقابل کی یہ صفات اور رویّہ ان کے لیے عطیۂ خداوندی ہے کیونکہ اگر وہ ان سے مخلص ہیں تو خودکار نظام کے تحت وہ جوابی طور پر بھی بے ریا خلوص ہی کے حقدار ٹھہریں گے۔ اس لیے عدنان اسے مزید کسی بھی ہاتھ میں کھلونا بنتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

دوسری جانب اس کے ذہن میں پنپنے والے ان وسوسوں کے برعکس واجد اپنی ہی دُھن میں اسے بتاتے ہوئے سادگی سے بولا۔

"ماہ گل سے صلح ہو گئی ہے میری۔"

عدنان نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا تو اس نے سلسلہ کلام ایک بار پھر جوڑتے ہوئے کہا۔ "میری کزن ہے وہ...... ہم بچپن ہی سے ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہاں آنے سے قبل ہمارا نکاح ہوا تھا۔ ہم دونوں میں کچھ غلط فہمیاں ہو گئی تھیں، آج ہماری وہ ناراضگی ختم ہو گئی۔"

"بہت مبارکباد بھئی دیر! تمہارے ذاتی معاملات میں بولنے کا مجھے کوئی حق تو نہیں اس لیے بس ڈھیروں دعائیں ہی دے سکتا ہوں۔" واجد کی آنکھوں میں ممنونیت جھلکنے لگی۔

"اب مجھے سچ سچ بتاؤ سپائرس نے کیا گولی دی ہے تمہیں؟"

"انہوں نے مجھے ایک نیا ٹاسک دینے کی ہامی بھری ہے۔"

"اور ٹاسک یہی ہو گا کہ تم پھر کسی کیمپ میں بھیجے جاؤ گے تاکہ ہم جیسے مزید معاشی مہاجر یہاں لائے جائیں۔"

"آپ واقعی نجومی ہیں لالہ!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"تم نے اس کی وہ آفر قبول کر لی ہو گی۔ ساتھ ہی اس نے یہ کہا ہو گا کہ وہ مجھے بھی فی الحال منظرِ عام پر لانے کا خطرہ نہیں لے گا کیونکہ کچھ قانونی مسائل درپیش آ سکتے ہیں۔"

"آ...... آپ کو کیسے علم ہوا...... میں یہی تو بتانے آیا تھا یہاں۔ واجد کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"میں اپنی آنکھیں کھلی اور دماغ حاضر رکھتا ہوں اور

سپائرس کو مقدس گائے ہرگز نہیں سمجھتا۔'' وہ نرمی سے اس کے دل و دماغ کے قفل کھولنے لگا۔ ''اس گھر میں بہت سی باتیں قابلِ اعتراض اور مشکوک ہیں۔ سرونٹ ہیڈ کسی مشیرِ خاص کی طرح مالک کے کمرے میں وقت گزارتا ہے...... گھر میں موجود واحد لڑکی انتہائی بددماغ، نسل پرست اور بلا کی مے نوش ہے اور گھر کا سربراہ اپنی این، جی، او کے لیے نہ صرف غیر ملکی افراد تلاشتا پھرتا ہے بلکہ ان کی زبانوں پر عبور حاصل کرنے کا خواہش مند بھی ہے۔''

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور واجد کے چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں دیکھ کر سلسلۂ کلام شروع کیا۔ ''اس کی عنایات مصطفیٰ پر بے حد زیادہ ہیں۔ اسے باقاعدگی سے شراب تو مہیا کی جاہی رہی تھی...... اب شباب کا اضافہ ہوتے بھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ وہ اس سے کوئی بہت خاص اور خفیہ کام لینا چاہتا ہے۔'' عدنان نے اسے اپنی مشاہداتی مہم کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا۔

''تو آپ اس صورتِ حال سے کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟''

''میں تو فی الوقت اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سپائرس کوئی ایسا کام شروع کر رہا ہے جس میں سابقہ طور پر اس کا کوئی تجربہ نہیں لیکن یہ کام اس کے لیے بے حد اہمیت کا حامل بھی ہے۔ ہماری آمد سے پہلے بھی وہ ہمارے ہی خطے کے کسی فرد پر ایسا کوئی 'ناکام تجربہ' کر چکا ہے۔ عین ممکن ہے کہ تمہارے ذریعے مزید افراد کو ٹریپ کرنے کا مقصد بھی یہی ہو کہ وہ احتیاطاً اس ٹاسک کے لیے 'ریزروڈ' افراد رکھنا چاہتا ہو یا ہمارے بعد ان کے توسط اسے آگے بڑھانا چاہتا ہو...... اب حقیقی وجہ کوئی بھی ہو، یہ بات تو طے ہے کہ اس کی ذات کسی بھی طرح شک و شبہے سے عاری نہیں۔'' عدنان ٹھوس لہجے میں نرمی سے اسے سمجھاتا چلا گیا۔

''میرا تو ذہن گھوم گیا ہے...... اتنے انکشافات...... آپ کی قیافہ شناسی کا قائل نہ ہوتا تو کبھی انہیں تسلیم کرنے کا تصور بھی نہ کر پاتا۔'' واجد نے اپنا سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

''تم بہت بھولے ہو واجد!'' عدنان 'بیوقوف' کہتے ہوئے خود کو بمشکل روک پایا۔ ''میں اپنی رائے ہرگز تم پر نہیں تھوپ رہا۔ بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہر وقت اپنے کمرے میں حجرہ نشین بنے رہنے کے بجائے میرے ساتھ وقت گزارا کرو، نیچے چکر لگا لیا کرو۔ تمہارے سامنے بہت سی باتیں خودبخود آشکار ہونے لگیں گی۔''

''ویسے ایک سوال میرے ذہن میں بھی ہے۔'' وہ جوش سے بولا۔ ''ہم تینوں ایک ہی قوم، ایک ہی وطن سے ہیں۔ ایک ہی بحران سے نکل کر یہاں تک آئے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں الگ الگ کرے کیوں دیے گئے اور ہم سے علیحدہ ملاقاتیں کیوں کی جاتی ہیں؟''

''گڈ! یہ کی ناں تم نے کام کی بات...... بچپن سے ہم کتابوں میں کیا پڑھتے آئے ہیں کہ اغیار نے ہم پر کس طرح حکومت کی؟''

''ڈیوائڈ اینڈ رول...... تقسیم کرو اور راج کرو۔'' واجد نے فوری کہا۔

''بالکل درست! یہاں بھی کم و بیش یہی صورتِ حال ہے...... الگ الگ رکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم متفقہ طور پر کسی مثبت نتیجے پر نہ پہنچ جائیں۔ تنہا رہیں گے تو بہ آسانی اس کے دام میں آجائیں گے۔''

''اب کیا حکمتِ عملی ہے آپ کی؟''

''بہت سادہ ہے۔ سپائرس دانستہ طور پر مجھے نظر انداز کر رہا ہے سو یہ بات تو واضح ہے کہ اسے میری جانب سے کچھ خدشات یا تحفظات لاحق ہیں...... اپنے اسی خوف میں وہ کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرے گا...... میں اسی ایک لمحے کی تلاش میں ہوں۔''

''اس تلاش میں آپ کے ساتھ میں بھی شامل رہوں گا۔'' واجد نے خلوص سے کہا۔

''ہاں ضرور! لیکن جزوی طور پر ساتھ رہنا...... اُسے اور برائن کو کسی صورت یہ شبہ نہ ہونے دینا کہ تم ان کی جانب سے مشکوک ہو چکے ہو۔ ورنہ اس گیم کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

''ٹھیک ہے لالہ! میں سمجھ گیا۔''

''اب یہاں سے سیدھے اپنے کمرے میں جاؤ...... میں ڈائننگ ہال میں جاؤں گا...... تم تھوڑی دیر بعد نیچے اس طرح آنا گویا اتفاقی طور پر یا بوریت کا شکار ہو کر چلے آئے ہو۔''

''اوکے لالہ۔'' وہ پُرجوش معانقہ کر کے رخصت ہو گیا۔

عدنان اس اہم ترین مرحلے کی کامیابی پر بہت مطمئن اور مسرور تھا۔

☆☆☆

جوانا اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون سے چھیڑ چھاڑ کرتی کچن کے دروازے پر پہنچی اور معتدل انداز میں

برائن کو پکارتے ہوئے بولی۔

''آج مینیو میں کیا ہے؟''

''بھنا ہوا دنبہ، مچھلی اور چاول بنائے ہیں میم!''

''یو آر گریٹ! جلدی کھانا لگاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' وہ مصروف سے لہجے میں گویا ہوئی۔

''آپ پہلے بتا دیتیں تو میں بکرے کی چانپیں بھجوا دیتا کمرے میں۔'' برائن نے خلوص سے کہا تو جوانا چہرے پر غصے کے رنگ جھلکنے سے بمشکل خود کو روک پائی۔

''میں ڈائننگ ٹیبل پر منتظر ہوں...... جلدی سرو کرو۔''

اگلے دس منٹ میں وہ حکم کی تعمیل کر چکا تھا۔

''انکل نہیں آئے کیا کھانے پر؟''

''انہیں علم ہی نہ تھا کہ آج آپ کا آؤٹنگ کا کوئی پروگرام نہیں...... ورنہ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں اور آپ ان کے لیے کس قدر اہم ہیں۔''

''بالکل! اُن کی محبت اور خلوص میں تو کوئی دو رائے ہی نہیں۔'' جوانا کو بھی اب اس بلی چوہے کے کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔

''آپ کھانے کے بعد وائن یہیں لیں گی میم یا کمرے میں پہنچا دوں؟''

''ارے نہیں برائن ڈیئر! آج میرا کہیں جانے کا پروگرام نہیں۔ اس لیے وائن کا موڈ نہیں ابھی...... تم بس فروٹس پہنچا دینا میرے کمرے میں۔''

''جی بہتر!''

''کھانا بہت لذیذ ہے اور ماننا پڑے گا کہ انکل کو تم جیسا ہرفن مولا شخص کہیں نہیں مل سکتا۔''

برائن انکساری سے مسکرا کر رہ گیا۔

''وہ نئے مہمان یہیں ہیں کہ چلے گئے؟'' جوانا کا انداز سرسری تھا۔

''یہیں ہیں فی الحال! آپ کی ملاقات کب ہوئی اُن سے؟''

''اونہہ! ملاقات نہیں...... بس ایک 'ایڈیٹ' سے سرسری سامنا ہوا تھا۔'' وہ نفاست سے نیپکن سے ہاتھ اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔

ملازمین نے اب جھوٹے برتن اٹھانے شروع کر دیے تھے۔

جوانا نے اوپری راہداری میں ریلنگ کے پاس عدنان کو کھڑے دیکھا اور کھنکھارتے ہوئے بہ آواز بلند بولی۔

''انکل ان مہمانوں کے اشتراک سے وہی کام تو نہیں کر رہے جس کے باعث پچھلی بار یہاں آئے لوگوں نے خاصا ادھم مچایا تھا۔'' اس نے اوپر دیکھ کر بائیں آنکھ شرارت سے دبائی۔

برائن ملازمین کو جوانا کے پسندیدہ پھل کمرے میں پہنچانے کا کہہ کر اندرونی جانب بڑھا ہی تھا کہ اس بات نے اس کے سر پر ایک ہتھوڑا سا دے مارا۔ انگریزی زبان میں ادا کیے گئے جملے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے باہر آیا اور اوپر نظر دوڑائی۔ راہداری میں کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہونے لگیں۔

''کیا ہوا ڈیئر؟ کوئی بھوت دیکھ لیا کیا؟'' جوانا معصومیت سے بولی۔ ''فروٹس جلد از جلد پہنچاؤ میرے کمرے میں۔'' اس کا تحکمانہ انداز عود کر آیا تھا۔

برائن سر ہلاتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

سپائرس اور مصطفیٰ ایک وسیع و عریض ہال میں موجود تھے۔

ہال میں لائٹنگ کا بہترین انتظام تھا۔ روشنی گویا در و دیوار سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

''یہ کہاں آگئے ہم...... یونہی ساتھ ساتھ چلتے۔'' مصطفیٰ نے حسبِ سابق بے سُری تان لگائی۔ وہ اس وقت بھی شدید نشے میں دھت تھا۔

''کام کے وقت میں کسی قسم کی غیر سنجیدگی اور کوتاہی برداشت نہیں کروں گا...... مائنڈ اِٹ!'' سپائرس نے داہنی انگشتِ شہادت اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔

''یس باس! جو سپائرس جی بولیں گے...... وہ میں کروں گا۔'' مصطفیٰ درحقیقت اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہا تھا۔

ممکن ہے کہ اس کی ایسی حالت پر دیکھنے والا کوئی بھی شخص سپائرس کی عقل پر ماتم کرتا۔ لیکن یہ بات تو صرف وہی جانتا تھا کہ مصطفیٰ کا یہ انداز اس کے لیے کس قدر فائدہ مند ثابت ہو گا۔

''ٹیکنیکل عملہ کدھر ہے بھئی؟'' اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔

ایک کونے میں جدید ترین کمپیوٹر سسٹم کے علاوہ ایک

مہنگا کیمرا تھامے درمیانی عمر کا ایک شخص بیٹھا تھا۔

''فلپ ہی یہاں آل ان آل ہے۔ یہ اکیلا بیسیوں پر بھاری ہے۔'' سپارٹس نے کہا۔

اسی اثنا میں ایک کم عمر سی لڑکی بھی وہاں چلی آئی۔ اس کا اعتماد قابلِ دید تھا۔ سپارٹس کے اشارے پر فلپ نے اپنا کیمرا تھاما اور مصطفیٰ نے رٹے رٹائے ڈائیلاگز بولنے کا آغاز کر دیا۔ سپارٹس نہایت اطمینان سے اس کی حرکات و سکنات اور چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں میں موجود تناؤ اور اعصابی کشیدگی کم ہونے لگی۔

اگلے پندرہ منٹ میں ان کے باہمی مکالمے ختم ہوئے تو وہ فرطِ مسرت سے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کمال کر دیا تم نے!...... لاجواب...... مجھے امید ہی نہیں تھی کہ تم اس قدر جاندار اداکاری کر لو گے۔''

''اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا؟ اگر میں نہ کرتا تو کوئی اور کر لیتا۔ اس لیے اپنی بقا کے لیے یہ تو کرنا ہی تھا۔'' مصطفیٰ ہنسنے لگا۔ وہ اسے یہ بتا ہی نہ سکا کہ برصغیر کے چند مشہور اداکاروں کی نقالی کا ملغوبا بنا کر مکالمے ادا کرنا اس جیسے گھاگ فلمی کیڑے کے لیے کون سی بڑی بات تھی؟ ہاں! مشکل کام بہرحال تلفظ کی ادائیگی تھا اور اسے سپارٹس پہلے ہی آسان بنا چکا تھا۔

''او کے اب تم جاؤ...... میں ابھی فلپ کے ساتھ کچھ مصروف رہوں گا۔ تمہاری ساتھی لڑکی بھی کچھ دیر تک وہیں پہنچا دی جائے گی۔ وہ میرا انعام سمجھ لو۔''

مصطفیٰ کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ ہال کے ایک بغلی دروازے کے عقب میں موجود زینے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ زینہ ایک اور دروازے کی صورت میں اس کے کمرے کی وارڈروب میں جا کھلتا تھا۔ اس قدر 'ذہنی مشقت' کے بعد اسے شدت سے چند پیگ کی طلب محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ رات اس گھر کے سبھی مکینوں کے لیے بہت اہم تھی۔

چار دیواری میں موجود ہر شخص اپنی سوچ کے دائروں میں مقید تھا۔ واجد خوشی، تفکر اور سنسنی کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے ذہن کے کواڑوں پر بھی عدنان کے انکشافات اور قیافے دستک دے کر پورے بدن میں سرسراہٹ پیدا کر دیتے تو کبھی سماعت میں رس گھولتی ایک مدھر آواز اپنی بے تابیوں کا اظہار کرتے ہوئے گونجتی تو اس کے لہو میں شرارے دوڑنے لگتے اور ایک میٹھی سی لہر دل کے نہاں خانوں سے اٹھتی اور دلفریب کسک لیے رگ و جاں کا احاطہ کر لیتی۔

بچپن سے جوانی تک کے سفر میں وہ ماہی کے مختلف روپ تاشتا، خوابوں کی خوش رنگ تتلیوں کے پیچھے لپکتا نیند کی وادی میں اترا تو بند آنکھوں کے پیچھے بھی ماہ گل کی شبیہ چمکتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے کہہ رہی تھی۔

''تم اس جذبے کے اسیر ہو چکے ہو جو ایک بار وجود میں جگہ بنا لے تو امربیل کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے...... جس سے رہائی ممکن ہے نہ فرار...... تم ابنِ آدم ہو۔ ذمے داریوں کی زنجیر میں جکڑے...... کہیں نہ کہیں اس جذبے کو پسِ پشت ڈال دیتے ہو لیکن میں بنتِ حوا ہوں...... میں جس سے محبت کر لوں، تاحیات اس کی داسی بن جاتی ہوں۔ اس سفر میں یقین ہی میرا زادِ راہ ہے۔ میرے جذبات کی شدت، دعائیں اور بے پناہ محبت کبھی رائگاں نہیں جائے گی...... تمہیں لوٹنا ہی ہوگا۔ جب تم میرے پاس لوٹ آؤ گے تو میں تمہاری زندگی کو اپنی محبت، خدمت اور وفا سے معطر کر دوں گی۔ اس کے بعد تم کہیں جانے کی تمنا نہ کرو گے۔ بس ایک بار لوٹ آؤ...... لوٹ آؤ گے ناں؟''

''ہاں ماہی! میں لوٹ آؤں گا۔ میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا...... میرا ہر راستہ اور اس رستے کی ہر منزل تمہی ہو...... میں ضرور آؤں گا۔'' اس رات پہلی بار واجد کے ہونٹوں اور پردۂ تصور پر گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور ماجد کی پکار کے بجائے محبت کے خوش رنگ پھول، تتلیاں، بادل، برکھا، دھنک اور خوشبو تھی۔

محبت فاتحِ عالم ہے۔

☆☆☆

عین اسی پل......

چند قدم کی دوری پر عدنان بھی اپنے بستر پر نیم دراز کچھ گھنٹے قبل پیش آنے والے واقعے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس وقت واجد کو اپنے کمرے میں بھیجنے کے بعد وہ معمول کی طرح نیچے جانے کے لیے کمرے سے باہر آیا تھا۔

جوانا کا ڈنر اختتامی مراحل میں تھا۔ وہ اپنی مردم شناسی کے باعث ان دونوں میں نادیدہ تناؤ کی موجودگی بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر وہیں کھڑے رہ کر اس نے معاملے کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن وہ مقامی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے دھیان ہٹاتے وہ ابھی سیڑھیوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ جوانا کا انگریزی زبان میں ادا کیا گیا جملہ اسے ساکت کر گیا۔ اس نے بے یقینی سے

اس کی جانب دیکھا اور آنکھ دباتے دیکھ کر فوری طور پر اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے۔

اس لڑکی کا تاثر گو اس پر بالکل بھی اچھا نہیں تھا لیکن اسے اپنی حسیات پر مکمل بھروسا تھا۔ اس لیے وہ جانتا تھا کہ جوانا اسے کوئی 'کلیو' دے رہی تھی...... لیکن کیا؟

''مہمانوں کے اشتراک سے وہی کام تو نہیں کر رہے؟'' اس کے ذہن میں جوانا کے الفاظ گونجے۔

''مصطفیٰ۔'' اس کے دماغ میں ایک نام سرسرایا۔

''وہی ملوث ہوگا اس کام میں...... لیکن سابقہ لوگوں نے ادھم کیوں مچایا؟'' وہ کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''ان سارے سوالات کی کڑی مصطفیٰ ہی سے جا ملتی ہے...... وہی اس کا جواب دے سکتا ہے۔''

عدنان کے تصور میں اس کا ہیولا آتے ہی اس سے وابستہ وجۂ ناگواری بھی عود آئی۔ اس کا دل بری طرح متلانے لگا۔

''مجبوری ہے پتر عدنان! گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔'' اس نے ناک سکیڑی اور مصطفیٰ کی راہ پر تکنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

اسٹڈی روم میں اس وقت کلاک کی مدھم ٹک ٹک کے سوا اگر کوئی اور آواز سنائی دے رہی تھی تو وہ لیپ ٹاپ کی 'کیسنز' تھیں۔ سپارٹس کی انگلیاں کھٹا کھٹ چل رہی تھیں۔ اس کی پیشانی پر بل اور جبڑے ابھرے ہوئے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی اندرونی دباؤ کا شکار ہے۔

مصطفیٰ نے اس کے پراجیکٹ پر شاندار کارکردگی دکھائی تھی اس لیے وہ اس جانب سے تو قدرے مطمئن ہو گیا تھا لیکن دوسرا 'اہم کام' بھی اتنی ہی توجہ کا متقاضی تھا بلکہ وسیع تناظر میں دیکھا جاتا تو یہ دونوں پراجیکٹس باہم متصل تھے۔ ایک کی کامیابی یا ناکامی دوسرے پر بھی اسی تناسب سے اثر انداز ہوتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے لیپ ٹاپ پر اسی مہم میں مگن تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ناگوار صورتِ حال میں مبتلا کسی کو تسخیر کرنے میں مصروف ہے۔ کچھ دیر بعد قدرے جھکے ہوئے انداز میں وہ اپنی پیشانی اور کنپٹی کو دھیرے دھیرے مسلنے لگا۔

''مووی پر کام مزید تیز کرنا ہوگا مجھے۔ ایک مہینے میں یہ ٹاسک مکمل ہو جانا چاہیے۔'' اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے گویا خود کو یاددہانی کروائی۔

☆☆☆

دو ہفتے گزر چکے تھے۔

عدنان کسی بھی مزید کلیو کی تلاش میں تاحال ناکام تھا۔ وہ ہر روز کسی نہ کسی بہانے مصطفیٰ کے پاس جا کر بات چیت کی کوشش کرتا لیکن وہ شراب میں اس قدر غرق ہوتا تھا کہ کسی بھی بات کا جواب نہ دے پاتا۔

کثرتِ مے نوشی نے اس کی آنکھوں میں لہو رنگ سرخی پیدا کر دی تھی۔ اعصابی نظام میں بری طرح لرزش طاری رہتی لیکن اسے اپنے ان جسمانی تغیرات کی کوئی پروا ہی نہ تھی۔ عدنان کو یقین ہو چلا تھا کہ مصطفیٰ کو دانستہ طور پر اس ٹریک پر چلایا جا رہا ہے۔

دن میں ناکام رہنے کے بعد اس نے رات کے وقت بھی اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی لیکن دروازہ مقفل رہتا تھا۔ عدنان کے کہنے پر واجد نے بھی شب و روز میں کئی ایک بار کوشش کی مگر اسے بھی کوئی کامیابی نہ ملی۔ ہاں...... مگر ملازمین ضرور مشکوک ہونے لگے تھے۔

تھک ہار کر عدنان نے اسے ٹٹولنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کوئی متبادل راہ اختیار کرنے پر غور کرنے لگا۔ اس کی چھٹی حس کئی بار جوانا سے بات چیت کرنے کا عندیہ بھی دے چکی تھی لیکن وہ اس کے بے جا تکبر اور سابقہ 'تاکرے' کی بدولت اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔

اس شب وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا لیکن نیند ہنوز آنکھوں سے دور تھی۔ ذہن بار بار بھٹک کر ماضی کے گلی کوچوں میں آوارہ گردی کے لیے لپک رہا تھا۔ عدنان کو اس کشمکش سے نکلنے کا ہنر بھی خوب آتا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھا اور بستر کی داہنی تپائی پر موجود رسالہ اٹھا لیا۔ پھر خیال آیا کہ اسے تو وہ آج شام ہی مکمل چٹ کر چکا تھا۔ اپنے اس بھلکڑپن پر خود کو صلواتیں سناتا وہ لاؤنج میں رکھے رسائل لینے کی غرض سے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

اسی پل اسے ایک ہیولا دکھائی دیا جو پُراسرار طریقے سے جوانا کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر ایک اوٹ میں ہو گیا۔ اسے کسی طوفان کی آمد سنائی دینے لگی تھی۔ ہیولا اپنے گرد و پیش سے بیگانہ دکھائی دیتا تھا۔ عدنان کے جسم میں چستی پیدا ہو گئی۔

نووارد نے اپنی جیب سے ایک خصوصی ساخت کی چابی نکالی اور دروازہ غیر مقفل کر کے اندر چلا گیا۔ عدنان پھرتی سے سیڑھیاں اتر آیا۔ کمرے کا منظر حسبِ توقع تھا۔ اس نے جست لگا کر نووارد کو جوانا سے الگ کیا اور گردن پر

ایک مخصوص جگہ زوردار ضرب لگائی۔ اسی پر غصہ ختم نہ ہوا تو یکے بعد دیگرے کئی گھونسے لگا دیے۔

جوانا فرش پر آڑھی ترچھی لیٹی گہرے سانس لیتی ہوئی اپنی گردن مسل رہی تھی۔ اس کا چہرہ تنفس میں تعطل اور حملہ آور کے بدارادوں کی جھلک سے بری طرح سرخ ہو چکا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ عدنان گھٹنوں کے بل بیٹھا اس کی پیٹھ سہلاتا رہا۔ اس کے انداز میں نرمی اور شائستگی تھی۔ جوانا کے وجود کا تناؤ کم ہونے لگا۔

عدنان نے سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس اسے تھمایا اور نرمی سے بولا۔

''لو پانی لو...... اور ریلیکس ہو جاؤ۔''

جوانا کی آنکھوں میں اب بھی شدید خوف تھا۔ وہ کسی چھوٹی بچی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو بھیڑ میں اپنے محافظ کی انگلی چھوڑ کر بچھڑ جائے اور کسی عفریت میں مبتلا ہو جائے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے پانی کا گلاس تھاما اور غٹاغٹ پینے لگی۔ لرزش اور حواس باختگی سے پانی اس کے کپڑوں پر گرنے لگا۔

''کیا کر رہی ہو بے وقوف؟ پہلے ہی اتنی سردی ہے، ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' وہ اسے بستر پر بٹھا کر بولا۔

عدنان کے لہجے کی بے ساختگی پر وہ چونک سی گئی۔

''تم بہت مختلف ہو! میری زندگی میں آنے والے سب انسانوں سے مختلف اور بہتر۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری...... مرد کبھی بھی مختلف نہیں ہوتا... اس کی جبلت، خمیر اور فطرت ہر دور میں ایک سی ہوتی ہے۔ مختلف تو وہ ماں ہوتی ہے جو اسے پروان چڑھا کر حقِ تربیت ادا کرتی ہے اور اس کی سوچ کو ایک نیا رخ عطا کرتی ہے۔'' وہ اب بھی اس سے نرمی ہی سے مخاطب تھا۔

''ضروری نہیں کہ ہر ماں ہی حقِ تربیت ادا کرے۔ کچھ مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی اولاد خودرو پودے کی طرح پروان چڑھتی ہے اور اتفاقی راہ اپنا لیتی ہے...... میری طرح۔'' جوانا کے اعصاب اب سنبھلنے لگے تھے۔

''سپارٹس کہاں ہے؟ میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔ دوسروں کے حق کے لیے آواز اٹھانے، انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں کے سامنے معاشی مہاجرین کے دکھڑے بیان کروانے کے دعوے کرنے والا انسان اپنے ہی گھر کے تحفظ سے اس قدر بے خبر کیوں ہے؟'' عدنان غصے میں آ گیا۔

''وہ بے خبر نہیں ہے۔ نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔''

''لیکن کیوں؟ یہ ہے کون شخص آخر؟''

''سپارٹس کا بیٹا......'' وہ زہرخند ہوئی۔

عدنان گنگ رہ گیا۔

''اس کی فیملی یہاں نہیں رہتی ہے۔'' جوانا نے مزید بتایا۔

''اتنا تو میں بھی سمجھ چکا ہوں کہ یہ شخص نقاب در نقاب چڑھائے ہوئے ہے۔''

''لیکن تم یہ نہیں جانتے ہو گے کہ اس رذیل انسان کو یہاں بھیجنے میں بھی کہیں نہ کہیں اسی کا ہاتھ ہوگا۔'' عدنان مزید بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

''اتنے حیران مت ہو...... یہاں درونِ پردہ بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جو تمہاری سوچ اور تصور سے بھی بالاتر ہے۔''

''ایسا کیا ہوتا ہے یہاں؟ کچھ روز قبل بھی تم نے مجھے کوئی اشارہ دینے کی کوشش کی تھی لیکن میں سرتوڑ کوشش کے باوجود سمجھ نہیں پایا ہوں اب تک۔''

''مکمل طور پر میں بھی واقف نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ پچھلی بار دو افراد نے یہاں بہت ادھم مچایا تھا۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''تم میرا تجسس مزید بڑھانے لگی ہو۔'' عدنان اُلجھ گیا۔ ''خیر! کہاں سے آئے تھے وہ لوگ اور اب کہاں ہیں؟''

''تمہارے ہی خطے سے تھے۔ کسی کیمپ سے فرار ہوئے تھے اور برائن کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان کی حالت اور کسمپرسی حیران کن تھی۔ سپارٹس نے ان سے چند بار ملاقات کی اور پھر ایک روز ان میں سے ایک نے خودکشی کر لی اور دوسرا طیش کے عالم میں ایک چاقو لیے سپارٹس پر پل پڑا۔ سیلف ڈیفنس میں اسے گولی چلانی پڑی اور اس کی لاش بھی غائب کر دی گئی۔''

''حیران کن!'' عدنان نے اپنی پیشانی مسلی۔ ''تم نے کوئی سراغ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی؟ تمہارے گھر میں، تمہاری چھت کے نیچے دو افراد جان کی بازی ہار دیتے ہیں اور تمہیں دلچسپی ہی نہیں ہوتی...... یہ بات بعید از قیاس ہے۔''

جوانا کچھ دیر تذبذب کا شکار رہی اور پھر کہنے لگی۔

''وہ...... اصل میں...... میں خود ان دنوں ایک ذاتی صدمے

سے دوچار تھی۔''

''دیکھو جوانا! اگر اسی طرح اُلجھی ہوئی باتیں کرتی رہو گی تو میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکوں گا۔ اگر تم واقعی اپنے خلاف ہونے والے اس عمل کی بابت احتجاج کرنا چاہتی ہو تو مجھے حقائق بتانے ہوں گے...... لیکن مکمل سچ۔''

وہ ایک بار پھر تذبذب میں مبتلا نظر آنے لگی۔

''میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی انسان جب کسی کو حقیقت بتاتا ہے تو اپنی جانب کے کچھ حقائق چھپا بھی لیتا ہے اور وہ سب بتاتا ہے جس میں اس کی ذات پر کوئی نام نہ آ سکے۔ لیکن یہ 'ادھورا سچ' اور ملاوٹ شدہ حقائق بالکل بے فائدہ ہوتے ہیں، سمجھ آئی؟''

جوانا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا اور مختصراً اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگی۔ اس نے جو حقائق بتائے اس سے سپارٹس کا کردار بھی کسی حد تک واضح ہو گیا۔

☆☆☆

جوانا کا بچپن گرہن زدہ تھا۔

کسی بھی بچے کی زندگی میں والدین کی ذات اس سورج کے مانند ہوتی ہے جس کی حدت اور روشنی ہی اس کی آئندہ زندگی کا تعین کرتی ہے۔ اس کے وجود میں جو سورج مقسوم ٹھہرایا گیا تھا، وہ کسی بھی آزمائش سے کم نہ تھا۔ اس کے والدین اپنی انا اور نفس کے قیدی تھے اور اسی قید نے ان کا ذہن جوانا کی پرورش کی جانب مبذول ہونے ہی نہ دیا۔

صوفیہ ایک دراز قد، سبک نقوش اور توبہ شکن خوبصورتی کی مالک تھی۔ اس نے...... اپنے احباب کے اکسانے پر ماڈلنگ کی دنیا میں قدم رکھ دیا اور اپنی خوبصورتی بھی خوب کیش کروائی۔ صوفیہ کے لیے شہرت سے بڑھ کر کچھ بھی نہ تھا اور اسی شہرت کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ہر ممکنہ قیمت ادا کی۔ سات سال تک مختلف افراد کے ہاتھوں کھلونا بنے رہنے کے بعد اسے بالآخر ایک 'جیک پاٹ' مل گیا۔

ساٹھ سال سے متجاوز ایک پروڈیوسر کے ساتھ دو ماہ گزارنے کے بعد جب اسے 'بی کلاس' مووی میں کام کرنے کا موقع ملا تو اس کی خوشی کا یہ عالم تھا جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ فلم کا آغاز ہوا اور وہ پوری تندہی سے اپنا کام کرنے میں مشغول ہو گئی۔ ابتدائی چند ایک مناظر کی عکس بندی کے بعد ڈائریکٹر اس کی کارکردگی پر تنقید کرنے لگا اور ایک روز سیٹ پر ہی اسے خاصی سخت سست سنا ڈالیں۔

''تم پروڈیوسر کی منظورِ نظر ہو تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اپنی اس فلم کا کباڑا کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔''

''میں ہر طرح سے تعاون کر تو رہی ہوں...... ایکٹنگ، ڈائیلاگ ڈلیوری اور رقص میں بھرپور محنت کرتی ہوں۔'' صوفیہ کو بھی غصہ آ گیا۔

''دیکھیے مادام! لوگ صرف اداکاری اور صلاحیتیں ہی نہیں دیکھتے بلکہ گلیمر، نزاکت اور دلکشی دیکھنے بھی آتے ہیں۔ اگر میں کسی کردار میں افریقی سرزمین سے کوئی ہیروئن لا کر ڈال دوں جو بیلنسڈ تو ہو لیکن قدرے بیمار محسوس ہوتی ہو تو میری فلم ایک ہی شو میں پٹ کر رہ جائے گی۔''

''تم میری توہین کر رہے ہو۔ تمہارا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں خوبصورت اور گلیمرس نہیں ہوں۔'' صوفیہ اپنی تذلیل برداشت نہ کر سکی۔

''میں اس چیز سے انکاری نہیں...... لیکن تم صحت مند نہیں رہیں اب۔'' وہ اسے لیے ایک آئینے کے سامنے آیا اور پھر بولا۔ ''ایک ناقد کی حیثیت سے ذرا دیکھو اپنے آپ کو۔''

صوفیہ تنقیدی نظروں سے خود کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے حلقے نمودار ہونے لگے تھے۔ صحت مند، سرخی چھلکاتے رخسار میک اَپ کی تہ کے باوجود زردی مائل جھلک دینے لگے اور کولہوں میں بھی قدرے بھاری پن آ گیا تھا۔

''میری تجویز مانو تو اپنا چیک اَپ کرواؤ۔ شاید تمہیں کوئی مرض لاحق ہو چکا ہے۔'' اس کی بات نے صوفیہ کو دہلا دیا۔

اس نے اگلے ہی روز ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لیا اور اپنا تفصیلی چیک اَپ کروایا اور نتیجہ کسی بھی مرض سے زیادہ خوفناک برآمد ہوا۔ اس کی بے احتیاط زندگی اور بے راہ روی جوانا کی صورت میں سامنے آنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ صوفیہ کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ فوری طور پر اس ناگہانی آفت سے جان چھڑوانا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر نے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ اس صورت میں وہ جان سے بھی ہاتھ دھو سکتی ہے اور صوفیہ بہرحال اتنی بہادر ہرگز نہ تھی۔

اس نے جیک کو بلیک میل کرنے اور میڈیا میں بات پھیلانے کی دھمکی دے کر شادی تو کر لی لیکن کبھی بھی عزت اور اعتبار حاصل نہ کر پائی۔ جیک کے لیے وہ گلے میں پڑا ڈھول تھی جسے وہ ہر صورت بجانے پر مجبور تھا۔ صوفیہ پہلے بھی

اخلاقی بے راہ روی کا شکار تھی، جیک کی بے اعتنائی نے اسے مزید برگشتہ کردیا۔ وہ جان چکی تھی کہ اس سے شادی کا مقصد محض ذہنی اذیت اور بڑھاپے میں ایک بلا معاوضہ نرس کے حصول کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جیک کی پہلی بیوی کینسر کے موذی مرض سے لڑتی ملکِ عدم سدھار چکی تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ جوانا کی ولدیت کے بارے بھی وہ ہمیشہ شکوک وشبہات میں ہی مبتلا رہا اور اسے اس بات کا احساس دلاتے رہنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتا۔ صوفیہ نے ان حالات میں ایک بار پھر اپنی سابقہ روش اختیار کرلی اور بہت سے دیگر افراد کے علاوہ شوہر کے قریبی دوست اور وکیل سپائرس سے بھی تعلقات قائم کرلیے۔

سپائرس، صوفیہ کے ذریعہ جیک کی جائداد پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کبھی بھی جیک کو شک میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ اس ماحول میں پروان چڑھنے والی جوانا کی نفسیات میں بہت اُلجھنیں پیدا ہوچکی تھیں۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گرد انسانیت کا گھناؤنا روپ ہی دیکھا تھا۔

اس کی ماں اسی کے باپ کی نرس بن کر وہاں رہتی اور ہر قسم کی اخلاقی حدود وقیود سے مبرا زندگی گزارتی۔ اس نے سپائرس کے علاوہ بھی کئی مردوں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے اور جوانا اس بات سے بے خبر نہیں تھی۔ جیک نے بیماری کے باوجود طویل عمر پائی اور جائداد حاصل کرنے کے خواب دیکھنے والی صوفیہ شراب کے نشے میں کار ایکسیڈنٹ میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

جوانا کو اس کی موت سے کوئی فرق نہ پڑا۔ اس کی زندگی بیٹی کے لیے اذیت اور شرمندگی کے سوا ویسے بھی کچھ نہ تھی۔ ردِعمل کے طور پر وہ مردوں سے شدید نفرت کرتی ایک اور اخلاقی بے راہ روی میں مبتلا ہوگئی۔ اگلے دو سال جیک بھی اپنی بیماریوں اور بڑھاپے سے لڑتا رہا۔ سات سے زائد دہائیوں پر مشتمل زندگی کا سفر جب اپنے اختتام تک پہنچا تو اس کے دل میں بیٹی کی ہڑک جاگ اٹھی۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیمان ہونا۔ اس نے اپنی جائداد جوانا کے نام کردی اور سپائرس کو اس کا نگران بنا کر اسے ایک اور اذیت میں مبتلا کر گیا۔

جیک کی وصیت کی رُو سے جوانا کی موت یا غیر شادی شدہ رہنے کی صورت میں سب اثاثہ جات ٹرسٹ کو منتقل ہو جاتے۔ سپائرس ایک بار پھر پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ اس وصیت کے معاملات میں وکلا کا پورا پینل ملوث تھا اس لیے وہ ذاتی طور پر کوئی ہیر پھیر نہیں کرسکتا تھا۔ جوانا کی اخلاقی کجی دیکھتے ہوئے اسے یہ جائداد ہاتھ سے نکلتی محسوس ہورہی تھی اس لیے وہ ان سبھی افراد کو سفاکی اور بے رحمی سے قتل کروادیتا جو جوانا کے قریب ہوتے۔

سپائرس کی اپنی فیملی شہر کے ایک نواحی علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے اور لامحالہ طور پر وہ بھی باپ ہی کی طرح جوانا اور اس کی جائداد کو مالِ غنیمت سمجھتے ہوئے اس پر ہاتھ صاف کرنے کی کوششوں سے کبھی بھی نہ چوکتے تھے۔ سپائرس اپنے بیٹے سے اس کی شادی کروانے کے بعد مکمل جائداد اپنے قبضے میں کرلینا چاہتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ جوانا اس کے گھر منتقل ہوجائے لیکن وہ رضامند نہیں ہوئی تھی۔ وہ دنیا میں ہر شے سے نفرت کرتی تھی اور خودترسی میں انتقامی راہوں کی مسافر بن گئی تھی۔

جونی کی آج مذموم ارادوں سے یہاں آمد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

☆☆☆

عدنان کو اس کے خانگی معاملات سے کوئی سروکار تھا نہ ہی دلچسپی۔ تاہم وہ اس کے انکشافات محض اس امید پر سن رہا تھا کہ شاید کوئی اہم سراغ مل سکے لیکن نتیجہ ندارد۔

انسانی ہمدردی کی بِنا پر وہ اس کے حالاتِ زندگی پر افسوس اور تاسف ہی کرسکتا تھا اور حقیقتاً اسے نفرت وانتقام کی آگ میں جھلستی اس لڑکی پر ترس آنے لگا تھا۔

''ہم اپنے کچے پکے آنگن میں بیٹھے، رشتے ناتوں کی چھاؤں میں زمانے کے سرد وگرم سے ناآشنا رہتے ہوئے کس قدر انسانیت سوز حقائق سے بے خبر رہتے ہیں، اس کا اندازہ آج سے قبل اس طرح کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہم اپنے اردگرد پھیلی غربت، معاشرتی ناہمواری اور چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنی ذات پر اس قدر حاوی کرلیتے ہیں کہ اغیار کی سرزمین سے نادیدہ محبت میں مبتلا ہوکر اپنا آشیانہ چھوڑ آتے ہیں۔ ہمیں کوئی اس وقت کیوں نہیں سمجھاتا کہ یہ بھی ہم جیسے انسانوں کا ہی دیس ہے اور یہاں کے مسائل ہماری سوچ اور برداشت سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ ان کے مسائل اور آزار زندگی تو ہم سے بھی کہیں زیادہ ہولناک ہیں۔ ہم اس سرزمین کے بیج ہی نہیں ہیں لہٰذا یہاں پنپ ہی نہیں سکتے۔ رشتوں کی ایسی پیچیدہ داستان اگر ہمارے معاشرے میں رقم ہو تو کس قدر طوفان برپا ہوجائے۔'' وہ اپنی سوچ کی لہر میں بہہ کر بے اختیار جھرجھری لے کے رہ گیا۔

جوانا اس کی کیفیت بغور دیکھ رہی تھی۔ عدنان کے چہرے پر مدوجزر کی کیفیت اس سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔

''تم شاید میرے ماضی اور حال کی گناہ گار زندگی کے بارے میں سوچ کر مجھ سے نفرت محسوس کررہے ہوگے..... قصوروار تم بھی نہیں...... میری زندگی کا تعفن اسی طرح سب کو مجھ سے دور کردیتا ہے۔''

''نہیں! میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہا...... بس ایک موازنہ کررہا تھا اور تم سے نفرت بھی کیونکر کروں گا؟ میرے اندر آج بھی اس باپ کی تعلیمات سانس لیتی ہیں جو ساری زندگی مجھے یہی سکھاتا رہا کہ برائی سے نفرت کرو، برائی کرنے والے سے نہیں...... جرم اسی سوچ سے پیدا ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ اس سے خار کھاتا رہا اور سمجھ لیا کہ اسے مٹی تلے دفن کر آیا ہوں تو اب وہ کبھی بھی زندہ نہیں ہوگا۔ لیکن نہیں..... آج اندازہ ہورہا ہے کہ وہ اب میرے وجود میں سانس لینے لگا ہے۔''

''بہت خوش قسمت ہو تم جو اپنے والد کو آج بھی اتنے اچھے الفاظ میں یاد کرسکتے ہو..... میرے پاس تو یہ بھرم بھی نہیں۔'' جوانا کی بات سن کر عدنان کے چہرے پر ایک زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تم واقعی مجھ سے نفرت نہیں کرتے ناں؟'' وہ افسردگی سے بولی۔

''نہیں بے وقوف لڑکی! بالکل بھی نہیں...... قصور تمہارا بھی تو نہیں...... تم نے زندگی میں جو حادثات دیکھے، اس کے بعد نفرت وانتقام ہی کی راہ بچتی تھی۔ ..... ضروری نہیں کہ مرد کا ایک ہی روپ ہو...... وہ بھائی بھی تو ہوتا ہے جو تحفظ کی علامت ہوتا ہے۔'' ماضی کی ایک جان لیوا یاد کے حملے سے عدنان کی آنکھوں میں یکایک ضبط سے سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ ''تم اپنے ساتھ بہت غلط کررہی ہو۔ اگر غیر جانبدار ہوکر سوچو تو بہت سے لوگوں سے بہتر زندگی ہے تمہاری۔ قدرت نے تمہیں دولت کی صورت میں وسائل دیے اور ساتھ ہی یہ موقع دیا کہ اپنا مستقبل اپنی مرضی سے سنوار لو۔ لیکن تم کس رستے پر چل نکلی ہو؟ ذرا سوچنا! کیا کل کو اس مستقبل کی بربادی کا ذمے دار کسی اور کو ٹھہرا سکو گی؟ ایک بار مثبت سوچ کے دیکھنا کہ محرومیوں کا ماتم زیادہ فائدہ مند ہے یا اپنی زندگی کو سنوارنے کی جدوجہد۔''

''تم بھی جانے کون سی فیری ٹیلو لے کر بیٹھ گئے ہو۔'' وہ یاسیت میں گھری تھی۔ ''اصل سوال تو اب بھی جوں کا توں برقرار ہے۔''

''ہاں! میں جاننا چاہوں گا کہ سپائرس اور مصطفیٰ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟''

''ایک رستہ ہے اس راز سے پردہ اٹھانے کا۔'' وہ پرجوش ہوئی۔ ''تم کل رات ہی اس سے آگاہ ہوسکتے ہو، میں جانتی ہوں کہ انہیں کیسے ٹریس کیا جاسکتا ہے؟''

''کس طرح؟'' عدنان بھی مضطرب ہوا۔

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے اپنا لائحہ عمل سمجھانے لگی۔ عدنان کی آنکھوں میں حیرت، سنسنی اور تجسس کے رنگ واضح تھے۔

☆☆☆

اگلی صبح نئے ہنگامے لیے طلوع ہوئی۔

سپائرس اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزار کر لوٹ آیا تھا۔ وہ ہفتے میں تین دفعہ وہیں شب بسری کرتا تھا۔ اپنی آمد کے فوری بعد وہ اسٹڈی میں کچھ اہم کاغذات کے مطالعے میں مصروف ہوگیا اور انٹرکام پر برائن کو کافی پہنچانے کی ہدایات دے دیں۔

وہ اس وقت کامل یکسوئی چاہتا تھا لیکن دروازے پر ہونے والی آہٹ اور قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔

''یہ مصیبت کہاں سے ٹپک پڑی؟'' وہ ناگواری سے بڑبڑایا۔

جوانا دستک دیے بغیر دندناتی ہوئی اندر چلی آئی تھی۔

''تمہیں کب مینرز آئیں گے جوانا؟ ایک کم عمر بچہ بھی اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دستک دی جاتی ہے۔''

''بھاڑ میں جائیں تمہارے مینرز! یہ میرا گھر ہے اور میں جب چاہے، جیسے چاہے اور جہاں چاہے اپنی مرضی سے آمدورفت رکھوں گی۔'' وہ غرائی۔

''تم یہ بھول رہی ہو بے بی کہ ابھی یہ گھر تمہارے نام لگنے میں بہت وقت باقی ہے۔'' وہ طنزیہ مسکرایا۔

''کل فیملی کے ساتھ کیسا وقت گزرا بائی دا وے؟'' جوانا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تم جان کر کیا کرو گی؟ فیملی کی اہمیت اور اقدار تم کبھی سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ والدین کی تربیت، اعتماد اور محبت اولاد کو کس طرح کندن کی طرح نکھارتی ہے، یہ ایک بے حیا اور بدکردار عورت کی اولاد کیسے جان سکتی ہے بھلا؟'' وہ زہرخند ہوا۔

''یس رائٹ! تربیت، اعتماد اور اقدار کبھی بھی سمجھ نہیں پاؤں گی۔ میں تو بس اتنا بتانے آئی تھی کہ تمہاری

خاندانی بیوی کی 'تربیت یافتہ' اولاد کل رات سے میرے کمرے میں بے ہوش موجود ہے۔ اپنے باپ کی غیر موجودگی میں وہ یہاں کیا لینے آیا تھا؟ یہ خود ہی اس سے پوچھ لینا۔ نشے میں تو وہ پہلے ہی سے تھا۔ میں نے پسٹل سر پر دے مارا تو اب تک وہیں اوندھا پڑا ہے۔ چیک کرلو کہیں لڑھک تو نہیں گیا۔'' جوانا کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ سپارٹس کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھے۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ جونی تو اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹی میں گیا تھا۔''

''واہ! بہت خوب... میرے نام لیے بغیر تم سمجھ گئے کہ یہ جونی ہی ہوسکتا ہے..... کیا کہنے!'' وہ کندھے اچکا کر ایک طنزیہ مسکراہٹ اچھالتی چلی گئی۔

سپارٹس فوری طور پر اس کے پیچھے لپکا۔ جونی کراہتا ہوا اب ہوش میں آنے لگا تھا۔ اس کا لباس اور حلیہ ابتر تھا۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

''یہ حالت کس نے بنائی ہے اس کی؟'' وہ چلّایا۔

''آف کورس امیں نے۔'' جوانا اطمینان سے بولی۔

سپارٹس نے اسے آزاد کروایا اور اپنی خوابگاہ میں لے گیا۔ ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد جونی کو ڈرائیور کے ہمراہ گھر روانہ کردیا گیا۔ اس کی یہاں آمد اور زخمی ہونے پر وہ بعدازاں بات کرنے کا ارادہ کیے ایک اور فوری معاملے کو پہلے نمٹانا چاہتا تھا۔

برائن اسٹڈی میں آچکا تھا اور اب سرنہوڑائے کھڑا تھا۔

''یہ سب کیا ہے برائن؟ کیا میں نے تمہارا انتخاب کر کے غلطی کی ہے؟'' اس کے سرد انداز نے برائن کی سٹی گم کر دی۔

''سوری سر! میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ کل رات مجھ سے اپنے فرائض میں کوتاہی ہوئی تاہم اگر اسی حادثے کو دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو آپ ایک اور نکتہ نظرانداز کررہے ہیں۔''

''کھل کر بات کرو مجھ سے..... اشارے کنایوں میں سمجھا کر اپنے لیے مزید مشکلات کھڑی نہ کرو۔''

''سر! میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جونی کی اس حالت کی ذمّے دار اکیلی جوانا نہیں ہوسکتی۔ جونی اگر نشے کی حالت میں تھا تو بھی وہ اس طرح اُس پر قابو نہیں پاسکتی کہ پہلے اسے بے ہوش کرے اور پھر مشکیں بھی کس دے۔''

''تو تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی شامل ہے؟''

''جی ہاں! اور وہ مددگار عدنان یا واجد میں سے کوئی ہے۔ اپنے اسی حامی و مددگار کو وہ یہ بھی اشارہ دے چکی ہے کہ پچھلی بار دو افراد یہاں خاصا ہنگامہ کھڑا کرچکے ہیں۔''

''ایسا کیسے ممکن ہے؟'' سپارٹس ششدر تھا۔

''چند سیکنڈز کے فرق سے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ پایا، لیکن آپ سے ایک درخواست ہے کہ لاؤنج، ڈائننگ ہال اوپری راہداری اور سیڑھیوں میں کیمرے نصب کروادیے جائیں تو بہتر ہے۔ ان کیمروں کا رخ جوانا کے کمرے کی جانب بھی ہونا چاہیے۔''

''اوکے! کل پہلی ہی فرصت میں یہ کام کروادیں گے۔'' سپارٹس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''پراجیکٹ ون کی کیا صورتِ حال ہے سر؟''

''کل شام روانگی سے قبل اس پر نوّے فیصد کام مکمل ہوچکا تھا۔ اب کچھ ہی دن کی بات ہے بس!''

''شاندار! بالآخر آپ نے اپنا مشن مکمل کردکھایا..... یو آر گریٹ سر!'' برائن کے خوشامدانہ انداز کا خاطر خواہ اثر ہوا اور سپارٹس کا غصہ اور پیشانی کے بل کافی حد تک کم ہو گئے۔

''یس! آئی ایم!'' وہ تکبّر سے بولا۔

''آپ کی ہمت اور حوصلہ قابلِ داد ہیں ورنہ اس پراجیکٹ پر کام کا آغاز بہت مشکل اور بظاہر ایک ناممکن امر تھا۔''

''اگر یہ مشکل ہے تو منافع بخش بھی تو بہت ہے..... بزنس کا ایک سب سے بڑا اصول یہی ہوتا ہے کہ صحیح وقت اور صحیح لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ اور اس معاملے میں اس بار قسمت نے میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ دولت اور شہرت بہت جلد ہم پر مہربان ہونے والی ہے۔''

''بیسٹ آف لک سر!'' برائن نے مزید چاپلوسی سے کہا۔

سپارٹس اب نارمل ہوچکا تھا۔

☆☆☆

مصطفیٰ اور سپارٹس سرِشام ہی ہال کمرے میں چلے گئے۔

عدنان اور واجد ان پر مکمل نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان کی روانگی کے نصف گھنٹے بعد عدنان نے واجد کو کچھ ہدایات دیں اور کمرے کی وارڈروب کے سامنے جا کھڑا

ہوا۔ اس کی سماعت میں جوانا کی آواز گونجنے لگی۔

''اس مکان کی تعمیر بہت الوکھے طریقے سے ہوئی تھی۔ جیک مجرمانہ ذہنیت کا مالک تو تھا ہی اس کے علاوہ اسے قدامت کا حسن بھی بہت بھاتا تھا۔ اپنے اسی شوق کی تسکین کے لیے اس نے اوپری منزل کے تینوں کمروں میں خفیہ میکنزم بنایا۔''

عدنان نے وارڈروب کا دروازہ کھول لیا تھا۔ جوانا کی آواز ایک بار پھر اس کی رہنما بن گئی۔

''وارڈروب میں ہینگ کیے گئے کپڑے باہر نکال دینا۔ بائیں سمت پر ایک چھوٹا سا دروازہ ہوگا۔ اسے کھول کر باہر نکالو گے تو دائیں جانب ایک ناب ہوگی۔ اسے دو مرتبہ دائیں اور تین مرتبہ بائیں طرف گھمانا۔ سامنے زینوں کے لیے رستہ تمہیں خودبخود نظر آجائے گا۔''

عدنان نے ٹٹولتے ہوئے یہی عمل دہرایا اور زینوں سے نیچے اترنے لگا۔ وہ برہنہ پا تھا اس لیے کسی قسم کی آہٹ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آخری زینے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔

''ہال کمرے میں صرف ایک دفعہ گئی تھی۔ جیک کو وہاں سے کچھ کاغذات لینے تھے۔ ان دنوں وہ مجھ پر بہت مہربان رہنے لگا تھا اور اس سمیت کتنے ہی راز مجھے بتاتا چلا گیا تھا جن کا سپارٹس کو بھی بہرحال علم نہیں۔ وہاں پہنچ کر تمہیں کوئی نہ کوئی سراغ ضرور مل جائے گا لیکن اپنی موجودگی پوشیدہ ہی رکھنا۔'' جوانا کے آخری الفاظ یاد آتے ہی وہ مزید چوکنا ہوگیا۔

زینوں کے اختتام پر ایک چوبی دروازہ تھا۔ عدنان سانس روکے اس کے عقب میں کھڑا کوئی رخنہ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے بے آواز طریقے سے دروازہ ہلکا سا سرکا دیا۔ ایک درز نظر آتے ہی وہ ہال کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اسے اپنے سامنے مصطفیٰ کھڑا نظر آیا جس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ وہ حسبِ معمول نشے میں تھا۔ سپارٹس کا چہرہ دوسری جانب تھا۔ ان دونوں کے علاوہ اسے ایک اور شخص کی موجودگی کا گمان بھی ہورہا تھا لیکن اس معمولی درز سے اس کا چہرہ نظر آنا ناممکن تھا۔

''کیا تم شاٹ کے لیے تیار ہو؟'' سپارٹس کی آواز ابھری۔

''ہاں!''

''یہ اس فلم کا آخری سین ہے اس لیے بہترین ہونا چاہیے۔''

''اتنی جلدی ختم ہوگئی یہ..... ابھی تو لطف آنا شروع ہوا تھا۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

''اس مووی کو مارکیٹ میں آنے تو دو! تمہارے پاس بین الاقوامی آفرز کے ڈھیر لگ جائیں گے۔'' سپارٹس کے لہجے کی کھنک ہی نرالی تھی۔

''سپارٹس ایک ایسا سانپ ہے جس کا زہر اس کی سوچ ہے۔ جب وہ انسانیت اور انسان دوستی کی یا کسی کو فائدہ پہنچانے کی بات کرنے لگے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ مقابل سے ایسا کام کروانا چاہتا ہے جو انسانیت کے کمتر درجے سے بھی گرا ہوا ہے۔'' جوانا کی ایک اور بات عدنان کے کانوں میں گونجی تو وہ اپنی منتشر دھڑکنوں پر قابو پاتا مصطفیٰ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس نے کاغذ رول کرنے کے بعد ایک جانب اچھالا اور مکالموں کی ادائیگی شروع کردی۔ عدنان کی سماعت میں کوئی پگھلا ہوا سیسہ انڈیلنے لگا۔ اس کی رگوں میں چنگاریاں چٹخنے لگی تھیں۔ لمحہ کے ہزارویں حصے میں وہ ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔

مصطفیٰ کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے بھلے ہی سادہ، سلیس اور رواں تھے لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں بہت عرق ریزی سے تیار کیا گیا ہے۔ الفاظ تلفظ میں آسان اور مختصر تھے لیکن یہ عام فہم بھی بہرحال نہ تھے۔ انہیں لازماً لغات کی مدد سے ہی بہت سوچ سمجھ کر تیار کیا گیا تھا اور صرف وہی اسے سمجھ سکتا تھا جسے زبان دانی پر مکمل عبور حاصل ہو۔

وجود میں بھڑکتے شعلے مصطفیٰ کی آواز کے ساتھ مزید بڑھنے لگے۔ عدنان نے تمام تر احتیاط، تحفظ اور ہوشمندی فراموش کر کے چوبی دروازہ کھولا اور بجلی کی سی تیزی سے اس پر پل پڑا۔ سپارٹس اس غیر متوقع صورتِ حال پر دنگ رہ گیا۔

مصطفیٰ کو زوردار گھونسے رسید کرنے اور اس کی گردن دبانے کے بعد عدنان سپارٹس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اسے دھکیلتے ہوئے نیچے گرا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے ان دونوں ہی کا نرخرہ دبانا شروع کردیا۔

''چھوڑوں گا نہیں میں تمہیں..... قتل کردوں گا میں تم دونوں کو..... تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ سب کرنے کی؟'' وہ وحشیانہ قوت کا مظاہرہ کررہا تھا۔

ان کے حلق سے خرخراتی ہوئی آوازیں برآمد ہورہی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگیں۔ عدنان کے سر پر

خون سوار تھا۔ وہ کسی قیمت پر انہیں زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن اپنے عقب سے آنے والی افتاد سے وہ بے خبر تھا۔

ہال میں موجود تیسرے شخص نے وہاں رکھی ہوئی ایک راڈ عقب سے اس کے سر پر دے ماری تھی۔ عدنان نے ہمت مجتمع کر کے اپنی گرفت کمزور نہ ہونے دی لیکن پے در پے ضربات نے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا طاری کر دیا اور اعصاب پر اس کا قابو ختم ہو گیا۔ سپارٹس بے اختیار اپنی گردن مسلتا ہوا لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ بیٹھا۔ عدنان کی آنکھیں غشی کے عالم میں بند ہو رہی تھیں۔

دھندلاتی ہوئی بصارت میں آخری مناظر سپارٹس کی خونخوار نظریں اور اپنا بہتا لہو دیکھ کر مصطفیٰ کی ندیدگی تھی۔ وہ اپنی ضربات فراموش کیے کسی چوپائے کی طرح اس کے لہو کی طرف لپک رہا تھا۔ عدنان نے اسے دبوچنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن وہ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔ اس کے اعصاب کمزوری کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔

ذہن میں ابھرنے والا آخری خیال اپنی بے بسی اور ان دونوں کو قتل نہ کر کے کے ملال کے سوا کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر، سپارٹس کے حلق کا چیک اَپ کرتے ہوئے نہایت تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔

”آپ کی زندگی بچ جانا ایک معجزہ ہے۔ ورنہ جس نے بھی یہ مجرمانہ حملہ کیا، وہ بہت شاطر انسان ہے۔ اسے جسمانی نظام میں نازک رگوں اور حساس پٹھوں کا بھی بخوبی اندازہ ہے۔ چند سیکنڈز کی مزید دیر ہو جاتی تو آپ کی فلائٹ ٹیک آف کر چکی ہوتی۔“

ڈاکٹر کی بات سن کر سپارٹس کے ذہن میں ایک بار پھر وہی لمحات اجاگر ہو گئے۔ موت کو اس قدر قریب سے دیکھنے کے بعد اس کی سٹی گم ہو چکی تھی۔

”ایک اور مریض بھی ہے ڈاکٹر! اسے بھی یہیں بلوائے لیتا ہوں۔“ سپارٹس کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ بولتے ہوئے گلے کی رگوں میں شدید تکلیف کا احساس ہونے لگتا تھا۔

”ابھی زیادہ بات چیت سے آپ گریز کیجیے۔ بہتر یہی ہوگا کہ اشاراتی زبان یا کاغذ قلم کا سہارا لے لیں۔“

ڈاکٹر کے ٹوکنے پر سپارٹس نے اثبات میں سر ہلایا اور براؤن کو اشارے سے مصطفیٰ کو بھی یہیں بلوانے کا کہا۔

ڈاکٹر اب اسے مزید کچھ پیشہ ورانہ ہدایات دے رہا تھا۔

☆☆☆

مصطفیٰ کی حالت بھی نہایت پتلی تھی۔

عدنان کی وحشت، جنون اور جناتی قوت دیکھ کر وہ اس وقت تو حواس باختہ ہوا ہی تھا لیکن اب وہ مناظر یاد کر کے اس کے اوسان مزید خطا ہو رہے تھے۔ اس نے سر جھٹکا اور لرزتے ہاتھوں سے جام بنا لیا۔

پہلا گھونٹ لیتے ہی اس کے حلق میں جیسے انگارے بھر گئے۔ رگوں میں شدید تکلیف اور جان لیوا جلن پیدا ہو گئی۔ کھانستے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی گردن کو مسلا۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ چند منٹ بعد حواس بحال ہوئے تو گہرے سانس لیتا وہ وہیں بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا ذہنی ارتکاز اب بھی عدنان ہی کی جانب تھا۔ اس کے طیش اور ردِعمل سے وہ اس معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔

اب سانپ تو گزر چکا تھا لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مستقبل زیادہ اہم تھا۔ اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر سپارٹس اسے طلب کرنے بعد ضرور ٹٹولنا چاہے گا۔ عدنان تو یقینی طور پر اس کے عتاب کا شکار ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ کو بھی اس وقت بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

وہ اپنے مستقبل کی بابت ممکنہ پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ اس دوران ایک شبیہ بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہی تھی۔ فیصلہ آسان ہو گیا۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا عادتاً ایک بار پھر جام بنانے کے لیے اٹھا لیکن کچھ دیر پہلے کی تکلیف یاد کر کے اس کے قدم رک گئے۔

”تمہیں باس نے طلب کیا ہے…… ابھی!“ براؤن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

☆☆☆

واجد بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

عدنان کی روانگی کو ڈیڑھ گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا اور تا حال اس کی جانب سے مکمل خاموشی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، اس کی بے چینی پریشانی میں ڈھلنے لگی۔ نچلی منزل پر بھی کسی قسم کی کوئی نقل و حرکت نہ تھی۔

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کمرے سے باہر آیا لیکن پھر دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ مصطفیٰ اسے واپس اپنے کمرے کی جانب آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

”اگر یہ یہاں موجود ہے تو لالہ ضرور کسی مشکل میں پھنس چکے ہیں۔“ وہ بلا ارادہ عدنان کے کمرے کی جانب

بڑھ گیا۔

کھلی وارڈروب اور زینوں کا رستہ دیکھ کر اس نے نیچے اترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

مصطفیٰ، سپارٹس کے پاس پہنچا تو اس کے چہرے پر گمبھیرتا طاری تھی۔

ایک ادھیڑ عمر شخص اسے چند گولیاں تھما رہا تھا۔ سپارٹس نے اشارے سے اسے مصطفیٰ کی جانب متوجہ کیا اور وہی شخص اس کے تفصیلی چیک اَپ میں مصروف ہو گیا۔

”ڈرنک کرتے ہو تم؟“ اس نے استفسار کیا۔

”یس!“ اس یک حرفی جواب کی ادائیگی سے مصطفیٰ کو اندازہ ہوا کہ وہ بولنے میں بھی دشواری محسوس کرنے لگا ہے۔

”اس کا حلق اور اندرونی نظام بھی کافی حد تک ویسے ہی متاثر ہوا ہے لیکن دباؤ کی شدت آپ کی نسبت بہرحال کم تھی۔ یہ ماضی قریب میں شاید بہت زیادہ ڈرنک کرتا رہا ہے جس کی وجہ سے اس کا اندرونی نظام پہلے ہی کافی مسائل کا شکار تھا۔ اب بھی اسے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔“

ڈاکٹر رخصت ہوا تو سپارٹس، براؤن کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا اور مصطفیٰ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”باس تم سے چند سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔ ان کی جانب سے یہ سوال میں ہی پوچھوں گا۔ جواب تم اپنی سہولت کے مطابق اپنی زبان میں دیتے رہنا۔“

مصطفیٰ نے اثباتی جنبش سے اسے بات مکمل کرنے کا اشارہ کیا۔

”عدنان نے تمہارے اور باس کے ساتھ جو کچھ کیا، کیا اس میں تمہاری بھی کوئی رضامندی شامل تھی؟“

”ہرگز نہیں! مجھے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ وہ اس طرح اچانک حملہ کر دے گا۔“

”کیا تم نے اسے ہمارے پراجیکٹ کی بابت کچھ بتایا تھا؟“

”مجھے وہ شخص سخت ناپسند ہے۔ وہ اس کائنات میں اگر آخری انسان بھی ہو تو بھی میں اس سے کوئی بات کرنا پسند نہیں کروں گا۔“ مصطفیٰ نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا۔

”تو اُسے خفیہ راستے کا کس طرح علم ہوا؟“

”یہ بات میرے لیے بھی حیران کن ہے۔ ہاں! لیکن پچھلے دنوں وہ میرے کمرے میں آ کر مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا تھا۔“

”کیسی باتیں؟ کیا اس نے کبھی پراجیکٹ کے بارے میں کچھ پوچھا؟“ اس دفعہ سپارٹس نے براہِ راست سوال کیا۔

”مجھے اچھی طرح یاد نہیں…… میں نشے میں ہوتا تھا۔ اگر روانی میں کوئی بات زبان سے پھسل گئی ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ اس کا انداز اُلجھا ہوا اور معذرت خواہانہ تھا۔

”خیر! اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا…… ایک اہم سوال بہرحال باقی ہے۔ تمہیں علم تو ہو ہی گیا ہوگا کہ یہ پراجیکٹ درحقیقت کیا ہے؟ تو کیا تم اسے جاری رکھنا چاہو گے؟“ سپارٹس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اسے بولنے میں شدید دشواری تھی۔

مصطفیٰ نادان نہیں تھا۔ اسے لہجوں میں پوشیدہ مطالب سمجھنے کا اتنا علم تو تھا کہ مذکورہ سوال میں اس سے کوئی سوال پوچھا جا رہا ہے، نہ ہی کوئی آپشن دی جا رہی ہے۔ اس کے جواب اور ردِعمل پر آئندہ مستقبل کا انحصار تھا۔

”بالکل جاری رکھنا چاہوں گا…… اگر مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا ہوتا تو تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

سپارٹس کے چہرے پر بے یقینی، حیرت اور مسرت کے تاثرات بہت جلد پھیلے تھے۔

”امیزنگ! اگر تمہیں اسی پراجیکٹ کی دیگر موویز میں کام کرنے کا موقع دیا جائے تو؟“ وہ بدقت تمام بولا۔

”مجھے تیار پائیں گے آپ۔“ مصطفیٰ نے کھانستے ہوئے کہا۔

سپارٹس کا جوش سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ”آج تم نے میرا اعتماد مکمل طور پر جیت لیا ہے! میں تمہیں ذاتی صوابدید پر یہاں سیاسی پناہ دلوانے کی کوشش کروں گا۔“ اس کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

”تھینک یو سوئچ!“ مصطفیٰ نے متانت اور وقار سے کہا۔

ادویات تھامے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسے شدت سے شراب کی طلب ہو رہی تھی لیکن خود پر عائد پابندی سے وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس فیصلے کے بعد اسے مدہوشی کی سخت ضرورت تھی۔

☆☆☆

سپارٹس کا مزاج بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔

''سر! یہ معاملہ تو ہماری توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا...... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ہم سے کوئی بلف کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' برائن نے حیرت سے کہا۔

''نہیں، اس جیسے بزدل، جاہ طلب اور سست الوجود شخص کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی قسم کا کوئی بلف کرے۔ بزدل انسان کو صرف اپنی زندگی سے پیار ہوتا ہے جس کی حفاظت کے لیے وہ ہر اصول اور ضابطہ بھول جاتا ہے...... یاد رہتا ہے تو صرف اپنا بچاؤ، بقا اور عیش و عشرت......'' سپارٹس نے اسے تحریری جواب دیا۔

''واجد کے بارے میں اب کیا فیصلہ ہے آپ کا؟ کیا اسے ڈھیل دینا مناسب ہوگا؟''

''نہیں، اس احمق کی بھی ضرورت نہیں رہی اب...... اسے بھی عدنان کے پاس ہی پہنچا دو...... فوراً۔''

''بہتر۔'' برائن نے کہا۔

☆☆☆

واجد کا جسم کسی ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔

اس کے حلق میں کانٹے اُگ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی قبر میں لیٹا ہے جہاں ہر طرف تاریکی، وحشت اور ہولناکی تھی۔ اس کے جسم میں تیز سنسناہٹ تھی اور دل یوں پھڑ پھڑا رہا تھا کہ پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آنا چاہتا ہو۔ وہ چیخنا چاہتا تھا، مدد کے لیے کسی کو پکارنا چاہتا تھا لیکن آواز حلق ہی میں پھنس کر رہ جاتی۔

کئی لمحات اسی کشمکش میں گزر گئے پھر بالآخر اس نے دانستہ اور مکمل شعوری کوشش کے تحت اپنے اعصاب پُرسکون کیے اور خود پر بیتنے والی اس افتاد کے بارے میں سوچنے لگا۔

مصطفیٰ کو اپنے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا تھا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ وہ سپارٹس سے ملاقات کر کے لوٹا تھا۔ اس کے چہرے سے عجیب وحشت ظاہر ہو رہی تھی۔ چال میں بھی بے پناہ تھکاوٹ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جبراً اپنا وجود گھسیٹ رہا ہے۔

واجد نے پہلے اس سے ملنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر موخر کر دیا۔ اب اس کی منزل عدنان کی بتائی گئی جگہ تھی۔ وارڈ روب حسبِ توقع الٹی پڑی تھی۔ وہ آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ ایک ناگوار بدبو اس کی ناک سے ٹکرائی۔ اس نے سانس روکنا چاہا لیکن بہت تاخیر ہو چکی تھی۔

وہ اسی پل اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا اور اب اس عجیب و غریب جگہ پر آنکھ کھلی تھی۔ اس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ چار ضرب چھ فٹ کا ایک کمرا تھا جہاں ٹانگیں بھی بمشکل ہی سیدھی ہو پائی تھیں۔ ہاتھوں کے بل کھڑا ہونے کی کوشش کی تو نیم تاریکی میں کسی ٹھوس شے سے اس کا پاؤں ٹکرایا۔

وہ اندازے سے اس جانب مڑا اور ٹٹولتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچا کہ عدنان بھی وہیں موجود بے ہوش تھا۔ اس کے سر سے بہتا لہو چہرے اور گردن پر جم چکا تھا۔ واجد چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کس طرح ہوش میں لائے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

بچپن میں وہ اور ماجد اکثر ساجد کے لیے ناول اور کتابیں لے کر آیا کرتے تھے۔ ساجد کی پڑھنے میں رفتار یوں بھی بہت تیز تھی۔ اس کے پڑھ لینے کے بعد وہ دونوں بھی ان کتابوں کو چٹ کیا کرتے تھے۔ ان دنوں انھیں جاسوسی ناولز کی بہت بری لت لگ چکی تھی۔ وہ دنیائے جاسوسی کے ایک مشہور کردار پر مبنی کہانیاں پڑھتے۔ وہ ایک ہرفن مولا کردار تھا جو دوستوں کے لیے ... ابریشم تھا تو دشمنوں کے لیے ایک قہر ثابت ہوتا۔ اس کی بذلہ سنجی، قہرناکی، سائنسی شعبدے اور دشمن کو ٹارچر کر کے مختلف راز اگلوانے کے طریقے انہیں بہت سحر زدہ کیے رکھتے تھے۔

اسی کردار پر مبنی کچھ ناولز میں اس نے پڑھا تھا کہ وہ دشمن کو بے ہوشی سے واپس لانے کے لیے اس کی ناک اور منہ دونوں ہاتھوں سے سختی سے بند کر دیتا تھا جس کے بعد مقابل بالآخر ہوش میں آ جایا کرتا۔ واجد کو یہ بات یاد آئی تو اس نے اللہ کا نام لے کر اسی ترکیب کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ گھٹنوں کے بل اس کے پاس جا بیٹھا اور دونوں ہاتھ مضبوطی سے اس کی ناک اور منہ پر جما دیے۔

اب خدا جانے یہ اسی شعبدہ کا کمال تھا یا واقعی وہ ہوش کی وادی میں قدم رکھنے لگا تھا۔ اس کے جسم میں ہلکی سی کسمساہٹ پیدا ہوئی اور وہ کراہنے لگا۔ واجد مطمئن سا سانس لیتا وہیں بیٹھ گیا اور اس کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ عدنان کی آنکھوں اور چہرے پر پہلے تو اجنبیت اور اپنے وجود سے لاتعلقی طاری رہی۔ پھر اس کے جسم نے زوردار جھٹکا لیا اور وہ غراتے ہوئے بولا۔

''نہیں چھوڑوں گا میں تم دونوں کو...... مار دوں گا... قتل کر دوں گا۔'' واجد کو اس کی آواز غیر انسانی محسوس ہو رہی تھی۔

''یہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے لالہ۔ آپ کسے مارنا چاہتے ہیں؟'' وہ نرمی سے اس کے ہاتھ اور

سر جھٹکنے لگا۔
”مصطفیٰ کہاں ہے...... اور وہ رذیل انسان سپائرس...... وہ کہاں گیا؟“
”مجھے تو خود بھی علم نہیں! میں تو مصطفیٰ کو اپنے کمرے میں جاتا دیکھ کر آپ کے کمرے کی جانب گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ یاد ہی نہیں۔“
”بچ گیا وہ...... کاش...... کاش میں انہیں مار سکتا۔“
عدنان نے ایک گالی دی۔
”لیکن کیوں لالہ؟ ایسا کیا ہوا ہے آخر؟“
”واجب القتل ہیں وہ...... فلمیں بناتے ہیں۔“
”تو اس میں قابلِ اعتراض بات کیا ہے؟“ واجد ہنوز اُلجھن میں تھا۔
”قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ فلم کا مواد، اسکرپٹ اور کردار انتہائی متنازعہ ہوتے ہیں...... ہمارے عقائد و نظریات سے متصادم۔“ وہ جھنجلا کر بولا۔
”اوہ...... کہیں آپ انہی بدنامِ زمانہ مووِیز کی بات تو نہیں کر رہے جن کی وجہ سے کئی ساجی ویب سائٹس بند کر دی گئی تھیں اور بین الاقوامی سطح پر بھی خاصا احتجاج کیا گیا تھا۔“ واجد نے لرز کر کہا۔
”ویسی تو نہیں... لیکن بہرحال اُن سے کم بھی نہیں...“
”آپ کو یقین ہے کہ وہ ایسا ہی کر رہے ہیں... کہیں کوئی غلط فہمی......“
”میں پاگل نہیں ہوں واجد کہ اتنی بڑی بات کسی غلط فہمی کی بنیاد پر کہہ دوں۔“ عدنان نے قطع کلامی کی۔ ”میں نے خود اپنے کانوں سے سب سنا ہے۔“
”لیکن مصطفیٰ...... وہ کیسے کر سکتا ہے یہ سب؟ کیا اسے اس معاملے کی سنگینی کا اندازہ نہیں؟ اور اسے تو یہ زبان آتی بھی نہیں۔“
”یہ سب سپائرس کی مکاری ہے۔ اس جیسے احمقوں کو ٹریپ کرنا اسے بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اسی نے مصطفیٰ کو مکالمے رٹوائے ہوں گے... مجھے یقین ہے کہ ان کا مطلب و مفہوم بھی اسے نہ آتا ہوگا لیکن محض اپنا مستقبل محفوظ کرنے اور دیگر مادّی فوائد حاصل کرنے کی خاطر وہ بنا سوچے سمجھے اس آگ میں کود پڑا ہوگا۔“
”ناقابلِ یقین...... یہاں اس اجنبی سرزمین پر آ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ ہماری سادہ لوحی، اپنی جڑوں سے دوری، اقدار سے بیزاری کس گڑھے میں دھکیل رہی ہے۔ ہماری کم علمی کا کس طرح فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔“ واجد نے کہا۔
”یہ وقت ان سوالوں اور اپنے حالات پر افسوس کے اظہار کا نہیں ہے۔ میرے وجود میں آگ لگی ہے اور میں اس کے انگاروں کی تپش سے ان سب کو بھسم کر دینا چاہتا ہوں...... چند سیکنڈز...... صرف چند سیکنڈز کے فرق سے میں ان کا ناپاک وجود ختم نہ کر سکا۔“ عدنان نے بے بسی سے اپنے بال نوچے۔
خون زیادہ بہہ جانے کے سبب اسے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی لیکن کوئی بھی عمل اس کی اندرونی کیفیت کو نارمل نہیں کر پا رہا تھا۔
”آپ پریشان نہ ہوں۔ یقیناً اس میں کوئی بہتری ہوگی۔“ واجد نے تسلی دی۔
”بہتری تو پتا نہیں ہوگی یا نہیں...... لیکن مجھے لگتا ہے کہ قدرت نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکوں۔“ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔
”ہاں! میں اس قابل کہاں بھلا۔ سراج دین کی اولاد نے زندگی میں کب کوئی ایسی نیکی کی تھی بھلا کہ یہ سعادت اسے نصیب ہو جاتی۔“
واجد نے اسے حوصلہ دینا چاہا لیکن وہ کروٹ بدل کر بے کلی سے لیٹ گیا۔ در و دیوار پر اب خاموشی، مایوسی اور وحشت کے سائے رقصاں تھے۔

☆☆☆

جوانا اس روز کافی تاخیر سے بیدار ہوئی۔
گزشتہ چند روز سے وہ ذہنی تناؤ اور اعصابی کشیدگی کا شکار رہی تھی۔ خود ترسی، خود اذیتی اور مختتم مزاجی نے اس کے وجود کو دیمک زدہ کر رکھا تھا۔ ان کیفیات میں گھرا کوئی بھی انسان مکمل طور پر صحت مند ہونے کے باوجود بے وجہ تھکاوٹ، بوجھل پن اور خوشی و مسرت کے لمحات میں بھی یاسیت میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی عالم جوانا کا بھی تھا۔
دو روز قبل عدنان سے ہونے والی گفتگو نے اس کے ذہن میں سوچ کے کئی در وا کیے تھے۔ اس کے ابتر کردار اور زندگی میں پیش آنے والی محرومیوں میں کہیں نہ کہیں اس کا اپنا ہاتھ بھی تھا۔ اس کے سرپرستوں نے زندگی کی بنیادی سہولیات کی فراہمی میں کہیں کوئی کوتاہی نہ رکھی تھی۔ اب غلطی تو اسی کی تھی کہ اس نے اپنی ذات کے لیے مثبت اور بامقصد رستہ تلاش کرنے کے بجائے اخلاقی بے راہ روی کو ترجیح دی۔ لیکن اب اس نے اپنے لیے بالآخر ایک راہ تلاش کر لی تھی اور یہ فیصلہ کرتے ہی وہ بے حد پُرسکون ہوگئی۔

سپائرس سے ذاتی جنگ اپنی جگہ لیکن وہ اپنے مستقبل کے بارے میں اب سنجیدگی سے کچھ کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ وہ خوشگوار موڈ میں ٹیبل پر آئی اور اخبارات اٹھاتے ہوئے برائن سے پوچھا۔
”انکل کہاں ہیں؟ کہیں میں نے تاخیر تو نہیں کر دی؟“
”جی ہاں! آپ نے تاخیر کر دی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ضروری کام کے لیے باہر گئے ہیں۔“ برائن اس کے اندازِ تخاطب پر حیران ہوا۔
یہ لڑکی اپنی تلخی اور اکھڑ مزاجی کی وجہ سے ہمیشہ ہی اس کے لیے دردِ سر بنی رہتی تھی۔ اس لیے یہ نیا انداز دیکھ کر وہ ذرا پریشان ہوگیا۔
”اوہ...... ویری بیڈ۔“ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔
”وہ رات گئے ہی گھر لوٹیں گے۔ کوئی خاص کام تھا آپ کو ان سے؟“ برائن اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکا۔
”ہاں! کالجز میں داخلے کی معلومات لی ہیں میں نے...... کچھ فارمز پر ان کے دستخط کی ضرورت تھی۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔
برائن کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا اور الفاظ گنگ ہو گئے۔
”تمہارے نئے مہمان کہیں نظر نہیں آ رہے؟“
”وہ واپس چلے گئے ہیں۔“ اس نے سنبھل کر کہا۔
”واپس...... کیوں؟“ اب حیران ہونے کی باری جوانا کی تھی۔
”یہاں رہنے کی صورت بھی تو کوئی نہیں تھی ان کی...... غیر قانونی طور پر آئے تھے یہاں۔ سو باس انہیں ڈی پورٹ کروانے کے لیے IMO کے پاس لے گئے ہیں تاکہ تمام تر قانونی مراحل سے نمٹنے میں ان کی مدد کی جا سکے۔“
جوانا کے چہرے پر واضح مایوسی پھیلی تھی۔
”جانا تو تھا ہی انہیں...... آج نہیں تو کل سہی۔“ برائن نے کہا۔
جوانا نے کوئی جواب نہ دیا اور ناشتا کرتے ہوئے اپنے حالیہ فیصلے کے متعلق مزید حکمتِ عملی طے کرنے لگی۔

☆☆☆

اس زنداں میں دن، رات اور وقت کا تصور ختم ہو چکا تھا۔
وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہاں قید ہوئے کتنا عرصہ بیت چکا ہے اور بیرونی دنیا میں کیا تغیرات پیش آ چکے ہیں؟ واجد کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہاں چار نہیں بلکہ پانچ دیواریں ہیں۔ عدنان بھی ہوش میں آنے کے بعد ایسی ہی ایک دیوار بنا ہوا تھا۔ بے حس و حرکت، ٹھوس ایسی کہ مقابل کی کوئی بھی پکار اس پر اثر انداز نہ ہو۔
اس جامد سناٹے سے واجد کو اب وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ خاک آلود فرش پر بے مقصد آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا اور جب اس مشغلے سے اکتا جاتا تو آنکھوں پر بازو رکھے لیٹ جاتا اور یادوں کے جگنوؤں کے پیچھے لپکنے لگتا۔ ماجد کا آخری وقت یاد کر کے آنسو بہاتا تو کبھی ماں کی کے اظہارِ محبت پر کتنی ہی دیر مسکراتا رہتا۔
اس کے برعکس عدنان پر ایک ہی کیفیت طاری تھی۔ وہ ہونٹ اور جبڑے بھینچے خلاؤں میں جانے کیا تکتا رہتا تھا۔
”لالہ، میں ایک بات سوچ رہا تھا۔“ واجد اس خاموشی سے گھبرا کر بولا۔
عدنان نے کوئی جواب نہ دیا بس گردن موڑے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔
”بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی جس میں چند مسافر ایک طوفان سے بچنے کے لیے کسی غار میں پناہ لے لیتے ہیں۔ پھر بیرونی طوفان غار کا دہانہ پتھروں سے بند کر دیتا ہے اور وہ مسافر قید ہو جاتے ہیں۔ بہت زور آزمائی کرتے ہیں لیکن پتھر اپنی جگہ سے نہیں سرکتے...... یاد ہے ناں آپ کو؟“ واجد نے معصومیت سے پوچھا۔
عدنان کی آنکھوں میں چھایا کہر پہلی بار چھٹتا محسوس ہوا اور اس کہرے کے پار اسے ہلکی سی چمک دکھائی دی۔
”ہاں، مجھے یاد ہے۔ اس وقت یہ میری فیورٹ کہانی ہوتی تھی۔“
”میری بھی لالہ۔“ واجد گرمجوشی سے بولا لیکن عدنان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔
”میری امی صرف مڈل پاس تھیں لیکن زندگی کی بابت ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ ہر سال جب نیا کورس خریدا جاتا تو وہ اردو کی نصابی کتاب نکال کر مجھے دیتیں اور پھر بتاتیں کہ یہ کتاب انہوں نے بھی اپنے اسکول میں پڑھی تھی۔ اس کی فلاں کہانی میں یہ سبق ہے تو فلاں والی میں یہ درس دیا گیا ہے...... پھر ہر کہانی اور نظم سے وابستہ اپنی خوبصورت یادیں اس قدر روانی اور اپنائیت سے شیئر کرتیں

کہ میں مسحور ہو جاتا تھا۔“ عدنان کے لہو رنگ چہرے پر بہت خوبصورت مسکراہٹ تھی پھر وہ یکدم بجھ سا گیا۔

”یار واجد! یہ مائیں اولاد کو اتنی جلدی چھوڑ کر کیوں چلی جاتی ہیں؟ وہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ ساری زندگی جس اولاد کو چوزے کی طرح اپنے پروں میں سمیٹ کر رکھتی ہیں، ان کے بعد وہ زمانے کے سرد و گرم سے کس طرح نمٹیں گے؟ اور کون بتائے گا انہیں کہ کون سی راہ اچھی ہے، کون سی نہیں؟“

واجد بھی آزردہ ہو گیا۔

وہ اپنے اندر چلنے والی کشمکش سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے خود ہی واجد سے مخاطب ہوا۔

”ہاں! تو تم کسی کہانی کی بات کر رہے تھے جس میں مسافر ایک غار میں پھنس جاتے ہیں...... اس کے بعد کیا ہوا تھا بھلا؟“ اس نے ذہن پر زور دیا۔ شدید دباؤ کی وجہ سے وہ فراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”اس کے بعد وہ اپنے نیک اعمال یاد کر کے اس مشکل سے رہائی کی دعائیں مانگتے ہیں۔“ واجد نے لقمہ دیا۔

”ارے ہاں...... یاد آ گیا۔“

”لالہ! آج پھر سے بچپن جی لیں۔ ہم بھی اپنے اعمال یاد کرتے ہیں۔ کیا علم کوئی رستہ نکل ہی آئے؟“ واجد نے دھیرے سے کہا۔

”ایسا صرف قصے کہانیوں میں ہی ممکن ہوتا ہے۔ حقیقت بہت بھیانک ہوتی ہے اور میری زندگی میں ایسا کوئی قابلِ ذکر کام ہی نہیں جس کا ان مسافروں کی طرح وسیلہ دے کر میں اپنی رہائی مانگ سکوں۔“

”ایسا کیسے ممکن ہے لالہ؟“

”تم خواہ مخواہ مجھے اتنی عزت دیتے رہتے ہو واجد! حقیقت تو یہ ہے کہ میں انتہائی قابلِ نفرت شخص ہوں۔ تم کچھ بھی نہیں جانتے میرے متعلق کہ میں کون ہوں۔“

”کون ہیں آپ؟ آج بتا ہی دیجیے۔“

”مجرم ہوں میں...... جانے کتنے گھر، خاندان اور ماؤں کی کوکھ اجاڑی ہے میں نے؟ اور آج اس بے بسی کی حالت میں یہاں بیٹھا ہوں تو... شاید یہ اسی مکافات کا نتیجہ ہے۔“ عدنان نے شکست خوردگی سے جواب دیا۔

☆☆☆

عدنان ملک اس صوبائی دارالحکومت کا باشندہ تھا جو جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں پیدا ہونے والا اِک ذرا سا تغیر بھی قومی سطح پر ہلچل پیدا کر دیا کرتا تھا۔

سراج دین ایک معمولی رنگ ساز تھا۔ لوگوں کے گھروں کو رنگ و روغن سے آراستہ کرتے اس کا اپنا آنگن بدرنگ ہی رہ گیا۔ بیوی بھلے وقتوں کی مڈل پاس تھی لیکن اس پر والدین کی تربیت کے رنگ اس قدر مضبوط تھے کہ زمانے کے بدلتے رنگ ڈھنگ اس کی شخصیت کی عمارت پر بالکل بھی ٹھہر نہ پائے۔ سراج دین کے والدین نے ان وقتوں میں گھر بنا لیا تھا جب زمینیں سستی جبکہ انسان اور اقدار مہنگی تھیں۔

رفتہ رفتہ مختلف کام کرتے ہوئے سراج ہرفن مولا بن گیا لیکن بنیادی طور پر اسے رنگ سازی کا کام بہت پسند تھا۔ بے رنگ اجڑی ہوئی عمارتوں پر رنگ پھیر کر وہ ان کی ہیئت تبدیل کرتا تو اس کی خوشی بے بہا ہوتی تھی۔ شادی کم عمری میں ہی والدین کے پرانے شناسا کی بیٹی رفیقہ سے ہو گئی لیکن اولاد میں مشیتِ ایزدی ہی سے تاخیر تھی اور بالآخر جب رفیقہ کی گود ہری ہوئی تو بیسویں صدی کے آخری عشرے کا آغاز ہو چکا تھا۔

عدنان کے تین سال بعد ارم کی پیدائش نے ان کا خاندان مکمل کر دیا۔ عدنان کا بچپن بھی اسی طرح گزرا جیسے اس محلے کے ستر فیصد بچوں کا گزرتا ہے۔ تین سال کی عمر میں اسے محلے کی مسجد میں بھیج دیا گیا اور پانچ سال کی عمر میں جب اسے اسکول میں داخل کروانے کا وقت آیا تو زمانہ ساز باپ اور سادہ لوح ماں کے درمیان زندگی میں پہلی بار اختلافِ رائے سامنے آیا۔

”نیک بخت! تجھے آخر مسئلہ کیا ہے میری بات تسلیم کرنے میں؟“ سراج نے زچ ہو کر کہا تھا۔

عدنان بھی وہیں موجود حیرانی سے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ان میں تو وہ کبھی بھی ان سے بات نہ کرتا تھا۔

”دیکھ بھلیا لوکا! میں نے ساری زندگی تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ تو جتنا کما کر لایا، میں نے صبر شکر کر کے اسے تھام لیا اور پھر گھر کا خرچ چلاتی رہی۔“

”تو میں کب اس حقیقت سے مکر رہا ہوں؟ تیرے اس وصف کی تو میں ہر جگہ تعریف کرتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں باہر کی عورتیں بلاوجہ کی فرمائشوں سے اپنے خاوند کی زندگی اجیرن بنا کر رکھتی ہیں لیکن تو نے ابھی سے اولاد کو حلال حرام کا فرق سکھایا ہے۔“

”میں بھی اسی اولاد ہی کے بھلے کے لیے بول رہی ہوں۔“

”سرکاری اسکول میں آخر برائی کیا ہے؟ جہاں میں اسے داخل کروانا چاہتا ہوں وہاں ہمارا ایک وزیراعظم بھی تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ بڑے بڑے مشہور لوگ پڑھتے رہے ہیں وہاں۔“

”وہ ماضی کی بات ہے لیکن اب حالات ویسے نہیں رہے۔“ رفیقہ نے متانت سے کہا۔ سراج اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا گویا اس نے بیوی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

رفیقہ شوہر کی رضامندی پا کر بہت خوش ہوئی اور اگلے ہی روز عدنان کو اسکول لے گئی۔

تین کمروں پر مشتمل اس عمارت کے داخلی دروازے کی دونوں دیواروں پر قائد اور اقبال کی تصاویر، ولولہ انگیز اشعار پینٹ کروائے گئے تھے۔

دفتر کی سجاوٹ بھی اس علاقے میں رہنے والے افراد کے نفسیاتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر کی گئی تھی۔ سامنے کی سمت میں ایک بک شیلف تھا جس میں اردو اور انگریزی کی ضخیم لغات کے علاوہ نامور ادبا کی شہرہ آفاق کتابیں، انگریزی کی کلاسیکل کتابیں اور مذہبی علوم پر مشتمل کئی ایک کتابیں اپنی جھلک واضح دکھاتی تھیں۔ نو وارد اس بہترین کمپوزیشن کو دیکھتے ہی مرعوب ہو جاتے اور اپنی یہاں آمد انہیں ایک نہایت عقلمندانہ فیصلہ محسوس ہوتی۔ مرعوبیت کی رہی سہی کسر ادارے کا پرنسپل پوری کر دیا کرتا تھا۔

پرنسپل چالیس کے پیٹے میں ایک خوش اخلاق اور بااعتماد شخص تھا۔ وہ مکمل طور پر کاروباری ذہنیت کا مالک تھا۔ اس نے نہایت سلیقے سے گفتگو کا آغاز کیا۔

”دیکھیے مادام! میں نے یہ ادارہ کچھ عرصہ قبل ہی یہاں قائم کیا ہے۔ اس کی اور بھی برانچز ہیں شہر بھر میں۔ ہمارا مقصد صرف کوالٹی ایجوکیشن ہے۔ پیسا کمانا میرا 'ایم' نہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اب تو بس شکرانے کا حق ادا کرنا ہے۔“ پرویز کے خلوص بھرے الفاظ، مہذب اندازِ تخاطب اور گفتگو میں انگریزی زبان کے بکثرت استعمال نے انہیں مزید متاثر کر دیا۔ اور عدنان نے اس اسکول سے اپنی تعلیم کا آغاز کر دیا۔

”آپ کا بچہ واقعی میں بہت جینئس ہے۔“ ٹیسٹ لینے کے بعد پرنسپل کے الفاظ تھے۔

رفیقہ کی آنکھیں خوشی سے جگمگانے لگیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے بچے کو انتہائی محفوظ ہاتھوں میں سونپ رہی ہے اور اس کی زندگی تبدیل ہو جائے گی۔

کہتے ہیں کہ اولاد کے لیے ماں کا وجدان کبھی بھی غلط یا باطل ثابت نہیں ہوتا۔ وقت کی اس گھڑی میں اس کے ذہن میں ابھرنے والا یہ خیال مستقبل میں درست ہی ثابت ہوا۔

☆☆☆

وقت دبے پاؤں بیتتا رہا۔

عدنان پرائمری سیکشن میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کسی بھی طالب علم کی زندگی میں یہ ایسا موڑ ہوتا ہے جب وہ اپنی ماں کے اثر و رعب سے قدرے آزاد ہونے لگتا ہے۔ اس کا زیادہ تر وقت دوستوں میں اور گھر سے باہر گزرتا ہے جہاں اس کی رکھوالی ماں کے بس میں ہرگز نہیں ہوتی۔ یہ ذمے داری گھر کا مرد سربراہ ہی نبھا سکتا ہے لیکن یہاں بھی تقدیر اس کی آزمائش کے لیے تیار تھی کیونکہ سراج تو صبح سے رات اپنی معاشی مجبوریوں میں ہی اُلجھا رہتا تھا۔

عدنان کی ذہانت اس کی سماجی زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اسکول کی نصابی سرگرمیوں کے علاوہ ماہانہ 'بزمِ ادب' میں بھی اسی کی کارکردگی بہترین ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ ٹیچرز اور انتظامیہ کی آنکھ کا تارا بن گیا اور ایسا بچہ ہمیشہ اپنے ہم جماعت بچوں کو کھٹکتا ہے۔ اس ساری صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عمر کے اس حصے میں ہی تنہا رہنے کا عادی ہو گیا جب انسان دوست بنانا سیکھتا ہے۔ گھر کا ماحول البتہ قدرے بہتر تھا۔ اکلوتا اور بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے اسے خاصا پروٹوکول ملتا۔ رفیقہ اس کے لیے دودھ بادام تیار کرتی تو سراج اپنی بساط کے مطابق اس کے لیے کوئی نہ کوئی موسمی پھل لے آیا کرتا۔

ارم کو لڑکیوں کے سرکاری اسکول میں داخل کروایا گیا تھا کیونکہ محلہ کی 'خصوصی زنانہ کمیٹی' کی مستند رائے کے مطابق ان اسکولز میں حالات بہت بہتر تھے اس لیے بچیوں کو وہاں بھیجنے میں کوئی خدشہ نہیں تھا۔ عدنان کے برعکس ارم کا مزاج اور مصروفیت بہت الگ تھی۔ وہ گھر آنے کے بعد رات گئے تک کتابوں میں مگن رہتی۔

ان کے محلے میں دیگر بچے ٹیوشن وغیرہ پڑھنے جایا کرتے تھے لیکن انہیں کبھی اس چیز کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ رفیقہ چاہے خود مڈل پاس تھی لیکن بھلے وقتوں اور محنتی اساتذہ نے مختلف مضامین کے 'بنیادی تصورات' اسے اس طرح گھول کر پلائے تھے کہ وہ ذہن کی تختی پر ہمیشہ کے لیے

منتقل ہو چکے تھے۔ اس لیے اپنے بچوں کو پڑھانا اور کسی بھی مضمون میں رہنمائی کرنا اس کے لیے زیادہ مشکل بہرحال نہ تھا۔

سراج کے اسکول کے حالات بہتری کی جانب مائل نہ تھے۔ پرویز کو دیگر برانچز سے خاصا مالی فائدہ حاصل ہو رہا تھا اس کے باوجود وہ معمولی منافع دینے والی اس برانچ کو بند کرنے کا حوصلہ پیدا نہ کرسکا۔ عدنان کی جماعت میں اب صرف دو لڑکیاں تھیں جو غیر محسوس طریقے سے باقی دو لڑکوں کے ساتھ اچھی خاصی 'فرینک' ہو چکی تھیں۔ ٹیچرز کی عدم توجہی میں چوری چھپے نظروں کا تبادلہ، معنی خیز اشارے اب خطوط کے لین دین تک منتقل ہو چکے تھے۔

عدنان اس صورتِ حال سے اوب چکا تھا۔ حلقۂ احباب محدود ہونے کے باوجود اسے بہرحال اتنی سمجھ تو تھی کہ اس ادارے میں اس کا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے اور یہ خدشات اس وقت حقیقت کا روپ دھار گئے جب اس سال مڈل بورڈ کے امتحانات میں اس کے نمبر صرف پچاس فیصد تھے۔

''یہ کیا ہے ہر دانی؟ اتنے کم نمبر؟ اسکول میں تو تیری پرسنٹیج پچانوے سے کبھی کم نہیں ہوئی تھی۔'' رفیقہ دنگ تھی۔

''آپ کے سامنے ہی ہے۔ کیا میں نے تیاری میں کوئی کسر چھوڑی تھی؟'' اس اسکول میں کوئی محنتی ٹیچر نہ تھا۔

''نیک بختے! ایک رستہ ابھی بھی ہے۔ دانی پتر کو نویں جماعت میں سرکاری اسکول میں داخل کروا دیتے ہیں۔ جم کے پڑھے گا ادھر۔ اور یہی فیس جو ہم اسکول میں بھرتے ہیں وہ شام کے وقت کسی ٹیوشن میں دے دیا کریں گے..... اللہ اللہ خیر صلا!'' سراج دور کی کوڑی لایا تو رفیقہ کی آنکھوں میں بھی چمک لوٹ آئی۔

''تو ٹھیک ہے پھر! اب یہ وہیں پڑھے گا۔'' سراج نے حتمی انداز میں کہا اور ایک بار پھر عدنان کے مستقبل کا فیصلہ بھیڑ چال کے تحت طے کرلیا گیا اور ایک بار پھر اس نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

☆☆☆

سرکاری اسکول عدنان کی سوچ اور تصورات سے بالاتر تھا۔

چند ایک بچوں میں بیٹھ کر گھریلو ماحول میں پڑھنے والا اساتذہ اور انتظامیہ کے لاڈ پیار میں رہنے والا لڑکا جب ستر سے زائد طلبہ کی کلاس میں جا کر بیٹھا تو یکدم اپنی شناخت ہی جیسے کھو بیٹھا۔ وہاں پڑھنے والے بچے اعتماد سے مالا مال تھے۔ ان میں سے اکثریت کم از کم تین سال قبل یہاں وارد ہوئی تھی اور اب وہ سبھی اس ماحول میں خاصے رچ بس چکے تھے۔

عدنان جیسے نو وارد اور نجی اداروں کے طلبہ ان کے لیے 'سامانِ تفریح' ہوتے تھے۔ وہ ان سے اپنے ذاتی کام کروانے کا ہنر بھی بخوبی جانتے تھے۔ ہر گزرتا دن عدنان کی بیزاری اور چڑچڑاہٹ میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کا اعتماد کھونے لگا۔ پڑھائی کے حوالے سے اسے یہاں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ یہاں پڑھانے والے اساتذہ سابقہ ادارے کی طرح کم عمر اور ناتجربہ کار تو ہرگز نہ تھے۔

لڑکوں کا برتاؤ البتہ ویسا ہی روکھا، تلخ اور حقارت آمیز تھا۔ ابتدا میں اس نے کئی بار ان سے دوستی کی کوشش کی لیکن مقابل اس کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر بڑے اطمینان سے چار چوٹ لگاتے اور دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے۔ وہ مایوس اور دلبرداشتہ ہونے لگا۔ اسے سمجھ ہی نہ آتی کہ وہ کس طرح لوگوں کے مقاصد اور ارادے سمجھا کرے؟ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا لیکن ابھی اس کی تقدیر میں کچھ موڑ آنے باقی تھے۔

اس روز وہ ریس کے وقت گراؤنڈ میں جانے کے بجائے کلاس ہی میں چھپ کر بیٹھا گھر سے لایا ہوا پراٹھا اور رات کے سالن پر مشتمل لنچ کرنے میں مصروف تھا کہ توقیر نامی ایک لڑکے کی آمد نے اسے چونکا دیا۔ اس نے بدک کر اپنا ٹفن باکس بیگ میں ٹھونس دیا۔

''کیا چھپا رہے ہو؟'' توقیر نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''کک..... کچھ نہیں..... میں تو بس یونہی۔'' وہ ہکلا گیا۔

''آج کل بریک ٹائم میں بہت چوریاں ہونے لگی ہیں..... کہیں تم اسی سلسلے میں تو یہاں نہیں بیٹھے؟''

''اُف! میری توبہ۔ میری امی کہتی ہیں کہ چوری کرنا سخت گناہ ہے..... میں تو یونہی یہاں بیٹھا تھا۔''

''گوبھی کا سالن بنا تھا کیا تمہارے گھر میں؟'' توقیر نے اچانک بات پلٹ دی۔

''ہاں! تمہیں کیسے علم؟'' عدنان بوکھلایا۔

توقیر نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹ کی داہنی جانب لگا سالن کا ننھا سا ذرہ اتار کر اسے تھما دیا۔

''بڑی تیز نظر ہے بھئی تمہاری!'' وہ کھسیا گیا۔

''ٹفن باکس لائے ہوناں گھر سے؟ اور اب یہاں بیٹھے چھپ کر کھا رہے ہوگے تاکہ دوسروں کو علم نہ ہوسکے۔''

''ہاں! وہ مذاق اُڑاتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں۔ یہاں میرے سوا کوئی اور گھر سے لنچ لاتا بھی تو نہیں۔''

''تو کیا ہوا؟ وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ تم انہیں خود یہ موقع فراہم کرتے ہو..... اب چلو یہاں سے اور باہر گراؤنڈ میں بیٹھ کر لنچ کرو۔ ورنہ ایسا نہ ہو کسی کی دو روپے کی پنسل بھی گم ہو تو نام تمہارا لگا دیا جائے۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر گھسیٹتا ہوا گراؤنڈ میں لے آیا۔

گراؤنڈ کے پاس ہی ایک کینٹین تھی جس کے قریب رکھی بینچ پر بیٹھ کر عدنان اپنے ٹفن سے باقی ماندہ لنچ کرنے لگا۔

''واہ بھئی واہ! اِدھر تو دعوتیں اُڑائی جارہی ہیں۔'' شاہد نامی ایک لڑکے نے ٹھٹا لگایا۔

''جیلس کیوں ہوتے ہو یار! آؤ تم بھی شریک ہو جاؤ۔'' عدنان نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اردگرد موجود سبھی لڑکوں کی نظریں خود پر مرکوز پا کر وہ خاصا نروس ہو رہا تھا۔ لیکن اپنی کمزوری ظاہر کرتا تو مزید ہرزہ رسوائی ہونے لگتی۔

''ہنا ساون کی گھٹا! یہ کینٹین کس لیے ہے؟ روزانہ گھر سے پچاس روپے لاتا ہوں اور مزے اُڑاتا ہوں۔''

''کیا ان پچاس روپوں کی خریدی گئی چیزوں میں ماں کے ہاتھ کا ذائقہ، محبت کی مہک بھی ہوتی ہے؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہے یہ! ماں کے بارے میں کوئی بات یا مذاق نہیں ہوگا۔'' فرحان نامی ایک لڑکے نے کڑے تیوروں سے شاہد کو گھور کر کہا۔

سب لڑکے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

''بس! دیکھ لیا..... اتنی سی بات تھی خوامخواہ ہوا بنایا ہوا تھا تم نے۔'' توقیر اس کے پاس چلا آیا۔

''شکریہ دوست!''

''شکریہ کیسا؟ کل تو نے میری مدد کی..... آج میں نے کر دی۔''

''میں نے..... کب..... کہاں؟'' وہ حیران تھا۔

''کل جب بائیو کا ٹیسٹ ہو رہا تھا..... میں تمہارے پیچھے ہی تو بیٹھا تھا..... بس کر لی ساری چیٹنگ۔'' توقیر نے آنکھیں مٹکائیں۔

''لیکن مجھے علم کیوں نہ ہوا؟''

''اب بھی میں نہ بتاتا تو کیسے ہوتا یہ علم؟ تم تو اب بھی ذہنی طور پر اپنے سابقہ اسکول اور اس اسکول کے موازنے میں اُلجھے رہتے ہو۔ سامنے کی بات نظر آئے بھی تو کیسے؟''

''او خدایا! تم کوئی جادوگر ہو کیا؟ یہ کیسے جان لیا تم نے۔'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اس دنیا کو دیکھنے کے لیے صرف یہی دو آنکھیں کافی نہیں ہوتیں بے وقوف! دماغ کی آنکھیں بھی کھولنی پڑتی ہیں۔ لہجوں کے اتار چڑھاؤ اور آنکھوں کے رنگ پہچاننا سیکھو! جس دن یہ سب کچھ سیکھ لیا تو کوئی تجھے دھوکا نہیں دے سکے گا۔''

''تم سکھاؤ گے مجھے یہ سب کچھ؟''

''تم پاس کرواؤ گے مجھے ہر ٹیسٹ اور پیپر میں؟'' توقیر نے بے ساختگی سے پوچھا۔

''ڈن! کروا دیا کروں گا۔'' عدنان نے فوری کہا۔

''ڈن ڈنا ڈن ڈن!'' وہ بھی گرمجوشی سے بولا۔

اس روز کے بعد توقیر اس کا 'گاڈ فادر' بن گیا۔ قیافہ شناسی، مردم شناسی، چھٹی حس پر بھروسا، تجزیہ نگاری کے سبھی رموز سے دھیرے دھیرے آشنا کرتے ہوئے بطور فیس اس کے پیپر سے نقل کر کے کامیابی حاصل کر لیتا۔ نتیجتاً عدنان اسکول میں ایڈجسٹ ہونے لگا۔ گزشتہ چند ماہ ڈراؤنے خواب کی طرح بھول جانے کے بعد وہ بھی ارم ہی کی طرح خود اعتماد اور نڈر ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

اکیڈمی میں اس کا وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔

مخلوط تعلیم کے باوجود طلبہ پر باہمی گفتگو کے معاملے میں خاصی سختی تھی۔ آرٹس اور سائنس مضامین کے سیکشن یوں تو الگ الگ تھے لیکن اردو، انگریزی، اسلامیات لازمی اور مطالعہ پاکستان جیسے مشترکہ مضامین میں انہیں اکٹھا ہی لیکچر دیا جاتا تھا۔ یہی وہ وقت ہوتا تھا جب تعداد میں اضافے کے باعث نظم و ضبط میں قدرے نرمی پیدا ہو جاتی اور طلبہ باہمی کشش کا شکار ہوتے ہوئے بات چیت یا مستقل رابطہ قائم کرنے کے لیے کوئی روزن تلاش کر ہی لیتے۔

عدنان کو تاحال ایسی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کلاس میں موجود لڑکیاں جب مرد اساتذہ یا کم عمر معلم سے لڑکے خوامخواہ 'فری' ہونے کی کوشش کرتے تو اسے کوفت ہونے لگتی تھی۔ انتظامیہ نے 'دانشمندی' کا مظاہرہ کرتے ہوئے سائنس مضامین کے لیے تو تجربہ کار اور سخت اساتذہ تعینات کر رکھے تھے لیکن کچھ مضامین کے معلم بہت کم عمر تھے۔

لڑکے اُن سے اپنے ہم جولیوں ہی کی طرح ہنسی مذاق کرتے تو لڑکیاں بھی ناز و انداز دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتیں۔ یہ کھیل انتظامیہ سے بھی پوشیدہ نہیں تھا لیکن وہ اپنے کاروباری نقطۂ نظر سے فوائد حاصل کرنے کے لیے مصلحت چشم پوشی سے کام لیتے تھے۔ خوش پوش اور خوش شکل اساتذہ طلبہ کے زیادہ 'فیورٹ' ہوتے تھے۔

بات اگر یہیں تک رہتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن یہ ناتجربہ کار، کم عمر اور زمانے کے سرد و گرم سے ناآشنا اساتذہ لیکچر دیتے وقت جذباتیت میں مبتلا ہو جاتے اور اپنا مقام و مرتبہ فراموش کیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتے جو طلبہ کے ذہن میں منفی رجحان پیدا کرنے لگتیں۔ اسی قسم کے ایک ٹیچر نادانستہ ان کی 'برین واشنگ' کرتے رہے۔

علیم نامی وہ ٹیچر دو روز سے چھٹی پر تھے۔ طلبہ و طالبات میں چونکہ یکساں طور پر مقبول تھے اس لیے غیر حاضری بہت زیادہ 'محسوس' کی گئی۔ انہوں نے آتے ہی ایک دھماکا کر دیا۔

''میں نے ریزائن کر دیا ہے اور اب صرف ایک ماہ ہی مزید پڑھاؤں گا آپ سب کو۔''

''لیکن کیوں سر! ہم سے کوئی غلطی ہو گئی کیا؟'' کلاس روم میں ملی جلی آوازیں ابھریں۔

''ارے نہیں! ناٹ ایٹ آل! اصل میں میرا اسٹڈی ویزا لگ گیا ہے اور میں آسٹریلیا روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں جاب اور اسٹڈیز ایک ساتھ جاری رکھوں گا۔'' علیم نے اترا کر کہا۔

''لیکن سر! اچانک یہ فیصلہ کیوں؟ آپ یہاں بھی رہ کر پڑھ سکتے ہیں۔'' سدرہ نے پوچھا۔

''یہاں کچھ نہیں رکھا...... ہر سال بے روزگاروں کی ایک نئی کھیپ تیار ہوتی ہے۔ اصل میں یہاں 'سسٹم' ہی خراب ہے۔ پہلے سب میڈیکل کی طرف بھاگتے تھے۔ کچھ سال گزرے تو انجینئرنگ کا بخار چڑھنے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں اتنے ڈاکٹر اور انجینئر ہو گئے کہ انہیں کھپانے کے لیے اتنی آسامیاں ہی نہ تھیں۔ پھر ایم بی اے کا ٹرینڈ چل نکلا تو سب ادھر دوڑنے لگے۔''

''کیا میڈیکل، انجینئرنگ اور بزنس ایڈمنسٹریشن کا کوئی اسکوپ نہیں یہاں؟'' عدنان بھی صدمہ میں مبتلا ہوا۔

''جب تک سسٹم ٹھیک نہیں ہوتا یہاں کسی بھی چیز کا اسکوپ پیدا نہیں ہو سکتا۔'' وہ دراصل خود کو ابھی سے آسٹریلوی شہری سمجھنے لگے تھے اس لیے بغیر سوچے سمجھے اور اپنے پیشے کے تقدس کا خیال کیے بغیر بولتے چلے جا رہے تھے۔

اگلے ایک ماہ میں وہ لیکچر کے دوران میں اسی قسم کے خیالات کا پرچار کرتے ہوئے اپنی خوش قسمتی اور اس 'سسٹم' سے 'چھٹکارا' پا لینے پر بہت خوشی کا اظہار کرتے رہے اور تیسویں دن اپنی تنخواہ وصول کرنے کے بعد ان طلبہ کے ذہنوں کو ایک نئی سمت اور منفی سوچ میں گھرا چھوڑ گئے۔ اس وقت ہر ایک کے دل و دماغ میں یہی خیال پختہ ہو چلا تھا کہ ''یہاں سسٹم کی خرابی سے ان کا مستقبل ایک یقینی خطرے سے دوچار ہے اور اس ملک میں ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں رکھا۔''

☆☆☆

اسی آنکھ مچولی میں بورڈ امتحانات کا وقت بھی آ گیا۔

عدنان کے پرچے شاندار ہوئے تھے۔ تین ماہ تک فارغ رہ کر رزلٹ کا انتظار کرنے کے بجائے اس نے 'اسپوکن انگلش' کا کورس کرنے کو ترجیح دی۔ جس روز وہ بیاسی فیصد نمبروں سے میٹرک پاس کرنے میں کامیاب ہوا، سراج اور رفیقہ کے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

عدنان نے حسبِ سابق اسکول ہی نہیں، اکیڈمی میں بھی ٹاپ کیا تھا۔ رزلٹ آنے کے اگلے ہی دن وہ ماں کو ساتھ لیے اکیڈمی چلا آیا اور چمکتی آنکھوں سے ایک جانب اشارہ کیا۔ سڑک پر ایک کھمبے کے ساتھ سفید رنگ کے بینر پر سب سے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

عدنان ملک ...رول نمبر 93168 A+

رفیقہ کی آنکھوں میں مسرت و فخر سے آنسو بھر آئے۔ گھر آ کر بھی اس کا جوش سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتی اور چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہنے لگتی۔

''شکر ہے میرے مولا! تیرا ہی کرم ہے ورنہ بندے کی کیا بساط بھلا؟''

ارم بھی بھائی کی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ اُس نے سنہری رنگ کے خوش نما کاغذ میں لپٹا ایک گفٹ اسے تھمایا تو عدنان جذباتی ہو گیا۔

''اوئے چڑیل! یہ کیا ہے؟''

''کھول کے خود ہی دیکھ لو۔'' وہ معنی خیزی سے بولی۔

عدنان نے بے تابی سے ریپر کھولا۔ ایک سنہری رنگ کا قلم اور سلور رنگ کی گھڑی دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔

''یہ تو بہت مہنگے ہیں ارم!''

''میرے بھائی اور اس کی کامیابی سے زیادہ نہیں۔''

''اتنے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس؟''

''پچھلی دفعہ جتنی عیدی اکٹھی ہوئی تھی، وہ میں نے جمع کر لی تھی۔ اس کے بعد روزانہ اسکول کے لیے ملنے والی پاکٹ منی سے بھی پیسے بچا لیتی تھی۔'' وہ اترائی۔

''واہ چڑیل! تُو تو بڑی سیانی ہو گئی ہے۔''

''سیانی تو میں شروع ہی سے تھی...... آپ کو بصارت بعد میں ملی۔'' اس کی بے ساختگی پر وہ مسکرانے لگا۔

بہن کے اعتماد اور سمجھداری کا تو وہ شروع ہی سے قائل تھا لیکن بڑے بھائیوں والے بھرم میں رہ کر اسے کبھی جتایا ہی نہ تھا۔ اپنی اس کامیابی کے نشے میں سرشار عدنان نے اب دوسرے خواب کی تکمیل کے لیے کوششوں کا آغاز کر دیا۔

میٹرک میں آتے ہی اس کی کلاس میں ایک مشہور گروپ آف کالجز میں داخلہ کا بہت چرچا رہتا تھا۔ ان کے اساتذہ کی ٹیم بہترین تھی۔ ہر سال بورڈ میں اس نجی کالج کے طلبہ کی پوزیشن لازمی آیا کرتی تھی اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہاں پڑھنے والے کسی بھی بچے کو پارٹ ٹائم کوچنگ لینے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اس کالج میں داخلہ ایک شاندار مستقبل کی یقین دہانی تھا۔ عدنان نے بھی شروع ہی سے 'پری میڈیکل' اسی ادارے سے کرنے کا ارادہ بنا رکھا تھا۔

کالج میں کلاسز کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کالج کی ایک تاریخی حیثیت تھی۔ انگریزوں کے وقت کی تعمیر شدہ یہ عمارت بہت شاندار تھی۔ اساتذہ کا معمول بھی قدرے بہتر تھا۔ پروفیسرز بہت سنجیدہ اور مخلص تھے۔ ان کا دیا گیا لیکچر آسانی سے ازبر ہو جایا کرتا لیکن عدنان کی بدقسمتی یہاں بھی ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔

طلبہ یونین ایک سیاسی تنظیم کے زیرِ اثر تھی اس لیے آئے دن وہاں دنگا فساد، سر پھٹول ایک معمول تھا۔ اسی لڑائی جھگڑے کا اثر کلاسز پر بھی ہوا کرتا تھا۔ ہڑتال اور ہنگاموں کی وجہ سے لیکچر باقاعدگی سے جاری رکھنا ممکن ہی نہ رہتا اور عدنان کو ایک 'کوچنگ سینٹر' کی ضرورت پھر سے پیش آنے لگی۔ رفیقہ نے بھی چند روز قبل اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔

''دانی پُتر! شام کے وقت اسی اکیڈمی چلا جایا کر۔ تیرے تو نمبر بھی بہت اچھے تھے۔ پرنسپل رعایت کر لے گا فیس میں۔''

''مجھے نہیں چاہیے ایسی رعایت!'' وہ بدک گیا۔

''تو پھر کیا مرضی ہے تیری؟ اس طرح تو پڑھائی پر بھی بہت اثر پڑے گا۔'' سراج نے محبت سے کہا۔

''یہ آپ لوگوں کا دردِ سر نہیں ہے...... میں جانوں اور میرا کام جانے! '' اس کا لہجہ اور انداز روز بروز گستاخ ہونے لگے تھے۔ ''اور ہاں، یہ ارم کو وہاں کیوں بھیجا آپ نے؟'' عدنان نے تیوریاں چڑھائیں۔

ارم اب نہم جماعت میں آ چکی تھی اور رفیقہ نے اُسے بھی عدنان ہی کی سابقہ اکیڈمی میں داخل کروا دیا تھا۔

''کیا مطلب کیوں بھیجا ہے۔ تو ڈی سی لگ گیا ہے کیا ہم پر جو ہر کام تیری مرضی اور مزاج کے مطابق کریں؟'' سراج کو بھی غصہ آ گیا۔

''نہیں لگا تو بہت جلد لگ جاؤں گا...... لیکن اگر ارم وہاں گئی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

''اس کا باپ ابھی زندہ ہے! تجھے زیادہ پھنے خان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''باپ نے چار جماعتیں پڑھ لی ہوتیں تو رونا ہی کس بات کا تھا؟ آپ دونوں کو تو ہر چمکتی چیز ہی سونا دکھائی دیتی ہے...... میں دو سال وہاں رہا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کس قسم کی لڑکیاں پڑھنے آتی ہیں۔ تنگ کپڑے، فیشن کی ماری ہوئیں جو اساتذہ کو بھی ادائیں دکھانے سے باز نہیں آتیں۔ اپنی بیٹی کو بھی اسی رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں کیا؟'' وہ بھڑک گیا۔

''لیکن دانی پُتر! پھر وہ جائے گی کہاں؟'' رفیقہ نے پوچھا۔

''کیوں؟ میں مر گیا ہوں کیا؟ میں پڑھا دیا کروں گا اُسے۔'' اس کی بات سن کر والدین کے چہرے سے تفکرات کی پرچھائیاں مدھم ہو گئیں۔

''جوانی کا جوش چڑھا ہے تھوڑا...... اس لیے 'اوکھا' ہو جاتا ہے ورنہ احساس تو ابھی بھی کرتا ہے ہم سب کا۔'' اس رات رفیقہ نے شوہر کو تسلی دی اور سراج نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

فرسٹ ایئر کا آغاز ہوئے تین ماہ سے زائد وقت بیت چکا تھا۔

کالج میں ماحول جوں کا توں برقرار تھا۔ تو قیر سے سیکھی گئی مردم شناسی اور چہرے پڑھنے کی عادت اس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ وہ لاشعوری طور پر کالج میں بھی اسی کام میں مشغول رہتا۔ اردگرد کا ماحول اب انجان نہ رہا تھا۔ اس کے

کلاس فیلوز شام کے وقت مہنگے اداروں میں پڑھ کر اپنی تعلیمی کمی پوری کرلیا کرتے۔ دھیرے دھیرے بہت سے حقائق اس پر آشکار ہو چکے تھے۔ اس نے کچھ دن وہاں 'پوشیدہ سرگرمیوں' کا جائزہ لیا اور پھر بالآخر ایک حتمی نتیجہ پر پہنچ گیا۔

اس ادارے میں دو قوتیں متوازی طور پر کام کرتی تھیں۔ پہلی تو طلبہ یونین تھی اور سیاسی تنظیم کے زیرِ اثر تھی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ شامل افراد کو مختلف سیاسی جلسوں، احتجاجی مظاہروں اور دھرنوں میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ مخالف پارٹی کا جلسہ خراب کر کے توڑ پھوڑ کرنی ہو یا کسی کے حق میں نعرہ بازی کرنی ہو، ہر عمل کا معقول معاوضہ ملتا تھا لیکن عدنان کو یہ راہ پسند نہ تھی۔ یہاں رسک زیادہ تھا اور منافع کا مارجن بہت کم۔ پھر یہ ایک اجتماعی سرگرمی تھی جس میں کہیں نہ کہیں پہچان لیے جانے کا خدشہ بھی بہرحال موجود رہتا تھا۔ اس تنظیم کے لڑکے اکثر پولیس کے نرغے میں بھی آجاتے تھے تاہم 'مک مکا' کر کے رہائی پالینا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

عدنان نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور سنی کے پاس جا پہنچا۔

سنی دبلا پتلا، قدرے لمبا اور بدفطرت لڑکا تھا۔ اس کے لمبوترے چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مکاری، موقع پرستی اور سفاکی کی واضح جھلک دکھائی دیا کرتی۔ عدنان نے کافی دنوں سے اس پر نظر رکھی ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کالج کی دوسری قوت کا 'نائب سربراہ' ہے۔

''ہاں بھئی...... کیا چاہیے؟'' اس نے سرتاپا عدنان کو گھورتے ہوئے کہا۔

''دوائی۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''رو کڑا لائے ہو؟''

''نہیں!''

''ابے چریا ہو گیا ہے کیا؟ مفت میں مال بٹورنا چاہتا ہے؟''

''نہیں! میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارا ایجنٹ بن کے۔''

''اتنا جگرا ہے کیا تیرے پاس؟ تجھے تو صرف کتابوں میں گمن اور پروفیسرز کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہے ہم نے۔''

''جگرا دیکھنا ہے تو آزمالو......''

''یہ ون وے روڈ ہے پیارے! ایک بند گلی......

یہاں جو ایک بار آگیا واپس نہیں جاسکتا...... سوچ لے پھر سے!''

''سفر کا آغاز کر کے واپسی بزدل کرتے ہیں...... اور عدنان ملک بزدل نہیں ہے۔''

''واہ بھئی دم تو ہے تجھ میں...... کتنے پیکٹ بیچ لیا کرو گے؟''

''جتنے تم کہو گے...... لیکن میں زیادہ لالچ نہیں کروں گا۔ ہاتھ پیر بچا کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ کالج کی حدود کے باہر اگر کام ملے تو اور بھی بہتر ہے۔ میں یہاں کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتا۔''

''کوئی مسئلہ ہی نہیں شہزادے! مجھے بھی جی دار لیکن ہوش مند بندوں کی ضرورت رہتی ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز سے کہا۔

اس کے بعد عدنان کے نئے سفر کا آغاز ہو گیا۔ پہلے ماہ اس نے چار پیکٹ فروخت کیے۔ سنی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر جانا اس کے لیے بالکل بھی مشکل نہ ہوتا۔ حاصل شدہ منافع سے اس نے سب سے پہلے پوش علاقے میں واقع ایک پیشہ ورانہ اور نامور ادارے میں داخلہ لیا اور جی جان سے پڑھائی شروع کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ وقت کم ہے اور مقابلہ ہر جانب انتہائی سخت۔ والدین کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ کالج کے ایک دوست کی فیملی کو 'ہوم ٹیوٹر' کی ضرورت تھی اس لیے وہ وہاں دو گھنٹے پڑھا کر اکیڈمی کی فیس پوری کر لیا کرے گا۔

''دائی! تو بہت تھک جایا کرے گا پتر۔'' رفیقہ نے اس کے چہرے کو تھامتے ہوئے کہا۔

''اگر ابھی یہ تھکاوٹ برداشت نہ کی تو زندگی کی اس دوڑ میں کچلا جاؤں گا۔ اس وقت مقابلے کا جو رجحان ہے آپ کو نہیں پتا۔''

''میں نمانی کیا جانوں؟ میری تو ساری زندگی تم لوگوں کو حق حلال کی کھلانے کی فکر میں گزر گئی۔'' ماں کی بات پر عدنان بے ساختہ چونکا۔ اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ اس کے دل میں چھپے چور تک پہنچ گئی ہے لیکن وہ اپنی ہی لے میں بولتی چلی گئی۔

''خیر سے اب تو بھی رزق کے پیچھے لگتا ہے۔ ان بچوں کو پڑھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑنا۔ وہاں جتنی بھی کمائی کرے، حق حلال کی کرنا۔ تیرے ہر کام میں برکت پیدا ہو گی۔''

''ہوسکتا ہے دو چار بچوں کی ٹیوشن اور مل جائے۔ پھر

میں ارم کا داخلہ کسی اچھے کالج میں کروادوں گا۔ ابھی وہ مجھ ہی سے پڑھا کرے گی۔'' عدنان نے اس کی ذہن سازی کا آغاز کیا۔

''جیوندا رہ پتر! رب تیری کمائی میں کمائی پیدا کرے۔'' وہ سادہ لوحی سے کہتی اٹھ گئی۔

عدنان کو ملال کی ہلکی سی لہر نے اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن جب سابقہ محرومیاں یاد آئیں تو سر جھٹک کر رہ گیا۔

''بقا کے لیے تو مردار بھی حلال ہو جایا کرتا ہے اور ڈرگز کی یہ ترسیل میری مجبوری ہے ورنہ میں ڈاکٹر تو کیا، کوئی گھسیارا بھی نہیں بن سکوں گا۔'' اس نے خود کو تاویل دے کر مطمئن کیا۔

☆☆☆

عدنان نہایت حکمت عملی سے اپنے پتے کھیلتا رہا۔

سنی اس کی کارکردگی اور اعتماد سے بہت خوش تھا۔ اسی کے مشورے پر اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیک بھی خرید لی اور شام کے وقت 'ضرورت مندوں' کو دوائی کی فراہمی کا آغاز کر دیا۔ اس کے کوچنگ سینٹر میں مالدار گھرانوں کے بچے پڑھتے تھے اس لیے ریٹ تین گنا تھے اور منافع کا مارجن بھی زیادہ تھا۔ اس کے بعد عدنان نے ایک بینک اکاؤنٹ کھلوایا اور اپنی بچت وہاں جمع کرنی شروع کر دی۔

اپنے کلاس فیلوز کی دیکھا دیکھی اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ وہ برانڈڈ کپڑے، جوتے، پرفیوم اور گھڑیاں استعمال کرے، مہنگے موبائل فون خریدا کرے لیکن وہ ایسی کوئی بھی بے احتیاطی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ والدین یا کسی بھی شخص کی نظروں میں مشکوک ہو جائے۔ اس نے درمیانی قیمت کا اچھی حالت میں ایک فون خرید لیا تھا اور اب نظریں صرف میڈیکل کالج میں داخلے کے اخراجات پر تھیں۔

والدین کی سادگی، کمتر معاشی حالت اور مخصوص طرزِ فکر سے وہ پہلے ہی مایوس ہو چکا تھا۔ اب جو کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا اور وہ اپنے معاملات بہت اچھی طرح سنبھالنے سیکھ چکا تھا۔

☆☆☆

انٹر پاس کرنے تک وہ اپنے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع کر چکا تھا کہ میٹرک پاس کرنے والی بہن کا داخلہ کسی اچھے کالج میں کروانے کے بعد میڈیکل کالج کے پہلے سال کے لیے اپنی فیس بھی ادا کر لیتا۔ تاہم اس بار قسمت نے آسانی پیدا کر دی۔ ارم اسکالرشپ پر اسی کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئی جہاں سے ناکامی کے بعد اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے کندھوں کا بار قدرے ہلکا ہو گیا۔ اب وہ مزید یکسوئی سے اپنے مستقبل پر توجہ دے سکتا تھا۔

کالج چھوڑنے سے قبل اس نے سنی سے ایک بار پھر ملاقات کی۔ وہ اسی کالج میں گریجویشن کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اب رستے الگ ہونے کا وقت آگیا تھا۔

''بہت ساتھ نبھایا ہے تو نے میرا! کبھی زندگی میں میری ضرورت پڑے تو بلا جھجک بتانا۔'' سنی نے کہا۔

''کیا یہ ساتھ مستقبل میں بھی برقرار نہیں رہ سکتا؟'' عدنان نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

''کیا کہنا چاہتا ہے تو؟ کھل کر بات کر۔''

''میں یہ ترسیل صرف اپنا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے ہی کرتا رہا ہوں اور ان دو سالوں میں صرف اپنی فیس وغیرہ کے علاوہ کسی اور معاملے میں فضول خرچی نہیں کی۔''

''تیری یہی احتیاط پسندی تو مجھے پسند ہے شہزادے! ورنہ میں نے آج تک سب تھرڈ کلاسیے ہی دیکھے ہیں۔ دو پیسے ہاتھ آتے ہیں تو چار کا خرچ پہلے ہی تیار رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی کی نظر میں آکر خاطر تواضع کے لیے اپنے 'سسرال' پہنچ

قیدی

ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک کو رات کے تین بجے انٹرکام پر کال موصول ہوئی۔ ''تمہارا بار کب کھلے گا؟'' دوسری طرف سے مخمور لہجے میں سوال آیا۔

''سر! دوپہر بارہ بجے کھلے گا!''

بات ختم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ وہی فون آیا۔ کلرک نے تحمل سے پرانا جواب دہرا دیا۔ جب تیسری بار وہی کال، اسی سوال کے ساتھ آئی تو کلرک نے کہا۔ ''سر! بار تو دوپہر میں کھلے گا۔ اگر آپ کو طلب شدید ہے تو حکم فرمائیں، میں روم سروس کے ذریعے تعمیل کرائے دیتا ہوں۔''

''روم سروس پر لعنت...... ہزار بار لعنت۔ میں بار میں بند ہو گیا ہوں...... پتا نہیں دوپہر کب ہو گی اور میں یہاں سے نکلوں گا۔ بار کو تالا لگانے سے پہلے یہ مردود سارے ٹوائلٹ کیوں نہیں چیک کرتے، میں وہاں پڑا رہا اور یہ نکل گئے۔''

گجرات سے مبشر مسیح کی لاچاری

جاتے ہیں۔"

"میں فی الحال یہ کام چھوڑ نہیں سکتا سنی! لیکن کسی نئے بندے کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے بھی دل نہیں مان رہا۔"

"تیرے کہنے کا مطلب ہے کہ تو دوائی کی ڈلیوری کرتا رہنا چاہتا ہے۔" اس نے آنکھیں سکیڑیں۔

"ہاں! مجھے میڈیکل کالج کے اخراجات بھی تو پورے کرنے ہیں۔ پیسوں کا کوئی درخت اگ سکتا تو اپنے آنگن میں وہی اُگا لیتا۔"

"ٹھیک ہے! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کچھ عرصے سے 'بڑوں' نے بھی ڈلیوری وسیع کرنے کا بول رکھا ہے۔ اچھا ہے! تیرے ساتھ پارٹنرشپ کر کے ان کا ٹارگٹ بھی پورا ہو جائے گا۔" سنی نے کہا۔

'معاش' کی فکر ختم ہوئی تو وہ انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں مگن ہو گیا۔ داخلہ فیس کی اب کوئی فکر ہی نہ تھی لیکن گھر والوں کی نظر میں پوزیشن کلیئر کرنی بھی ضروری تھی۔ سراج نے خود ہی ایک روز اس سے دریافت کر لیا۔

"میں نے تو سنا ہے لاکھوں روپے چاہیے ہوتے ہیں ڈاکٹر بننے کے لیے۔"

"صحیح سنا ہے۔"

"لیکن اتنے پیسے آئیں گے کیسے؟ میں تو تیرے پیدا ہوتے ہی ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ مجھے کیا علم تھا کہ اس میں اتنا پیسا لگتا ہے۔" رفیقہ افسردہ تھی۔

"ساری زندگی یہی تو المیہ رہا آپ دونوں کا...... اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑے بڑے خواب سجا لیے اور مجھے بھی اس رستے پر لگا دیا کہ جا بیٹا! ہمارے الٹے سیدھے تجربوں کی بلی چڑھتا جا۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہا ہے پتّر تو؟ کیا ماں باپ اولاد کا بُرا سوچتے ہیں کبھی؟" سراج ساکت رہ گیا۔

"مجھے کیا پتا۔ میرے ساتھ تو آج تک جتنا بُرا ہوا ہے اس کے ذمے دار آپ دونوں ہی ہیں۔ آپ لوگوں کو ہاتھی پالنے کا شوق تو تھا لیکن دروازے بڑے کرنے سیکھ ہی نہ سکے۔" اس کی تلخ گفتگو سن کر رفیقہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"کیا اب کوئی حل نہیں تیرے داخلے کا؟" سراج نے پوچھا۔

"کچھ پیسے میں نے جمع کر رکھے ہیں۔ باقی مالکوں سے ادھار پکڑ لوں گا۔"

"وہ اتنی بڑی رقم دے دیں گے کیا؟"

"احسان نہیں کریں گے مجھ پہ...... بدلے میں ان کے بچے بھی تو مفت میں پڑھاؤں گا۔ اور کل کو نوکری لگے گی تو قسطوں میں چکا دوں گا باقی رقم۔"

"اللہ بھلا کرے اس نیک آدمی کا۔ اس کی کمائی میں برکت دے اور حق حلال کمانے کی توفیق دے اُسے!" رفیقہ نے حسبِ معمول اپنی دعاؤں کی پٹاری کھول کر خزانے لٹانے شروع کر دیے لیکن عدنان کو ان کی دعاؤں اور خلوص سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ والدین کی جذباتیت اور محبت اسے ڈھکوسلا محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے تئیں 'عقلِ کل' تھا اور اپنے خواب پورے کرنے کے لیے ایک بہترین رستہ منتخب کر چکا تھا۔

سنی کے دیے گئے مال کی ڈلیوری اس کے بینک اکاؤنٹ میں موجود رقم میں اضافہ کرتی رہی۔ زندگی بظاہر بہت پُرسکون گزر رہی تھی لیکن میڈیکل کالج کا دوسرا سال اس کی زندگی میں ایسا موڑ لے آیا جس نے اس کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

☆☆☆

موسم سرما اپنے جوبن پر تھا۔

سراج کو ایک بڑی کوٹھی میں رنگ کرنے کا ٹھیکا ملا تھا۔ اس کے ہاتھ کی صفائی کسی بھی ماہر کاریگر سے کم نہ تھی اس لیے اکثر مکانوں کے ٹھیکیدار اپنا کمیشن رکھنے کے بعد رنگ سازی کا کام اس کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ سراج کے پاس پرانے وقتوں کی 'سہراب' سائیکل تھی جو اس کی اپنی جسمانی حالت کی طرح 'ایکسپائر' ہونے کے قریب تھی۔

شام کے وقت وہ اپنا کام مکمل کر کے لوٹ رہا تھا۔ اس روز سرِشام ہی خاصی دھند پڑنے لگی تھی۔ حدِ نگاہ صفر تھی۔ یونیورسٹی روڈ پر مڑنے کے بعد اسے خاصی طویل سڑک عبور کرنی تھی لیکن عقب سے آنے والی گاڑی کی ٹکر سے وہ فٹ پاتھ سے جا ٹکرایا۔ بائیں ٹانگ میں شدید تکلیف کا احساس اسے یقین دلا گیا کہ ایک آدھ ہڈی داغِ مفارقت دے چکی ہے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ گاڑی میں موجود فیملی خدا ترس تھی جو اسے وہیں چھوڑ کر بھاگنے کے بجائے اسپتال لے گئی۔

اس کی ٹانگ میں ہلکا سا فریکچر آیا تھا اور وہ اس پر بھی رب کا شکر ادا کرتے نہ تھک رہا تھا کہ کسی بھی جانی نقصان سے محفوظ رہا ہے۔ گاڑی کے مالک نے اس کے کہنے پر عدنان کے نمبر پر فون کر دیا۔ باقی معاملات اس نے خود ہی

آ کر دیکھ لیے تھے۔ سراج کو ڈیڑھ ماہ کا مکمل آرام بتایا گیا۔ وہ اب گھر میں ہی رہنے پر مجبور تھا۔ دیہاڑی کا نقصان تو ہونے لگا لیکن عدنان نے بہرحال انہیں کسی معاشی مسئلے کا شکار نہ ہونے دیا اور دو روز بعد دس ہزار روپے ماں کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"یہ کہاں سے آئے ہیں پتّر؟"

"ایک نئی ٹیوشن ملی ہے آج۔ فیس میں ہمیشہ ایڈوانس ہی لیا کرتا ہوں...... رکھ لیں یہ پیسے...... کچھ دن تک مزید ایک دو ٹیوشن بھی پکڑ لوں گا۔"

"تیری پڑھائی کا حرج تو نہیں ہوگا ناں؟"

"نہیں! میں سنبھال لوں گا...... اور آج نہیں تو کل یہ سب ذمے داریاں مجھے ہی تو اٹھانی ہیں۔ ساری زندگی تھوڑے ہی کام کرنا ہے آپ نے۔"

"ویسے میں بھی کچھ سوچ رہی تھی۔" ارم نے کہا۔

"اچھا! چڑیلیں سوچتی بھی ہیں...... مجھے تو لگتا تھا صرف خون ہی پیتی ہیں۔" اس نے دانستہ طور پر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"میں شام کے وقت فارغ ہی ہوتی ہوں۔ اگر کسی چھوٹے موٹے ادارے میں پارٹ ٹائم جاب کر لوں یا گھر میں ٹیوشن پڑھانا شروع کر دوں تو آپ لوگوں کی بھی مدد ہو جائے گی۔"

"اپنی بکواس بند کرو! آئندہ ایسا فضول خیال بھی دل میں مت لانا۔" عدنان کے پردۂ تصور پر اپنی اکیڈمی اور اسکول لائف کی وہ نوعمر خواتین اساتذہ آ گئیں جنہیں وہ کلاس میں کبھی بھی سنجیدہ نہیں لیتے تھے۔ ان کی ڈریسنگ، چال ڈھال اور فگر تک بہت اہتمام سے ڈسکس کرتے اور کلاس میں ان کا ناک میں دم کیے رکھتے۔ ارم کو ایسے کسی 'موضوعِ گفتگو' کے روپ میں دیکھنا اسے بھلا کس طرح گوارا ہو سکتا تھا؟

"گھر میں ٹیوشن پڑھانے میں کیا حرج ہے بھائی؟" وہ منمنائی۔

"یہ مزدور پیشہ لوگوں کا علاقہ ہے ارم! ان کی دال روٹی دیہاڑی پر چلتی ہے۔ تمہیں کتنی فیس دے لیں گے؟ دو سو...... چار سو۔ وہ بھی اس طرح ملے گی کہ ڈیڑھ پونے دو ماہ...... پڑھوانے کے بعد ایک ماہ جتنی ادائیگی کریں گے۔ اور باقی رہی کسی ادارے کی بات...... تو وہاں بھی ڈیڑھ دو ہزار سے زیادہ تنخواہ نہیں ملے گی تمہیں...... اس لیے خاموشی سے اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور اگر ہماری کچھ مدد کرنا ہی چاہتی ہو تو اپنی پرسنٹیج اتنی بہتر بنا لو کہ گریجویشن میں بھی اسی کالج میں اسکالرشپ پر پڑھ سکو۔"

"جی بھائی! ایسا ہی ہوگا۔ سوری اگر آپ کو میری بات بُری لگی تو۔" وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

سراج کے حادثے کو پندرہ دن سے زائد ہو گئے۔

وہ سارا دن مصروف رہنے والا شخص تھا۔ اس طرح یکدم فراغت اسے بہت بیزار کرنے لگی۔ کچھ دن سے اسے اپنے وجود میں بے عنوان اضطراب کروٹیں لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر کھویا کھویا سا رہتا لیکن بہت سوچنے کے بعد بھی اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

"کیا بات ہے بھلیا لوکا؟ کئی دن سے دیکھ رہی ہوں کافی پریشان لگتے ہو۔" رفیقہ نے دریافت کیا۔

"نہیں نیک بختے! پریشان تو نہیں ہوں...... بس طبیعت بوجھل سی رہنے لگی ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی بے برکتی سی ہو رہی ہے۔ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ لیکن پتا نہیں کیا ہے؟" اس نے بوجھل سانس خارج کی۔

"خواہ مخواہ وہم نہ کیا کرو۔"

"یہ سبزی تو نے کس سے لی ہے آج؟" سراج کے اگلے سوال نے اسے حیران کر دیا۔

"پھیری والے سے...... روز اسی سے تو لیتی ہوں۔"

"اگر کھانا پکانے کا دل نہیں کر رہا تھا تو ارم سے کہہ دیتیں...... یہ کیا عجیب سا سالن بنا کر رکھ دیا ہے؟"

"کیوں؟ کیا خرابی ہے اس میں؟ پہلے باہر جو کھا لیا کرتے تھے اس لیے اب بیوی کے پکائے سالن میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں۔" رفیقہ کو شوہر کی بات بہت بُری لگی اور وہ عورتوں کی مخصوص نفسیات کے مطابق چڑ سی گئی۔

"او نہیں جھلیے! یہ نہیں کہہ رہا میں...... لیکن کچھ دن سے سالن میں واقعی ذائقہ نہیں رہا۔" وہ الجھ کر بولا لیکن اس کی الجھن، سوچ اور پریشانی یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ فرق کھانے کے ذائقے میں نہیں بلکہ 'حرام اور حلال' کا تھا۔

وائٹ پاؤڈر کی فروخت سے کمائی جانے والی رقم میں وہ لذت کہاں ہو سکتی تھی جو سارا دن خون پسینہ ایک کر کے کمائی گئی دیہاڑی میں ہوا کرتی تھی۔

"بہت ناشکرے ہیں یہ!" اپنے کمرے میں بیٹھے عدنان نے ان کی باہمی گفتگو سن کر خود کلامی کی۔

☆☆☆

سراج کی طبیعت اب مزید گری گری رہنے لگی تھی۔

اس کی ٹانگ کا پلستر کھل چکا تھا تاہم ڈاکٹر نے اب بھی زیادہ وزن ڈالنے سے منع کیا تھا۔ وہ ایک چھڑی کے سہارے چل پھر لیا کرتا اور شدت سے اس دن کا منتظر تھا جب اپنا کام کاج دوبارہ شروع کر کے اس کوفت اور مضطرب زندگی سے چھٹکارا پالے لیکن دوسری طرف زندگی نے اس کے لیے ایک اور 'سرپرائز' سوچ رکھا تھا۔

انہی دنوں رفیقہ کی بھانجی کی شادی تھی۔ انہیں برات میں شرکت کے لیے صرف دو افراد کی شمولیت کا کارڈ ملا تھا۔ وہ عدنان کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی لیکن سراج نے خود جانے کی تجویز پیش کردی۔ بہن کا گھر شہر کے دوسرے کونے میں تھا۔

عدنان نے انہیں دو طرفہ ٹیکسی کروا دی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کا ایک واقف کار تھا۔

''ڈرائیور آپ کے ساتھ ہی رہے گا..... کوئی نیا تجربہ کر کے بیاچن نہ چڑھالینا دولوں۔''

''جیند ارہ پُتّر! تیری یہ کڑوی باتیں بھی جانے کیوں بُری نہیں لگتیں..... بہن کا دھیان رکھنا۔'' سراج نے اس کا کندھا تھپکا۔

''اوہو! بچہ نہیں ہوں میں جو یوں سمجھا رہے ہیں..... جایئے اب! باہر انتظار کر رہا ہے مشتاق!'' اس نے بے نیازی سے کہا اور سنی سے لیے گئے پیکٹ کی ڈلیوری کے لیے روانہ ہوگیا۔

دو گھنٹے بعد ملنے والی ایک کال نے اس کے سر پر جیسے پہاڑ توڑ دیا۔ مشتاق کی ٹیکسی ایک ٹریلر کی زد میں آگئی تھی۔ سراج اور رفیقہ موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ بیزاری، کوفت اور نحوست سے چھٹکارا دلوا کر زندگی نے انہیں ایک شاندار سرپرائز ہی تو دیا تھا۔

☆☆☆

والدین جب پاس ہوں تو ان کے طرز فکر اور سادگی سے ہزاروں اختلافات ہوا کرتے ہیں لیکن جب نظروں سے دائمی طور پر اوجھل ہو جائیں تو ان کی قدر و منزلت یاد آتی ہے کہ ان کے اختلافات اپنی جگہ لیکن کم از کم ان کی دید اور موجودگی تقویت تو دیتی تھی۔ عدنان بھی انہی کیفیات میں جلا تھا۔ ارم کو سنبھالنا بھی ہرگز آسان نہ تھا جو بلکتے ہوئے ایک ہی بات دہراتی۔

''کیوں جانے دیا انہیں اکیلے..... کیوں بھیجا اتنی دور؟ روک لیتے انہیں..... کیوں نہ روکا؟''

عدنان کے دل میں بھی ملال ڈیرے ڈال بیٹھا تھا۔ زندگی میں یکدم بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اپنا وجود ادھورا محسوس ہوتا۔ گھر کے ہر کونے سے والدین کی یادوں کی بازگشت سنائی دیتی۔ آنسو خود بخود چہرہ بھگونے لگتے اور دل کی اداسی کسی پل چین نہ لینے دیتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ قدرت کے خودکار نظام کے تحت ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ تو آیا تھا لیکن والدین کی کمی اب بھی برقرار تھی اور شاید تاحیات اسی طرح قائم رہتی تھی۔ ارم کا داخلہ اسکالرشپ ہی کی بنیاد پر اسی ادارے میں ہو گیا۔ وہ کمپیوٹر سائنس پڑھنا چاہتی تھی۔ پڑھائی کے ساتھ اس نے گھریلو ذمے داریاں بھی سنبھال لی تھیں۔ کھانا ایک دن بنایا جاتا اور اگلے دو دن وہی چلتا۔ اپنے اور عدنان کے کپڑے وہ ہفتہ وار دھویا کرتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک جامد چپ نے بسیرا کرلیا تھا۔

دوسری جانب عدنان کی ڈاکٹر بننے کی خواہش اب جنون میں ڈھل گئی تھی۔ اس جنون کے لیے اُس نے اپنا تن من مصروفیات کے بھاڑ میں جھونک دیا۔ میڈیکل کیریئر کے علاوہ ارم کی شادی کا خیال بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا تھا۔ اس نے مال کی ڈلیوری میں تیزی کردی اور اگلے ڈیڑھ سال میں بینک بیلنس بھی خاصا بڑھا لیا۔ خواہشات کے تعاقب میں اندھا دھند بھاگتے وہ ذہنی طور پر مطمئن تھا کہ اب زندگی میں کوئی غیر متوقع موڑ نہیں آئے گا اور اس کی لگن و محنت ان دونوں بہن بھائیوں کی ناؤ پار لگا دے گی لیکن اس بار بھی وہ نہ ہوسکا جو برسوں سے سوچ رکھا تھا اور جو ہوا وہ تو کبھی سوچ نے بھی نہ سوچا ہوگا۔

☆☆☆

عدنان اب میڈیکل کے فورتھ ایئر کا طالبعلم تھا۔

دو سال بعد بالآخر طویل جدوجہد کے بعد وہ ڈاکٹر بننے میں کامیاب ہو جاتا لیکن پھر اس کے بعد... اس کے بعد کیا ہوتا؟

یہی سوال ان دنوں کلاس میں 'ہاٹ ایشو' بنا ہوا تھا۔

''صرف ڈگری کافی نہیں ہے..... ڈگری تو یہاں کوڑیوں کے مول خریدی جاتی ہے۔ یہاں سے ڈگری ملنے کے بعد کسی سرکاری اسپتال میں چند ہزار کی نوکری مل جائے گی جہاں سینیئرز گدھوں کی طرح ہم سے کام کروائیں گے اور بدلے میں اسٹاف کے سامنے ذلیل کیا کریں گے۔''

جاسم نامی وہ لڑکا بھی پچانوے فیصد نوجوانوں کی طرح مایوسی اور منفی سوچ کا شکار تھا۔ اسے بھی 'سسٹم' سے بہت سی شکایات تھیں۔

''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟'' عدنان نے اس سے پوچھا۔

''سوچنا کیا ہے؟ یہاں کون رہے گا بھلا؟ اسپیشلائزیشن کے لیے کسی یورپی ملک کی طرف نکل جاؤں گا اور پھر انٹرن شپ کے بعد وہیں جاب کرلوں گا۔''

عدنان کے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا، وہ ساری زندگی ایک ہی خواب جیتا آیا تھا اور اب اسے علم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر تو مزید آزمائشیں لے کر آئے گی۔ مایوسی، بیزاری اور منفی رجحان نے جب اس پر غلبہ پایا تو ایک بار پھر سنی سے رجوع کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

سنی نے بھی گزرے وقت کے ساتھ خوب ترقی کی تھی اور اب یونیورسٹی میں ماسٹرز سال اول کا طالبعلم تھا۔ یہاں آنے کے بعد اس نے مزید پر پُرزے نکالے تھے، اس کا کاروبار بھی تیزی سے چمکا تھا۔

''ابے ڈھکن! منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''منہ ہی ایسا ہے میرا۔'' عدنان نے خود ترسی سے کہا۔

''ابے نہ کر..... نہ کر..... اچھی خاصی چکنی صورت دے رکھی ہے اوپر والے نے لیکن ایک تو ہے..... ہر وقت اس پر بیزاری اور غصیلے تاثرات کا میک اَپ کیے رکھتا ہے۔ اللہ قسم! ایسی شکل اور وجاہت میرے پاس ہوتی ناں تو یونیورسٹی کی ہر تتلی میرے پیچھے ہوتی۔''

''بقراط کے بہنوئی! کیوں بھول رہا ہے کہ آج کل ان تتلیوں کو صرف اچھی صورت نہیں بلکہ مال و دولت سے بھری جیب بھی چاہیے ہوتی ہے..... وہ میرے پاس کہاں؟''

''لاکھوں کمائے ہیں تو نے! لیکن مجال ہے کبھی ڈھنگ کا کام کیا ہو اس سے..... کپڑے ایسے پہنتا ہے کہ لنڈا بھی شرما جائے اور ایسا موبائل فون تو میٹرک یا مڈل کلاس کے بچے بھی استعمال نہیں کرتے جس کا 'کی پیڈ' تک اپنی اصل رنگت کھو چکا ہے۔''

''میں نے جو کمایا ہے، اس سے سرمایہ کاری کی ہے۔ ان لاکھوں سے کروڑوں کماؤں گا اور تیرے جیسے اپنے چپراسی بھرتی کروں گا۔'' عدنان نے بھی اسی کے انداز میں جوابی وار کیا۔

''اچھا اب حساب برابر ہوا..... سیدھی طرح بتا کر کیا لینے آیا ہے میرے پاس؟''

''مجھے مزید کام درکار ہے۔''

''دیکھو عدنان! تجھے میں سالوں سے جانتا ہوں۔ بے شک تو میرا سب سے کامیاب اور خوش قسمت ورکر رہا ہے۔ تیرے بعد آنے والے لونڈے کسی نہ کسی غلطی یا بدقسمتی کی وجہ سے پکڑے جاتے رہے ہیں لیکن تیرا ریکارڈ آج بھی بے داغ ہے۔'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''حکمتِ عملی، اعتماد اور ٹائمنگ..... یہ تین ایسے ہتھیار ہیں جو کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ میں بھی اسی وجہ سے کامیاب ہوں۔ تیرے لونڈے اس لیے مار کھاتے ہیں کہ کسی نہ کسی لونڈیا کے چکر میں پڑ کر یا کسی اور کے سامنے اپنا راز اُگل کر اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مارتے ہیں جبکہ میرے مقاصد کچھ اور ہیں اور نیت بالکل صاف ہے۔ اللہ بخشے میری والدہ کہتی تھیں کہ نیتاں صاف، بیڑا پار..... اس لیے میں کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھوں گا۔'' اس نے نہایت تکبر سے رفیقہ کی ایک عمومی بات کو اپنی مجرمانہ سوچ و عمل کے دفاع کے لیے استعمال کیا۔

''بہت کچھ لائف میں فرسٹ ٹائم بھی ہو جاتا ہے میرے ماموں! تو پرانا بجن ہے اس لیے بتا رہا ہوں کہ میڈیا میں آنے والی چند خبروں نے ایجنسیوں کو بہت چوکس کردیا ہے۔ میڈیا میں تو اپنے چیلے چانٹے بیٹھے ہیں اس لیے ان کا منہ بند کروانا اتنا مشکل نہیں ہوتا لیکن ان..... ایجنسیوں کی نظر میں جو آجائے، قبر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔'' سنی نے ایک انتہائی نازیبا لفظ استعمال کیا۔

''تو پھر اب اس ڈر سے میں اپنی برسوں کی محنت پر پانی پھیر لوں کیا؟ مجھے پیسوں کی جس قدر ضرورت اس وقت ہے، پہلے کبھی بھی نہ تھی اور اس کے لیے میں ہر رسک لینے کے لیے تیار ہوں۔ سسک سسک کر زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ رسک لے کر کوئی بڑا ہاتھ مار لیا جائے۔'' وہ جھنجلایا۔

''ٹھیک ہے! میں تنظیم کے بڑوں سے کسی بڑی کنسائنمنٹ کی بات کر لیتا ہوں..... آگے تیری قسمت۔''

''میں منتظر رہوں گا۔'' عدنان نے جوش سے کہا اور رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

سنی سے معاملات طے پا جانے کے بعد اُس نے اپنے دوسرے اہم مقصد کی طرف توجہ مبذول کرلی۔

وہ ارم کی شادی کر دینا چاہتا تھا۔ ارم بھی یونیورسٹی میں ماسٹرز ہی کی طالبہ تھی۔ اس کی پڑھائی مکمل ہونے تک کوئی اچھا رشتہ تلاش کر کے وہ مکمل آزادی سے اپنے مستقبل

کے لیے بیرونِ ملک اُڑان بھرنا چاہتا تھا۔ والدین کی وفات کے بعد کئی رشتے داروں نے ارم اور اس کے لیے رشتوں کی پیشکش کی تھی لیکن وہ ان کی غربت اور طرزِ فکر کی بنا پر کسی بھی صورت موجودہ رشتے داری برقرار نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی رکھائی اور ذلت آمیز رویہ دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہٹتے چلے گئے۔

محلے میں ایک دو رشتے کروانے والی خواتین موجود تھیں۔ عدنان نے انہیں اپنا مدعا بیان کیا۔ ایک خاتون تیسرے ہی روز ایک رشتہ لیے چلی آئی۔ توقیر کے والدین کو اس کے ہمراہ دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔

''ہماری آمد اگر نامناسب لگی ہو تو معذرت چاہوں گا بیٹا! ہمیں خود بھی علم نہ تھا کہ حبیبہ خاتون ہمیں یہاں لے آئیں گی۔'' توقیر کے والد نے نہایت سبھاؤ سے بات کا آغاز کیا۔

''انکل! کیوں شرمندہ کر رہے ہیں؟ میں تو خود پشیمانی محسوس کرنے لگا ہوں۔ دو سال قبل توقیر سے اس کی دبئی روانگی کے وقت ملاقات ہوئی تھی پھر زندگی کے دھندوں میں اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ اپنے جگری دوست کا احوال ہی پوچھ لوں۔'' وہ حقیقتاً شرمندہ تھا۔

''تم پر یک دم ذمے داریاں بھی تو بہت آن پڑی تھیں..... توقیر بچپن ہی سے تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو اس دوستی کو رشتے داری میں بدل دو۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

''جی ہاں جی! میں آپ کو ایک دو دن میں بتا دوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔ اسے یقین ہی نہ آرہا تھا کہ قسمت اس قدر مہربان ہو گئی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ارم کے لیے بہترین رشتہ مل گیا۔

وہ بہت ہلکا پھلکا ہو گیا تھا لیکن ارم کے ردِعمل نے اس پر بجلی گرا دی۔

''کس نے حق دیا ہے تمہیں میری مرضی کے بغیر کوئی رشتہ طے کرنے کا؟'' وہ اپنے حواس میں نہیں لگ رہی تھی۔

''بڑا بھائی ہوں میں تمہارا۔ یہی حق ہے میرا۔ اگلے ماہ نکاح کر دوں گا تمہارا۔ اس کے بعد توقیر کاغذات بنوا کر تمہیں بھی دبئی بلوا لے گا اور میں اسپیشلائزیشن کے لیے بیرونِ ملک چلا جاؤں گا۔'' اس نے حتی الامکان اپنا لہجہ نرم رکھا۔

''آج تمہیں بھائی بننا یاد آ گیا؟ ماں باپ کے جانے کے بعد بھی دو گھڑی میرے پاس بیٹھنے یا سر پر ہاتھ رکھنے کی فرصت ملی..... کبھی مجھ سے کوئی ضرورت دریافت کی؟ مفت کی نوکرانی بنا کے رکھ چھوڑا گھر میں۔ آج یکا یک بہن کی شادی یاد آئی بھی تو کس موقع پر جب خود بیرونِ ملک روانگی کا پروگرام بن چکا ہے۔'' وہ چلائی۔

''میں یہ سب تمہارے بھلے ہی کے لیے کر رہا ہوں۔'' عدنان کو سمجھ ہی نہ آرہی تھی کہ وہ کن الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرے۔

''تم نے کبھی والدین کی عزت نہ کی تو میرا بھلا خاک کرو گے۔ تمہارا وہ دوست بھی تمہی جیسا ہوگا..... بے حس..... خود غرض اور کم ظرف۔''

''مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور مت کرو ارم! شادی تو تمہیں کرنی ہی ہوگی۔'' اسے غصہ آنے لگا۔

''میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی..... اگر زبردستی کرو گے تو عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی..... یاد رکھنا!'' وہ تنتناتی ہوئی چلی گئی۔

عدنان اس ردِعمل پر ہکا بکا تھا۔ آج ایک مدت بعد ان میں اتنی طویل گفتگو ہوئی تھی اور وہ بھی تلخی پر منتج ہوئی۔ والدین کی وفات کے بعد وہ ایک دوسرے سے ذہنی طور پر بہت دور ہو گئے تھے۔ تنہائی اور بقا کی کوشش نے دونوں کو قریب لانے کے بجائے کب اپنے مدار کا قیدی بنا دیا، اسے علم ہی نہ ہو پایا۔ اپنی عیدی اور پاکٹ منی جوڑ کر اس کے لیے گفٹ لانے والی بہن اس قدر بدظن ہو چکی تھی کہ آنکھوں میں دید لحاظ تھا نہ ہی لہجے میں اپنائیت۔

وہ رات عدنان پر بہت بھاری تھی۔ اس نے بھی دنیا دیکھ رکھی تھی۔ جانتا تھا کہ کوئی بھی لڑکی بلاوجہ کسی رشتے سے انکار نہیں کرتی۔ شادی اور اپنے گھر کی خواہش تو ہوش سنبھالتے ہی اس کی زندگی کا جزو لازم بن جاتی ہے۔ ایسا ردِعمل تو اس وقت سامنے آتا ہے جب دل و دماغ میں پہلے سے موجود کسی تصوراتی خاکے پر ضرب لگے۔

وہ یکدم بستر سے اٹھ بیٹھا۔

''کیا ارم کی زندگی میں بھی کوئی پہلے سے موجود ہے؟ کون ہو سکتا ہے وہ جس کی شہ پر وہ اس طرح اچھل کود کر رہی ہے۔'' آج پہلی بار وہ نہایت سنجیدگی سے اس کا تجزیہ کر رہا تھا۔ کئی سالوں سے دنیا والوں کے چہرے پڑھتے وہ اپنے گھر میں موجود فردِ واحد کو کیسے نظر انداز کر گیا کہ اس کی ناک تلے اتنا بڑا کھیل کھیلا جاتا رہا اور وہ لاعلم رہا۔

''کچھ عرصے سے اس کی آنکھوں اور چہرے پر پیلاہٹ بھی جھلکنے لگی ہے..... کمال ہے! مجھے پہلے کیوں نظر

نہ آیا یہ سب؟'' وہ بڑبڑایا۔

رات بھر کروٹیں بدلنے اور اپنا محاسبہ کرنے کے بعد بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق وہ سنی سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

''مجھے آج شام تجھ سے ملنا ہی تھا۔ میسج کیا تو تھا تیرے نمبر پر۔'' سنی اسے یونیورسٹی میں دیکھ کر کوفت سے بولا۔

''ادھر پہنچ کر دیکھا میسج تیرا۔ اب آ گیا ہوں اس لیے یہیں بات کیے لیتے ہیں۔ کیا فیصلہ ہوا ہے پھر میرے بارے میں؟''

''کیوں اتنا اتاولا ہو رہا ہے دانی؟ میں اگر تجھے یہاں آنے سے منع کرتا ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے۔''

''میرے ساتھ زیادہ رنگ بازی نہ کر سنی! میں کہہ چکا ہوں تجھے کہ اس وقت پیسوں کی جتنی ضرورت ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔''

''تو میں کب مکر رہا ہوں؟ تیری موٹی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آرہی کہ ایجنسیوں والے یہاں جال پھیلا رہے ہیں۔ ہمارا ریکٹ بھی ان کی نظر میں ہے اور جس دن کوئی بکرا ان کے ہاتھ لگ گیا، سب لپیٹ میں آجائیں گے۔''

''عدنان ملک کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلتا..... میں اپنے اصل حلیے میں کبھی ڈلیوری دینے نہیں جاتا۔ مصنوعی داڑھی، مختلف چشموں اور موسم کی مناسبت سے ٹوپیوں کا استعمال کرتا رہا ہوں۔ اپنے کسی بھی کسٹمر سے پوچھ لینا..... ایک دفعہ اپنایا گیا حلیہ چھ۔ آٹھ ماہ تک دوبارہ اختیار نہیں کرتا..... ایجنسی والے تو کیا ان کے باپ بھی میری گرد نہیں پا سکتے۔''

''ٹھیک ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا! کسی بھی نقصان کی صورت میں یہ تیری کھال کھینچ کر بھس بھروائی کریں گے۔'' سنی نے دھمکایا۔

''مجھے منظور ہے۔ مال کب دینا ہے؟''

''آج دوپہر کو۔ بیگ کینال روڈ پر عامر سے لے لینا۔''

''تم پہنچانا کہاں ہے؟''

''کچی بستی میں۔''

الوداعی کلمات کے بعد عدنان وہاں سے رخصت ہوا اور ارم سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ ایگزامز کے بعد آج کل چھٹیاں تھیں اور وہ گھر میں ہی ہوتی تھی۔ ارم کا ردِعمل اس بار بھی شدید تھا۔

''میں کہہ چکی ہوں ناں کہ مجھے یہاں شادی نہیں کرنی۔''

''تو پھر کہاں کرنی ہے؟ وہاں کروا دیتا ہوں۔'' اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''کک..... کہیں نہیں..... مجھے اپنی پڑھائی مکمل کرنی ہے بس!''

''دیکھو ارم! میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ مجھے بھی علم ہے کہ جب لڑکی منہ بھر کر شادی سے انکار کرنے لگے اور اپنے خونی رشتوں کے سامنے تن جائے تو اس کا سیدھا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور موجود ہے۔''

''خوامخواہ اندازے نہ لگاؤ۔'' وہ تنفر سے بولی۔

''میں نہیں جانتا کہ تم مجھ سے کیوں اتنی متنفر ہو چکی ہو؟ کس لمحہ ہم دونوں میں اتنی دوریاں پیدا ہونے کا آغاز ہوا۔ لیکن اگر تم نے تنہائی جھیلی ہے تو یہ عذاب میں نے بھی اسی طرح برداشت کیا ہے۔ تم گھر کی چار دیواری میں تھیں تو مجھے بھی بیرونی دنیا میں ہزاروں مسائل کا سامنا تھا۔ والدین سے محرومی کا دکھ مجھے بھی کم نہ تھا۔ غلطی بھی شاید ہم دونوں ہی کی تھی کہ ایک دوسرے کی پہل کا انتظار کرتے رہے۔'' اس نے ایک توقف کیا اور ارم کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ عدنان کی باتیں اُس کے دل کو لگ رہی تھیں۔

''اگر تم مجھے اپنی پسند بتا دو تو یقین کرو میں تمہاری شادی بخوشی اس سے کروا دوں گا۔ لیکن اگر واقعی تمہاری زندگی میں کوئی اور نہیں ہے تو توقیر کے رشتے میں کوئی برائی نہیں۔ میرے لیے نہ سہی، مرحوم والدین کی خوشی کا خیال کر کے اسے قبول کر لینا۔'' اس نے اپنا آخری داؤ کھیلا۔

''ٹھیک ہے! میں کل بتا دوں گی۔'' وہ نظریں چرا کر بولی۔

عدنان اس جانب سے مطمئن ہونے کے بعد عامر نامی لڑکے سے کنسائنمنٹ لینے کے لیے کینال روڈ جا پہنچا۔ نقلی داڑھی اور مونچھوں نے اس کا ایک تہائی چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ رہی سہی کسر ہیلمٹ نے پوری کر دی۔ کینال روڈ سے نکل کر وہ ذیلی سڑک پر آ گیا۔ آمد و رفت کے لیے وہ کبھی بھی مرکزی شاہراہ استعمال نہیں کرتا تھا۔ گلیوں اور ذیلی سڑکوں کا انتخاب ہمیشہ محفوظ رہتا۔

اس وقت بھی وہ ایک ایسی سڑک پر آچکا تھا جہاں ایک جانب نالا بہتا تھا۔ یہ گندہ نالا تھا جس میں علاقے بھر کی گندگی اور غلاظت بہا کرتی۔ شہری انتظامیہ نے عوامی سہولت اور سابقہ سڑک کی توسیع کے لیے اس پر ایک نئی سڑک تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ آس پاس کے علاقے میں مشینری نصب ہونے کے بعد کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ سابقہ سڑک خاصی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ عدنان نہایت احتیاط سے بائیک چلا رہا تھا۔ اس کے بیگ میں لاکھوں روپے کی 'دوائی' تھی۔ یہ بیگ اس نے بائیک کے ساتھ لٹکا دیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ڈیلیوری تھی۔ غلطی کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ ہر حوالے سے محتاط تھا لیکن تقدیر کو وار کرنے کے لیے کسی احتیاط اور حفاظتی تدابیر سے بچاؤ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسے تو نہایت سکون سے ایک کاری وار کرنا تھا اور وہ اس نے کر دیا تھا۔

☆☆☆

سڑک شدید ابتری کا شکار تھی۔ بائیک کو بہت جھٹکے لگ رہے تھے۔ عدنان حتی الامکان احتیاط سے چلا رہا تھا۔ یکدم اس پر انکشاف ہوا کہ بریکس فیل ہو چکی ہیں۔ اس بائیک کی حالت خریداری کے وقت ہی بہت خستہ تھی۔ آئل بدلی اور ٹیوننگ باقاعدگی سے ہوا کرتی لیکن اس بار اپنی ذہنی اُلجھنوں کے باعث وہ اسے چیک نہیں کروا سکا تھا اور اب نتیجہ اس کے سامنے تھا۔

بریکس سے اُلجھتے اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ نالے کے بالکل پاس آچکا تھا۔ متبادل رستہ ہونے کے باوجود علاقے کے مکین عادتاً اسی رستے سے آمدورفت جاری رکھتے تھے۔ عدنان کی بدقسمتی اسے چاروں طرف سے گھیر چکی تھی۔ عقب سے آنے والی ایک تیز رفتار کار کی ٹکر بائیک کو لگی تو اس کے کل پرزوں سے کئی احتجاجی صدائیں برآمد ہوئیں اور عدم توازن کے بعد وہ بائیک سمیت کئی فٹ نیچے بدبودار اور غلیظ پانی میں جا گرا۔

موقع پر موجود انتظامیہ کے چند افراد نے اسے کسی طرح وہاں سے نکالا اور ابتدائی طبی امداد کے لیے ملحقہ سڑک پر واقع ایک پرائیویٹ کلینک میں منتقل کر دیا۔ لباس سمیت اسے بھی اچھی طرح 'واش' کیا گیا۔ ہیلمٹ کی وجہ سے گندگی میں گھرنے پر بھی چہرہ اور دماغ 'سلامت' تھے۔ چند گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو دو پولیس اہلکاروں کو اپنے پاس موجود پا کر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پولیس کی ایک گاڑی اتفاقی طور پر ہی وہاں گشت پر تھی لیکن اب یہی اتفاق اُس کے گلے کا پھندا بننے والا تھا۔

"ایک نئی زندگی ملی ہے تمہیں...... ورنہ ٹکر کافی شدید تھی اور بائیک بہت خراب۔" ایک اہلکار نے کہا۔

"جی ہاں! پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ سے اس کی ٹیوننگ کا ٹائم نہ مل سکا جس کی وجہ سے یہ سب ہو گیا۔" وہ اعتماد سے بولا اور نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔

"کہاں اسٹوڈنٹ ہو تم؟"

"میڈیکل کالج...... فورتھ ایئر۔" اس کے بااعتماد انداز اور کالج کے حوالے نے مقابل کو مزید موم کر دیا۔

"دو خصوصی غوطہ خوروں کے ذریعے تمہاری بائیک نکال دی جائے گی...... اس کے علاوہ تو کوئی سامان نہیں تھا؟"

"ایک موبائل فون تھا بس!" اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔

"کالج کا کوئی بیگ وغیرہ؟"

"نہیں...... کوئی بیگ نہیں تھا۔"

"ہمم...... کل پولیس اسٹیشن سے پتا کر لینا۔" اہلکار نے کہا۔

عدنان کی دنیا اس وقت اندھیر ہو چکی تھی۔ پولیس اہلکاروں کے سامنے کسی بھی بیگ کی ملکیت کا اعتراف اپنے لیے ایک کال کوٹھری اور قانونی عتاب مول لینے کے مترادف تھا۔ عامر کے تھمائے اس بیگ میں لاکھوں کی ڈرگز تھیں جسے کچی بستی میں پہنچانے کے بعد راتوں رات شہر کے مخصوص ٹھکانوں پر منتقل ہونا تھا۔ اس نقصان کے 'آفٹر شاکس' سوچ سوچ کر اس کے بدن میں پھریریاں دوڑنے لگیں۔

"یہ کیا ہو گیا؟ کیا کر بیٹھا میں؟ اگر سنی کچھ دن صبر سے گزارنے کا کہہ رہا تھا تو میں گزار ہی لیتا ...... جلد بازی لے ڈوبی مجھے۔" اس نے اپنے ہاتھ مسلتے ہوئے خود کلامی کی۔

"اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو تیری کھال کھینچ کر بھر وا لیں گے یہ لوگ۔" سنی کے الفاظ یاد آئے تو حالت مزید غیر ہونے لگی۔

اس شام کلینک سے ڈسچارج ہونے کے بعد اس نے اندرونی جیب میں موجود رقم سکھانے کے بعد وہاں ادائیگی کی اور اپنی سم ری نیو کروا کے ایک سستا سا فون خریدا اور سنی سے رابطہ کیا۔ اس کے خیاب پر وہ خاصا بے چین تھا اس لیے چھوٹتے ہی بولا۔

"کہاں مرے ہو تم؟ نمبر بھی بند ہے اتنے گھنٹوں سے۔"

"میں تم سے ارجنٹ ملنا چاہتا ہوں۔ بولو کہاں آؤں؟"

"اسٹیڈیم کے باہر والے ریسٹورینٹ میں آجاؤ۔"

کچھ دیر بعد وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔

"مال کہاں ہے؟ دوسری پارٹی کے فون پہ فون آرہے ہیں؟"

"مال نہیں ہے میرے پاس!" عدنان نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟ کہیں تیری اپنی نیت تو خراب نہیں ہو گئی مال پر؟"

"اگر میری نیت خراب ہوئی ہوتی تو تیرے سامنے نہ بیٹھا ہوتا بلکہ شہر سے فرار ہو گیا ہوتا۔" اس نے تلخی سے کہا اور بلاکم و کاست سارا قصہ سنا دیا۔

"لوگوں کو لالچ لے ڈوبتا ہے اور تجھے تیری کنجوسی لے ڈوبی...... جب تمہیں علم تھا کہ اتنی اہم ڈیلیوری پہنچانی ہے تو اپنی اس کھٹارا بائیک کو چیک کیوں نہیں کروایا۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے بزدل یا احمق فوجی بھی اپنے ہتھیار چیک کر لیا کرتا ہے...... تم تو انتہائی ڈفر نکلے۔"

"بھاشن نہ دے مجھے! بدقسمتی تو پیدائش کے ساتھ ہی میرے ساتھ بیاہی گئی تھی اسی لیے تو میرا پیچھا نہیں چھوڑتی...... تم 'بڑوں' سے بات کر کے پولیس والوں سے ٹک مکا کروا لو۔ انہیں چارا ڈالو، بیگ خود بخود مل جائے گا۔"

"میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ایجنسیوں نے بہت سختی کی ہوئی ہے۔ پولیس میں دو افراد اگر کرپٹ ہیں تو انہی میں ایک کو ایمانداری کا مرض بھی ہوتا ہے...... اگر اس بات کی بھنک بھی باہر نکلی تو سارا سیٹ اَپ وہ خود ہی کھود نکالیں گے۔ اس لیے یہ کام تو سوچنا بھی مت۔" سنی نے رکھائی سے کہا۔

"تو پھر کیا کروں میں...... کیسے نکلوں اِس 'سیاپے' سے؟" عدنان زچ ہوا۔

"میرے چاند! یہ سیاپا تو نے خود ہی اپنے گلے ڈالا ہے اور خود ہی اس سے بچنا بھی ہو گا۔ مال کی قیمت ادا کر دے...... اوپر والوں کو میں سنبھال لوں گا۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو؟" اس نے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

لذیذ غلطی

ہوٹل میں مقامی پادریوں کا اجلاس ہو رہا تھا۔ موسم کی مناسبت سے یخ بستہ تربوز پیش کیے گئے جن میں سادے مشروب کے بجائے غلطی سے وہسکی داخل کر دی گئی۔ سروس منیجر کو غلطی کا علم ہوا تو وہ بہت بوکھلایا مگر تلافی کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے اجلاس میں خدمات انجام دینے والے ویٹرز کے سربراہ کو بلا کر پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"کیا ہو رہا ہے...... پادری ناراض ہو رہے ہوں گے؟"

"کچھ بھی نہیں...... سب تلکیوں سے بڑے مزے سے چسکیاں لے رہے ہیں اور ایک دوسرے کی نظریں بچا کر اپنے اپنے تربوزوں کے بیج جیب میں ڈال رہے ہیں۔"

کوئٹہ سے محمد آفریدی کا تعاون

"تو اپنے گھر اور خاص طور پر بہن سے محرومی یا کسی بھی قسم کی زیادتی کے ذمے دار تمہی ہو گے۔" سنی نے سفاکی سے کہا۔

عدنان اس کے انداز اور کم ظرفی پر دنگ تھا۔ اس نے تو کبھی بھی اپنے خاندان یا اہلِ خانہ کے متعلق اسے کچھ نہ بتایا تھا۔ وہ تنظیم کے اس حیوانی روپ پر شدید غصے کے باوجود بے بس تھا۔

"کتنی قیمت ہے میری رہائی کی؟" جواب میں سنی کی بتائی گئی رقم سن کر وہ حقیقتاً اپنی نشست سے اچھل پڑا تھا۔

"خدا کا خوف کر سنی! میں تو بالکل قلاش ہو جاؤں گا...... اتنی رقم کہاں سے لاؤں میں؟ بینک میں موجود پیسے اور بائیک کا مل ملا کر بمشکل بن پائے گا۔ آخری سال کی فیس بھی دینی ہے مجھے۔" عدنان گڑگڑایا۔

"قلاش ہو جا بیٹا! مرحوم، لولا لنگڑا یا ٹنڈا ہونے سے تو بہت بہتر ہے......" سنی کے لہجے میں پوشیدہ دھمکی نے اس کا وجود سنسنا دیا۔

"ٹھیک ہے...... یہ میرا اے ٹی ایم کارڈ پکڑو اور بینک سے پیسے نکلوا لینا۔" اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے لباس کی اندرونی جیب میں موجود ایک والٹ سے کارڈ نکال کر اسے تھمایا اور کوڈ بتا دیا۔ کلینک انتظامیہ نے بھی اس کی

سبھی چیزیں جوں کی توں لوٹا دی تھیں۔

''گڈ! اب تجھے ایک لمبی چھٹی کی ضرورت ہے۔ خاموشی سے اپنی پڑھائی پر دھیان دے۔ فیس بھرنے کے لیے مکان بیچ دینا اور ڈگری لے کر لوگوں کی کھال اتارنا۔ ایک بات یاد رکھنا...... آج تو تیرے کام آگیا ہوں...... آئندہ پہچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر کارڈ تھاہے رخصت ہو گیا۔

عدنان کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اسپیشلائزیشن تو درکنار، میڈیکل کی ڈگری لینے کا خواب بھی اب کبھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اپنے جسم و جان میں سناٹے اترتے محسوس ہونے لگے۔ ایک طویل سفر کے بعد منزل کے کھو جانے کا کرب اور مسافت رائگاں ہونے کی اذیت اس کے اعصاب کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس رات وہ بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اپنے اردگرد چمکتے چہرے دیکھ کر اسے ساری دنیا سے نفرت ہونے لگی تھی۔

رات دو بجے وہ بے دلی سے اپنا آپ گھسیٹا گھر پہنچا۔ اضافی چابی سے گیٹ کھولا تو اندر ہر سُو اندھیرا نظر آیا۔ اس نے پلٹ کر باہر گلی میں نظر دوڑائی۔ لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ڈیوڑھی میں موجود سوئچ بورڈ سے صحن کی لائٹ آن کی تو اندرونی برآمدے اور کمرے میں بھی اندھیرا دیکھ کر اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا سائرن بجانے لگی۔ اس لمحہ اس کا دل شدت سے چاہنے لگا کہ کسی بھی کونے سے ماں سامنے آجائے اور وہ اس کی گود میں دبک کر اپنے سارے تفکرات بھول جائے لیکن ایسا کہاں ممکن تھا؟

وہ اپنی دھڑکنیں سنبھالتے ہوئے ارم کو آوازیں دیتا اس کے کمرے میں چلا گیا۔ موبائل اسکرین کی مدھم روشنی میں ٹٹولتے ہوئے لائٹ آن کی۔ ارم سامنے بستر پر ہی موجود تھی لیکن اس کا وجود زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کے پاس 'وائٹ پاؤڈر' کے کچھ پیکٹ، سگریٹ کی ایک آدھی ڈبیا کے علاوہ نیند کی گولیوں کی شیشی بھی موجود تھی۔ قرائن یہی بتاتے تھے کہ اس نے دانستہ طور پر اس قدر بھاری مقدار میں وہ زہر استعمال کیا ہے۔

عدنان نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولی۔ دھڑکنیں ساکت ہو چکی تھیں۔ وہ کم از کم چھ گھنٹے قبل ہی ملکِ عدم سدھار چکی تھی۔ عدنان ملک کا آخری خونی رشتہ بھی اس سے بچھڑ گیا تھا۔

☆☆☆

زندگی میں ہر غیر متوقع موڑ اور حادثے سے گزرتے ہوئے عدنان کو ایسا لگتا تھا کہ اس سے کٹھن وقت وہ دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گا لیکن ہر سانحہ اس کے لیے نئی اذیت اور کرب لے آتا تھا اور وہ پھر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا۔ موت نے دھیرے دھیرے اس کی زندگی میں دیمک لگا دی تھی۔ گھر کی ویرانی، ہر خونی رشتے سے محرومی کے بعد وہ ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ وہ پیدائشی بدقسمت ہے۔

ارم کی تجہیز و تکفین کے مراحل طے کرتے کس نے تعزیتی کلمات ادا کیے اور کس نے اس کی جواں مرگی پر طنزیہ سرگوشیاں کیں، اسے کوئی ہوش تھا نہ پروا۔ اس کی سماعت نے ذہن سے ناتا توڑ لیا تھا لیکن ایک تجسس بہرحال موجود تھا کہ اپنی پسند کی شادی کی اجازت دینے کے باوجود ارم نے ایسا انتہائی قدم کیوں اٹھایا؟

تین روز بعد وہ اس کی کتابیں، الماری، ڈائریاں اور بیگ مکمل طور پر کھنگال بیٹھا لیکن کسی قسم کا کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔ اس کی نعش کے پاس وائٹ پاؤڈر کی موجودگی نے بھی عدنان کو باؤلا بنا رکھا تھا۔ اس 'سفید موت' نے کب اور کس کے ذریعے اس کے گھر میں سیندھ لگائی؟ ارم کو یہ لت کیسے لگی؟ وہ کس قیمت پر یہ مہنگی موت اپنے اندر اتارتی رہی؟...... سوالات کا تند و تیز سیلاب اسے اپنے ساتھ بہا لے جاتا اور وہ بے بسی کی انتہا پر اپنے بال نوچنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پاتا۔

تھک ہار کر وہ اس کا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا جو اس نے پچھلے سال ہی پڑھائی میں مدد کے لیے لے کر دیا تھا۔ وہاں بھی ارم کا کوئی سوشل اکاؤنٹ موجود نہیں تھا۔ 'ہسٹری' چیک کرنے پر علم ہوا کہ وہ اپنے چنیدہ اکاؤنٹس تین روز قبل ہی ڈیلیٹ کر چکی تھی۔ مختلف فولڈرز کھنگالتے اسے 'فار عدنان' نامی ایک فائل نظر آئی۔ اس نے فوری طور پر اسے کھولا۔ وہ یک ورقی ڈاکومنٹ تھا جسے تین روز قبل ہی شام سات بجے محفوظ کیا گیا تھا۔ وہ بے تابی سے ان سطروں پر نظریں دوڑانے لگا۔

''تو آخر تم یہاں تک پہنچ ہی گئے۔ حیران مت ہو...... میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ تم یہاں رسائی حاصل کر لو اس لیے لیپ ٹاپ سے ہر قسم کا سیکیورٹی الرٹ اور پاس ورڈز ہٹا دیے ہیں۔ آج صبح جب تم نے مجھے اپنی پسند بتانے کے لیے اصرار کیا تو قدرتی بات تھی کہ میں نے سب سے پہلے اسی شخص سے رابطہ کیا جسے میں اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتی تھی۔ مجھے دو سو فیصد امید تھی کہ اب کوئی ظالم سماج

میرے رستے میں نہیں آئے گا...... تمہاری طرف سے کچھ دھڑکا تھا لیکن آج وہ بھی ختم ہو گیا اور میں نے اسے تم سے ملنے کے لیے کہا۔ لیکن ٹھہرو!...... یہ تو جان لو کہ وہ میری زندگی میں کب اور کیسے آیا؟ اپنی ذات کی تنہائی جھیل کر جب میں تھک چکی تھی تو اس وقت دوستی کا بڑھا ہوا وہ ہاتھ میں ٹھکرا نہ سکی۔ مجھے ایک سامع کی ضرورت تھی جسے اپنے سب دکھ، پریشانیاں اور مسائل بتا سکوں...... ہم لڑکیاں بھی جذباتیت میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ دوستی کی آڑ میں سبھی راز مقابل کو دے دیتی ہیں۔ اعتبار کی بارش میں اس قدر بھیگ جاتی ہیں کہ جسم تک نمایاں ہونے لگتا ہے اور ایسا تبھی ہوتا ہے جب گھر میں خونی رشتوں سے وہ محبت اور اعتبار نہ مل سکے......

جب تک والدین زندہ تھے مجھے جینے کی ایک راہ نظر آتی تھی۔ اس دور میں بھی بہت ہاتھ میری طرف بڑھے لیکن والدین کا تصور اور تربیت مجھے ایسی کوئی بھی راہ اختیار کرنے سے روک لیتی تھی۔ جب ابو جی بیمار ہوئے تو اس کے بعد جانے کیوں میرے اندر ایک بے حسی اور منفی رجحانات پروان چڑھنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد تو میرا خود پر کنٹرول ہی نہیں رہا۔ اب میرے اندر کوئی سگنل نہیں ملتا تھا جو مجھے قدم بڑھانے سے روک لیتا...... میں بہکتی چلی گئی...... بات دوستی سے شروع ہوئی اور پھر جانے کون کون سے سفر طے کرتی گئی۔ میں اسے احاطہ تحریر میں نہیں لا سکتی۔ اس سے ملاقاتوں کا آغاز ہوا تو ذہنی سکون کے لیے ڈرگز کا استعمال سکھایا۔ بہت سکون اور خود فراموشی تھی...... میں بہت خوش رہنے لگی اور یوں ڈرگز کی عادی ہوتی چلی گئی۔ وہ جو کہتا رہا، میں مانتی چلی گئی...... مانتی چلی گئی...... اور احمقوں کی جنت میں رہتے یہ سوچتی رہی کہ وہ مجھ سے شادی کے لیے سنجیدہ ہے...... بہرحال تمہاری آفر مطلوبہ بندے تک پہنچائی تو جواب ملا کہ میں تو مہا احمق ہوں جو دوستی اور نظریۂ ضرورت کے تحت بنائے گئے اس رشتے کو سنجیدہ لے رہی ہوں۔ وہ میرے ساتھ 'لو ان ریلیشن شپ' بنا کر تو رہ سکتا ہے لیکن شادی کے لیے اس کی ترجیح ایک خاندانی لڑکی ہی ہوتی جس نے کبھی غیر مرد کا منہ بھی نہ دیکھا ہو۔

تم نہ تو مجھے پہلے کبھی سمجھ سکے...... نہ ہی اب کوئی امید ہے...... ٹھکرائے جانے کی اذیت، استحصال کا کرب اور برباد زندگی کا احساس لے کر نہ تو مجھ میں کسی سے شادی کا حوصلہ ہے اور نہ ہی مزید جینے کی تمنا۔

اب تک تم اس شخص کا نام جاننے کے لیے بے تابی سے میرا سامان اور لیپ ٹاپ تک کھنگال چکے ہو گے...... لیکن میں تمہیں اس کا نام بتاؤں گی اور نہ ہی کوئی سراغ چھوڑوں گی...... بہت محتاط انگز کھیلی تھی میں نے...... اس کا مطلب یہ مت سمجھنا کہ میں محبت کے نام پر اُسے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں...... میں تمہیں بھی اپنی طرح ایک دائمی خلش میں مبتلا کر کے جاؤں گی تاکہ تمہیں میرے کرب کا احساس ہو...... لیکن نہیں! تمہیں احساس ہوتا تو میں یہ دن دیکھتی ہی کیوں؟ تمہیں اپنے خواب عزیز تھے نا! جی بھر کر جیو ان خوابوں میں...... میں تمہیں جینے کی ڈھیروں دعائیں دے کر مروں گی......''

عدنان سناٹے اور وحشت میں گھرا تھا۔

☆☆☆

اس مختصر قید خانے میں سناٹا بھی اپنے اردگرد پھیلی ہولناک وحشت سے گھبرانے لگا تھا۔

''میں چاہتا تو کئی حقائق چھپا لیتا یا اپنی غلطیاں پوشیدہ رکھ لیتا لیکن دل پر دھرے اس بوجھ کو اٹھا کر جیتے جیتے میں تھک چکا ہوں...... بہت تھک چکا ہوں۔'' عدنان نے اپنے سامنے گم صم بیٹھے واجد کو دیکھ کر کہا۔

''آپ نے واقعی ارم کے گناہگار کو ٹریس کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''وہ تو اسی روز ٹریس ہو گیا تھا جب میں اُس کا تحریر کردہ آخری نوٹ پڑھ رہا تھا۔''

''کون تھا وہ؟ کیسے ملا آپ کو؟'' واجد تجسس کی انتہا پر تھا۔

''وہ عدنان ملک تھا۔''

''ناممکن...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟''

''یہی سچ ہے...... ارم نے لکھا تھا ناں کہ والدین کی زندگی میں اُسے کچھ سگنلز روک لیتے تھے لیکن بعد میں وہ بہکتی چلی گئی...... تو اس کی وجہ میں، میرے غلط فیصلے، چھوٹی سوچ اور حرام کمائی تھی...... جب تک ہم سراج دین کی کمائی پر پلتے رہے، آفات سے محفوظ رہے اور ہر کام میں خیر و برکت بھی قائم رہی...... لیکن جس روز میں نے سنی سے ہاتھ ملایا، قسمت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔''

''آپ اپنی پڑھائی تو پوری کر لیتے...... ڈگری ہی لے لیتے کم از کم۔''

''کس حق سے لیتا وہ ڈگری؟ میری ڈرگز کی کمائی نے پہلے والدین چھینے...... پھر بہن نے گناہ کی وادی میں بھٹکنے کے بعد حرام موت کو گلے لگا لیا۔ میرے خوابوں نے

تین زندگیاں اجاڑ دیں۔ ڈاکٹر بن جاتا تو یقینی بات تھی کہ میرے ہاتھ میں شفا کبھی بھی نہ آتی..... پہلے پہل میں سوچتا تھا کہ جب ڈاکٹر بن جاؤں گا تو ہفتہ میں ایک روز فری علاج کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ والدین کو بھی ثواب پہنچ جاتا۔ لیکن ارم کی باتیں پڑھیں تو علم ہوا کہ کسی بھی توجیہہ سے حرام کو حلال نہیں بنا سکتے..... وہ آگہی کا لمحہ تھا اور آگہی کا عذاب اعصاب کا ریشہ ریشہ ادھیڑ دیتا ہے۔ ارم کا گناہ گار کوئی اور نہیں، میں تھا..... اگر مذکورہ شخص کو ڈھونڈ نکالتا تو کیا کر لیتا؟ اس سے اُلجھ کر بہن کے کردار پر مزید کیچڑ اچھالتا؟ اگر اسے سزا دیتا تو کس قانون کے تحت؟ سب سے پہلی سزا تو مجھے ملنی چاہیے تھی۔'' وہ بات مکمل کرتے ہانپنے لگا۔

''کیا وہ بیگ واقعی نہیں ملا؟ سنی یا اُس کی تنظیم نے کوئی تو کوشش کی ہوگی؟'' واجد نے پوچھا۔

''جہاں تک میں جانتا ہوں، وہ سب گدھ ہیں... ان کے بڑوں نے اسی روز ہی لازمی طور پر بیگ نکلوا لیا ہوگا۔ مجھ سے وصول کی گئی 'پینالٹی' میرے لیے ایک سبق تھی۔ حرام کمائی جس طرح چور راستے سے آتی ہے، اسی طرح ایک ہی جھٹکے میں لوٹ بھی جاتی ہے۔ وہ حادثہ میرے لیے سبق تھا کہ جس کمائی کے زعم میں اپنے والدین کو دھتکارتا رہا، بہن کو تنہائی کا عذاب جھیلنے کے لیے چھوڑ دیا، وہ کمائی ایک لمحے میں میرے منہ پر تھوک کر چلی گئی۔ عدنان ملک اسی قابل تو تھا۔ اس کا گھمنڈ، حکمتِ عملی، اوور کانفیڈنس یونہی تباہ ہونا تھا کہ ایک روز وہ پھوٹی کوڑی کا محتاج ہو جائے۔''

''تو پھر یہاں کیسے آئے آپ؟''

''قدرت نے شاید ایک اور سبق دینا تھا مجھے اس لیے اِدھر کی راہ سجھا دی۔''

''کیسا سبق لالہ؟'' واجد اُلجھا۔

''میں سالہا سال حرام کما کر اپنی پڑھائی کے اخراجات پورے کرتا رہا اور خود کو یہ کہہ کر بہلاتا رہا کہ بقا کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ ارم کی موت نے یہ بھرم تو چاک کر دیا لیکن بچپن سے ذہن میں نقش ایک بات تب بھی ڈستی تھی۔ 'سسٹم' غلط نہ ہوتا تو مجھے ڈرگز سپلائی کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی؟ اور پھر میں نے وہی کیا جو ہمارے ملک کا ہر مایوس نوجوان سوچا کرتا ہے..... 'اس ملک میں کچھ بھی نہیں رکھا' جیسا جملہ جب اپنے ناخداؤں سے سنا جائے تو اس کا یہی ردِعمل سامنے آتا ہے کہ ہم مایوسی کے عالم میں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے سے بھی خائف نہیں ہوتے۔''

''اتنی رقم کیسے اکٹھی کی آپ نے؟ مجھے یہاں بھیجنے کے لیے تو ساجد لالہ نے اپنا ایک گردہ فروخت کر دیا تھا۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''مکان فروخت کرنے کا ارادہ بن گیا تھا لیکن تو قیر نے کاغذات لے لیے اور مجھے مطلوبہ رقم فراہم کر دی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ دبئی چلوں لیکن میں نے اس دور دراز جزیرے کا انتخاب کیا تا کہ ماضی کی کوئی پرچھائیں مجھے نظر نہ آسکے۔ ایران اور ترکی کا کٹھن سفر، پھر یہاں پہنچنے کے لیے سمندری سفر میں ہر پل کتنے دھڑکے، خطرات اور اندیشے تھے، اس پر کئی دن بھی بولتا رہوں تو یہ قصے ختم نہ ہوں۔''

''لیکن آپ کم علمی اور انگریزی نہ جاننے کا ناٹک کیوں کرتے رہے؟''

''اپنی ذات سے وابستہ جرائم، اخلاقی کجی اور اپنے آپ کو ایک خول میں چھپائے رکھنے کے لیے۔''

واجد تاسف آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا لیکن وہ آنکھیں موند چکا تھا۔ خاموشی ایک بار پھر ان کے درمیان حائل تھی۔ کئی لمحے خاموشی سے سرک گئے اور پھر اچانک واجد نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''لالہ!''

''اب کیا پوچھنا چاہتے ہو واجد؟'' وہ بیزار ہوا۔

''کیا سپارٹس وہ موومی ریلیز کروانے میں کامیاب ہو جائے گا؟ مصطفیٰ کے دل میں ذرا سی حمیت بھی باقی نہیں رہی کیا؟''

عدنان کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اپنی کوتاہیوں پر بین کرتی روح پر ایک شدید چرکا لگا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور انگلیوں میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ وہ ان دونوں کو قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن صیاد نے قفس میں کوئی روزن نہیں چھوڑا تھا۔

پنچھیوں کی پھڑپھڑاہٹ شدید ہو گئی۔

☆☆☆

مصطفیٰ اپنے کمرے میں چت لیٹا تھا۔

اس کے حلق میں اب بھی بہت تکلیف تھی۔ گردن پر عدنان کی انگلیوں کے نشان نمایاں ہو چکے تھے اور بیرونی جانب بھی ہلکی سی سوجن نظر آنے لگی تھی۔ اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ سے ان نشانات کو ٹٹولا۔ اس رات کی اذیت، گھٹن اور سانس رک جانے پر موت کو اپنے پاس کھڑے

دیکھنے کی دہشت پل بھر میں دوبارہ اجاگر ہو گئی۔

''جنگلی..... وحشی..... حرام خور کہیں کا۔'' اس نے ہزاروں بار ادا کی جانے والی مغلظات ایک بار پھر دہرائیں۔

ڈاکٹر کی دی گئی ادویات سے افاقہ تو ہوا تھا لیکن تکلیف اب بھی باقی تھی۔ ان ادویات میں ٹرنکولائزر کی بدولت نیند کا غلبہ رہنے سے درد اور خراش سے سکون رہتا تھا۔ بیدار ہوتے ہی شراب کی طلب بھی اسے بے چین کرنے لگتی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شراب سے دوری ہی اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

جسم کی ہر ایک رگ جب دہائیاں دینے لگی تو ضبط ناممکن ہو گیا۔ سائڈ ٹیبل پر موجود ایک بوتل سے جام بنا لیا۔ پہلے ہی گھونٹ نے حلق میں انگارے بھر دیے تھے لیکن اپنی قوتِ ارادی کے بل پہ وہ دھیرے دھیرے معمول پر آ گیا۔ ذہن پر کیف و سرور کی کیفیت چھا گئی۔ اب وہ سنجیدگی سے اپنے ارگرد رونما ہونے والے واقعات و معاملات پر غور کرنے لگا۔

سپارٹس اور برائن اس کی جانب سے مکمل مطمئن ہو چکے تھے۔ سپارٹس سے اس روز کے بعد ملاقات تو نہ ہو پائی تھی لیکن اتنا تو اسے علم تھا کہ اس کا پراجیکٹ پیشکش کے لیے تیار تھا۔ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ وہ بہت خوش اور سرشار تھا۔ دل میں عدنان سے بدلہ چکانے کی خلش تو تھی لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اس کا ذہنی رتکاز اپنے اگلے پلان کی طرف مڑ گیا اور اس اثنا میں پہلی بار اس کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے تھے۔ حکمتِ عملی کا مبہم خاکہ تو پہلے ہی تیار تھا۔ اب کچھ جزئیات طے کرنا باقی تھیں۔

دروازے پر دستک نے اسے ان خیالات سے چونکا دیا۔

''اب کون سی مصیبت ٹپک پڑی؟'' وہ جھنجلایا۔

☆☆☆

سپارٹس کی خوشی اور جوش دیدنی تھا۔

اس کا دیرینہ خواب تکمیل کے مراحل میں پہنچ چکا تھا۔ تعبیر اب صرف چند گھنٹوں کی دوری پر تھی۔ سپارٹس زمانۂ طالب علمی ہی سے بہت منفی ذہنیت اور تخریب کارانہ رجحانات کا حامل تھا۔ مسلم قوم سے نفرت اس کی گھٹی میں... پڑی تھی۔ شومئی قسمت اساتذہ بھی ایسے میسر آئے جو تعصب اور نفرت کی آبیاری کرتے رہے۔

اس کا باپ ایک ایشیائی مسلم تھا جس نے شہریت حاصل کرنے کے لیے اس کی والدہ سے پیپر میرج کی اور بعد میں خاندانی دباؤ کے باعث اُسے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ سپارٹس کے نقوش اس کے لیے سب سے بڑی آزمائش تھے۔ وہ اپنا ماضی کبھی عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے خدوخال میں باپ کی جھلک اس کے سامنے بہت سے سوالات کھڑے کر دیتی اور نفرت ہر بار اس کا وجود بھسم کر دیتی۔

تعلیمی اداروں کے متعصب طلبہ اور نسل پرستی نے نفرت کے بیج کو تناور درخت کی شکل دے دی۔ ایک روز کچھ طلبہ سے جھگڑا اس قدر بڑھا کہ نوبت سر پھوڑنے تک جا پہنچی۔ معاملہ انتظامیہ تک پہنچا اور انہیں ایک ماہ کے لیے معطل کر دیا گیا۔ دیگر لڑکوں کو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ وہ پڑھائی لکھائی میں انتہائی غیر سنجیدہ تھے۔ سپارٹس نے اس ذلت کو بھی اپنے اس باپ سے وابستہ کر دیا جس نے اسے کبھی دیکھا تھا، نہ ہی اس کے وجود سے باعلم تھا۔ آصف گلزار کے گناہوں میں ایک گناہ کا مزید اضافہ ہو گیا۔

اس شام وہ پب میں بیٹھا بنتِ انگور سے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب کوئی کرسی کھسکا کر اس کے سامنے آ بیٹھا اور ویٹر کو آواز دی۔

''ایک ڈرنک میرے لیے بھی!''

سپارٹس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اسی کا ایک ریٹائرڈ پروفیسر تھا۔

''میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ تمہارا بل بھی چکاؤں۔''

''نو پرابلم مائی ڈیئر! میں تمہارا بل بھی ادا کر دوں گا۔''

''اس مہربانی کی وجہ؟'' سپارٹس نے بھویں اچکائیں۔

''مجھے علم ہوا تھا کہ ڈین نے تمہیں ایک ماہ کے لیے معطل کر دیا ہے۔''

سپارٹس نے منہ بنا کر اُسے چند ذاتی اختراع کردہ گالیوں سے نوازا اور ایک نیا جام منگوا لیا۔

''مجھے تمہارے دکھ کا اندازہ ہے مائی سن!'' پروفیسر نے شفقت سے کہا۔

''جھوٹ! مجھے طفل تسلیاں مت دو پروفیسر! تمہیں اس دکھ کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم مخلوط نسل سے تعلق نہیں

رکھتے...... تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال نہیں کیا ہوگا...... تم نے نسل پرستوں کے زہریلے الفاظ کی برچھیاں نہیں سہی ہوں گی...... تمہیں ہر جگہ محض ایک ایشیائی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جاتا ہوگا اور نہ ہی تمہاری گرل فرینڈز اس وجہ سے بے اعتبار سمجھتی ہوں گی۔‘‘

’’تو اس کا بدلہ اپنی ذات سے کیوں لے رہے ہو؟‘‘ پروفیسر نے متانت سے کہا۔

’’تو اور کس سے لوں؟ وہ نطفۂ بے تحقیق تو اتنا شاطر تھا کہ میری ماں کو اپنا ایڈریس تک نہ بتایا کبھی۔ ورنہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کی گردن اُڑا دوں۔‘‘

’’اسے تمہاری خود ترسی اور اس خود اذیتی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا!‘‘

’’تو پھر کس چیز سے پڑے گا؟‘‘ سپارس نے گلاس میز پر پٹخا۔

’’اس کے ہم قوم اور ہم وطن افراد کو برباد کرو۔‘‘ پروفیسر نے سرگوشی کی۔

’’یہ کیسے ممکن ہوگا؟‘‘

’’بہت سے طریقے ہیں...... یہ لوگ اکثر یہاں غیرقانونی طور پر آتے ہیں...... چھپ چھپا کر کام کرتے ہیں...... انہیں بلوں سے باہر لاؤ۔ قانون کے شکنجے میں پھنسا ڈالو۔‘‘

’’تو اس سے آصف گلزار کو کیا فرق پڑے گا؟‘‘ اس نے منہ بنایا۔

’’یہ ایشیائی ضرورت سے زیادہ جذباتی ہوتے ہیں...... اپنی ذات پر ایسی کسی افتاد کا ڈھنڈورا اپنے ملک میں جا کر ضرور پیٹتے ہیں...... کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی روپ میں تمہارے باپ تک ایک بھی قصہ پہنچا تو وہ لازماً بہت دکھی ہوگا۔‘‘

’’اسے دکھ کیونکر ہوگا بھلا؟‘‘ سپارس اُلجھا۔

’’یہی تو تم جانتے نہیں... تمہارا باپ جس ملک سے تعلق رکھتا ہے، وہ اپنے کسی بھی ہم وطن فرد کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ میرے ذاتی خیال میں یہ روئے ارض کی احمق ترین قوم ہے کیونکہ کوئی بھی بات عقل اور دلیل کی کسوٹی پر نہیں پرکھتے۔ جذبات ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے...... تم انہی جذبات سے فائدہ اٹھاؤ۔‘‘

’’میں کافی حد تک تمہاری بات سمجھ رہا ہوں پروفیسر!‘‘ اس نے سر ہلایا۔

’’گڈ! اگر ان کی زبان سیکھ لوگے تو تمہارے لیے اور بھی آسانی پیدا ہوجائے گی۔ یہ لوگ بہت جلد اعتبار کرلیتے ہیں۔ اسی اعتبار کا سہارا لے کر انہیں برباد کرنا سیکھو...... اور ایک بات یاد رکھنا! یہ کام فوری نتائج نہیں لائے گا۔ اسے اپنی لانگ ٹرم پلاننگ کا حصہ بنالوگے تو کئی نسلیں اُجڑ کر سسکتی پھریں گی۔‘‘ وہ سفاکی سے بولا۔

’’مجھے ان پر قطعی ترس نہیں آئے گا۔ اگر میں نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ وہی کام دہرائیں گے جو آصف گلزار نے کیا۔‘‘

’’گڈ! مجھے امید ہے آئندہ زندگی میں تم مجھے ایسے کسی تھرڈ کلاس پب میں بیٹھ کر اپنا خون جلانے کے بجائے کسی دشمن کی بربادی کا جشن مناتے نظر آؤ گے۔‘‘

’’ایسا ہی ہوگا پروفیسر! میں ایک روز تاریخ رقم کروں گا۔‘‘ اس نے ایک عزم سے کہا اور پھر آنے والے وقت میں اپنی نفرت، بغض اور عناد کا مکمل تاوان وصول کرتا رہا۔

اسے آج بھی پروفیسر کی کہی ایک بات یاد تھی۔ اس نے ’ولیم بلیک‘ کی مشہورِ زمانہ نظم ’دی پوائزن ٹری‘ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

’’غصہ اگر کسی پر ظاہر کردیا جائے تو اس کی شدت اور افادیت ختم ہوجاتی ہے۔ تمہارا غضب کسی بھی دشمن کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ اسے منافقت، چالبازی اور ابن الوقتی کے زہر میں بجھالو۔ دشمن کو کبھی بھی یہ ظاہر مت ہونے دینا کہ تم اس کے لیے کیا جذبات رکھتے ہو؟ اپنی ذات اس سرسبز درخت کی طرح بنا لو جس کا چمک دار، خوشبودار پھل دشمن کو تمہاری پناہ میں آنے اور اس پھل کو چکھنے پر مجبور کردے۔ جب وہ اسے چکھ لیں گے تو زہر ان کے جسم میں سرایت کرکے تمہارا انتقام پورا کردے گا۔‘‘

سپارس نے یہ بات اپنے پلّے باندھ لی۔ اس نے اپنا وجود وہی ’دی پوائزن ٹری‘ بنا دیا۔

وہ معاشرے کا معزز اور ’وائٹ کالر‘ شخص تھا جس کے زیرِ ماتحت این جی او بھی قائم ہوچکی تھی لیکن اس کا اصل مقصد کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ گزشتہ دہائیوں میں اس نے اَن گنت خاندان برباد کیے تھے۔ اپنے پاس پناہ گزین افراد کو بردہ فروشوں کے ہاتھ فروخت کرتا تو کبھی انہیں ایڈز کی شکار لڑکیاں فراہم کرکے ان کی نسلیں برباد کردیتا۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے آصف گلزار کے ہم وطن افراد کو انتقام کا نشانہ بنایا۔ آتشِ انتقام کبھی بجھ ہی نہ پائی تھی۔ اسے روشن

اور حدت آمیز رکھنے کے لیے کئی ایک بار اپنے والد کے آبائی وطن بھی گیا۔ وہ اس کے ہم وطن افراد کی طرزِ زندگی، سوچ اور فکرِ مجسم دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں کئی دورے کرنے کے بعد اس نے یہ سیکھا کہ بڑی سے بڑی مصیبت بھی انہیں حواس باختگی میں مبتلا نہیں کرتی۔ وہ پانی کی طرح تھے جو مٹھی مارنے سے دولخت تو ہوتا تھا لیکن پھر پوری قوت سے اپنی اصل ہیئت میں لوٹ آتا۔ وہ کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر اس ’قوت‘ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

عجلت اور بے صبری کو اس نے کبھی بھی اپنے سحر کا ساتھی نہ بنایا تھا۔ وہ ہر کام نہایت سکون، صبر اور مکمل ہوم ورک سے کیا کرتا۔ اس نے مذہبی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔ تشریحی کتب سے استفادہ کیا اور پھر بین الاقوامی سیاسی حالات مدِنظر رکھتے ہوئے ’موویز‘ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس فیصلے پر عمل ہرگز آسان نہ تھا۔ اس کے متعین کردہ اصول وضوابط ہی اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ وہ صرف ایشیائی افراد سے ہی ان موویز میں کام کروانا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد بزنس یا منافع نہیں تھا بلکہ ذاتی انتقام اور تسکینِ نفس درکار تھا۔ وہ نہایت عرق ریزی سے مذہبی کتب کا مطالعہ کرکے اسکرپٹ بناتا تھا۔ اس پراجیکٹ میں زیادہ افراد کی شمولیت بھی فی الوقت اس نے ضروری نہ سمجھی تھی۔ ایک مرتبہ یہ فلم ریلیز ہوجاتی تو اس کے بعد وہ حالات کو مدِنظر رکھ کر ہی مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس قدر بھاگ دوڑ کے بعد مصطفیٰ جیسا گوہرِ نایاب ہاتھ لگ گیا۔ پچھلی بار جن افراد کا انتخاب کیا گیا تھا وہ اسی کے گلے پڑ گئے تھے۔ موویز بنانے کے علاوہ وہ سوشل میڈیا پر اپنی شناخت خفیہ رکھتے ہوئے کچھ ایسے ’پیج‘ بھی چلا رہا تھا جو مذہبی منافرت، نظریات کی تضحیک اور اصل عقائد سے گمراہی کو فروغ دیتے تھے۔ تیسرے درجے کے وہ ایشیائی افراد اسے وہاں دلائل دیتے، دھمکاتے، گالیاں بکتے، انتظامیہ میں اس کے پیج کے خلاف رپورٹ درج کرواتے لیکن اس کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا بھلا؟

’’سر! میں نے تمام مہمانوں کو فون پر مدعو کرلیا ہے۔‘‘ برائن کی آمد نے اسے خیالات کے بھنور سے نکالا۔

’’گڈ! آج رات کے اس شو میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔‘‘ وہ دھیرے سے بولا۔

اس کی آواز اب قدرے بہتر تھی۔ ادویات میں نیند کی وجہ سے وہ گزشتہ رات اپنے منصوبے پر عمل نہیں کرپایا تھا اس لیے اپنی طبیعت کی بحالی کے بعد سارا پروگرام ازسرِنو ترتیب دیا تھا۔

’’آپ بےفکر رہیں جناب! یہ ایک یادگار اور دھماکا دار رات ہوگی۔‘‘

’’ہونی بھی چاہیے برائن! ہونی بھی چاہیے۔ اس دن کے لیے میں نے مدتوں انتظار کیا ہے...... آج میں تاریخ رقم کروں گا۔‘‘

’’بالکل کریں گے سر!‘‘ برائن نے دانت نکوسے۔

’’اس پراجیکٹ میں کامیابی کے بعد تمہاری مراعات میں بھی اضافہ کردوں گا...... تم میرے اسسٹنٹ بنو گے اور میں اس کام کے متعلق سب باریکیاں تمہیں سمجھاؤں گا تاکہ میری زندگی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے۔‘‘

’’میں آپ کی شاگردی میں آنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھوں گا...... اور ایک بات...... ان دونوں قیدیوں کا کیا کرنا ہے؟‘‘

’’پہلے تو میں چاہتا تھا کہ انہیں خاموشی سے آف کروا دوں لیکن اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ آج رات پہلے اس مووی کو اچھی طرح دیکھ کر ٹھوک بجالیں۔ ہمارے معزز مہمان اس میں جن تبدیلیوں کی تجویز دیں گے، انہیں ایڈٹ کرنے کے بعد فائنل کلپ انہیں بھی ضرور دکھاؤں گا۔ مرنے سے پہلے یہ ان کے لیے ایک شاندار موت ہوگی۔‘‘ وہ خباثت سے مسکرایا۔

’’ونڈرفل آئیڈیا سر! آپ کی دوائی کا وقت ہوچلا ہے۔ کچھ دیر آرام کرلیں تاکہ رات کو تازہ دم رہیں۔‘‘

سپارس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوائی نگل کر تھوڑی ہی دیر میں انٹا غفیل ہوگیا۔

برائن اپنے دیگر کام کاج میں مشغول ہوگیا۔ اُسے یکدم یاد آیا کہ جوانا کی تبدیلی اور پوچھ گچھ کے متعلق وہ سپارس سے ذکر کرنا ہی بھول گیا ہے۔

’’کوئی بات نہیں! ابھی انہیں آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ معاملات بعد میں بھی طے ہوتے رہیں گے۔‘‘ اس نے خودکلامی کی۔

☆☆☆

مصطفیٰ گہری سوچ میں تھا۔

اس کا فیصلہ لمحہ بہ لمحہ اسے کمزور کررہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ کمزوری اسے سپارس اور برائن کے سامنے مجرم بنا دے گی۔ وہ انہیں کسی صورت خفا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے شراب کی اشد ضرورت تھی۔ ایک نیا جام بنانے کے بعد اس

نے کئی گہرے سانس لیے اور اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر بولا۔

''کم آن مصطفیٰ! تو یہ کام نہیں کرے گا تو کوئی اور کر لے گا...... بہتر ہے کہ موقع سے فائدہ اٹھائے...... پیچھے بھی تیرے لیے کچھ نہیں رکھا...... کم آن! اپنے فیصلے پر قائم رہ۔ یو کین ڈو اِٹ مین! یو کین ڈو اِٹ......'' اس نے جام حلق میں انڈیلا تو ایک زوردار ٹھسکے سے کھانسی ہونے لگی۔

کھانسی کے ساتھ خون کے چند قطرے بھی تھے۔

''اُف۔ لگتا ہے زخم خراب ہونے لگے ہیں۔'' وہ خوف زدہ ہوا اور اگلے ہی لمحے لہو کے وہ قطرے سونگھتے ہوئے زبان سے پونچھ دیے۔

☆☆☆

رات کی آمد آمد تھی۔

سپارس نے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا اور پسندیدہ برانڈ کا پرفیوم چھڑکنے کے بعد لاؤنج میں چلا آیا۔ اس کے مہمان کسی بھی وقت آسکتے تھے۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ تینوں افراد براؤن کے ہمراہ لاؤنج میں آگئے۔

''ویلکم مائی ڈیئر فرینڈز!...... ویلکم ہوم!'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''شکریہ سپارس! تم نے آج تاریخ رقم کر ہی دی۔'' ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص نے کہا۔

''سالہا سال سے محنت کر رہا ہوں...... کامیابی کیسے نہ ملتی بھلا؟'' وہ قہقہہ لگانے کی کوشش میں کھانس کر رہ گیا۔

''لگتا ہے تمہاری طبیعت اب بھی ناساز ہے۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

''نہیں! ہلکی پھلکی کھانسی ہے بس...... میں کور کرلوں گا۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''چلیں! ہمارا خواب تعبیر پانے کے لیے مچل رہا ہے۔'' اس نے ہال کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں افراد بدنامِ زمانہ بین الاقوامی تاجر تھے جو سپارس ہی کی طرح مذہبی جنون اور تعصب میں مبتلا تھے۔ چار افراد پر مشتمل یہ تنظیم سپارس نے کچھ عرصہ قبل ہی قائم کی تھی۔ ان کا مقصد اور خواب مشترک تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح مختلف سائبر چینلز چلاتے تھے۔

مووی بنانے کا خیال سپارس ہی کی ذہنی اختراع تھی۔ جسے سن کر وہ سبھی پھڑک اٹھے تھے۔ ان میں سے دو افراد یورپی ممالک سے تعلق رکھتے تھے جبکہ تیسرے کا تعلق ایک ایسے ایشیائی ملک سے تھا جو سپارس کے دشمن کا دشمن تھا اور دشمن کا جانی دشمن اس کا بہترین دوست بن چکا تھا۔

وہ اپنے ذاتی لیپ ٹاپ بھی ساتھ ہی لائے تھے تاکہ مووی پسند آنے کی صورت میں اسے اپنے پاس محفوظ کرکے ملک واپسی کے بعد وائرل کی جاسکے۔ وہ اس مووی کے لاکھوں 'ناظرین' چاہتے تھے اس لیے مختلف براعظموں سے وائرل کرنا بہترین حکمتِ عملی تھی۔

ہال میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر سب سے پہلے مصطفیٰ پر پڑی۔

''ان سے ملیے! یہ ہمارے موجودہ اور آنے والے اَن گنت پراجیکٹس کے ہیرو ہیں...... سپر ہیرو۔'' سپارس نے والہانہ انداز میں اس کا تعارف کروایا۔

''کب سے منتظر ہوں آپ کا...... اپنے آپ کو پردۂ اسکرین پر دیکھنے کے لیے صبر ہی نہیں ہو رہا ہے۔'' وہ بے تابی سے بولا۔

''ارے! تمہاری آواز تو اب بھی خراب ہے۔'' سپارس فکرمند ہوا۔

''مجھے مووی دیکھنے کی فکر میں اس طرف دھیان دینا یاد ہی نہیں رہا۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''فکر نہ کرو! بس براؤن ریفریشمنٹ کا سامان لے آئے پھر مہمان نوازی کے بعد اپنے پروگرام کا آغاز کرتے ہیں۔''

اسی لمحے براؤن چند ملازمین کے ساتھ ٹرالی لیے ہال میں داخل ہوا۔ اسے ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر اوپری راہداری کے ایک ستون کی آڑ میں اس پر مرکوز دو آنکھوں میں اضطراب کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔

☆☆☆

''لالہ! سو گئے کیا؟'' کمرے میں واجد کی نقاہت زدہ آواز ابھری۔

''نہیں یار! بھوک میرا معدہ اپنے کیلے پنجوں سے اُدھیڑ رہی ہے...... اب تو ایسا لگتا ہے کہ ایسی نیند آئے گی جس کے بعد روزِ حشر ہی آنکھ کھلے گی۔'' عدنان کی آواز بھی ڈوب رہی تھی۔

کئی روز کی بھوک، پیاس اور لہو بہہ جانے کی نقاہت کے باعث اس کی حالت واجد سے کہیں زیادہ خستہ تھی۔

''میرے گھر والے تو کبھی جان ہی نہ پائیں گے کہ میں اپنا وعدہ نبھانے کے لیے کس طرح سسکتی ہوئی بھیانک موت مرگیا...... ماں ٹھیک ہی تو کہتی تھی کہ اسے کوئی مجھ سے جدا کر رہا ہے۔'' اس کے لہجے میں ہجر کی تپش تھی۔

''واجد! ایک بات مانے گا میری؟''

''بولیں لالہ!''

''اگر کبھی تم یہاں سے نکل سکو تو واپس لوٹ جانا۔ بہت خوش قسمت ہو تم کہ تمہاری پشت پر دعا مانگنے والے ہاتھ اور چاہت سے بھرپور دل منتظر ہیں۔''

''میں تو دعاؤں سے بھی مایوس ہو چکا ہوں لالہ! کچھ غلطیاں دعاؤں کے حصار سے بہت بڑی ہوتی ہیں...... ماں اور اپنے معذور بھائی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر آنا اور سپارس جیسے زہریلے سانپ پر اعتبار کرکے آپ لوگوں کو بھی یہاں لے آنا میری بہت بڑی حماقتیں ہیں...... ایسی حماقتیں جن کا مداوا کرنے کے لیے ماں کی دعائیں بھی کم پڑ گئی ہیں۔'' وہ شدید مایوس تھا۔

''تمہاری غلطیاں میرے گناہوں سے بڑی نہیں واجد! میرے سر پر جب تک والدین کا سایہ سلامت تھا، ہر الٹا کام بھی سیدھا ہو جاتا۔ ان کے خاک نشیں ہوتے ہی میری ساری تدبیریں چوپٹ ہو گئیں...... لیکن تم یہاں سے ضرور لوٹ جانا۔''

''ہمارا ابھی جواب نہیں لالہ! اتنے اطمینان سے یہاں بیٹھے پلاننگ تو ایسے کر رہے ہیں جیسے رہائی بچوں کا کوئی کھیل ہو۔ ہم میں سے کوئی اٹھے گا، اپنے فولادی کندھوں کی ضرب سے یہ دروازہ توڑ دے گا، پھر باہر کھڑے گارڈز میں سے کسی ایک کا اسلحہ چھین کر کشتوں کے پشتے لگاتے ہوئے گیراج میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ جائے گا۔ گاڑی میں چابیاں پہلے سے لگی ہوں گی۔ اس میں بیٹھ کر طوفانی رفتار سے بیرونی گیٹ توڑیں گے اور تو دو گیارہ ہو جائیں گے۔'' اس نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔ وہ اپنی جسمانی کمزوری اور پیٹ اُدھیڑتی بھوک کو نظرانداز کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔

عدنان نے اس کی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور دھیرے سے بولا۔ ''واقعی! موت سامنے ہے...... اور ہم شیخ چلی کے لکڑ بنے کیا کیا ہانک رہے ہیں۔''

اسی پل دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔

''بریوو! تین دن سے یہاں قید ہو اور پھر بھی ایسی ہنسی اور مسکراہٹ! جینے کا ڈھنگ تو کوئی تم سے سیکھے۔ کاش! تم مجھے پہلے ملے ہوتے۔'' واجد نے چونک کر آواز کے ماخذ کی جانب دیکھا اور حیران رہ گیا۔

''بڑی دیر کر دی آنے میں...... میں تو واقعی اب مایوس ہو چکا تھا۔'' عدنان نے اطمینان سے کہا۔

''نکل چلو یہاں سے! میں نے گیراج میں گاڑی تیار رکھی ہے۔'' جوانا عجلت میں تھی۔

''واجد کو لے جاؤ! میں ان لعنتیوں کو جہنم رسید کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' عدنان کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''ڈونٹ بی فول! وہ یہاں پر موجود ہوتے تو میں کیسے آسکتی تھی بھلا؟''

''کیا مطلب؟ تو پھر کہاں ہیں وہ؟''

''شہر کے ایک اور بزنس مین کے پاس مووی کی پروموشن کے لیے گئے ہیں۔ سپارس، مصطفیٰ کو مزید پراجیکٹس میں کام دلوانا چاہتا ہے۔''

''ایک منٹ! تمہیں کیسے علم ہوا کہ وہ کسی مووی کے چکر میں ہیں؟ پہلے تو تم بے خبر تھیں؟'' عدنان ٹھٹکا۔

''اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے بس۔ سب کچھ پتا لگ گیا لیکن یہ وقت ایسے سوالات کا نہیں۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''میں انتظار کر لوں گا...... لیکن انہیں موت کے حوالے کرکے ہی یہاں سے قدم ہلاؤں گا۔''

''اوکے! ایسا کرتے ہیں کہ واجد کو کسی محفوظ مقام پر چھوڑ کر تمہاری مرہم پٹی کرواتے ہیں۔ پھر واپس آکر تم اپنے پلان کے مطابق عمل کر لینا۔''

''اوکے، ڈن!'' وہ مطمئن ہو گیا۔

''یہ انرجی بارز اور جوس لے لو۔ یہاں سے نکلنے کے لیے بھی تم لوگوں کو ہمت کی ضرورت ہے۔'' جوانا نے انہیں بارز تھمائیں۔ ''وقت بہت کم ہے...... جلدی ختم کرو انہیں۔'' وہ بے قدموں آگے اور باہر کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

عدنان، واجد کی سوالیہ نظریں اور شہہ کے مسلسل نظرانداز کر رہا تھا۔

☆☆☆

ہال میں موجود افراد اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ ان کی نظریں مصطفیٰ پر جمی تھیں۔

''یہ گوہرِ نایاب کہاں سے ڈھونڈ لیا سپارس!؟ بنا بنایا ہیرو ہے یہ تو!'' ڈیوڈ نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا۔

''بہت سرمایہ کاری اور محنت سے ملا ہے...... برسوں خاک چھانی ہے۔'' سپارس نے حریصانہ انداز میں جواب دیا۔

''فکر نہ کرو۔ اس سرمائے کی پوری پوری وصولی کی جائے گی۔'' جوانکس کا لہجہ اس کی آنکھوں اور چہرے ہی کی طرح سرد اور سپاٹ تھا۔

سپارٹن نے اس کی بات پر تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا ۔''میں بھی گھاٹے کا سودا کرتا ہی نہیں۔''

مصطفیٰ نے بھی بھرپور مسکراہٹ سے اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

☆☆☆

جوانا بیرونی جانب کا جائزہ لے کر تیزی سے مڑی اور ہیجانی انداز میں بولی۔''آل از کلیر...... ہمت کرو اور چلو میرے ساتھ۔''

''میں بھی واپس نہیں جانا چاہتا۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ ایسے گھناؤنے مجرموں سے نظریں چرا کر میں صرف اپنا بچاؤ سوچوں گا اور آپ کو یہاں بھیج کر خود کہیں چھپ جاؤں گا۔'' واجد طیش میں آیا۔

''تم کچھ دیر پہلے مجھ سے وعدہ کر چکے ہو کہ اگر موقع ملا تو یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اب اپنے قول سے مکر نہیں سکتے تم!''

''یہ فاول ہے لالہ! کیا آپ پہلے ہی سے جانتے تھے یہ؟ اس لیے اتنا اصرار کر رہے تھے؟'' وہ صدمے سے بولا۔

''ہاں! اور اب تم مزید بحث نہیں کرو گے۔''

''فار گاڈ سیک! یہ کیا بحث لے کر بیٹھ گئے ہو تم دونوں؟'' جوانا وجۂ بحث کسی حد تک سمجھ چکی تھی۔''دیکھو لٹل بوائے! عدنان کو اس وقت فرسٹ ایڈ کی اشد ضرورت ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''اوکے ماسی خیراں، لیٹس گو۔'' واجد نے کلس کر کہا تو عدنان اس کے طرزِ تخاطب پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

☆☆☆

''مسٹر سپارٹن! مجھے آپ کی صلاحیتوں سے انکار تو نہیں لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ دھوکا کھا رہے ہیں۔'' امریش نامی تیسرے فرد نے اچانک کہا۔

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی مکاری تھی۔ تنگ پیشانی، گٹھا ہوا جسم اور متعصبانہ انداز و اطوار دیکھ کر مصطفیٰ کو بے اختیار سونیا یاد آنے لگی تھی۔ ان دونوں میں بظاہر کوئی مشابہت نہیں تھی لیکن پھر بھی جانے وہ کیا سگنل تھے جن کی فریکیونسی بار بار سونیا کی شبیہہ اس کے سامنے لا رہی تھی۔

''میں اس بزنس میں تمہاری طرح نو وارد نہیں ہوں مسٹر امریش! ایک تہائی عمر اس کے ہم وطن اور ہم مذہب افراد کو برباد کرتے گزری ہے...... اور تمہیں لگتا ہے کہ اس موڑ پر میں دھوکا کھا جاؤں گا۔'' سپارٹن بھنا گیا۔

''ریلیکس ڈیئر! امریش نے تو صرف ایک ممکنہ بات کہی ہے۔ کول ڈاؤن!'' ڈیوڈ نے فوری طور پر بات سنبھالی۔

سپارٹن اب بھی کینہ توز نظروں سے امریش کو گھور رہا تھا۔

''برائن! ایک ڈرنک بناؤ میرے لیے!'' وہ گہرے سانس لیتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پانے لگا۔

☆☆☆

لاؤنج بالکل خالی تھا۔ ملازمین کی چہل پہل یا کوئی بھی آواز مفقود تھی۔

''برائن کہاں ہے؟'' عدنان نے استفسار کیا۔

''انہی کے ساتھ گیا ہے۔'' جوانا نے بتایا۔

''اور دیگر ملازمین؟''

''سب اپنے کاموں میں مصروف ہیں...... آج رات کی پارٹی کے انتظامات کر رہے ہوں گے۔''

وہ اب لاؤنج کے داخلی دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر اس نے پتھریلی روش اور آس پاس ماحول کا جائزہ لیا۔ اطمینان بھرا سانس خارج کرتے وہ واجد سے مخاطب ہوئی۔

''میں گاڑی اسٹارٹ کرتی ہوں...... میرے اشارے پر فوراً یہ جگہ چھوڑ دینا۔''

''اوکے!'' واجد چوکس ہو گیا۔

اسی پل عدنان کے ذہن میں ایک برق سی کوندی۔

☆☆☆

''اپنا مزاج درست کیجیے مسٹر سپارٹن اور لہجہ ذرا درست کیجیے۔ یہ مت بھولیں کہ میں آپ کا ماتحت یا زرخرید غلام نہیں ہوں، برابری کی بنیاد پر اس پارٹنرشپ کا حصہ ہوں۔'' امریش نے رعونت سے کہا۔

''کم آن امریش! یہ کون سا وقت ہے ایسی بحث میں پڑنے کا؟ یہ تلخی اور مباحثہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔'' جوائس نے غرا کر کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو امریش؟ اگر تمہیں کوئی تحفظات ہیں تو اپنا نقطۂ نظر واضح کرو...... ہم اس کا مدلل جواب دے کر تمہیں مطمئن کر دیں گے۔'' ڈیوڈ نے سپارٹن کا ہاتھ دبا کر اسے کچھ کہنے سے روکا اور نرمی سے گویا ہوا۔

''پارٹنرز! یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ صورتِ حال کس قدر نازک ہے اس لیے میرے

تحفظات بے جا بھی نہیں ہیں۔''

''اب کچھ منہ سے پھوٹو گے بھی یا یونہی اپنی اہمیت جتانے کے لیے الٹی سیدھی ہانکتے رہو گے؟'' سپارٹن نے اپنا جام زور سے پٹخا۔ اس کا دماغ کھولنے لگا تھا۔

☆☆☆

''رک جاؤ جوانا!'' عدنان نے سختی سے کہا۔

''اب کیا ہوا لالہ؟ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟ اپنی حالت دیکھو آئینے میں...... رنگت بالکل زرد پڑ چکی ہے۔ آپ کو واقعی اس وقت فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔'' واجد نے محبت سے اس کا بازو تھام لیا۔

''میں ہال کمرا ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں۔'' عدنان کے مطالبے پر جوانا نے بمشکل اپنے چہرے کے تاثرات نارمل کیے۔

''وہاں اب کچھ بھی نہیں ہے عدنان! انہوں نے اسی رات اپنا سیٹ اپ اکھاڑ لیا تھا۔ وہ بہت محتاط اور پروفیشنل لوگ ہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ وہ اب بھی وہیں تمہاری نام کروز والی انٹری کے منتظر ہوں گے؟''

''سچ کہہ رہی ہو کیا تم؟'' وہ ہنوز مشکوک تھا۔

''ہاں! اب چلو یہاں سے...... قسمت بار بار اس طرح ساتھ نہیں دیتی۔'' جوانا جھنجلا گئی۔

عدنان نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دعوے کی تصدیق کرنی چاہی لیکن وہ رخ موڑے گاڑی کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''مجھے اس شخص پر شک ہے کہ یہ کسی ایجنسی کا آلۂ کار ہے۔'' امریش نے مصطفیٰ کو گھورتے ہوئے انکشاف کیا۔

''بس اسی پاگل پن کی کسر رہ گئی تھی۔'' سپارٹن نے نخوت سے کہا۔

''کس ایجنسی سے تعلق ہے تمہارا؟'' امریش نے براہِ راست ہندی زبان میں دریافت کیا۔

''مسٹر سپارٹن! کیا آپ نے اپنے مہمانوں کو کسی کی بھی یوں تذلیل کرنے کا لائسنس دے رکھا ہے؟'' مصطفیٰ نے بھی اسی زبان میں جواب دیا۔

''میں بھی اسی خطے سے تعلق رکھتا ہوں اور تم سے زیادہ تمہارے ہم وطنوں کو جانتا ہوں۔ یہ لوگ کبھی بھی ایسے کسی پراجیکٹ میں کام کرنے کے لیے راضی ہو ہی نہیں سکتے...... کسی بھی قیمت پر بھی نہیں...... اور اگر اس نے واقعی یہ کام کیا ہے تو اس میں ضرور کوئی سازش ہوگی یا اسے کوئی خصوصی ٹاسک دیا گیا ہوگا...... میں بتا رہا ہوں تمہیں! بہت بڑا پچھتانے والے ہو تم!''

''امریش ڈیئر! یہ تم نہیں، تمہارا خوف بول رہا ہے۔'' مصطفیٰ ہنسا۔

''واٹ ربش! میں کیوں خوف زدہ ہونے لگا؟'' وہ بھڑک گیا۔

''خیر! یہ تو تم خود بھی جانتے ہو......'' اس نے حظ اٹھایا۔

''مصطفیٰ ہمارا وفادار ساتھی ہے۔ اس کی کارکردگی بھی لاجواب تھی۔'' سپارٹن بھی اپنا ضبط کھونے لگا۔

اس خصوصی رات میں یہ بدمزگی اس کے حسین تصورات کا تاج محل چکنا چور کر رہی تھی۔

☆☆☆

گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

جوانا نے اس مہم کے لیے خصوصی طور پر پراڈو کا انتظام کیا تھا جس کے شیشے ٹنٹڈ تھے۔ روش کی دونوں جانب کافی سناٹا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سبھی ملازمین کسی اہم ترین کام میں مصروف ہیں۔ عدنان اپنی قوتِ ارادی کے تحت یہاں تک چلا تو آیا تھا لیکن اب اسے حقیقتاً اپنی جسمانی کمزوری اور دگرگوں حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آنکھوں تلے نقاہت سے اندھیرا چھانے لگا۔

پیاسا

بتیاں گل کر کے اس نے بیٹے کو سو جانے کی ہدایت کی۔ کچھ ہی دیر بعد بچے نے ہانک لگائی۔''ابو...... پانی!''

''سو جاؤ...... اب کچھ نہیں ملے گا...... بار بار باتھ روم جاؤ گے!''

بچے نے وقفے سے دو بار پھر التجا کی مگر باپ نے سختی سے انکار کر دیا۔

جب بچے نے چوتھی بار پانی مانگا تو باپ غرایا۔ ''اب تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو آ کر زوردار تھپڑ لگاؤں گا۔''

''ابو! پیاس لگ رہی ہے۔ جب تھپڑ مارنے آئیں تو آدھا گلاس پانی بھی لیتے آئیں!''

جاوید کاظمی۔ میامی، امریکا

واجد نے اسے ایک جانب سے سہارا دے رکھا تھا۔ انہیں جوانا کی جانب سے سگنل کا انتظار تھا۔ اپنی حالت دیکھتے ہوئے عدنان کو اب کہیں نہ کہیں ان دونوں کی باتیں اور فیصلہ درست محسوس ہونے لگا۔ ایسی صورتِ حال میں سپارٹس اور مصطفیٰ کا سامنا اور ممکنہ مزاحمت اس کے لیے صریحاً خودکشی کے مترادف ہوتی۔

"پروردگارا مجھے تھوڑی سی مہلت اور عطا کر دینا۔ ان موذیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں...... میری اتنی بساط تو نہیں لیکن تیری رحمت میری بساط سے بہت بلند ہے...... اپنے حبیب ﷺ کے صدقے...... مجھے قوت عطا فرما دے۔" اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور بڑھی ہوئی شیو میں جذب ہو گئے۔

☆☆☆

ہال کمرے میں بحث اب شدت اختیار کر چکی تھی۔

امریش کی عیّاری سے دلائل ختم ہی نہ ہو رہے تھے۔ خوشگوار ماحول بدمزگی کا شکار ہو گیا۔ برائن بھی ایک جانب کھڑا اس صورتِ حال کو ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔ ملازمین روبوٹ کی طرح داخلی دروازے کے پاس بے نیازی سے کھڑے تھے جیسے انہیں اس جھگڑے سے کوئی سروکار نہ ہو۔

"تم جس طرح سپارٹس کے اس حسین خواب کی تعبیر کے موقع پر رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہو، اس سے تو مجھے تمہی پر شک ہونے لگا ہے۔" مصطفیٰ نے امریش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسا شک؟ کھل کر بات کرو تم!" سپارٹس چونکا۔

"یہ بار بار میرا تعلق کسی ایجنسی سے جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں وارد ہوتے ہی ہمارے پروگرام میں تاخیر پیدا کرنے کے حربے اپنا رہا ہے۔ اس کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد تو نہیں؟ اور مجھے لگتا ہے، میں وہ مقصد سمجھ چکا ہوں۔" مصطفیٰ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ اسے بولنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔

ڈیوڈ اور جوائس اس ساری گفتگو کی سپارٹس سے بریفنگ لے رہے تھے۔

"اب تو میں بھی جاننا چاہوں گا کہ یہ ینگ مین کیا انکشاف کرنا چاہتا ہے۔" ڈیوڈ نے دلچسپی اور سنجیدگی سے کہا۔

ہال میں سناٹا چھا گیا۔

☆☆☆

جوانا نے گاڑی کی بیک لائٹ تین بار آن کر کے انہیں چوکس رہنے کا سگنل دے دیا۔

عدنان نے بمشکل اپنے حواس مجتمع کیے اور دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھانے لگا۔ واجد مسلسل اسے سہارا دیے ہوئے تھا۔ گاڑی میں بیٹھی جوانا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج تھا۔ وہ کہیں بھی کوئی سقم نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

گاڑی حتی الامکان پیچھے لانے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اپنے موبائل فون سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گئی۔ بادی النظر میں وہ ایسا تاثر دینا چاہتی تھی کہ کسی اہم میسج کا جواب دینے میں مگن ہے۔

عدنان اور واجد گاڑی کے پچھلے دروازے تک پہنچ گئے۔ واجد نے لپک کر دروازہ کھولا اور ہدایات کے مطابق عقبی نشستوں میں دبک گئے۔ شیشے ٹنٹڈ ہونے کے باعث باہر سے دیکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جوانا نے ان کے بیٹھتے ہی سکون کا سانس لیا اور ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

"امریش جب سے یہاں آ کر بیٹھا ہے، مسلسل ایک ہی نقطے پر دلائل دے رہا ہے۔ مسٹر سپارٹس! کیا آپ نے اپنے اس پراجیکٹ کے بارے میں اپنے پانٹرز کو اعتماد میں نہیں لیا تھا؟"

"بالکل لیا تھا۔ ہم چاروں اس دنیا کے بہترین دماغ ہیں... اور کوئی بھی پراجیکٹ کلی طور پر متفق ہونے کے بعد ہی شروع کرتے ہیں تاکہ اس میں کوئی سقم نہ رہ سکے اور ہمارا یہ مووی پراجیکٹ تو ایک مشترکہ خواب ہے۔" وہ سہل ترین الفاظ کا انتخاب کر کے مصطفیٰ کو انگریزی میں جواب دے رہا تھا تاکہ ڈیوڈ اور جوائس بھی مطمح نظر سمجھ سکیں۔

"آپ نے یقیناً یہ بھی بتایا ہو گا کہ میری قومیت کیا ہے؟"

"ویل! ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کاسٹ ایشیائی ہو گی...... تاہم قومیت کے بارے میں کوئی شق نہیں رکھی گئی تھی۔"

"اور اس فیصلے کا مقصد کیا تھا؟"

"یورپی فرد سے کام لینے کی صورت میں اسے تعصب سمجھا جاتا اور مووی تاثرانگیز نہ رہتی۔ صرف یہی مقصد تھا۔"

"عزت مآب امریش صاحب اگر اتنے ہی تحفظات کا شکار ہیں تو اس شق پر پہلے اپنی رائے کیوں نہ دی؟ پہلے

وہ خاموشی اختیار کیے بیٹھے رہے..... اور آج جب یہ پراجیکٹ مکمل ہو چکا ہے تو انہیں کاسٹ مشکوک لگنے لگی ہے۔" مصطفیٰ نے کلائی پر بندھی گھڑی پر غیرمحسوس طریقے سے نظر دوڑائی اور پہلو بدل کر سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ خود ہی کسی ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں آج ہی کے دن، اسی وقت، اسی گھڑی کا خصوصی انتظار ہو تاکہ اپنے 'بڑوں' سے یہاں پر ریڈ کروا کے ثبوت کے ساتھ گرفتاری کروائی جائے۔" اس انکشاف پر سپارٹس اور امریش دونوں ہی ساکت رہ گئے۔

☆☆☆

"گیٹ پر آپ سے کوئی پوچھ کچھ تو نہیں کرے گا کہ اتنی بڑی گاڑی لیے آپ اکیلی اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟" واجد پریشانی اور الجھن میں مبتلا تھا۔ وہ جوانا سے عمر میں بڑا تھا لیکن اس کے قد کاٹھ، جسامت سے قطع نظر احتراماً تکریم دے کر مخاطب ہوتا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا لالہ بوائے۔ یہاں شخصی آزادی کا پورا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ میں ان گارڈز کے سامنے تو کیا، سپارٹس کی موجودگی میں کسی طیارے میں بھی کہیں جاؤں تو وہ مجھ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔" جوانا اس کے چہرے کی معصومیت اور سادگی کی بدولت اُسے چٹکیاں بھرنے سے باز ہی نہ آ رہی تھی۔

"اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ کسی اسپتال لے کر جائیں گی انہیں یا کلینک میں؟"

"کہیں بھی نہیں......" عدنان نے کہا۔ "مجھے اسپتال جانا ہے نہ ہی کسی کلینک...... وہاں بہت وقت لگے گا اور میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"خدا کا خوف کیجیے لالہ! میں آپ کے جذبات سے اختلاف نہیں کر رہا...... لیکن اس وقت آپ کو چیک اپ کی اشد ضرورت ہے۔" واجد بلبلا اٹھا۔

"میں چند دوائیوں اور ضروری اشیا کے نام لکھ دیتا ہوں...... مجھے بس انہی کا بندوبست کر دو۔"

"ٹھیک ہے! میں کرتی ہوں کچھ۔" گاڑی میں کاغذ اور قلم کی غیرموجودگی کی وجہ سے جوانا نے اپنا موبائل غیرمتقل کر کے اسے تھما دیا تاکہ وہ مطلوبہ ادویات کے نام ٹائپ کر دے۔

☆☆☆

"کیا کہا ہے مصطفیٰ نے؟" ڈیوڈ کی آواز نے خاموشی چھناکے سے توڑی اور سپارٹس کو یاد دہانی کروائی کہ وہ ترجمانی کے فرائض فراموش کر رہا ہے۔

سپارٹس یکدم چونکا اور ان دونوں کو اس کے شکوک و شبہات سے آگاہ کر دیا۔

"تم خواہ مخواہ بات کو ایک نیا رنگ دے رہے ہو!" امریش کا چہرہ اہانت سے سرخ ہو گیا۔

"آغاز تمہی نے کیا تھا۔" مصطفیٰ بھی درشت ہو گیا۔

"تم نے کیا مجھے کوئی سڑک چھاپ سمجھ رکھا ہے؟ میں صوبائی دارالحکومت کے سیاستدان کا بیٹا ہوں...... میرے ماضی کا ریکارڈ انتہائی 'شاندار' رہا ہے...... اسلحہ ڈیلنگ بھی کرتے تھے ہم...... میری سوتیلی ماں سونیا کا تعلق بھی تمہارے ہی ملک سے تھا اور میں اسی کا تربیت یافتہ ہوں۔ کچھ مسائل کی وجہ سے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا اور پھر ایجنسیوں سے بچنے کے لیے ہی وہاں سے فرار ہونا پڑا...... سپارٹس کی اس مووی میں صرف اس لیے کام کرنے پر راضی ہوا تھا کہ اس نے مجھے سیاسی پناہ دلوانے کا وعدہ کیا تھا...... میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جب ہم کسی بھی شخص کو اپنے اہم پراجیکٹ میں کام دلواتے ہیں تو اس کا ماضی ایک بار ضرور چیک کر لیتے ہیں...... دور کیوں جاتے ہو؟ تمہاری ہم وطن سونیا جب گھر میں کوئی ملازم رکھتی تھی تو اس کی سات پشتیں کھنگال ڈالتی تھی کہ کسی کا بھی تعلق کسی ایجنسی یا قانون نافذ کرنے والے ادارے سے تو نہیں؟ اور تم سپارٹس کے تجربے کو للکار رہے ہو کہ وہ اتنا احمق ہے کہ اس میگا ایونٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے کسی بھی مشکوک شخص کو کاسٹ کر لے گا۔ یہ پروفیشنل جیلسی ہے یا تم درونِ پردہ کچھ اور کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر امریش یکدم بیک فٹ پر چلا گیا۔

"مصطفیٰ قمر ہوں میں...... ساری زندگی راج کیا ہے میں نے...... منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا تھا۔ سیاسی پناہ کی ترغیب اور اپنے آپ کو پردۂ اسکرین پر دیکھنے کا شوق تھا جو تم جیسے دو ٹکے کے آدمی سے منہ ماری کرنی پڑ رہی ہے۔" اس کے اندر 'حکمران' پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے امریش! میں نے واقعی سب کچھ چیک کروایا تھا۔" سپارٹس کے تیکھے چتونوں سے ماحول کی کشیدگی اور تناؤ مزید بڑھ گیا۔

☆☆☆

"ڈاکٹر نسخہ نہیں مانگے گا کیا؟ ہمارے پاس تو ایسا کوئی مواد ہی نہیں۔" واجد نے اپنی مخصوص زبان دانی میں

دریافت کیا۔

”فکر کیوں کرتے ہو لٹل بوائے! اس کا حل بھی میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ میں نے جس کلب کی ممبرشپ لے رکھی ہے، وہاں بنائے گئے دوست آخر کس کام آئیں گے؟ ایسے ہی ایک دوست کو کچھ عرصہ پہلے ایک پولیس کیس سے بچایا تھا، آج وہ میری مدد کردے گا..... حساب برابر۔“

”واہ ماسی خیراں! یو آر گریٹ!“ جوانا نے نا سمجھی سے کندھے جھٹک دیے۔ گویا یہ کہہ رہی ہو کہ اس لفظ کی تشریح تم سے بعد میں پوچھ لوں گی۔

☆☆☆

”میں نے تو محض ایک ممکنہ بات کہی تھی اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مسٹر سپارٹس کی اہلیت یا تجربے پر شک کر رہا ہوں..... اگر آپ لوگ مطمئن ہیں تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔“ امریش نے یکدم پینترا بدلا۔

”آل رائٹ! ایک جام ہو جائے اور پھر اپنی منزل کی جانب بڑھتے ہیں۔“ ڈیوڈ نے مصالحانہ انداز میں کہا۔

مصطفیٰ کی نظریں امریش کے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کے لبوں پر نظر آنے والی مسکراہٹ سے سونیا ایک بار پھر پوری شدت سے یاد آئی۔ وہ بھی تو یونہی پل بھر میں اپنا مزاج بدل لیا کرتی تھی اور اپنے فائدے کے لیے کسی بھی اخلاقی حد سے تجاوز کر جاتی۔ قمر علی سے ملنے والی مراعات ختم ہوتی نظر آئیں تو مصطفیٰ کی طرف مائل ہو گئی۔

اس کا وجود بے جان ہونے لگا۔

☆☆☆

عدنان کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔

جوانا نے بمشکل ہی سہی لیکن اس کا بتایا گیا سارا سامان اکٹھا کر لیا تھا۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ کی مدھم روشنی میں ہی اس نے چہرے اور گردن سے اسپرٹ اور ڈیٹول کی مدد سے لہو صاف کیا۔

واجد کو ہدایات دے کر اس نے اسپرٹ ہی کے ذریعے اپنے سر کا زخم صاف کروایا۔

”لالہ! کہیں انفیکشن ہی نہ ہو جائے۔“ واجد نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”کچھ نہیں ہوگا..... تم جلدی ہاتھ چلاؤ اور میڈیکیٹڈ پٹی چپکا دو۔“ وہ سختی سے بولا۔

اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے مزید انرجی بارز اور کچھ فریش جوس لیے۔ اس کی چستی لوٹ آئی تھی۔

”آئی ایم فٹ..... کینس موو۔“

☆☆☆

ہال کمرے کا ماحول اب معمول پر آچکا تھا۔

امریش کی فوری معذرت کے ساتھ ہی سپارٹس کی تلخی ختم ہو گئی۔ ڈیوڈ اور جوانس بھی ہلکے پھلکے موڈ میں خوش گپیاں کرنے لگے۔ ملازمین اب بھی مستعدی سے انہیں مختلف لوازمات پیش کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

مصطفیٰ کے ہاتھ میں بھی شراب کا جام تھا۔ بلوریں گلاس میں ہلکورے لیتا جام اس کے ذہن میں کئی بھنور پیدا کرنے لگا۔

”اتنی ڈرنک مت کرو ڈیئر! کہیں انفیکشن بڑھ نہ جائے۔“ سپارٹس نے اسے ٹوکا۔

”آج کی رات بے احتیاطی کر لینے دو یار! اس رات کا بہت انتظار کیا ہے میں نے۔ تمہیں کیا علم؟“

”میں سمجھ سکتا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر کسے انتظار ہوگا بھلا؟“

”تو پھر ایک اور جام ہو جائے..... ایک آخری جام..... تمہاری فتح اور میری نئی زندگی کے نام!“

”چیئرز!“ گلاس کھنکے اور مختلف آوازیں بلند ہوئیں۔

☆☆☆

جوانا شہر کی مختلف سڑکوں سے گاڑی گھماتے اب ایک پوش علاقے میں پہنچ چکی تھی۔ اس عرصے میں پہلی بار اس کے چہرے سے اضطراب اور پریشانی نے اپنی جھلک دکھائی۔

”کیا چھپا رہی ہو ہم سے جوانا؟“ عدنان نے درشتی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... ابھی علم ہو جائے گا تمہیں۔“ اس نے وقت دیکھتے ہوئے پیشانی مسلی۔

”یہ کہاں لے آئی ہو ہمیں؟ یہ وہ علاقہ تو نہیں ہے۔“ واجد نے قرب و جوار پر نگاہ دوڑائی۔

”مجھے یہاں موجودگی کے شواہد پیدا کرنے ہیں۔ یہ وہی کلب ہے جہاں اکثر میری راتیں گزرتی رہی ہیں۔“ اس کا انداز کھویا کھویا تھا۔

”ہمیں یہاں لانے کا کیا مقصد ہے بھلا؟ میں ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میرے لیے ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔“

”جہاں اتنا انتظار کیا ہے، کچھ دیر اور سہی..... اس وقت میری یہاں موجودگی کے عینی شاہدین بہت ضروری

ہیں..... بہت ضروری۔“ کلائی پر بندھی گھڑی پر بار بار وقت دیکھتی وہ بہت عجلت میں تھی۔

”اس وقت..... اس وقت کیا ہے ایسا؟“ وہ مضطرب ہوا۔

جوانا نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی لاک کر کے کلب کی اندرونی جانب بڑھ گئی۔ وہ مادر پدر آزاد کلب تھا جہاں اخلاقی حدود و قیود کی بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ جوانا ان دونوں کو رہا کروانے سے قبل یہاں اپنی انٹری کروا چکی تھی۔ اب کلب کے ریکارڈ کے مطابق وہ ایک گھنٹا قبل ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔

وہ متوازن چال چلتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

عدنان نے غصے سے اپنا ہاتھ سیٹ کی پشت پر دے مارا۔

”ریلیکس لالہ! آجائے گی وہ..... کیوں اتنا ہائپر ہو رہے ہیں؟“ واجد نے تسلی دی۔

”یہ کوئی بات چھپا رہی ہے ہم سے..... کوئی بہت بڑی بات دبائے بیٹھی ہے اپنے دل میں۔“ عدنان ہیجان میں مبتلا ہونے لگا۔

”بس تھوڑے ہی وقت کی بات ہے۔ جہاں اتنا انتظار کیا ہے..... تھوڑا اور سہی۔“ واجد نے سمجھایا۔

”ہاں! اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟“ اس نے آنکھیں موند لیں۔

ایک ایک لمحہ صدیوں کے برابر لگ رہا تھا۔

☆☆☆

مصطفیٰ کے لیے ایک ایک لمحہ صدیوں کے برابر تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنی گھڑی کی جانب دیکھ کر وقت کا اندازہ کیا۔ سپارٹس اور اس کے مہمان ریفریشمنٹ سے فراغت پا چکے تھے۔

”اب مزید تاخیر مناسب نہیں!“ اس نے سپارٹس کو کہا۔

”یس رائٹ!“ وہ بھی ہیجان میں مبتلا تھا۔

برائن نے ہال میں روشنیاں گل کرنے کا آغاز کر دیا۔ ملازمین سامان سمیت جا چکے تھے۔ ان کے باہر روانہ ہوتے ہی مووی چلا دی جاتی۔ برائن، ڈیوڈ، جوانس اور امریش کے چہرے جوش سے سرخ تھے۔ سپارٹس کی حالت سب سے دیدنی تھی۔ مسرت و فخر سے دانت نکوستا وہ کوئی بھیڑیا محسوس ہو رہا تھا۔

اسکرین روشن ہوتے ہی ایک دھماکے نے اُن کے حواس مختل کر دیے۔

☆☆☆

”سوری گائز! مجھے ذرا دیر ہو گئی۔“ جوانا آدھے گھنٹے بعد کلب سے نمودار ہوئی اور معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

ان دونوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ عدنان کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔

”ایسے مت گھورو مجھے..... دی گیم از اوور..... مر چکے ہوں گے وہ سب۔“ اس کے الفاظ نے ان کی سماعت میں دھماکا کر ڈالا۔

”کک..... کیسے..... کب؟“ واجد نے پوچھا۔

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“ جوانا نے دامن بچایا۔

”بالکل ضروری ہے۔ تم نے کلب میں بیٹھ کر ایسی کون سی جادو کی چھڑی گھمائی جو وہاں سب مر گئے؟“ عدنان چلایا۔ ”تم ہم سے بلف تو نہیں کر رہیں؟“

”نہیں، میں کوئی بلف نہیں کر رہی۔“

”تو پلیز بتا دو کہ وہ سب کیسے مرے؟ میری رگیں پھٹ جائیں گی۔“ عدنان نے التجا کی۔

”مصطفیٰ نے سب کچھ ختم کر دیا..... میں سمجھ ہی نہیں پائی اُسے..... وہ جب گھر میں آیا تو مجھے عورت باز، عادی مے نوش اور انتہائی خود غرض انسان لگا تھا۔“ جوانا نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکایا اور بوجھل آواز میں بولی۔

”وہ..... ایسا ہی تھا۔“ عدنان نے گالی دی۔ ”وہ ایک ایسا حیوان تھا جسے دیکھ کر حیوانیت بھی شرما جائے۔“

”نہیں، اس کے اندر بھی ایک 'انسان' سانس لیتا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ سپارٹس نے انتہائی متنازعہ مووی بنائی ہے اور وہ اپنی جہالت و لاعلمی میں اس کا کردار بن بیٹھا..... میرے بہت اصرار پر صرف اتنا ہی مزید بتایا کہ وہ فلم مذہبی تعصب اور منافرت پر مبنی تھی۔“

”مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا۔“ عدنان نے کہا۔

”یقین کر لو..... اس نے مجھے کہا کہ وہ سپارٹس کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہونے دے گا..... اس کے خوابوں کا گلشن عین اس وقت بھسم کرے گا جب وہ بے تابی سے انہیں مجسم دیکھنے کے لیے منتظر ہوگا۔“

”ایسا کیا کر دیا اس نے؟ جس قدر نشے میں وہ رہتا تھا اس کے بعد تو اس کے لیے کوئی 'واٹر پسٹل' چلانا بھی ممکن نہیں تھا؟“ واجد بھی حیران تھا۔

”بلاسٹ..... اُسے کچھ مہلک ڈیوائسز بنانی آتی تھیں..... اس نے وہی تیار کی اور عین اس وقت بلاسٹ کر

دیتا تھا جب سپائرس اور اس کے مہمان وہاں موجود ہوں۔ اب تو وہاں صرف ملبا اور لوتھڑے ہی بچے ہوں گے۔"

عدنان اور واجد گنگ تھے۔ جوانا نے ہاتھ مسلتے ہوئے انہیں دھیرے دھیرے حقیقت سے آگاہ کرنا شروع کیا۔

☆☆☆

"اس وقت تو کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔" دروازہ کھولتے ہی مصطفیٰ نے لوفرانہ انداز میں کہا۔

جوانا بہت سوچنے کے بعد اس کے پاس آئی تھی۔ جانے کیوں برائن کی کہی گئی باتیں اسے ہضم نہیں ہوئی تھیں۔ سپائرس جس روز سے اس کا کیئر ٹیکر بننے کے بعد اس گھر میں منتقل ہوا تھا، ایشیائی افراد کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ وہ ان سے بدترین سلوک کرتا اور بعد میں وہ کہیں نہ کہیں منتقل کردیے جاتے۔ عدنان اور واجد بھی اس معمول کا شکار ہوسکتے تھے لیکن اس کے دل میں ایک کھٹک تھی جسے دور کرنے کے لیے وہ یہاں تک چلی آئی۔

"بولنا تمہارے لیے مناسب نہیں..... بہتر ہے کاغذ اور قلم کا سہارا لے لو!" جوانا نے جواب دیا۔

مصطفیٰ دروازہ مقفل کرنے کے بعد اسے اندر لے آیا اور کاغذ قلم تلاش کرنے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے سوئی!" اس نے پوچھا۔

"جوانا۔"

"سوری جوانا ڈیئر! کاغذ قلم تو مل ہی نہیں رہا۔" اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اور گرامر کے اصولوں سے مبرّا انگریزی میں کہا۔

"تمہارے حواس ٹھکانے پر نہیں ہیں اس لیے کہاں نظر آئے گا کچھ؟" وہ ہنسی۔

"مجھے تمہاری زبان بولنی نہیں آتی، کام کی بات کرلیں اب؟"

"یس شیور..... عدنان کہاں ہے؟"

"مجھے علم نہیں۔"

"مجھے گمراہ کرنے کی کوشش مت کرنا مسٹر، برائن کہہ رہا ہے کہ وہ دونوں ڈی پورٹ کروادیے گئے ہیں۔ لیکن میں یہ بات کبھی تسلیم نہیں کرسکتی..... وہ جس طرح سپائرس کے اصل دھندوں کی کھوج میں لگا تھا، اس کے بعد اچانک واپسی کے لیے کبھی تیار نہیں ہوسکتا۔"

"وہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔" مصطفیٰ نے بتایا۔

"مائی گڈنیس! مجھے اندازہ تھا کہ وہ ان کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔"

"ہاں! وہ بہت غصے میں آگیا تھا۔ اس نے ہم دونوں پر حملہ بھی کیا..... یہ دیکھ لو! ثبوت تمہارے سامنے موجود ہے۔" اس نے اپنی گردن دکھائی۔

"سپائرس تم سے کیا کام کروا رہا تھا بائی داوے؟"

"وہ ایک مووی بنا رہا ہے۔"

"تمہاری زبان دانی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس نے تم سے ایکٹنگ کیسے کروالی؟" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "اپنی باڈا میرا خیال ہے کہ میں جان گئی ہوں عدنان کہاں ہوگا لیکن اسے وہاں سے نکالنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔"

"دیکھو لڑکی! یہ طنز آئندہ مت کرنا..... مصطفیٰ کو کسی کی بات برداشت کرنے کی عادت نہیں۔ تمہارے انکل نے مجھ سے جھوٹ بول کر یہ کام کروایا۔ ڈائیلاگز بولتے ہوئے مجھے ان کے اصل معنی پتا ہی نہ تھے..... کہیں کوئی شک ہوتا بھی تھا تو شراب کا خمار زیادہ گہرائی میں سوچنے ہی نہ دیتا..... میں نے فی الحال سپائرس کا ساتھ دینے کی ہامی بھرلی ہے..... لیکن میرے ذہن میں کچھ منصوبے بہرحال موجود ہیں جن پر عمل درآمد کرنے سے ہم دونوں اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔" اس نے انگریزی کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے بات مکمل کی۔ بات کے دوران وہ بے اختیار اردو بھی بول دیتا تھا۔

"لیکن عدنان؟ اس دوران اگر اسے کوئی نقصان پہنچ گیا تو؟" جوانا متذبذب تھی۔

"دیکھو بے بی! جتنا میں سپائرس کو جان پایا ہوں، وہ ابھی انہیں زندہ رکھے گا اور اذیت دینے کے لیے وہ مووی بھی ضرور دکھائے گا۔"

"آخر ایسا کیا ہے اس مووی میں؟ پچھلی دفعہ بھی ایک شخص نے خودکشی کرلی تھی۔ کہیں وہ نیوڈ....."

"نہیں! ایسا کچھ نہیں ہے۔" مصطفیٰ نے قطع کلامی کی۔ "اگر اس شخص نے خودکشی کی تھی تو یقیناً وہ بہت بہادر تھا۔"

"مجھ سے کیسی مدد چاہیے تمہیں؟"

"مجھے کچھ اشیا درکار ہیں۔"

"یہ لو موبائل! اس میں ٹائپ کردو۔ میں سیو کرلوں گی۔" جوانا نے فون تھمایا۔

مصطفیٰ نے مطلوبہ اشیا کے نام ٹائپ کردیے۔

"واٹ ربش! یہ کیسی چیزیں ہیں؟" وہ اُلجھی۔

"اس تفتیش میں اُلجھوگی تو بہت پچھتاؤ گی..... جو کہہ رہا ہوں جلدی کرو اور خریداری ایک جگہ سے مت کرنا۔"

"اوکے!! ایز یو وش۔" اس نے کندھے جھٹکے۔

☆☆☆

"کیسا سامان تھا وہ؟ کیا منگوایا تھا اُس نے؟" عدنان ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔

"بال بیئرنگ..... کیل..... دو موبائل فون..... اور عجیب الم غلم چیزیں۔" جوانا نے جواب دیا اور ایک بار پھر مصطفیٰ سے ملاقات کا احوال بتانے لگی۔

"ہیئر یو آر!" وہ اس کی مطلوبہ اشیا لے آئی تھی۔

"کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟" وہ مسکرایا۔

"مشکل نہیں..... مشکلات کہو..... عجیب وغریب چیزیں تھیں یہ تو۔"

مصطفیٰ نے بے تابی سے سامان کھولا۔ "پرفیکٹ..... بہت شکریہ!"

"تم کرنا کیا چاہتے ہو آخر؟" وہ متجسس تھی۔

"بتادوں گا سب..... ابھی تم جاؤ یہاں سے۔ میں مناسب وقت پر تمہارے سارے سوالوں کے جواب دوں گا۔"

کمرے سے روانہ ہوتے ہوئے اس نے مصطفیٰ کو ملحقہ واش روم کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ غالباً وہ شاور لے کر اپنا ذہن یکسو کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

"ایک بار پھر سوچ لو..... کیا یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟" پارٹی کے آغاز سے قبل جوانا اس کے کمرے میں موجود تھی۔ برائن اور سپائرس اپنے معاملات میں اُلجھے تھے اس لیے اس کی وہاں موجودگی کسی کی نظر میں نہ آئی۔

"یس! بالکل حتمی..... تمہیں صرف ان سب کے ہال میں جاتے ہی دونوں کو کسی طرح آزاد کروانا ہے۔"

"وہ سب میں بہ آسانی کرلوں گی لیکن میری ایک آخری اُلجھن دور کردو۔"

"تم یقیناً یہ جاننا چاہتی ہو کہ میں نے وہ سامان کیوں منگوایا اور میں اس کا کیسے استعمال کروں گا؟"

"بالکل۔"

"مجھے ماضی میں اپنی سوتیلی ماں کی مہربانی سے ایک پروفیشنل ٹرینر سے ہتھیار چلانے کی تربیت ملی تھی۔ سونیا کے متعین کردہ 'کے۔ ڈی' نے ہتھیاروں کے علاوہ ہمیں کچھ ایسی مہلک ڈیوائسز بنانی بھی سکھائی تھیں جو شہر میں دھماکے اور امن وامان کی صورت حال خراب کرنے کے لیے استعمال ہوسکیں۔"

"مائی گڈنیس! کیا تم نے بھی وہی بنایا؟ لیکن کیسے؟" جوانا کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔

"یہ اصل میں دیسی ساختہ بم ہوتے ہیں جو کہیں بھی اور کسی بھی شکل میں بآسانی بنا کر چھپائے بھی جاسکتے ہیں۔ انہیں بنانے کے لیے کسی بھی بین الاقوامی فارمولا یا طریقۂ کار اختیار نہیں کرنا پڑتا بلکہ بال بیئرنگ، کیل اور مختلف کیمیکل چیزوں کا وافر مقدار میں استعمال ہی خاصی تباہی مچا سکتا ہے۔ اس 'ڈیوائس' کو ایسی بیٹری کی ضرورت بھی ہوتی ہے جس سے 'اسٹارٹرز' کو چارج مل سکے۔ اس کے لیے 'موبائل فون' کا استعمال کیا ہے۔ ایک موبائل اس ڈیوائس میں موجود ہے اور دوسرا میرے ٹراؤزر کی جیب میں۔"

"یہ ڈیوائس کہاں رکھوگے؟" وہ خوفزدہ تھی۔

"خفیہ رستے کے دروازے کی عقبی جانب۔ جب سپائرس وہ مووی دیکھنے کے لیے بالکل تیار ہوگا تو میں اپنے موبائل سے ڈیوائس میں موجود موبائل پر رِنگ کردوں گا جس سے 'اسٹارٹرز' سے 'ایکسپلوزو' تک چارج جائے گا اور یہاں موجود ہر شے ملیا میٹ ہوجائے گی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"بہت ہولناک منصوبہ ہے یہ۔" وہ جھرجھری لے کر گئی۔

"ایک جانب عدنان اور واجد ہیں، دوسری جانب تمہارا سپائرس انکل اور اس کے متنازع منصوبے۔ تم کسے بچانا چاہتی ہو؟"

"عدنان کو۔" اس نے پل بھر میں فیصلہ کر لیا۔

"لیکن اس منصوبے سے تمہاری اپنی زندگی بھی تو نہیں بچ پائے گی۔ تم کوئی درمیانی راہ نہیں نکال سکتے کیا؟ عین موقع پر وہاں سے باہر نکل آنا۔"

"صبح تک یہاں واپس مت لوٹنا۔ عدنان لازماً یہیں رہنے کی ضد کرے گا۔ اس کی ضد اور اصرار کو سنبھالنا بھی تمہارے ہی ذمے ہے..... یاد رکھنا!" اس نے بات پلٹ دی۔

جوانا عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہے پگلی؟ کہیں دل تو نہیں آگیا مجھ پر؟" وہ بائیں آنکھ میچ کر بولا۔

"تم نے ہر قدم پر مجھے حیران کیا ہے مصطفیٰ! میں اب بھی تمہارا یہ فیصلہ سمجھ نہیں پائی ہوں۔"

"میں بھی نہیں سمجھ پایا سوئی! ہال میں بیٹھ کر اس پر غور

ضرور کروں گا۔‘‘ اس نے بائیں آنکھ میچی۔

☆☆☆

’’ناممکن! مصطفیٰ ایسا کیسے کرسکتا ہے بھلا؟ اتنا بڑا قدم...... ناممکن۔‘‘ عدنان نے شدومد سے سر ہلایا۔

’’میں بھی یہی سوچتی تھی...... پھر مجھے اس بات کا جواب بھی مل گیا...... تمہارا مذہب ایک کرشاتی عنصر ہے۔ ایک ایسا بیج جس کی آبیاری کر دو تو وہ انسانی جڑوں میں پیوست ہو جاتا ہے...... بعد میں چاہے کوئی انسان اس سے غافل رہ کر بھی زندگی گزارے لیکن یہ موجود وہیں ہوتا ہے اور زندگی میں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی مقام پر لحوں میں ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔‘‘ جوانا کے اس تجزیے پر عدنان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے ڈیش بورڈ سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ’’یہ تمہارے لیے دیا تھا مصطفیٰ نے!‘‘

واجد نے لپک کر وہ کاغذ تھام لیا۔ لڑکھڑاتی لکھائی میں چند الفاظ قومی زبان میں ہی گھسیٹے گئے تھے۔

’’تم لوگوں کی رہائی میرا قرض ہے...... اس قرض کو چکا دینا...... واپس لوٹ جانا اور پھر کسی مصطفیٰ، واجد یا عدنان کو یہاں مت آنے دینا...... اگر پھر کوئی مصطفیٰ کسی سپائرس کے ہتھے چڑھا تو روزِ آخرت میرا ہاتھ تمہارے گریبانوں پر ہوگا......‘‘

’’اب کیا پروگرام ہے تمہارا؟‘‘ عدنان نے ڈبڈباتی نظروں سے کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا اور جوانا سے دریافت کیا۔

’’صبح ہوتے ہی تم لوگوں کو کسی کمرشل ایریا میں ڈراپ کر دوں گی۔ وہاں کسی بھی دکاندار سے کام طلب کرنا۔ وہ انکار کریں گے۔ تم اصرار کرتے رہنا۔ تمہاری شناخت طلب کی جائے گی۔ تھوڑی ایکٹنگ کرو گے تو وہ خود ہی سمجھ جائیں گے کہ کسی کیمپ سے فرار شدہ ہو اور رجسٹرڈ نہیں ہو۔‘‘

’’او ہو لو! پھر سے وہیں...‘‘ واجد کراہا۔

’’میں ایک وکیل سے بھی بات کر چکی ہوں...... کچھ روز پہلے کیمپ ایریا میں عالمی نمائندے آئے تھے اور کئی اصلاحات نافذ کر گئے ہیں۔ مہاجرین کپڑے کے خیمے کے بجائے کنٹینرز میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ ان کی کاؤنسلنگ بھی کی جا رہی ہے۔ واپسی کے خواہشمند افراد کو IMO کے سپرد کیا جا رہا ہے اور جو لوگ وطن نہیں لوٹنا چاہتے انہیں کہیں اور ڈی پورٹ کر دیا جاتا ہے۔ حالات قدرے بہتر ہیں۔‘‘

وہ دونوں خاموش رہے۔

’’فیصلہ اب تمہی نے کرنا ہے!‘‘ جوانا نے کہا۔

☆☆☆

اس چھوٹے سے آنگن میں آج خوشیوں بھرا سورج طلوع ہوا تھا۔

فجر کی اذان کے بعد سب گھر والے اٹھے تو ڈور بیل کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

’’اتنی صبح سویرے کون آ گیا؟ کہیں تبریز کے بیٹے تو نہیں چلے آئے؟‘‘ گلالئی سراسیمہ ہوئی۔

’’وہ کیوں آئیں گے اب یہاں؟‘‘ ساجد نے کہا۔

بیل ایک بار پھر بجی۔

’’واجد...... باہر واجد آیا ہے لالہ! یہ اسی کا انداز ہے...... ہاں! یہ اسی کا انداز ہے۔‘‘ ماہ گل پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

گلالئی نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ باہر واجد ہی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ ان کے کپڑے میلے، چیتھڑوں پر مائل تھے۔ شیو بڑھی ہوئی اور آنکھوں میں کئی رتجگوں کی سرخی تھی۔

’’کہاں غائب ہو گئے تھے واجی؟ کوئی فون بھی نہیں کیا۔ بس اکاؤنٹ میں پیسے بھیج دینا ہی تیرا فرض تھا کیا؟‘‘ گلالئی نے اُسے گلے سے بھینچ لیا۔

واجد بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد سب نے ایک بار پھر اُسے گھیر لیا۔

’’واجی! تو نے تو کمال کر دیا...... کل ہی تبریز کے بیٹوں کا قرض اتار آیا ہوں۔ پکی رسید بھی مل گئی ہے۔‘‘ ساجد نے شفقت سے اُسے دیکھا۔

’’بہت کڑا وقت گزرا ہے لالہ! میں وہ سب دہرانا ہی نہیں چاہتا۔‘‘ واجد کو وہاں گزرے روز و شب نے جھنجھوڑ دیا۔

جوانا کی بتائی گئی باتیں حرف بحرف پوری ہوئی تھیں۔ انہیں IMO کے حوالے کر کے ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ روانگی سے قبل جوانا نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے کافی رقم انہیں منتقل کروا دی۔

’’اسے میری طرف سے قرض سمجھ لینا...... اور جب لوٹانا چاہو تو خود لے کر آنا... لیکن اس بار قانونی طریقہ اختیار کرنا۔‘‘ اس نے دونوں کے منع کرنے پر حجت سے کہا۔

وہ نئی رہائش گاہ خریدنے سے قبل ہوٹل منتقل ہو چکی تھی اور اپنے وکیل کے توسط سے ان سے مسلسل رابطے میں تھی۔

’’ماہ گل نے بہت دعائیں کی ہیں تمہارے لیے!‘‘ ساجد نے بتایا۔

’’یہ دعائیں ہی شاید ہمارے لیے رہائی کا سبب بن گئیں ورنہ موت تو دو قدم کے فاصلے پر کھڑی ہمارا حوصلہ آزماتی تھی۔‘‘ واجد کی نرم، جذبے لٹاتی نظریں دیکھ کر ماہی کی آنکھوں سے ایک بار پھر برسات جاری ہوئی۔

☆☆☆

’’لالہ! یہیں رہ لو ہمارے ساتھ..... کیا کرو گے واپس جا کے؟‘‘ واجد نے عدنان سے التجا کی۔ وہ چند دنوں سے وہیں رہائش پذیر تھا اور اب واجد مستقل قیام پر مصر تھا۔

’’بہت سے قرض چکانے ہیں۔‘‘ اس کا انداز کھویا کھویا تھا۔

’’ایک بات تو مان لو لالہ! اپنی ڈگری ہی مکمل کر لینا... ماضی میں جو ہوا وہ بدلا تو نہیں جا سکتا لیکن آپ ڈگری ضرور لینا۔‘‘

’’نہیں جگرا! جس درخت کی جڑوں میں تیزاب ڈال دیا گیا ہو وہ کبھی ہریالی نہیں دے سکتا۔ میں ڈاکٹر بن بھی گیا تو میرے ہاتھ میں کبھی شفا نہیں ہوگی۔ میں مسیحا کہلانے کے قابل ہی نہیں۔‘‘

’’تو پھر کیا کرو گے؟‘‘

’’بہت کچھ... تم بھی میرے پاس ضرور آنا! اور رابطے میں رہنا... بہت خوش قسمت ہو تم کہ اس قدر پیار کرنے والے رشتوں میں گھرے ہو۔ ان محبتوں کی قدر کرنا!‘‘ عدنان نے خلوص سے کہا۔

’’اِن شاء اللہ ضرور!‘‘ وہ ایک عزم سے بولا۔

☆☆☆

کلاس کھچا کھچ بھری تھی۔

اس علاقے میں ایک نئی اکیڈمی کا اجرا ہوا تھا۔ یوں تو ہر گلی، محلہ میں ٹیوشن سینٹرز اور اکیڈمیز برسات میں اُگنے والی کھمبیوں کی طرح موجود تھے لیکن اس ادارے نے چند ماہ میں ہی اپنی ساکھ مضبوط کر لی تھی۔

اکیڈمی کا مالک اور کرتا دھرتا ایک ہی شخص تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہاں کسی قسم کی کوئی فیس متعین نہیں کی گئی تھی۔ والدین ادائیگی کے ضمن میں کسی بھی قسم کے دباؤ سے آزاد تھے اور اپنی سہولت و استطاعت کے مطابق بقدرِ توفیق ادائیگی کر دیا کرتے۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ پڑھائی کے سلسلے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی جاتی تھی۔ دیگر اداروں میں جن مضامین پر کم توجہ دی جاتی تھی، یہاں انہیں بھی بطورِ خاص وقت دیا جاتا۔ اساتذہ کی بھرتی بہت چھان پھٹک کر اور احتیاط سے کی جاتی۔ کم عمر اساتذہ کے بجائے تجربہ کار اور ادھیڑ عمر افراد بھرتی کیے جاتے۔ عام طور پر یہ ریٹائرڈ ٹیچرز ہی ہوتے تھے۔

ٹیچرز اور طلبہ ایک ہی بات دہرایا کرتے۔

’’سر عدنان بہت ’رُوڈ‘ ہیں بھئی! اصولوں پر سمجھوتا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔‘‘

عدنان ان تاثرات سے بے خبر ہرگز نہیں تھا تاہم اب اسے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

کلاس کھچا کھچ بھری تھی۔ وہ اپنی اس اکیڈمی میں ’مطالعۂ پاکستان‘ کا پیریڈ ہمیشہ خود لیتا تھا۔ آج کا عنوان بہت یادگار تھا۔

’’قیامِ پاکستان کے اغراض و مقاصد‘‘

اس کے ذہن میں بہت سی یادیں حملہ آور تھیں اس لیے سنجیدگی حد سے سوا تھی۔ طلبہ بھی اس کا مزاج بھانپ چکے تھے اور خاموشی سے لیکچر سننے میں مگن تھے۔

’’پاکستان...... صرف ایک مملکت نہیں...... پناہ گاہ ہے...... ایک شجر ہے اور ہم سبھی جانتے ہیں کہ شجر کیوں اُگائے جاتے ہیں؟ ہم اس کی شاخوں پر موجود وہ پتے ہیں جو اگر اس شجر سے دور ہو جائیں تو اسے بہر حال کوئی فرق نہیں پڑے گا...... فرق پڑے گا تو ہمیں...... ان پتوں کو...... ہم اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور پھر ہر راہ گیر کے پاؤں تلے روندے جائیں گے۔ اس لیے ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا! اس کے اغراض و مقاصد ہماری ذات کی بقا سے منسلک ہیں۔‘‘

اس نے ٹھہرے ہوئے دلنشین انداز میں کتاب میں موجود سبھی نکات مثبت اور مدلل انداز میں سمجھائے اور آخر میں اپنا مخصوص سوال دہرایا۔

’’اینی کوئسچن کلاس؟‘‘

’’سر! اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اس ملک نے ہمیں کچھ نہیں دیا تو اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟‘‘ صائم نامی ایک بے حد ذہین لڑکے نے کہا۔

’’دیکھو بیٹا! ملک ہمیں شناخت دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر ہمارے لیے کچھ بھی نہیں۔ سوال یہ بھی تو ہے کہ ہم

نے اس ملک کو کیا دیا؟ تبدیلی ہم سے مشروط ہے اور ہم ذہنی طور پر اس قدر بیمار ہیں کہ یہاں رہ کر محنت کرنا اور اس ملک کی خدمت کرنا تو باعثِ شرم سمجھتے ہیں لیکن غیر قانونی طور پر بیرونِ ملک جانے اور خوار ہونے کے لیے ہمیشہ بے چین رہتے ہیں۔''

''سر! کیا آپ بیرونِ ملک ملازمت کے حق میں نہیں؟'' سمیر نے پوچھا اس کے والد اور بڑا بھائی ایک خلیجی ریاست میں کام کرتے تھے۔

''میں غیر قانونی راستوں کے حق میں نہیں بیٹا! سب سے پہلے آپ کے ملک کا آپ پر حق ہے...... اگر یہاں روکھی سوکھی بھی ملتی ہے تو کھا لینی چاہیے...... غیر ملک میں انسانیت کے کمتر درجوں میں زندگی گزارنے پر جب اس پناہ گاہ کی یاد آتی ہے تو پھر پچھتانے کے لیے آنسو بھی ساتھ نہیں دیتے۔''

''قانونی راستے سے جانا بھی بہت مشکل ہے سر! گرین پاسپورٹ کی کوئی ویلیو ہی نہیں۔'' صائم نے کہا۔

''اگر ویلیو نہیں ہے تو آپ سب بنائیں گے اس کی ویلیو...... ماضی میں جو ہوا ہم اسے بدل نہیں سکتے لیکن حال اور مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ ہی اسے بدل سکتے ہیں۔'' اس نے عزم سے جواب دیا۔

لیکچر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے دفتر میں چلا آیا جو درحقیقت سراج اور رفیقہ کا کمرا تھا۔

وطن واپسی کے وقت جوانا کی جانب سے اس کے اکاؤنٹ میں بھیجے گئے پیسوں سے عدنان نے توقیر کا قرض ادا کیا اور گھر کے کاغذات لے لیے۔ ابتدا میں صرف ایک کمرے سے پڑھانے کا آغاز کیا۔ اب تعداد اس قدر بڑھ چکی تھی کہ صحن اور دوسرے کمرے میں بھی کوئی جگہ نہ بچی تھی۔ وہ اوپری منزل تعمیر کروانے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

یہ پیریڈ فری تھا۔ اس نے وقت گزاری کے لیے موبائل پر انٹرنیٹ کھول لیا۔ واجد نے اپنے بیٹے کی تصویر بھیجی تھی۔

''میرے ماجد لالہ مجھے پھر سے مل گئے!'' اس کا پیغام پڑھ کر عدنان کو بہت خوشی ہوئی۔

''سدا خوش رہو! پڑھائی کیسی چل رہی ہے تمہاری؟'' اس نے جوابی پیغام میں دریافت کیا۔ وہ ابھی آف لائن تھا۔

تبریز سے لیا گیا قرض ادا کرنے کے بعد اس نے بقیہ پیسوں سے ایک چھوٹے سے باغ کا ٹھیکا لے لیا تھا جس کے بعد معاشی طور پر کوئی تنگی باقی نہ رہی۔ ماہ گل اور واجد نے اپنی پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ عدنان محبت سے اس کے بیٹے کی تصویر دیکھ رہا تھا کہ جوانا کی کال دیکھ کر فوری سبز بٹن دبا دیا۔

''آج میری یاد کیسے آ گئی ماسی خیراں؟'' وہ بشاشت سے بولا۔

''آپ کو آن لائن دیکھا تو کال کر دی۔ فرصت تو آپ کے پاس نہیں ہوتی۔'' اس نے ہنستے ہوئے شکوہ کیا۔

وہ اس لفظ کا مطلب سمجھ چکی تھی کہ اس کی خیر بانٹنے والی فطرت کے باعث ایسا نام دیا گیا تھا۔

''ککل بوائے ڈیڈی بن گیا ہے۔'' عدنان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''امیزنگ! میں آج ہی بات کروں گی اس سے۔'' وہ پُرجوش ہوئی۔

''تمہاری روٹین کیسی چل رہی ہے؟''

''بہت اچھی...... میں نے وکالت کی پڑھائی کے بعد یو این او کا ایک خصوصی ونگ جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مہاجرین کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے کر انہیں بہتر طور پر رہنمائی فراہم کرنے کے لیے سپائرس کی این جی او سے ذیلی کام چلا رہی ہوں۔ اس کے بیٹوں کو اس میں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ اس لیے میں نے اختیارات خرید لیے۔''

''گڈ موو! خدا تمہیں جزائے خیر دے!'' اس نے چند مزید الوداعی کلمات کے بعد کال بند کر دی۔

سپائرس کی موت کے بعد وہ نادیدہ آزار سے رہا ہو چکی تھی۔ جائداد اس کے اکیس سال کے ہونے کے بعد مکمل طور پر مل جاتی۔ وہ ابھی سے اپنے وسائل کا استعمال بہت ذہانت سے کر رہی تھی۔ سپائرس اور اس کے مہمانوں کی موت بھی کئی دن تک سرخیوں میں رہی لیکن سرتوڑ کوشش کے بعد بھی اصل مجرم کا علم نہ ہو سکا۔ ہال کمرے کی مشینری، فلم سمیت پورا گھر ہی جلنے اور راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔

گزرے دنوں کی یاد نے اس کی طبیعت میں بوجھل پن پیدا کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور بیرونی دروازے کے پاس جا کر بورڈ پر نظریں جما دیں۔

'دی فیوچر آف پاکستان' کے الفاظ پر نظر پڑتے ہی اس کے دل میں ہمت و توانائی کا ایک نیا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ وہ ایک نئے جذبے سے پھر اندرونی جانب لوٹ آیا۔

اگلی کلاس کا وقت ہو چکا تھا۔

یہ واقعہ موسم گرما کی ایک طوفانی رات کا ہے۔ ہر دو مہینے بعد سنیچر کی شب جاز کلب زگ زیگ کا مالک لیکی اٹونگی، جاز پلیئرز اور عقیدت مندوں کو اپنے اپارٹمنٹ پر مدعو کیا کرتا ہے۔ اس مرتبہ اس نے پہلی بار مجھے اور بیف کو بھی بُلایا۔ ہم دونوں سیون رنگز نامی بینڈ سے وابستہ تھے۔ بینڈ کے دوسرے لوگوں کو اس دعوت میں شرکت کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ موسیقاروں اور موسیقی کے پرستاروں کے علاوہ اس دعوت میں ایک سیلزمین اور ایک نجومی بھی موجود تھا۔ سب لوگ لیونگ

قیافہ شناس

تنویر واسطی

بھیگے موسم میں ہر شے نکھر جاتی ہے... اور مزاج کے رنگوں میں بھی رنگینی و مستی کا عنصر بڑھ جاتا ہے... ایسی ہی ایک رات کا قصہ جب طوفانِ بادوباراں اپنے عروج پر تھا... مگر شوقین مزاج لوگوں نے ایک ہی جگہ ڈیرے ڈالے ہوئے تھے... اور اپنے اپنے مشاغل سے لطف اندوز ہو رہے تھے... ساز و آواز کے آہنگ کے ساتھ ساتھ کمالاتِ فن دکھانے والوں نے بھی اپنی جادوگری سے سبھی کو سحرزدہ کر رکھا تھا...

اچانک رونما ہونے والی ایک واردات کا ماجرا......

قیافہ شناس نے اپنے اندازوں کی انتہا کر دی......

روم اور باہر بالکونی میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

جب میں بالکونی سے لیونگ روم میں آیا تو دیکھا کہ سیلز مین ناموراہ زگ زیگ، میں کام کرنے والی نوجوان لڑکی اسامی کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"میں تمہیں جادو کا ایک بہت ہی خاص کرتب دکھانے والا ہوں۔" اس نے کہا۔

"واقعی؟" اسامی نے جواب دیا۔

"ہاں، تمہیں اس میں دلچسپی ہے؟"

"بالکل۔" وہ پُرشوق لہجے میں بولی۔

"مسز اتوکی، کیا تم مجھے سفید کاغذ کی ایک بڑی شیٹ مہیا کر سکتی ہو؟"

مسز اتوکی نے اثبات میں سر ہلایا اور کاغذ لینے چلی گئی جبکہ سب مہمان شوق کے عالم میں میز کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ میزبان کی بیوی کاغذ لے کر آئی جسے سیلز مین نے میز پر بچھا دیا۔

"اب میں چاہوں گا کہ سب لوگ اپنی قیمتی اشیا مثلاً گھڑی، انگوٹھی وغیرہ مجھے دے دیں۔" سیلز مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پریشان مت ہوں۔ میں ان چیزوں کو غائب نہیں کروں گا بلکہ انہیں کاغذ پر رکھ کر کچھ دیر بعد واپس کر دوں گا۔ اسامی، کیا تم اپنی یہ انگوٹھی دے سکتی ہو جو تم نے پہن رکھی ہے؟"

"یہ تو زیادہ قیمتی نہیں ہے۔" اسامی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

سب لوگوں نے اپنی انگوٹھیاں اور گھڑیاں اتارنا شروع کر دیں۔ میں نے بھی سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے ڈزنی کی گھڑی پہن رکھی تھی جس کی قیمت چار ہزار ین تھی۔

جب تمام چیزیں میز پر رکھ دی گئیں تو وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "سب چیزیں بہت شاندار ہیں۔ ان میں ایک نیکلس بھی ہے۔ یہ تمہارا ہے مسز اتوکی۔ اب میرا جادو اور زیادہ قابلِ دید ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہار تمہارے شوہر نے شادی کی سالگرہ پر دیا ہوگا؟"

"ہاں۔" مسز اتوکی نے فوراً جواب دیا۔

اچانک ہی ناموراکا لہجہ بدل گیا اور وہ بولا۔ "ہمارے نجومی نے مجھے اپنی گھڑی دینا پسند نہیں کی۔"

"شاید تم نے غور نہیں کیا۔" اس نے مذاق کے انداز میں کہا۔

"لگتا ہے کہ تم گھڑی نہیں پہنتے۔" سیلز مین نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ درست ہے۔ اس سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم اس دور میں بھی وقت دیکھنے کے لیے گھڑی کے محتاج رہیں۔" نجومی نے نپے تلے انداز میں کہا۔

"ہمیں اس شخص کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔" ناموراہ نے اسامی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا پھر وہ سب چیزوں کو کاغذ پر ترتیب سے رکھنے لگا۔ ان کی تعداد سات تھی۔ جن میں گھڑیاں زیادہ تھیں۔ اس کے علاوہ ان میں اسامی کی انگوٹھی اور مسز اتوکی کا نیکلس والا ہار بھی شامل تھا۔

سیلز مین نے تمام چیزیں ایک دائرے کی شکل میں ترتیب دیں۔ اپنی جیب سے ایک فونٹین پین نکالا اور دائرہ کے مرکز سے ہر چیز تک لائنیں کھینچ دیں۔ "اب ہم ان سب پر نمبر لگاتے ہیں۔" اس نے کہا اور ایک سے سات تک ہر چیز کے سامنے نمبر ڈال دیے۔ نقاد کی گھڑی کو ایک اور موتیوں کے ہار کو سات نمبر ملا۔

"یہ کام تو ہو گیا۔" یہ کہہ کر ناموراہ نے اپنی جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس میں سے ایک صفحہ پھاڑ لیا لیکن وہ مطمئن نہیں تھا کیونکہ اس صفحے کا بایاں نچلا کونہ صفائی سے نہیں پھاڑا گیا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے ایک گیند کی شکل دی اور دور پھینک دیا پھر اس نے ایک اور صفحہ پھاڑا، اور اسے اسامی کے حوالے کر دیا۔

"اب تم یہ قلم لو اور اس صفحے پر اس آئٹم کا نمبر لکھ دو جو تمہیں سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کے علاوہ اپنی سب سے بڑی پریشانی بھی لکھو۔ میں اسے حل کر دوں گا۔"

"واقعی؟"

"بالکل، تم لکھو تو سہی پھر دیکھو۔ میں تمہارے لیے کیا کرتا ہوں۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔"

"کیا مجھے یہی پین استعمال کرنا ہوگا؟"

"نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تم وہاں جاکر لکھو۔ میں اپنا منہ دوسری طرف کر لیتا ہوں۔"

اسامی نے ہماری طرف اپنی پشت کر لی اور لکھنا شروع کر دیا پھر بولی۔ "میں نے لکھ لیا۔"

"اب اس کاغذ کو موڑ کر دو تہیں بنالو۔" ناموراہ نے کہا۔ "اب دوبارہ موڑ دو۔ اس کی تہیں بناتی چلی جاؤ۔ یہاں تک کہ مزید گنجائش نہ رہے۔"

"ڈن۔" اسامی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے یہاں لے آؤ۔" سیلز مین نے کہا۔ "اور میز کے پاس کھڑے ہو کر اس مرکزی نقطے کو دیکھو جہاں ساتوں لائنیں مل رہی ہیں۔"

"اس طرح۔"

"ہاں، اب اس چیز کے بارے میں سوچو جو تمہیں سب سے زیادہ پسند ہے اور اس کاغذ کو بیچ میں گرا دو۔"

پہلی کوشش ناکام رہی۔ ناموراہ نے اسے دوبارہ کاغذ پھینکنے کے لیے کہا۔ "تم کوشش جاری رکھو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ اسی نمبر کی طرف جائے گا جو تم نے اس میں لکھا ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں کوشش کرو۔"

اسامی میز پر بچھے ہوئے کاغذ پر جھکی اور پوری توجہ سے کاغذ کی گولی اس پر پھینک دی، اس نے کئی بار یہ عمل دہرایا لیکن وہ گولی دائرے سے باہر ہی رہی۔

عین اسی وقت جاز کے ایک شوقین کوبو نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے کچھ زیادہ پی لی ہے میں ٹوائلٹ جا رہا ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ بہت ہو گیا۔" ناموراہ نے کہا۔ "تم سب نے غور کیا ہوگا کہ زیادہ تر یہ گولی کس سمت میں گئی ہے؟"

"ٹھہرو، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔" اسامی بولی۔

"سات نمبر سات۔"

"واقعی؟" وہ اچانک ہی بہت سنجیدہ نظر آنے لگی۔

"ہاں، اب مجھے اندازہ لگانے دو۔ تم نے کاغذ پر بھی یہی نمبر لکھا ہے کیونکہ تمہیں موتی پسند نہیں لیکن تمہارا خیال ہے کہ نیکلس تمہارے گلے میں اچھا لگے گا۔"

اسامی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "تم نے کیسے ...؟"

"یعنی میرا اندازہ صحیح ہے؟"

"ہاں۔"

"اور اب مجھے تمہاری پریشانی کے بارے میں سوچنے دو۔"

سیلز مین نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔ "مجھے معلوم ہو گیا تم کسی سے محبت کرتی ہو۔"

اسامی یہ سن کر حیران رہ گئی۔ سیلز مین بولا۔ "اور اس کا نام ..."

"نہیں، اس کا نام مت بتانا۔" وہ مڑی اور سیلز مین کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا تم نے اس کا نام کاغذ پر لکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر میں اس کا نام نہیں جان سکتا۔ میرا دماغ صرف وہی کچھ پڑھ سکتا ہے جو تم نے کاغذ پر لکھا ہوگا۔ میں تمہارا ذہن نہیں پڑھ سکتا۔"

کوبو کمرے میں واپس آیا۔ ناموراہ اسے دیکھ کر حیران نظر آنے لگا۔ "کیا ہوا، طبیعت کیسی ہے کچھ بہتر محسوس کر رہے ہو؟"

"ہاں۔" کوبو نے عجیب سے انداز میں جواب دیا۔

☆☆☆

یف اور میں بالکونی کی جنوبی سمت میں کھڑے بپھرتے ہوئے طوفان کو دیکھ رہے تھے۔

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" میرے عقب سے ایک آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہاں کوبو ایک براؤن رنگ کا اونی ہیٹ پہنے کھڑا تھا۔

"میں اکتیس سال کا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ کوبو نے یہی سوال یف سے کیا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پچیس سال کا ہوگا۔

"تمہاری کیا عمر ہے؟" کوبو نے دوبارہ پوچھا۔

"میں تمہیں کیوں بتاؤں؟" یف نے کہا۔

کوبو مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ کیا تم اس گانے بجانے سے اتنا کما لیتے ہو کہ زندگی آرام سے گزر سکے؟"

"اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔" یف نے کہا اور لیونگ روم میں جاکر اپنے ڈرم پر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرم اسٹکس اٹھائیں اور ایک ہلکی پھلکی دھن بجانے لگا۔ اتوکی اس کے پاس جاکر بولا۔ "تم جو چاہو، بجا سکتے ہو۔"

یف نے ایک تیز دھن چھیڑ دی۔ اچانک ستاری کمرے کے عقب سے نمودار ہوا اور اس نے یف کے پاس جاکر کچھ کہا۔ پھر اس نے گٹار اٹھایا اور دونوں مل کر چک کوریا کے مشہور گانے کی دھن بجانے لگے۔ میں نے بھی اپنا ساز اٹھایا اور ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ باقی لوگ بھی وہاں آ گئے لیکن جب گانا ختم ہوا تو وہاں صرف اشیوکا، مسز اتوکی اور نقاد اتوکی رہ گئے تھے جبکہ ناموراہ اور کوبو بالکونی میں چلے گئے تھے۔ جب میں اپنا ساز بجا رہا تھا تو میری نظر میز پر گئی۔ وہاں تمام چیزیں سفید کاغذ کی شیٹ پر ابھی تک رکھی ہوئی تھیں۔

پھر اچانک ہی بجلی چلی گئی لیکن ہم اپنے ساز بجاتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ مسز اتوکی موم بتیوں کا انتظام کرے

گی۔ اسی وقت میں نے ناموراکے چلانے کی آواز سنی۔ ''یہ، مسٹر کوبو۔'' یہ آواز ہمارے عقب سے آئی تھی پھر میں نے بالکونی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی ''یہ۔ مسٹر کوبو۔'' یہ آواز ہمارے عقب سے آئی تھی۔ میں نے بالکونی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور کوئی آدمی اچانک ہی کمرے میں داخل ہوا۔ اندھیرے کی وجہ سے ہم اسے نہ دیکھ سکے۔ پھر غالباً مسز اتوکی نے ٹارچ جلائی۔ اس کی روشنی میں ہم نے ایک آدمی کو باہر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مدھم روشنی میں، میں نے اس کی پشت اور اونی ہیٹ دیکھ لیا۔ وہ کوبو تھا۔ اس کے باہر جاتے ہی دروازہ بند ہوگیا۔

مسز اتوکی کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ ''میرا ہار۔'' مسز اتوکی نے ٹارچ کی روشنی میز پر ڈالی۔ وہاں اب صرف چھ چیزیں نظر آرہی تھیں۔ پانچ گھڑیاں اور ایک انگوٹھی جبکہ موتیوں کا ہار غائب تھا۔ یقیناً کوبو ہی اسے لے گیا ہوگا۔

''کیا ہوا؟'' نامورانے بالکونی سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ گوکہ اندھیرا تھا لیکن میں نے اس کی آواز پہچان لی۔

''میرا ہار چوری ہوگیا۔'' مسز اتوکی نے کہا۔

''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔'' سیلزمین نے کہا۔ ''ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ اپارٹمنٹ کے دروازے کی جانب لپکا۔ آکا اور یف بھی اس کے پیچھے چل دیے۔

''بہتر ہے کہ تم لوگ پہلے اپنی گھڑیاں اٹھالو۔'' نامورا نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ آکا اور یف لمحہ بھر کے لیے ہچکچائے۔ پھر کوئی ان کے قریب سے گزرتا ہوا دروازے کی طرف دوڑا۔ میں نے اپنا ساز نیچے رکھا اور اس کا پیچھا کرنے لگا۔ مدھم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ وہ متاری ہے جو راہداری میں بھاگا چلا جارہا تھا۔ اس سے آگے نامورا تھا جو آگے جاکر دائیں جانب مڑ گیا۔ اس عمارت کی راہداری انگریزی حرف T کی شکل میں تھی اور ہم سب اس کے عمودی حصے کی طرف جارہے تھے۔ آکا اور یف بھی ہمارے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گئے۔

''کیا معاملہ ہے؟'' متاری نے ناموراسے پوچھا۔ اس وقت تک اتوکی اور اسامی بھی وہاں آچکے تھے۔

''لیکن.....'' سیلزمین راہداری کے اختتام پر ریلنگ پر جھکا ہوا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ''یہاں کوئی بھی ہنگامی سیڑھی نہیں ہے۔'' اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے متاری اور میں نے بھی جھک کر دیکھا۔ اندھیرے کی وجہ سے نیچے سڑک پر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ میں نیچے کھڑی ہوئی سفید کار کی چھت دیکھ سکتا تھا۔

''لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مسٹر کوبو کو یہاں آتے اور اس ریلنگ پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ضرور ہنگامی سیڑھی ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ کہاں گیا؟''

''اس راہداری میں ہنگامی سیڑھیاں نہیں ہیں۔'' اتوکی نے کہا۔ ''اور نہ ہی میرے اپارٹمنٹ کے سامنے والی راہداری میں۔ البتہ مغربی راہداری کے اختتام پر ہنگامی سیڑھیاں ہیں شاید کوبو نے سوچا ہو کہ یہاں بھی ایسی ہی سیڑھی ہوگی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس نے موت کے منہ میں چھلانگ لگادی۔''

ہم سب تیزی سے لفٹ کی جانب بھاگے جو راہداریوں کے سنگم پر واقع تھی۔ میں نے لفٹ کا بٹن دبایا لیکن وہ اوپر نہیں آئی۔ تب ہمیں یاد آیا کہ بجلی نہیں ہے۔ لہٰذا ہم سیڑھیوں کی طرف دوڑے جو لفٹ کے برابر میں ہی تھیں۔ سیڑھیوں کے ذریعے گیارہویں منزل سے نیچے آنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ ہم بارش میں بھیگتے ہوئے اس جگہ کی جانب بڑھے جو ہم نے گیارہویں منزل سے دیکھی تھی لیکن وہاں ایک سفید کار کے سوا کچھ نہیں تھا۔

کچھ فاصلے پر اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ اس لیے ہم مکمل طور پر تاریکی میں نہیں تھے۔ یقیناً وہاں کوئی لاش نہیں تھی اور نہ ہی خون نظر آرہا تھا۔ ''یہ بڑی عجیب بات ہے۔'' نامورا چلاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں کیا ہورہا ہے؟''

متاری بارش میں کھڑا نظریں اوپر اٹھائے گیارہویں منزل پر لگی ریلنگ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی لیکن مجھے کہیں بھی کوئی لاش لٹکی ہوئی نظر نہیں آئی۔ ہم بارش سے بچنے کے لیے پہلی منزل کی راہداری کے نیچے آکر کھڑے ہوگئے لیکن سیلزمین کو بارش میں بھیگنے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ سیڈان کار کے پاس گیا اور اس میں جھانک کر اندر دیکھنے لگا۔

''یہ تمہاری کار ہے؟'' متاری نے بہ آوازِ بلند پوچھا۔

''ہاں۔'' نامورانے چلاتے ہوئے جواب دیا۔

عین اسی وقت ہم نے ٹرین کے بریک لگنے کی آواز سنی۔ اس کی پٹری سڑک کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ نامورا نے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر اس آواز کی جانب دیکھا۔ میں اور متاری بھی باہر آکر اس جانب دیکھنے لگے۔ پٹری، سڑک سے بہت اونچائی پر تھی اس لیے ہم صرف ریل کی چھت ہی دیکھ سکے جو کسی وجہ سے اسٹیشن سے کافی دور رک گئی تھی۔

ہم سب واپس سایہ دار جگہ پر آگئے۔ متاری نے کہا۔ ''ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ یہاں کوئی لاش نہیں ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' نامورانے کہا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں۔'' متاری نے ناموراکو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جب ہم اپارٹمنٹ میں تھے تو تم نے بالکونی سے چلاتے ہوئے کوبو کا نام لیا تھا اور پھر وہ بھاگتا ہوا کمرے میں آیا۔ تم دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی تھی؟''

''میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں کیوں بتاؤں، تم پولیس والے نہیں ہو۔'' سیلزمین نے سردمہری سے جواب دیا۔

''جیسا تم مناسب سمجھو۔ اب ہمیں اندر چلنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ ہم بیمار ہوجائیں۔''

لیونگ روم میں واپس آئے تو متاری کے دوست اشیوکا نے پوچھا۔ ''کچھ معلوم ہوا؟'' متاری نے اسے پوری بات بتا دی۔

''بہرحال پہلے ہمیں پولیس کو فون کر دینا چاہیے۔'' مسٹر اتوکی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا اور اس کی بیوی نے بھی تائید کی۔ ''جو کچھ بھی ہوا لیکن کوبو نے ہی موتیوں کا ہار چرایا ہے۔''

اس نے ریسیور اٹھایا اور پولیس کو فون کر دیا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ مسز اتوکی نے لپک کر فون اٹھا لیا۔ ہم سب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''جی ہاں، وہ چند منٹ پہلے یہیں تھا۔ کیا..... کیا۔'' مسز اتوکی کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ یقیناً کوئی بری خبر تھی۔ ہم سب کان لگا کر اس کی بات سننے لگے۔ ''جی، جی۔ میں سمجھ رہی ہوں ایسا ہی ہوگا۔''

جیسے ہی اس نے ریسیور رکھا، اتوکی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''مسٹر کوبو نے خودکشی کرلی۔''

''کیا؟'' سب کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ ''کہاں؟''

''ریل کی پٹری پر، اس نے ٹرین کے سامنے چھلانگ لگادی۔''

یہ کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ اس علاقے میں ریل کی پٹری زمین سے کئی فٹ اوپر تھی اور کسی بھی شخص کے لیے ٹرین کے سامنے آنا ممکن نہیں تھا۔

''کیا اس نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے چھلانگ لگائی؟'' اتوکی نے پوچھا۔

''نہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ جگہ ہماری عمارت سے بہت قریب ہے۔''

''کیا کوبو ریل کی پٹری کے ساتھ چل رہا تھا؟'' اتوکی نے پوچھا۔

''انہوں نے یہاں کیوں فون کیا؟'' نامورانے کہا۔ ''انہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کچھ دیر پہلے یہاں تھا؟''

''اس کی جیب سے ایک کاغذ ملا ہے جس پر ہمارا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔''

سب لوگ اس وضاحت سے مطمئن ہوگئے۔

''وہ چاہتے ہیں کہ کوئی اس کی لاش شناخت کرنے کے لیے فوراً اساکوساباشی اسٹیشن پہنچ جائے۔'' مسز اتوکی نے کہا۔

اس لمحے مجھے یاد آیا کہ ہم نے ٹرین کے بریک لگنے کی آواز سنی تھی اور بالکل اسی جگہ جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے۔ بالائی پٹری پر ٹرین رک گئی تھی۔ لیکن کوبو وہاں کیسے پہنچا؟

''ہم میں سے چند لوگ لاش کی شناخت کرنے چلے گئے جب ان کی واپسی ہوئی تو میں نے اتوکی اور ناموراکے چہروں پر دہشت دیکھی۔

''لگتا ہے کہ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔'' اتوکی نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''ایک ایسی لاش کو جو ٹرین سے نیچے آکر کچلی گئی ہو، دیکھنا بہت ہولناک ہے۔''

''کیا وہ بہت بُری حالت میں تھی؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پورے جسم پر زخم ہوں گے۔'' اتوکی نے کہا۔

''وہ دور جاکر گری تھی اور پوری طرح کیچڑ میں لت پت تھی۔'' اتوکی نے جواب دیا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ کوبو ہی تھا؟'' اتوکی نے پوچھا۔

''ہاں وہ یقیناً کوبو ہی تھا۔'' اس بار متاری نے جواب دیا۔

''اور وہ نیکلس؟'' مسز اتوکی نے پوچھا۔

''وہ اس کی جیب میں تھا۔ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ وہ اسے کل واپس کردیں گے۔ وہ بالکل صحیح حالت میں ہے۔'' اتوکی نے کہا تو اس کی بیوی پُرسکون ہوگئی۔

آکا میری طرف مڑا اور سرگوشی میں بولا۔ ''کوبو گنجا تھا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اونی ہیٹ پہنے رہتا تھا۔''

''واقعی؟''

''ہاں لیکن اس وقت اس کے سر پر ہیٹ نہیں تھا۔''

نقادنے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب یہ قصہ ختم ہوا۔ گوکہ یہ اچھا نہیں ہوا لیکن کوبو چور تھا اس لیے ہمیں

افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ نیکلس بھی محفوظ ہے گویا اب سب ٹھیک ہے۔"

"نہیں۔" متاری بولا۔ "اب ایک بہت ہی خاص مسئلہ سامنے آیا ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟" آکا نے پوچھا۔ باقی سب لوگ بھی متاری کی جانب متوجہ ہوگئے۔

"کیا کسی نے بھی اس پر غور نہیں کیا؟" متاری حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "کوبو کمرے میں آیا۔ اس نے نیکلس اٹھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ عین اس وقت دیوار گیر گھڑی نے دس کا گھنٹا بجایا۔"

مجھے یاد آگیا کہ جس وقت گھنٹا بجنا شروع ہوا تو میں نے ناموراکو اپنے عقب میں بالکونی سے چلاتے ہوئے سنا۔ "ہے، مسٹر کوبو۔" اسی وقت بالکونی کا دروازہ کھلا اور کوبو کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس وقت برقی ساز بجا رہا تھا لیکن بجلی جانے کی وجہ سے وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بجلی دس بج کر تین منٹ پر گئی تھی۔

"ٹرین ڈرائیور کے کہنے کے مطابق یہ حادثہ دس بج کر تیرہ منٹ پر پیش آیا۔ وہ یہ بات اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہا ہے کہ ٹرین دس بج کر گیارہ منٹ پر اسٹیشن سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ہم سب بھی دس بج کر تیرہ منٹ پر باہر تھے اور ہم نے خود ٹرین کے بریک لگنے کی آواز سنی۔ لاش بالائی پٹری پر تھی اور سڑک سے اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا جس کا مطلب ہے کہ کوبو اس کمرے سے نکل کر اسٹیشن تک گیا۔ ٹکٹ گیٹ عبور کر کے پلیٹ فارم تک پہنچا اور وہاں سے ریل کی پٹری کے ساتھ چلتا ہوا اس مقام تک آیا جہاں یہ حادثہ ہوا تھا۔"

سب لوگ تائید میں سر ہلانے لگے۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔

"وہ اس کمرے میں دس بجے تک موجود تھا اور یہ حادثہ دس بج کر تیرہ منٹ پر پیش آیا اس کا مطلب ہے کہ اس نے یہ فاصلہ تیرہ منٹ میں طے کیا ہوگا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے جب ہم اسٹیشن گئے تو ہمیں وہاں پہنچنے میں دس منٹ لگ گئے۔ طوفان اتنا شدید ہے کہ وہ کار سے وہاں نہیں جاسکتا۔"

"وہ کسی بھی صورت میں کار استعمال نہیں کرسکتا تھا۔" آکا نے کہا۔ "وہ یہاں بھی ٹرین سے آیا تھا۔ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس کے پاس لائسنس نہیں ہے۔"

"ممکن ہے کہ وہ ٹیکسی سے گیا ہو۔" اسامی نے خیال ظاہر کیا۔

"اس طوفان میں کوئی بھی ٹیکسی والا وہاں جانے کو تیار نہیں ہوگا۔" اشیوکا نے کہا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس نے پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے یہ فاصلہ آدھے وقت یعنی ساڑھے چھ منٹ میں طے کر لیا ہو۔" اتوئی نے کہا۔

"ناممکن۔" آکا بولا۔ "شاید کوئی اولمپک چیمپئن ایسا کر سکے لیکن کوبو کی عمر چالیس سے زیادہ تھی۔ اس لیے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اتنے کم وقت میں وہ وہاں تک پہنچ سکے۔"

"تم سب ایک بات بھول رہے ہو۔" متاری نے کہا۔ "دس بج کر تین منٹ پر بجلی چلی گئی تھی اور اسی وجہ سے لفٹ کام نہیں کر رہی تھی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اتوئی نے کہا۔ "ہم تو خود سیڑھیوں کے ذریعے نیچے گئے تھے۔"

"اور ہمیں نیچے جانے میں دس منٹ لگ گئے۔ اگر کوبو دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا گیا ہوگا تو بھی اسے کم از کم پانچ منٹ تو ضرور لگ گئے ہوں گے۔" آکا نے کہا۔

"اس طرح اس کے پاس آٹھ منٹ بچتے ہیں، اتنے کم وقت میں اسٹیشن پہنچنا، گیٹ سے گزر کر پلیٹ فارم پر آنا اور پھر جائے حادثہ تک پہنچنا قطعی ناممکن ہے۔" اتوئی نے کہا۔

"اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔" متاری بولا۔ "ناموراکا کہنا ہے کہ اس نے کوبو کو شمالی راہداری کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھا تھا پھر وہ ریلنگ پر چڑھا اور غائب ہو گیا۔"

"ہاں، میں نے یہی دیکھا تھا۔"

"لیکن سڑک پر اس کی لاش نہیں ملی پھر وہ ریل کی پٹری تک کیسے پہنچا؟"

ہم لوگ کافی دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے لیکن یہ معاملہ حل نہیں ہوا۔ نصف شب کے قریب پولیس والوں نے ایک بار پھر فون کر کے کہا کہ وہ اگلے روز کسی وقت آئیں گے اور ہم سب اس وقت تک اتوئی کے اپارٹمنٹ میں ہی رہیں۔

"ہمیں گھر جانے کی اجازت کیوں نہیں مل رہی۔ کیس ختم ہو چکا ہے اور کوبو کی خودکشی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔" نامورا نے اتوئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ہی فون سنا تھا۔

اتوئی یہ فون کال سننے کے بعد کافی فکرمند نظر آرہا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں کہا۔ "اب تک میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ کوبو نے خودکشی کی ہے لیکن پولیس والوں نے بتایا ہے کہ

اس کی گردن پر گلا گھونٹنے کے نشانات ملے ہیں اور لگتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" آکا بولا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک مردہ شخص دوڑتا ہوا جائے اور ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا دے۔ شاید اس کی گردن پر گلا گھونٹنے کے نشانات ملے ہوں لیکن اس سے اس کی موت واقع نہیں ہوئی۔ کسی نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہوگی لیکن وہ اس سے نہیں مرا۔"

"بہرحال قتل کا امکان اپنی جگہ موجود ہے۔" اتوئی نے کہا۔ "اور اسی لیے ہم سب مشتبہ ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہاں رکنے کے لیے کہا گیا ہے۔"

دوسری صبح ناشتے کے بعد ہم بے چینی سے پولیس کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ اتوئی نے ہمارے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد پھر انتظار شروع ہوگیا۔ تین بجے چائے اور اسنیکس سے ہماری تواضع کی گئی لیکن ہم سب اس طویل انتظار سے اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے۔

"ہم کب تک اس طرح بیٹھے رہیں گے؟" اتوئی نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے گھر جا کر ایک مضمون بھی لکھنا ہے۔ آخر ہم کیوں ان احمق پولیس والوں کی پروا کریں۔ کیا ہم میں کوئی اس قابل نہیں کہ اس کیس کو حل کر سکے؟"

"مسٹر نامورا، کیا تم اپنی روحانی قوت استعمال نہیں کر سکتے؟" اسامی نے کہا۔

"میں تمہاری کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔" نامورا نے جواب دیا۔ "کم از کم ایک بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سات کے عدد کا اس کیس سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔"

سب لوگ اس کی بات سن کر بہت متاثر ہوئے لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔

"اسامی نے گزشتہ شب سات کے عدد کا انتخاب کیا تھا۔ کوبو نے جو نیکلس چرایا۔ اس کا نمبر بھی سات ہی تھا اور ہمارے گٹارسٹ نے گزشتہ رات جو گانا گایا، اس کے بولوں میں بھی سات کا لفظ آرہا تھا۔ کیا یہ سب باتیں اس شخص کی جانب اشارہ نہیں کر رہی ہیں جو اس جرم میں ملوث ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ....."

"چپ ہو جاؤ۔" یف چلایا۔ "تم ادھر اُدھر کی ہانک رہے ہو۔ ہم یہاں ساز بجانے آئے تھے۔" نامورا کا اشارہ ہمارے بینڈ سیون رنگز کی جانب تھا۔

"واقعی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے بعد میں تمہارا ڈرم سن سکوں گا۔"

محرم الحرام

اس متبرک مہینے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو دریائے نیل میں ڈبو کر فرعون کے لاشے کو کنارۂ نیل پر بغرض عبرت نہایت ذلت کے ساتھ نمایاں کر کے دکھایا۔ حضرت موسیٰؑ نے تشکر میں یوم عاشورہ کا روزہ رکھا۔ عاشورہ کے دن حضرت نوحؑ کشتی سے جودی پہاڑ پر اترے اور روزہ رکھا اور اپنے ساتھیوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ عاشورہ ہی کے دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ، حضرت یونسؑ اور شہر والوں کی توبہ قبول فرمائی۔ اسی روز بنی اسرائیل کے واسطے دریا پھٹ گیا۔ اسی ماہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت آدمؑ پیدا ہوئے۔ سرورِ دو عالمؐ کا فرمان ہے کہ جو شخص اپنے اہل و عیال پر اس روز رزق کی وسعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ تمام سال اس کے رزق میں وسعت کرے گا اور برکت عطا فرمائے گا۔ اس روز خود حضورؐ نے روزہ رکھا اور اپنے صحابہؓ کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ اسی ماہ دنیا وجود میں آئی۔

کراچی سے انیس رحمانی کا شوقِ مطالعہ

مجھے بالکونی میں ہونے والی یف اور کوبو کی معمولی جھڑپ یاد آئی۔ کیا اس کا کوئی تعلق...

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ مسز اتوئی نے دروازہ کھولا اور ایک آدمی برساتی پہنے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وردی میں ملبوس دو پولیس والے بھی تھے۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ میں سراغ رساں کاتو ہوں۔" اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور بولا۔ "مجھے ہر ایک سے اس کیس کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنی ہیں۔ کیونکہ کچھ باتیں ایسی ہیں جو ہم ابھی تک نہیں سمجھ پائے۔ بہتر ہوگا کہ سب لوگ دوسرے کمرے میں چلے جائیں اور ایک ایک کر کے میرے سوالوں کا جواب دیں۔"

ہم نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور سوال و جواب کا سلسلہ تقریباً ایک گھنٹا تک چلتا رہا۔ تمام تفصیلات جمع کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "گویا کوبو بالکونی سے کمرے میں داخل ہوا، اور اس نے ٹھیک دس بجے یہ ہار چرالیا۔ تمہیں اس بارے میں پورا یقین ہے؟"

ہم سب نے تائید میں سر ہلا دیا۔ کاٹو نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ دیا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ میں اس کے لبوں کی جنبش پڑھ سکتا تھا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ بھی ہمارے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس کا گلا گھونٹا گیا تھا تو ہم میں سے کوئی بھی قاتل نہیں ہو سکتا کیونکہ کوبو زندہ حالت میں اپارٹمنٹ سے باہر گیا تھا جس کا مطلب ہے کہ باہر کے کسی آدمی نے اس کا گلا گھونٹا ہوگا۔

”بہرحال میں تم لوگوں کو ابھی جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ سراغ رساں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ نامورا بولا۔ ”مجھے کل صبح کام پر جانا ہے۔“

”مجھے بھی اس پر اعتراض ہے۔ میرے کئی مسودے نامکمل پڑے ہیں۔ مجھے گھر جا کر ان پر کام کرنا ہے۔“

میں نے متاری کی طرف دیکھا۔ وہ ہمارے پاس ہی کھڑا ہوا تھا لیکن شاید اسے کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی۔ میں نے ہلکے سے کہا۔ ”آج چھ بجے ٹی وی پر چیکوریا کا لائیو کنسرٹ دکھایا جائے گا۔ ہم وہ بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔“

”ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ اس ہنگامی صورتِ حال میں مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ متاری نے کہا اور سراغ رساں کو پکارا جو دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”معاف کرنا مسٹر کاٹو۔ کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ قاتل کون ہے؟“

اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟“

”مجھے کسی کام سے جانا ہے۔ لہٰذا میں بتاؤں گا کہ قاتل کون ہے۔ کیا تم ہتھکڑیاں ساتھ لے کر آئے ہو؟“

سراغ رساں نے اپنی جیب سے ہتھکڑی نکال کر اسے دکھائی اور بولا۔ ”میں ہر جگہ یہ ساتھ لے کر جاتا ہوں۔ میں بھی تو سنوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ مجھے کس کو گرفتار کرنا ہوگا؟“

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ مسز اتوکی دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان سراغ رساں اندر داخل ہوا۔ اس نے پہلے کاٹو کو دیکھا پھر اپنی جیب سے ایک پولی تھین کی تھیلی نکالی جس میں براؤن رنگ کا لفافہ تھا۔

”مسز اتوکی، یہ وہ چوری شدہ ہار ہے جو ہم نے مقتول کے پاس سے برآمد کیا۔ براہِ کرم اسے چیک کر لو۔“

مسز اتوکی جلدی سے اٹھی اور اس نے لفافہ پکڑ کر اس میں سے ہار نکالا پھر وہ چلاتے ہوئے بولی۔

”یہ وہ نیکلس نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ کاٹو حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ تمہارا نیکلس نہیں ہے؟“

”میرا ہی ہے لیکن اس میں یاقوت جڑے ہوئے ہیں اور اس کی قیمت اس نیکلس سے کہیں زیادہ ہے جو چوری ہوا تھا۔ یہ تو میرے بیڈروم کی دراز میں رکھا ہوا تھا۔ گویا اس نے اسے بھی چرا لیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”یاقوت کا ہار؟“ نامورا حیرت سے چلایا۔

”یعنی تمہارا خیال ہے کہ اس نے کوئی دوسرا نیکلس چرایا تھا؟“ سراغ رساں نے پوچھا۔

”ہاں، اس نے میرا موتیوں کا ہار چرایا تھا۔ کیا اس کی جیب میں ایسا کوئی ہار تھا؟“

”نہیں۔“ سراغ رساں نے جواب دیا۔

کاٹو نے متاری کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟“

متاری اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں جلدی میں ہوں اس لیے تیزی سے وضاحت کروں گا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ قاتل کون ہے۔ میں صرف یہ بتاؤں گا کہ یہ سب کیسے ہوا؟“

”ایک منٹ۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ قاتل کون ہے؟“ سراغ رساں نے کہا۔

”یہ سیلز مین نامورا ہی کوبو کا قاتل ہے۔“

نامورا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے بولا۔ ”تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ میں پورے وقت اس کمرے میں موجود رہا۔“

”معاف کرنا۔ میرے پاس تمہاری کہانیاں سننے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ تم ان پولیس والوں کو سنانا۔ میں صرف اپنی بات کروں گا۔ گزشتہ شب اس سیلز مین نے اپنی جعلی روحانی قوت کا مظاہرہ کیا اور سات بیش قیمت چیزیں جمع کر لیں۔“

”کیا؟ وہ جعلی تھا؟“ اسامی نے پوچھا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ متاری نے کہا۔ ”تم نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ ایسا ہی ایک کاغذ اس نے تہ کر کے پہلے سے اپنے جسم میں چھپا رکھا تھا جب تم نے اپنا کاغذ زمین پر پھینکا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اٹھا کر اس کی جگہ اپنا کاغذ رکھ دیا پھر اس نے یوں ظاہر کیا کہ اسے غیبی پیغام موصول ہو رہے ہیں جبکہ وہ تمہارا لکھا ہوا کاغذ گھٹنے پر رکھ کر پڑھ رہا تھا۔ اس نے یہ سارا ناٹک اس لیے رچایا تھا کہ ان میں سب سے قیمتی چیز چرا سکے۔ اس کے لیے اس نے کوبو کو ساتھ ملایا تاکہ وہ ٹوائلٹ کے بہانے باہر جا کر سرکٹ بریکر آف کر دے اور اسے اندھیرے میں ہار چرانے کا موقع مل جائے۔ لیکن وہ تلاشی کے ڈر سے اس ہار کو اپنی جیب میں نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے ضروری تھا کہ وہ اسے جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پر منتقل کر دے۔ میں نے اس بارے میں سوچا کہ یہ کام اس نے کیسے کیا ہوگا۔

”میں نے غور کیا کہ یہ عمارت انگریزی حرف T کی شکل میں بنی ہوئی ہے۔ یہ کمرا T کے بائیں جانب ہے اور اس نے اپنی کار T کے عمودی رخ پر آخری کونے کے نیچے کھڑی کی تھی اس کے علاوہ جب یہ کوبو کی تلاش میں بالکونی سے کمرے میں آیا تو اس کا پورا جسم پانی میں بھیگا ہوا تھا تب مجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی بندوبست کر کے آیا ہے۔ یقیناً اس نے عمودی راہداری کے آخری سرے اور اس اپارٹمنٹ کی بالکونی کے درمیان پہلے سے رسی باندھ رکھی ہوگی اور اسی لیے یہ کل دیر سے آیا تھا۔ میں ایک کاغذ پر ایک نقشہ بنا کر سمجھاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے وہی شیٹ اٹھائی جسے سیلز مین نے استعمال کیا تھا اور اس پر ٹی کی شکل میں راہداری کا نقشہ بنانے کے بعد کہا۔ ”ہم اس کمرے کی بالکونی کو 'اے' اور عمودی راہداری کے آخری سرے کو 'بی' فرض کر لیتے ہیں۔ اس نے رسی کو ایک طرف سے پوائنٹ بی پر ریلنگ میں ڈالا اور دونوں سروں کو کھینچتا ہوا عمودی راہداری کے آخری سرے تک لے گیا پھر اس نے رسی کے ساتھ ایک وزن باندھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ کوئی بہانہ بنا کر ہار لے کر بالکونی میں آئے گا اور اسے وزن کے ساتھ باندھ دے گا پھر وہ رسی کھینچ کر اسے پوائنٹ بی تک پہنچا دے گا جس کے بالکل نیچے اس کی کار کھڑی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ اپارٹمنٹ عمارت کے دوسرے حصے میں ہوتا تو اسے صرف ہار کو رسی میں باندھ کر نیچے لٹکانا ہوتا لیکن کیونکہ اس بالکونی کے بالکل نیچے دریا ہے اس لیے اسے یہ انتظام کرنا پڑا۔

”اگر اسے اس منصوبے پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا تو وہ کوئی بہانہ کر کے نیچے اپنی کار تک جاتا اور نیکلس نکال کر اپنی کار میں رکھ لیتا اور رسی کو کہیں چھوڑ دیتا لیکن میری توقع کے برعکس یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا کیونکہ بجلی نہ جانے کی وجہ سے کوئی بھی قیمتی چیز چوری نہیں ہوئی اور کوبو اپنا کام کیے بغیر کمرے میں واپس آ گیا۔

”میں نے سوچا کہ کھیل ختم ہو گیا اور یہ سب کچھ میرا وہم تھا لیکن پھر میں نے اس کے چہرے پر ناراضی کے آثار دیکھے۔ کوبو نے اسے دھوکا دیا اور اس کے کہنے پر سرکٹ بریکر آف نہیں کیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کوئی غلط کام کرنا نہیں چاہتا

لیکن اس نے لمبا ہاتھ مارا، اور اس سے کہیں زیادہ قیمتی نیکلس چرا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ میں نے خود اس امکان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

”لیکن سیلز مین اتنی آسانی سے اپنے ساتھی کو معاف کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے بالکونی میں جا کر کوبو سے پوچھا کہ اس نے اپنے حصے کا کام کیوں نہیں کیا۔ اس پر ان دونوں میں بحث ہونے لگی۔ جس نے بڑھتے بڑھتے جھگڑے کی شکل اختیار کر لی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سیلز مین کو اپنے غصے پر قابو نہ رہا اور اس نے کوبو کی گردن دبوچ لی۔ اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کوبو کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”جب سیلز مین کے حواس بحال ہوئے تو اس نے جانا کہ وہ ایک بری صورتِ حال سے دوچار ہو چکا ہے۔ وہ لاش کو اس طرح بالکونی میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کیا وہ اسے دریا میں پھینک دے؟ لیکن سب لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ دونوں بالکونی میں گئے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے اسی پر شک کیا جاتا۔ پھر کیا کیا جائے؟

”اچانک اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اس لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے اس رسی کو استعمال کیا جا سکتا ہے جو اس نے نیکلس کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جانے کے لیے باندھی تھی۔ وہ لاش کو رسی کے ایک سرے سے باندھ کر بالکونی سے نیچے لٹکاتا پھر دوسرے سرے کو اپنی جگہ کھڑے کھڑے کھینچنا شروع کرتا۔ یہاں تک کہ لاش پوائنٹ بی تک پہنچ جاتی پھر وہ رسی کو زوردار جھٹکے دیتا۔ اس طرح گرہ ڈھیلی ہوتی اور لاش گیارھویں منزل سے نیچے زمین پر گر جاتی۔ وہ رسی کو واپس اپنی طرف کھینچ کر دریا میں پھینک دیتا اور اس طرح کسی کو اس پر شک نہ ہوتا۔

”نامورا کا خیال تھا کہ یہ ایک شاندار منصوبہ ہے۔ اس نے جوش میں آ کر کوبو کا ہیٹ اتارا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے ساتھی نے یاقوت کا نیکلس چرایا ہے تو وہ اسے بھی اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ اتفاق سے ان دونوں کے سوٹ ایک ہی رنگ کے تھے اور قد بھی تقریباً برابر تھا۔ اس لیے اگر وہ اپنے سر پر اس کا ہیٹ رکھ لیتا تو اندھیرے میں کوبو بن کر ہمیں دھوکا دے سکتا تھا اس وقت سب لوگ ساز بجانے اور سننے میں مگن تھے۔ اس لیے کسی کے بالکونی جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”لیکن جیسا اس نے سوچا تھا، وہ نہیں ہوا۔ جب اس نے لاش کو بالکونی سے نیچے لٹکایا اور رسی کا ایک سرا کھینچنا شروع

کیا تو اس نے اچانک ہی محسوس کیا کہ کوبو کی لاش رسی سے الگ ہو گئی ہے اسی وقت پورے علاقے کی بجلی چلی گئی اور ناموراا اندھیرے میں نہ دیکھ سکا کہ کوبو کی لاش کہاں گری لیکن اس کا اندازہ تھا کہ وہ اس کی کار کے قریب ہی ہوگی۔ اس نے رسی کو بالکونی سے الگ کیا اور دریا میں پھینک دیا اور منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کرنے کے لیے چل پڑا۔

''اس نے کوبو کا ہیٹ اپنے سر پر رکھا اور لیونگ روم کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرنا چاہ رہا تھا کہ کوبو زندہ ہے۔ اس نے ڈرامے میں جان ڈالنے کے لیے کوبو کو نام لے کر پکارا پھر اس نے موتیوں کا ہار جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے بالکونی کے مشرقی حصے میں جا کر کوبو کا ہیٹ دریا میں پھینکا اور کمرے میں واپس آ گیا۔ بالکونی میں کافی دیر رہنے کی وجہ سے وہ بھیگ گیا تھا لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے کسی کی نظروں میں نہ آ سکا۔

''بہرحال جب وہ لیونگ روم میں واپس آیا تو اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے کچھ معلوم نہیں۔ ہار کی گمشدگی کا سنتے ہی اس نے دکھانے کے لیے کوبو کا تعاقب کیا اور راہداری میں دوڑتا ہوا اپارٹمنٹ لی تک گیا۔ اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ کوبو کی لاش عین اسی جگہ نیچے سڑک پر پڑی ہوگی، اس لیے ہمیں بتایا کہ اس نے کوبو کو ریلنگ پر چڑھتے اور چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔ پھر ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے لیکن وہاں کوبو کی لاش نہیں تھی۔

''سب سے زیادہ حیرانی ناموراا کو ہوئی کیونکہ اس کے اندازے کے مطابق لاش کو اس کی کار کے آس پاس ہی گرنا چاہیے تھا لیکن ہواؤں کہ طوفان بہت شدید تھا۔ اور تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ رسی کی گرہ پہلے ہی ڈھیلی تھی۔ اس لیے لاش ایک ہی جھٹکے میں رسی کی گرفت سے آزاد ہو گئی اور اڑتی ہوئی ریل کی پٹڑی پر جا گری۔ جب ناموراا کو کار کے قریب لاش نظر نہیں آئی اور اس نے ٹرین کے رکنے کی آواز سنی تو وہ سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہوگا۔

''جب ہم اپارٹمنٹ کی طرف واپس جانے لگے تو ناموراا ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ وہ لاش ڈھونڈنے کے بہانے اپنی کار تک چلا گیا اور اس نے موتیوں کا ہار اس میں چھپا دیا اس لیے مسز اتوئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہار کار میں موجود ہے۔

''یہ ہے پوری کہانی۔ واقعات جس ترتیب سے پیش آئے، وہ میں نے تمہیں بتا دیے اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ وہ لاش کس طرح ریل کی پٹڑی پر پہنچی۔ اب تمہیں کس بات کا انتظار ہے مسٹر کاٹو۔ اس سے پہلے کہ یہ فرار ہو جائے، اسے ہتھکڑی ڈال دو۔ یہ بہت چالباز ہے۔''

یہ سننے کے بعد کاٹو نے ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگائی اور ناموراا کو ہتھکڑی پہنا دی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ متاری نے اپنا کوٹ اٹھایا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ہم سب حیرت زدہ سے بیٹھے تھے۔

''تم کون ہو؟ کیا تم دوبارہ اپنا نام بتانا چاہو گے؟'' کاٹو نے کہا۔

''متاری۔ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ میں نجومی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ قیافہ شناس بھی ہوں۔''

''حیرت ہے۔ تم نے تو پورا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے جیسے سب کچھ تمہاری نظروں کے سامنے ہوا ہو؟''

''مجھے شروع سے ہی اس شخص پر شک تھا۔ جب اس نے اپنا کرتب دکھانے کے لیے لوگوں کی قیمتی چیزیں اکٹھی کیں تو مجھے اس کی نیت میں کھوٹ نظر آیا۔ ایک سیلز مین شعبدہ باز کس طرح ہو سکتا ہے۔ میں اس کی ہر حرکت نوٹ کرتا گیا پھر جب میں نے واقعات کی کڑیاں ملائیں اور انہیں علم قیافہ کی روشنی میں ترتیب دیا تو سب کچھ واضح ہوتا چلا گیا لیکن اگر اس سے ایک غلطی نہ ہوتی تو شاید میں بھی فوری طور پر اس کی جانب توجہ نہ دیتا۔''

''مجھ سے کہاں غلطی ہوئی؟'' ناموراا چلاتے ہوئے بولا۔

''بہت عمدہ۔ مجھے تمہارا یہ انداز پسند آیا۔ اس واقعے سے سبق سیکھو تاکہ آئندہ غلطی کا امکان نہ رہے۔'' متاری اطمینان سے بولا۔ ''ویسے تم نے کوئی خاص غلطی نہیں کی لیکن تمہیں سات کے عدد کا حوالہ نہیں دینا چاہیے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے تم اپنی جانب اشارہ کر رہے ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''تمہارا پورا نام ناتسوکی ناموراا ہے۔ اگر دونوں ناموں کے پہلے دو حروف ملا کر پڑھے جائیں تو یہ 'نانا' بنتا ہے۔ جاپانی زبان میں سات کو نانا ہی کہتے ہیں۔''

ہم سب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

سراغ رساں کاٹو اس سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس نے متاری سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم سے دوبارہ کب ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''جب تمہارے پاس اس سے بھی زیادہ کوئی پیچیدہ کیس ہو۔'' متاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ اور...

منظر امام

کہتے ہیں کہ مصیبتیں کہہ کر نہیں آتیں... مگر منظر امام کی کہانیوں میں ہر کردار بڑے اہتمام سے انہیں دعوت دیتا ہے... ایک ایسے ہی دلچسپ... پُرلطف کردار کی کوتاہی... اس نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مار لی تھی...

خطرناک لمحوں کو آواز دے کے بلانے والوں کا خوفناک انجام...... وحشت و راحت کا سنگین امتزاج......

وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ بہت ہی بھیانک صورت تھی۔ اس کا قد بھی بہت بلند تھا۔ موٹے، موٹے ہونٹ، لال، لال آنکھیں، پہاڑ جیسا جسم۔ اس کو دیکھ کر میری گھگی بندھ گئی تھی۔ میں وہاں سے بھاگنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے کرخت آواز میں کہا۔ ''ابے کیوں بھاگ رہا ہے۔ تو نے ہی تو بلایا ہے مجھے۔''

''میں...... میں نے کب بلایا ہے؟''

''کیوں؟'' وہ غرایا۔ ''کیا تو نے مجھے قابو میں کرنے

کے لیے وظیفے نہیں پڑھے تھے؟''

''ہاں، ہاں پڑھے تھے۔'' میں نے گردن ہلادی۔

''توتم ہی اخناطوس جن ہو؟''

''ہاں، میں ہی ہوں، تو نے کیا سمجھا تھا کہ تیرے سامنے کوئی اور آکر کھڑا ہوگیا ہے۔''

''بھائی اخناطوس میں تو یہ سمجھا تھا کہ کوئی خوب صورت ساجن میرے سامنے آجائے گا۔''

''تجھے کیا معلوم میں اپنی برادری کا سب سے حسین نوجوان ہوں۔''

اس حسین نوجوان کو دیکھ، دیکھ کر دم نکلا جارہا تھا۔ قصہ صرف اتنا ہے کہ میں نے سگریٹ والے بابا سے یہ کہا تھا کہ ''میں بہت پریشان ہوں، کوئی جاب نہیں ہے، کوئی مستقبل نہیں ہے، ایک وقت کھالیا تو دوسرے وقت فاقہ ہوجاتا ہے، سارے دوست احباب مجھے دیکھ کر کترانے لگے ہیں، ہر ایک سے قرض لے چکا ہوں، مالک مکان نے دھمکی دی ہے کہ اگر کرایہ نہیں ادا کیا تو مکان خالی کروالے گا اور سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ نازنین تک سے ناامیدی ہوگئی ہے۔''

''یہ نازنین کون ہے؟'' سگریٹ والے بابا نے پوچھا۔

''یہ وہ لڑکی ہے جس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے، اس کے باپ کی ایک گروسری کی دکان ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگر میری اس سے شادی ہوگی تو اس کا باپ مجھے اپنے کاروبار میں شریک کرلے گا۔ اس طرح میرے روزگار کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ بس اسی آسرے پر اس سے عشق کیے جارہا تھا لیکن نازنین کے باپ نے اس کی شادی کہیں اور کردی ہے، میرا یہ آسرا بھی ختم ہوچکا ہے، زندگی عذاب ہوتی جارہی ہے۔''

سگریٹ والا بابا سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر سوچ میں مبتلا ہوگیا۔ اس کو سگریٹ والا بابا اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ ہر وقت سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے کیریئر کی ابتدا لوگوں سے سگریٹیں مانگ، مانگ کر کی تھی۔ پھر ترقی کرتے، کرتے بابا کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ اس نے اپنے گرد عقیدت مندوں کی بھیڑ جمع کر رکھی تھی۔ مجھے وہ اس لیے جانتا تھا کہ جب وہ بابا نہیں بنا تھا اس وقت میں اسے سگریٹ پلادیا کرتا تھا اسی لیے وہ میرا مشکور تھا۔

میری دکھ بھری داستان سن کر اس نے یکے بعد دیگرے تین چار سگریٹ پی لیے پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''دیکھو چونکہ تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے اسی لیے تمہاری حیثیت کچھ اور ہے، میرے پاس ایک پرانی کتاب ہے جس میں اخناطوس کو قابو میں کرنے کا طریقہ لکھا گیا ہے، وہ کتاب باپ، دادا کے زمانے سے میرے پاس چلی آرہی ہے، کبھی اس کو آزمانے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

''وہ کیوں؟''

''ایک تو یہ وجہ ہے کہ اس میں بہت گاڑھی قسم کی اردو لکھی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں تو سیدھا سادہ الف، بے، پے والا بندہ ہوں، ایسی اردو اپنے پلے نہیں پڑتی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے کبھی اس کتاب پر یقین نہیں آیا اسی لیے میں نے اس پر عمل بھی نہیں کیا۔''

''تو میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''اس کتاب میں جو وظیفہ لکھا ہے، تم اس پر عمل کرو، ہوسکتا ہے کہ اخناطوس قابو میں آجائے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''بے وقوف انسان، اگر واقعی ایسی کوئی بات ہے تو خود سوچو، اس سے کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہو، تمہارے سارے دلدّر دور ہوجائیں گے، اتنا ہی نہیں بلکہ تم اس کے ذریعے میرا بھی بھلا کرسکتے ہو۔ یہ سمجھو کہ میں خزانے کی چابی تمہارے حوالے کررہا ہوں اور ویسے بھی تمہارے حالات ایسے ہیں کہ تم خودکشی بھی کرسکتے ہو تو کیوں نا خودکشی سے پہلے ایک ٹرائی کرکے دیکھ لو۔ اگر بات بن گئی تو مزہ آجائے گا۔ اگر کچھ نہیں ہوا تو مرنا تو ہے ہی۔ سوچ لو، میں جب تک ایک دو ضرورت مندوں سے نمٹ لوں۔''

میں ایک طرف بیٹھ کر سوچتا رہا۔ اس کی پیشکش پر غور کرتا رہا۔ پھر میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ ویسے بھی زندگی میں سوائے بوریت کے اور رہا کیا تھا۔ ایک تجربہ یہ بھی سہی۔ میں نے ہاں کردی۔ اس کے بعد بابا نے کہا۔ ''اب تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کیسا وعدہ؟''

''یہی کہ اگر اخناطوس قابو میں آگیا تو صرف تم فائدہ نہیں اٹھاؤ گے بلکہ میرا بھی فائدہ ہونا چاہیے۔''

''چلو میں یہ وعدہ کرتا ہوں۔''

اس کے بعد بابا نے اندر سے ایک کتاب لاکر میرے حوالے کردی۔ وہ بہت پرانی کتاب تھی۔ اس کے صفحات خستہ ہورہے تھے، میں اسے گھر لے آیا اور موم بتی کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ موم بتی کی روشنی اس لیے کہ گھر کی لائٹ کٹ گئی تھی۔

اُس کی اردو واقعی بہت مشکل تھی، قدیم دور کی اُردو تھی۔

ے الفاظ متروک ہوچکے تھے لیکن کسی نہ کسی طرح نے وہ طریقہ سیکھ ہی لیا تھا جس سے اخناطوس کو قابو میں کیا سکتا تھا۔ اس کی پہلی شرط یہی تھی کہ دو دن سے کچھ کھایا نہ فاقے کی حالت میں وظیفہ پڑھنا تھا، اور یہ بھی لکھا تھا کہ شروع کرنے سے پہلے ایک مرغی ذبح کی جائے اور اس کا ت چیلوں کو کھلادیا جائے۔

اس کے بعد کسی قبرستان میں بیٹھ کر کسی قبر کی مٹی اپنے سر ڈال کر وظیفہ پڑھا جائے۔ تین دن کے بعد اخناطوس قابو آجائے گا۔ وظیفہ بھی ذرا مشکل تھا، اسے یاد کرنے دشواری ہوئی تھی۔

چیلوں کو گوشت کھلانے کی حد تک تو معاملہ صحیح تھا۔ ے لوگ اس قسم کا صدقہ دیتے رہتے ہیں، لیکن کسی قبر کی کی سر پر ڈال کر قبرستان میں بیٹھ جانا ذرا مشکل ہوگیا تھا۔ لیکن میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

چیلوں کو گوشت کھلانے کے بعد میں ایک قبرستان پہنچ گیا۔ یہ ایک ویران سا قبرستان تھا۔ بہت پہلے یہاں تدفین بند ہوگئی تھی، جگہ ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک قبر کا انتخاب کرلیا۔ جو ذرا سا ہٹ کر تھی۔

میں اپنے ساتھ پھول اور اگربتیاں بھی لے گیا تھا۔ قبر کے پاس بیٹھ کر میں نے اگربتیاں جلائیں، اور ادھر ادھر کی مٹی اٹھا کر سر پر ڈال لی۔ عجیب حماقت سی معلوم ہو رہی تھی۔ ابھی میں نے وظیفہ شروع ہی کیا تھا کہ گورکن نہ جانے کس طرف سے نکل کر میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے حیرت سے میرے حلیے کو دیکھا۔ اب موقع ایکٹنگ کا تھا۔ میں نے رونے کی ایکٹنگ شروع کردی۔ جیسے میں مرنے والے کے غم میں سر پر مٹی ڈال کر رورہا ہوں۔

وہ میرے پاس ہی آکر کھڑا ہوگیا۔ ''صاحب بیس سال کے بعد کوئی اس قبر پر آیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ہاں بھائی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''لوگ اب زندوں کو نہیں پوچھتے تو مردوں کو کون پوچھے گا۔''

''پانی ڈال دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ڈال دو۔''

اس نے دو بالٹی پانی لاکر اس قبر پر ڈال دیا جو نہ جانے کس کی تھی۔ میں نے اسے پیسے دے دیے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''صاحب، آپ کے سر پر اتنی مٹی کیوں لگی ہوئی ہے؟

''کیا بتاؤں بھائی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ 'اپنے آپ کو رو رہا ہوں کہ میں نے اتنے دنوں تک مرنے والے کی خبر کیوں نہیں لی۔ میں ملک سے باہر تھا اسی لیے اس طرف آنا نہیں ہوا۔ اب آیا ہوں تو آتا ہی رہوں گا۔''

''ہاں جی، اس دنیا میں آپ جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔''

وہ اپنی بالٹی لے کر چلا گیا۔ میں نے وظیفہ پڑھنا شروع کردیا۔ وظیفہ مشکل تو نہیں تھا لیکن تین دنوں تک پڑھنا تھا۔ پہلا دن مکمل ہوا تو میں گورکن کو کچھ اور پیسے دے کر واپس آگیا۔ میں نے اس کام کے لیے کسی سے کچھ رقم ادھار لے لی تھی۔

دوسرا دن بھی ایسا ہی تھا۔ اور تیسرے دن اخناطوس میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

وظیفہ کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اخناطوس کو دیکھ کر میری حالت خراب ہوگئی تھی۔

''اخناطوس۔'' بہت دیر بعد میں نے اپنے خوف پر قابو پایا تھا۔ ''تم میرے قابو میں ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں میرے، آقا میں تمہارے قابو میں ہوں، بتاؤ کیا حکم ہے؟''

''اخناطوس، میں تمہیں قابو کرنے کے چکر میں اس حال کو پہنچ گیا ہوں۔'' میں نے اپنے حلیے کی طرف اشارہ کیا۔

''پہلے تو مجھے ڈھنگ کے حلیے میں لے کر آؤ۔ اس کے بعد کوئی

ایک سردار صاحب سڑک کے درمیان ٹہلتے جارہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔ ''خان صاحب ایک سائڈ پر ہوکر چلیں، ٹرک آرہا ہے۔''

خان صاحب غصے سے بولے۔ ''میرے اوپر سے تو جہاز گزر جاتے ہیں، یہ بھلا کیا چیز ہے۔''

☆☆☆

ایک آدمی اپنے گھر میں بیٹھا گانا گا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی بیوی بولی۔ ''میرے ابا مرحوم جب گانا گاتے تھے تو اُڑتے پرندے گر پڑتے تھے۔''

شوہر نے کہا۔ ''کیا تمہارے ابا حضور منہ میں کارتوس ڈال کر گانا گاتے تھے۔''

حسنین عباس، کمیل عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں

اور کام کہوں گا۔“

”یہ تو کوئی مشکل ہی نہیں ہے۔“ اس نے ہاتھوں سے اشارہ کیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے نیا کر دیا ہو، ایک لمحے کی بات تھی دوسرے ہی لمحے میرے جسم پر نیا جوڑا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میرے جسم کی مٹی بھی جھڑ چکی تھی۔ بال سنور گئے تھے، ایسا لگا ہو جیسے میں نہا دھو کر باہر نکلا ہوں۔

میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، اب میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ وہ سارے خواب میری مٹھی میں تھے جو اب تک صرف خواب ہی تھے۔

اب میں اپنا مکان لے سکتا تھا۔ میرے پاس گاڑی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب تک زندگی میں خُسن نام کی کوئی خوشی میرے پاس نہیں آسکی تھی لیکن اب اختاطوس کی مدد سے سب کچھ کر سکتا تھا۔

میں جب اس قبرستان سے باہر آ رہا تھا تو اسی گورکن سے ملاقات ہو گئی لیکن اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس بیچارے نے مجھے بہت بُرے حال میں دیکھا تھا۔ اور اب اس صاف ستھرے حلیے میں دیکھ رہا تھا۔ میں قبرستان سے باہر آیا تو میرے اندر کی دنیا ہی کچھ اور ہو چکی تھی۔ اب میرے اختیار میں بہت کچھ تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں جس قبرستان میں بیٹھا تھا وہ شہر سے دور تھا۔ اور اب وہ بند بھی ہو چکا تھا۔ میں وہاں تک رکشا سے آیا تھا لیکن اب وہ رکشا والا بھی جا چکا تھا اور وہاں سے کوئی سواری بھی نہیں مل سکتی تھی۔

میں اسی پریشانی میں تھا کہ اچانک اختاطوس کی آواز آئی۔ ”کیا بات ہے میرے آقا...... کیوں پریشان ہو؟“

”اختاطوس، میں یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مجھے کیوں بھول گئے آقا، ابھی تمہارے لیے ایک ٹیکسی کا بندوبست کر دیتا ہوں۔“

”لیکن تم مجھے نظر کیوں نہیں آرہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ہر وقت نظر نہیں آتا۔ صرف میری آواز آتی رہے گی۔“ اس نے کہا۔

”چلو ٹیکسی بھیج دو۔“

”آقا یہ سب تو ہو جائے گا لیکن میری ایک شرط بھی ہے۔“

”کیسی شرط......؟“ میں نے پوچھا۔

”تم گھر پہنچ جاؤ، پھر تمہیں بتاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ دیکھو، وہ ٹیکسی آگئی۔ اور تمہارے کرتے کی جیب میں، میں نے پانچ ہزار روپے بھی رکھ دیے ہیں۔“

واقعی سامنے سے ایک ٹیکسی بھی آرہی تھی اور میری جیب میں پانچ ہزار بھی تھے۔ واہ اختاطوس، اس نے تو میری زندگی کے مسائل ہی حل کر دیے تھے، میں بہت شان کے ساتھ اپنے محلے میں ٹیکسی سے اُترا تھا۔

گھر پہنچا تو فوراً اختاطوس کو آواز دی۔ اس نے خود کو بُلانے کا طریقہ بھی بتا دیا تھا۔ بہت آسان طریقہ تھا۔ بس دو بار اختاطوس پکارنا تھا، وہ آ جاتا۔ میں نے بلایا تو وہ آکر کھڑا ہو گیا۔ پہلی بار تو میں اس کی بھیانک صورت دیکھ کر ڈر گیا تھا لیکن اب وہ خوف ختم ہو گیا تھا۔

”کیا حکم ہے میرے آقا؟“ اس نے پوچھا۔

”اختاطوس، میں کرائے کے مکانوں سے تھک چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے لیے اپنے گھر کا بندوبست کرو۔“

”وہ ہو جائے گا آقا لیکن آپ کو یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ میری ایک شرط ہے۔“

”ہاں، یاد ہے، بتاؤ کیا شرط ہے؟“

”آقا مجھے بھوک بہت لگتی ہے، میرے کھانے کا بندوبست کرنا ہوگا۔“

”تمہارے لیے کیا مشکل ہے، تم جب چاہو اپنے لیے کھانا حاصل کر سکتے ہو۔“

”نہیں، یہی تو بات ہے، میں ہوٹل کا کھانا نہیں کھاتا۔ گھر کا پکا ہوا کھاتا ہوں۔“

”کمال ہے، تمہارے لیے کون بنائے گا؟“

”تم بناؤ گے آقا...... تم۔“

”میں...... ؟“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں کیسے بناؤں گا؟“

”دیکھو، میں تمہارے لیے کیا، کیا کر رہا ہوں، اور کرتا رہوں گا، تمہاری اُلٹی سیدھی خواہشات پوری کروں گا، تمہارے پاس اپنی گاڑی ہوگی، بینک بیلنس ہوگا، اور ایک شاندار مکان ہوگا، دنیا کی ہر لڑکی تمہارے پاس آجائے گی۔ کیا ان سب کاموں کے بدلے تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔“

اس کی آفر اتنی زبردست تھی کہ انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیا فرق پڑتا تھا اگر میں اس کی یہ بات مان لیتا۔ اور ویسے بھی میں اپنے لیے کھانے تو بناتا ہی تھا۔ اب اس کے لیے سہی...... اس کے بدلے وہ مجھے کیا، کیا دے رہا تھا۔

”ایک بات اور ہے آقا۔“ اس نے کہا۔

”ہاں کہو...!“

”تم یہ مت سمجھنا کہ تم میری بات ماننے سے انکار کر سکتے ہو، ایک بات یاد رکھو، جس نے ایک بار میری مدد لے لی، اسے ہر حال میں میرے کام کرنے پڑتے ہیں، بولو منظور ہے؟“

”ہاں بھائی منظور ہے۔“

”تو چلو میرے لیے کھانا بناؤ۔ بھنڈی گوشت ...... اور روٹیاں...... ساتھ میں کسٹرڈ بھی بنا دینا۔“

”لیکن بھائی اختاطوس، میرے گھر میں راشن نام کی تو کوئی چیز نہیں ہے۔“ میں نے بتایا۔

”آقا، تم اپنے کچن میں تو جا کر دیکھو، سب کچھ ہے۔“

کچن میں جا کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ واقعی بہت سارا راشن تھا، سب کچھ تھا اور وہ بھی تھوک کے حساب سے۔ اس نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ اب میرا یقین اور مستحکم ہو گیا تھا کہ میرے حالات بدلنے والے ہیں بلکہ بدل ہی گئے ہیں۔

”تو پھر شروع ہو جاؤ۔“ اختاطوس نے کہا۔ وہ میرے ساتھ ہی کچن تک آیا تھا۔ ”آج مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے، بس صرف ستر اسی روٹیاں بنانا۔“

”ستر اسی روٹیاں؟“ میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ ”اتنی روٹیاں کون کھائے گا؟“

”ظاہر ہے میں کھاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”کیوں بھول رہے ہو کہ میں ایک جن ہوں، چلو اسٹارٹ کرو۔“

مرتا کیا نہ کرتا، میں آٹا گوندھنے بیٹھ گیا۔ دو گھنٹوں تک آٹا ہی گوندھتا رہا تھا، ساتھ میں بھنڈی بھی ایک چولھے پر چڑھا دی تھی۔ وہ بھی بیس کلو بھنڈی لے آیا تھا۔ تقریباً شام تک میں اس کے لیے کھانا بناتا رہا تھا جو اس نے آدھے گھنٹے تک ختم کر لیا تھا۔

”اختاطوس۔“ میں کراہ کر بولا۔ ”اب مجھ میں تمہارے لیے کسٹرڈ وغیرہ بنانے کی ہمت نہیں ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وہ ناراض ہو گیا۔ ”ابھی تم نے میرے لیے کام ہی کیا کیا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ خود دیکھو، میں نے تمہارے لیے کتنی محنت کی ہے، اتنی روٹیاں تو بنا چکا ہوں۔“

”لیکن میرا پیٹ کہاں بھرا؟“ اختاطوس نے کہا۔ ”اتنی روٹیاں اور بنا دو۔“

اتنی ہی مزید روٹیوں کا سُن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے جھلا کر کہا۔ ”سوری، اب میں روٹیاں نہیں بنا سکتا۔“

”سوچ لو، تم جانتے ہو کہ میں تمہارا کیا حال کر سکتا ہوں۔ یہ دیکھو۔“ اس نے مجھے پکڑ کر گھمانا شروع کر دیا۔ جس طرح پھرکی کو گھمایا جاتا ہے۔ مجھے قے ہونی شروع ہو گئی تھی لیکن وہ گھمائے جا رہا تھا۔ جب اس نے مجھے چھوڑا ہے تو میرا برا حال ہو رہا تھا۔ مجھ میں اتنی قوت ہی نہیں تھی کہ میں کھڑا بھی ہو سکوں۔

”جاؤ، اتنی اجازت دیتا ہوں کہ اپنا حلیہ درست کر و، نہا کر دوسرے کپڑے بدل لو۔ اس کے بعد پھر روٹیاں بنانی شروع کر دو۔“

خدا کے لیے میں نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”کیا تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، جو مجھ سے دوستی کر لیتا ہے، اس کو میں کبھی نہیں چھوڑتا، جاؤ جلدی۔“

میں اس کے لیے روٹیاں بناتا رہا اور وہ کھاتا رہا۔ ہر بار وہ یہی کہتا تھا کہ کچھ اور...... کچھ اور...... میں ہر بار مزید روٹیاں بنا کر لے جاتا۔ پھر ہوا یہ کہ اس نے جتنا آٹا فراہم کیا تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ میں نے جب یہ بات اسے بتائی تو وہ قہقہہ لگانے لگا۔ اب تم خود کہیں سے آٹا خرید کر لاؤ۔“

”میں کہاں سے لاؤں؟“ میں تقریباً رونے لگا تھا۔

”یہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے کہا۔ ”میرے لیے کچھ اور تو تمہیں کرنا ہی ہوگا ورنہ......؟“

اور میں اس کے اس ورنہ کے ڈر سے اس کے لیے آٹے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ میں نے لوگوں سے خیرات مانگی، دکان داروں سے ادھار کیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے اپنے گھر کی چیزیں بیچنی شروع کر دیں۔ اور وہ کچھ اور کچھ اور کہتا رہا۔

اب میں بالکل تباہ ہو کر رہ گیا ہوں لیکن اختاطوس کی بھوک بڑھتی جا رہی ہے، نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی کہ میں نے اچھی زندگی کی خواہش کی تھی۔ اس کے مطالبے بڑھتے ہی جا رہے ہیں، اور میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں، کیسے جان چھڑاؤں؟

ہو سکتا ہے کہ آپ کو میری یہ کہانی کچھ عجیب سی لگ رہی ہو۔ لیکن ذرا غور کریں، تو ایسا ہی ہو رہا ہے۔ آپ اگر کچھ اور کچھ اور کا ترجمہ انگلش میں کریں تو کیا بنتا ہے؟ ڈو مور، ڈو مور...... ڈو مور ...

اب بتائیں، کیا یہ کہانی غلط ہے؟

انگارے

طاہر جاوید مغل

تینتیسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام ساہوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آیا تھا مگر یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور نالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور نالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیزار ہو کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ مقامی مسجد کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمیندار کا ہاتھ تھا۔ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ ایک گھناؤنی درگاہ کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سجاول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھا۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ سجاول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں بھٹک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوا لیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو دو بیاہتا دلہن کی طرح سجا سنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، دھماکے کی گونج اٹھے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیسٹ کرایا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام قتل و غارت میں آقا جان ملوث تھا مگر کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ ثاقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کر کے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے دو بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا

پیچھا کرتا ہوا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سیف عرف سیفی کی شیخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے۔ یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا بیٹا رائے زل مخالف پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھتیجی قسطینا کمانڈر اور جی دار آفیسر تھی۔ وہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے مجھے جان گئی تھی۔ میں کئی مہم میں اس کے ہمراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن ایجنسی کی قوت نے محل پر دھاوا بول دیا تھا۔ افراتفری اور قتل و غارت گری نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کلی طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زیرِ زمین مقید تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لانچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ ابھی تک باہر موجود تھی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ بن مشہد اور تبارک زیرِ زمین بنکر سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر سخت پہرا تھا...... تبارک پھسل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے ڈھونڈنے جاتے ہیں مگر ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ بے تحاشا تشدد سہنے کے باوجود ہم قسطینا اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے...... سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زہر دے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لونگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ جاماجی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان چکے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پر کفن باندھ چکے تھے۔ ہمارے قافلے کا رخ اب ڈی پیلس کی جانب تھا۔ پال کی مدد سے پوری ٹیم اور عوام کا سمندر ڈی پیلس کی جانب گامزن تھا۔ ہر طرف گولیاں...... شیلنگ اور دھواں دھار لڑائی تھی۔ بالآخر پسپا ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبے اور جنون سے کام لے کر رائے زل کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے حق دار قسطینا اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجور اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد بھاؤ کے پاس تھا لیکن وطن آتے ہی اس دشمن نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا جس سے میں چھپتا پھر رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ پاکستان آ چکا تھا ہر طرف قتل و غارت گری پھیلا رہے تھے...... ڈیتھ اسکواڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی معصوموں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہوگیا تھا میں اور انیق نے ان کے ٹھکانے کا کھوج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ ادھر جاماجی سے خورسنہ آ چکی تھی اور سجاول کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیتھ اسکواڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے انیق کے ساتھ مل کر ان کے ٹھکانے کو تباہ کر دیا اور خود بھی بمشکل یعنی جان بچا پایا۔ اس مقام پر زبردست بلاسٹ ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری گینگ سے بچنے کا ہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر سرجری کے ذریعے تبدیلیاں کروا کے میں اپنوں میں اجنبی بن گیا تھا۔ اجنبی چہرے کے ساتھ ہی سیف کے گھر تک آ پہنچا تھا۔ اصل مقصد میرا تاجور کا حصول تھا میں اس تک پہنچنا چاہتا تھا اس کے گھر والوں نے داراب فیملی میں اس کا رشتہ طے کر دیا تھا مگر اہلِ خاندان اس سے ناخوش تھے۔ سیف کے گھر میں داخل ہو کے مکینوں کے دل میں بھی جگہ بنائی...... اور تاجور سے بھی ملاقات کر لی ...میں اب اسے اپنانا چاہتا تھا اور داراب فیملی سے ہمیشہ کے لیے اس کا ناتا توڑنا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

دروازے پر دوبارہ بیل ہوئی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ، دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔

''کون؟''

جواب میں شرافت کی آواز آئی اور میں نے اطمینان کا سانس لے کر دروازہ کھول دیا۔ شرافت اپنے سسرال سے ہو کر آیا تھا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لو وقاص بھائی، آپ کا مسئلہ حل ہوگیا۔ اب آپ اطمینان سے دس پندرہ روز میرے گھر میں رہ سکتے ہیں۔''

''اپنی بیگم سے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ دفتر کے کام سے مجھے دو ہفتے کے لیے راولپنڈی سے باہر جانا پڑ گیا ہے لہٰذا وہ اکیلی پڑی رہنے کے بجائے چند دن اور ماں باپ کے پاس گزار لے۔''

''تمہارے اور یونس کے تعاون کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس لفظ نہیں ہیں شرافت۔''

''یہ غیروں والی باتیں چھوڑو وقاص بھائی، یہ بتاؤ نکاح کس دن ہے؟''

''جمعے کے دن کا سوچ رہے ہیں۔ تھوڑی بہت تیاری کرنی ہے۔ ایک دو مہمانوں کو بھی آنا ہے۔''

شرافت بولا۔ ''میرے ذمے جو بھی کام ہو، مجھے بلا جھجک بتانا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے اپنا گھر دے دیا، اس سے بڑا کام اور کیا ہوگا۔ پھر بھی کوئی ضرورت ہوئی تو ضرور بتاؤں

گا۔"

"ہاں" کرنے کے بعد سے تاجور کچھ شرمائی ہوئی تھی۔ میرے سامنے آنے سے کترا رہی تھی (اس کی "ہاں" پہلوان حشمت کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچی تھی) شام کے بعد میں نے اسے کچن میں گھیر لیا۔ وہ ہم تینوں کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے منہ پھیرا۔ ایسے موقعوں پر اس کا خون جیسے یلغار کر کے اس کے شفاف چہرے کی طرف آتا تھا اور اسے گلنار کر دیتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ چاولوں کو الٹ پلٹ کرنے میں مصروف ہوگئی۔ میں نے اس کے عین پیچھے جا کر کہا۔ "ہاں کے لیے شکریہ۔"

وہ ذرا توقف سے اور میری طرف رخ کیے بغیر بولی۔ "آپ کا بھی شکریہ اگر آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

"وہ کیوں بھئی؟"

"چاچا حشمت اور شرافت بھائی کیا سوچیں گے.....؟"

"یہی سوچیں گے کہ ہونے والا شوہر اپنی ہونے والی بیوی سے مل رہا ہے۔ ایسا تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"ایسا نہیں ہوتا ناں۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور ایک دم کچھ اداس نظر آئی۔ وہ چولھے کی آنچ دھیمی کرتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے گھر میں ہوتی اور آپ اپنے گھر میں..... تو ہمارے درمیان فاصلہ ہوتا۔ یہی فاصلہ تو ایسے موقعوں کی خوبصورتی ہوتا ہے۔"

"چلو فاصلہ بڑھا لیتے ہیں۔" میں نے کہا اور ایک ڈیڑھ فٹ پیچھے ہٹ گیا۔ "اتنا کافی ہے یا اور بڑھا لوں؟" میں نے پوچھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ آنکھوں میں مسکراہٹ کی ہلکی سی چمک نمودار ہوگئی تھی۔ اتنے میں پہلوان حشمت کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔

"دیکھا ناں۔" تاجور نے جلدی سے پر دوپٹا درست کیا اور پوری طرح چاولوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

پہلوان مصنوعی انداز میں کھانستے ہوئے اندر آ گیا۔ "لگتا ہے کہ بریانی پک رہی ہے، بڑی مزیدار خوشبو آ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "چاچا حشمت! یہ بریانی نہیں۔ اس کو بلیک پیپر کہتے ہیں۔ چائنیز کھانا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ چاندگڑھی سے نکلنے کے بعد ہماری بٹیا بھی ماڈرن ہوگئی ہے۔ ویسے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وہ کیا محاورہ ہے جیسا دیس ویسے فرشتے۔"

میں نے درستگی کی۔ "جیسی روح ویسے فرشتے اور جیسا دیس ویسا بھیس۔"

"چلو بات تو سمجھ میں آ گئی ناں، ویسے میں تم سے ایک اور بات بھی کرنا چاہتا ہوں، اگر نکاح میں......"

وہ بات کرتے کرتے چپ ہوگیا کیونکہ کہیں پاس ہی شرافت کی آہٹ سنائی دی تھی۔ شرافت کی موجودگی میں پہلوان اور تاجور مجھے وقاص کے نام سے مخاطب کرتے تھے..... بلکہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کے سامنے بات ہی نہ کی جائے۔

تھوڑی دیر بعد جب میں اور حشمت کمرے میں پہنچے تو حشمت نے مسرور لہجے میں کہا۔ "آج بہت عرصے بعد تاجور بٹیا کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی ہے۔ کہیں نظر نہ لگ جاوے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ پورے چاندگڑھی کی آنکھ کا تارا تھی یہ..... اگر اس کی شادی چاندگڑھی میں ہو رہی ہوتی تو پورے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی دعائیں اس کے ساتھ ہوتیں۔"

"چلیں کوئی بات نہیں چاچا حشمت! آپ کی صورت میں پورے گاؤں کے بزرگوں کی نمائندگی موجود ہے۔"

"جمعے کا دن پکا ہے ناں؟" پہلوان نے تصدیق چاہی۔

"انشاءاللہ!"

"اس کا مطلب ہے ابھی چھ دن باقی ہیں۔ اگر تم دونوں اجازت دو تو میں بس ایک چکر چاندگڑھی کا لگا آؤں۔ وہاں شکل دکھا آؤں، پھر پورے اطمینان کے ساتھ تمہارے نکاح کی تیاری کروں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے کہا۔

اگلے روز پہلوان چاندگڑھی کے لیے روانہ ہوگیا۔ جاتے وقت تاجور نے اسے خاص طور سے ہدایت کی کہ وہ چوہدری بشیر کے گھر جائے اور گھر والوں کی خیر خبر لائے۔ سیف کی بڑی بہن شازیہ اور تاجور میں گہری دوستی تھی۔ سیف کی ناگہانی موت کے بعد اس کے گھر والوں پر اور شازیہ پر جو کچھ گزری تھی، اس نے تاجور کو براہ راست متاثر کیا تھا۔ سیف کی والدہ کی موت کا اندوہناک واقعہ تو تاجور کے ذہن سے نکلتا ہی نہیں تھا۔

پہلوان حشمت کے جانے کے بعد جب شرافت بھی دفتر گیا ہوا تھا، میں اور تاجور گھر میں اکیلے تھے، ہم دونوں نے وہ کمرا سلیکٹ کیا جو ہم دونوں کے مشترکہ استعمال میں آ نا تھا۔ اس کی آرائش کے حوالے سے تاجور نے شرماتے ہوئے انداز میں ایک دو مشورے بھی دیے پھر کتی کترا کر وہاں سے چلی گئی۔

رات تک سب کچھ ٹھیک تھا مگر اگلے روز مجھے وہ پھر کچھ بجھی بجھی سی لگی۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ اپنے گھر والوں سے دوری کا دکھ رہ رہ کر اس پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم کھو سی جاتی تھی۔ گھر میں ٹیلی ویژن موجود تھا مگر میرے کہنے پر شرافت نے اس کا کنکشن کاٹ دیا تھا اور تاجور کو یہی بتایا تھا کہ کیبل وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ باہر کی کوئی بھی پریشان کن خبر تاجور کی سماعت تک پہنچے۔ تین دن پہلے وہاں گوجرانوالہ میں جو کچھ ہوا تھا، وہ بہت تہلکہ خیز تھا۔ ٹی وی اور اخبارات میں مسلسل اس حوالے سے خبریں آ رہی تھیں۔ ان میں مختار جہارا اور اس کے ساتھیوں کی اندوہناک موت کا ذکر بھی تھا اور رانیق کے بچ نکلنے کی اطلاع بھی۔ ان آہنی میخوں اور شکنجوں کی تصاویر بھی میڈیا پر دکھائی جا رہی تھیں جن کے ذریعے بھاؤ گینگ کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یہ سارا واقعہ اسی رات ہوا تھا جس رات میں راولپنڈی سے غائب ہو کر لاہور پہنچا تھا اور تاجور صبح تک میرے لیے پریشان رہی تھی۔ اگر اس واقعے کی خبر اسے ہو جاتی تو وہ اس واقعے اور میرے اوجھل ہو جانے میں تعلق ڈھونڈ سکتی تھی جو مجھے کسی صورت قبول نہیں تھا۔ میں اسے بار بار یہی باور کرا رہا تھا کہ اپنی اس نئی شخصیت کے ساتھ میں ماضی سے اپنا ہر تعلق توڑ رہا ہوں۔

اسی شام سجاول کے ذریعے مجھے یہ خبر ملی کہ پولیس پپ والا اسلام آباد میں ہے اور اس نے یہ اچھی اطلاع دی ہے کہ تاجور کی والدہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر اسی بنگلے میں واپس آ گئی ہے جہاں وارج نے باقی گھر والوں کو رکھا ہوا ہے۔

میں نے یہ خبر تاجور کو بتا کر اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی اور واقعی اس کے چہرے پر سکون کی جھلک دکھائی دی۔ وہ بولی۔ "میں نے بہت دکھ دیے ہیں ان کو..... اور اب بھی دے رہی ہوں۔ جب انہیں بتایا جائے گا کہ میں گھر سے چلی گئی ہوں تو پتا نہیں، وہ اس خبر کو کیسے سہیں گی۔"

"تاجور! انہیں فوراً تو بتایا بھی نہیں جائے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ جب بتایا جائے گا تو وہ دکھی ہونے کے بجائے سکھ کا سانس لیں گی کہ تم ان شکاریوں کے جال سے بچ نکلی ہو۔ تم دیکھ لینا تمہارے اس فیصلے کو تمہارے سارے سچے ہمدرد اچھی نظر سے ہی دیکھیں گے۔"

وہ اپنی والدہ کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اسے وہی کچھ بتایا جو سجاول کی زبانی مجھ تک پہنچا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے باقی گھر والے بھی اسلام آباد کے اس بنگلے میں ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔ میں نے اسے اس کے بڑے ماموں کی خیر سلامتی کی اطلاع بھی دی۔

رات کو جب میں اپنے کمرے میں لیٹا تھا اور نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا، مجھے یوں لگا کہ ساتھ والے کمرے میں تاجور فون پر کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم جانا مگر پھر اٹھ کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ آواز بہت دھیمی تھی..... اور پھر بند ہوگئی۔ میں دوبارہ بستر پر آ گیا۔ کل شام بھی مجھے ہلکا سا شک ہوا تھا کہ جیسے وہ فون پر کسی سے بات کر رہی ہے۔ وہ اتنی نا سمجھ تو ہرگز نہیں تھی کہ اپنے عزیزوں میں سے کسی کو اپنی "لوکیشن" کے بارے میں بتا دیتی۔ آج کے یہی امکان تھا کہ اس نے ہمراز ملازمہ فردوس سے بات کرنے کی کوشش کی ہو اور اس سے اپنے بھائیوں اور والدہ وغیرہ کی خیریت دریافت کی ہو۔

مگر ایسا تھا تو بھی اسے مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ کل تک مجھ سے اس بارے میں کوئی بات کرے۔ انہی خیالوں میں الجھا سلجھا میں سو گیا۔ صبح اٹھ کر فریش ہوا ہی تھا کہ ناشتے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ ٹرے لیے سامنے کھڑی تھی۔ ہلکے گرے رنگ کا سوٹ پہنے اور سرخ کناری والے گرے دوپٹے کے ساتھ ہمیشہ سے زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم اس دلکشی میں سنجیدگی اور دکھ کی آمیزش بھی موجود تھی۔

"بہت دیر تک سوتے ہیں آپ۔" وہ شکوہ کناں لہجے میں بولی۔

"لیکن لگتا ہے کہ اب عادتیں تبدیل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

لہو نے ہمیشہ کی طرح اس کے شفاف چہرے کی طرف یلغار کی مگر میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ اس "یلغار" میں پہلے والی شدت نہیں تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔ کہیں جاگتی تو نہیں رہی ہو؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے عام لہجے میں کہا پھر بات بدلنے کی غرض سے بولی۔ "چاچا حشمت سے کوئی رابطہ ہوا آپ کا؟ میرا مطلب ہے چاچا بشیر کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے ناں..... مجھے کسی وقت بڑا ڈر لگتا ہے۔

چاچا بشیر کی طرف سے بھی لگتا ہے کہ بیٹے کی موت کا دکھ انہیں بھی کھا رہا ہے۔"

"نہیں تاجور، انہوں نے یہ دکھ سہہ لیا ہے۔ والدہ کی بات اور تھی۔ وہ پہلے ہی دل کی مریضہ تھیں۔ بجھتے ہوئے دیے کی طرح تھیں ....."

پھر میں نے تاجور کو بتایا کہ سیف کی والدہ کو بیٹے کی موت کی اطلاع دینے سے پہلے میں نے کتنی احتیاط سے کام لیا تھا...... اور کس طرح کوشش کی تھی کہ ان کو کم سے کم صدمہ پہنچے۔ تاجور کو بھی اس بارے میں سیف کی بہن شازیہ کی زبانی کافی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ بطور "ڈرائیور وقاص" میں نے سیف کی والدہ کو پہلے لاہور کے ایک بہترین اسپتال میں ایڈمٹ کروایا تھا...... اور تب ان تک سیف والی خبر پہنچنے دی تھی۔

میں نے اس کے علاوہ بھی سیف کے گھر والوں کے لیے کچھ نہ کچھ کیا تھا۔ ان باتوں کی خبر تاجور کو نہیں تھی۔ میں نے اپنے منہ سے بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔ اس گفتگو کے دوران میں، میں منتظر رہا کہ شاید تاجور مجھے رات والی ٹیلی فونک بات چیت کے بارے میں کچھ بتائے لیکن وہ خاموش رہی۔ میری الجھن میں تھوڑا سا اضافہ ہو گیا۔

وہ شیشے کی طرح شفاف لڑکی تھی۔ اس کے اندر کے احساسات اس کے بلوری چہرے پر فوراً جھلک دکھاتے تھے، اور اس کی شکل گواہی دے رہی تھی کہ وہ اندر سے پریشان ہے۔ میں نے اس کا موڈ بحال کرنے کے لیے ایک بار پھر ہلکی پھلکی باتیں شروع کر دیں۔

میں نے کہا۔ 'اب زیادہ دن نہیں ہیں۔ تھوڑی بہت پلاننگ کر لو۔ میں نے گزارش کی تھی کہ ایک بار خورسنہ سے بھی بات کر لو۔ وہ نئی نئی شادی شدہ ہے۔ تمہیں تیاری کے حوالے سے قیمتی مشورے دے سکتی ہے۔"

شرمانے کے بجائے وہ سنجیدگی سے بولی۔ "پرسوں میں نے آپ کے کہنے پر کال کی تو تھی۔ انہوں نے فون اٹھایا بھی مگر بات نہیں ہوئی۔ شاید میری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی تھی یا پھر سگنلز کا کوئی مسئلہ تھا۔"

"چلو کوئی بات نہیں، میں سجاول کو فون کرتا ہوں۔ وہ خورسنہ سے تمہاری بات کرا دے گا۔"

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

میں نے کہا۔ "تاجور! مجھ سے ایک وعدہ کرو، کبھی بھی مجھ سے کوئی بات کہتے ہوئے دل میں کسی طرح کا کوئی اندیشہ نہ رکھنا۔ نہ اب...... نہ بعد میں۔ میں بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنے دل کی ہر کیفیت تم سے کھل کر کہوں گا بالکل ایسے جیسے میں کسی اور سے نہیں اپنی ذات سے کہہ رہا ہوں۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"یونہی دل میں بات آ گئی تھی۔" میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کہے۔

اچانک وہ کھڑی ہو گئی۔ نتھنے سکیڑ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے ماننا پڑا کہ اس کی حس شامہ تیز ہے۔ کچن سے سالن کے جلنے کی بالکل ہلکی سی بُو آئی تھی لیکن اسے پتا چل گیا تھا۔ "اوہ...... کام خراب ہو گیا۔" اس نے کہا اور بھاگ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

اس بالکل عام سے گھر اور معمولی سے در و دیوار کو اس کی موجودگی نے رنگوں سے بھر دیا تھا۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے یوں ہی سیل فون سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ فون پر موبائل نیٹ آن تھا۔ میں کچھ مارشل آرٹ سے متعلق سائٹس دیکھنے لگا۔ یہاں بھی "میری موت" کی خبر جگہ جگہ دردناک انداز میں موجود تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مختلف سائٹس پر میری سیکڑوں تصاویر پوسٹ کی گئی تھیں اور تبصرے لکھے گئے تھے۔ مداحوں نے دلدوز فقروں کے ساتھ میری جدائی پر دکھ کا اظہار کیا تھا۔ میرے پرانے مقابلوں کی تصاویر اور چھوٹے چھوٹے "کلپس" بھی کئی جگہوں پر دکھائی دیتے تھے۔ وہ تصویر بھی جا بجا نظر آتی تھی جس کا تعلق جاماچی سے تھا اور جو اس جزیرے پر انقلاب کا سبب بنی تھی۔ کیپر پیچر سیل میں میری قوتِ برداشت کا وہ امتحان لوگوں کے دل و دماغ پر نقش تھا۔ ان ساری تصویروں تبصروں اور کلپس سے اس پیار کا اظہار ہوتا تھا جو "ایم ایم اے" کے شائقین مجھ سے کرتے تھے۔ ایسی چیزیں دیکھ کر مجھے رنج بھی ہوتا تھا کہ میں نے اپنے چاہنے والوں کے جذبات کو ایک جھوٹ سے مجروح کیا ہے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک بار پھر داؤد بھاؤ کا خیال آیا۔ وہ نجانے کہاں چھپ گیا تھا۔ اس سے ایک بار بھی رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس کا نمبر ہر بار بند ہی ملتا تھا۔ سجاول درجنوں بار اس سے رابطے کی کوشش کر چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میری پرانی "سم" میں شاید اس کا ایک اور نمبر بھی موجود ہو۔ یہ "سم" میں نے ایک ڈبیا میں ابھی تک محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں کچن کی کچھ اشیا لینے کے لیے سوزوکی پر مین مارکیٹ گیا تو ایک جگہ گاڑی روک کر

میں نے پرانی سم ایک فالتو موبائل فون میں ڈالی اور اس میں نمبرز دیکھے۔ داؤد بھاؤ کا اور مختار جھارا کا ایک ایک نمبر یہاں بھی مل گیا۔ مختار جھارا سے رابطہ تو اب اگلے جہان میں ہی ہو سکتا تھا، داؤد بھاؤ کے لیے کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں نے کوشش کی اور مایوسی ہوئی۔ داؤد بھاؤ کا یہ نمبر بھی خاموش تھا۔ میں یہ دیکھ کر بھی چونکا کہ میرے پرانے نمبر پر میرے لیے ایک میسج بھی آیا ہوا تھا۔ یہ حیرانی کی بات تھی۔

اگر میں آج یہ سم آن نہ کرتا تو شاید یہ میسج بھی بے شمار دوسرے میسجز اور کالز کی طرح ہوا میں اُڑ جاتا۔ میں نے یہ ٹیکسٹ میسج پڑھا۔ یہ میرے ناروے کے ایک جگری دوست فخر کی طرف سے تھا۔

اس نے جذباتی انداز میں لکھا تھا۔ "تمہارے اس نمبر پر درجنوں بلکہ شاید سیکڑوں بار ہی کال کر چکا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ کئی دوسرے لوگوں کی طرح میرے دل سے بھی یہ شک جاتا نہیں ہے کہ شاید تم ابھی زندہ ہو اور دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں موجود ہو...... سانس لے رہے ہو۔ کاش یہ انمول شک میرے ذہن اور دل سے نہ نکلے یہاں تک کہ تم مجھے مل جاؤ۔ اگر میرے یہ الفاظ تم تک پہنچیں تو جان لو کہ ہمارے لیے ایک بڑی اچھی خبر موجود ہے۔ آخر اس بندے کا کھوج لگ گیا ہے جس کے ذریعے ہم جان ڈیرک اور اس کے گینگ کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے اور شاید تمہارے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے ہوں۔ ہاں میں والس وائے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ یہاں بینکاک میں موجود ہے۔ ایک جگہ ایک قیدی کی حیثیت سے پایا جا رہا ہے اور اس کی بیٹی بھی ساتھ ہے۔ میں نے ساری معلومات اکٹھی کی ہیں۔ ڈ۔ جے اسکواڈ کے پانچ چھ سر منڈے خبیث اس کی حفاظت پر مقرر ہیں۔ اگر ہم والس وائے تک پہنچ جائیں تو اس ذلیل جان ڈیرک کی دنیا میں قیامت برپا ہو جائے۔ تم یہ بات بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر میرے یہ الفاظ تم تک پہنچ گئے ہیں تو فوراً جواب دو فوراً۔

تمہاری زندگی اور تمہارے ساتھ کا متمنی تمہارا دوست فخر زمان۔"

فخر کے اس میسج نے واقعی مجھے زیر و زبر کر دیا۔ اگر یہ میسج مجھے چند ماہ یا سال ڈیڑھ سال پہلے ملا ہوتا تو میرے نزدیک اس کی بے پایاں اہمیت ہوتی، واقعی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور میں ایکساری گینگ کو اس کے ہی ایک رکن کے ذریعے تباہ و برباد کرنے پر تیار ہو جاتا۔ لیکن اب یہ میسج میرے لیے بیکار تھا اور اس طرح کے سب میسجز، کالز اور رابطے بیکار تھے جو مجھے میرے ماضی کی طرف کھینچ سکتے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر اس میسج کو ڈیلیٹ کیا اور پھر ماضی کی اس پُرخطر سم کو بھی فون سے نکال لیا۔

مین مارکیٹ میں ضروری خریداری کے بعد میں دوبارہ گھر پہنچا تو تاجور کچن میں تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں شام تک منتظر ہی رہا کہ شاید تاجور مجھ سے اپنی کسی الجھن کا ذکر کرے اور بتائے کہ کل اور منگل کے روز وہ فون پر کس سے گفتگو کر رہی تھی مگر اس حوالے سے ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شام سے پہلے میں نے اسے دیکھا۔ وہ شاید نہا کر نکلی تھی۔ اپنے گیلے بال کھولے صحن کے اس حصے میں بیٹھی تھی جہاں ابھی تھوڑی سی دھوپ موجود تھی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اپنے موبائل کو دیکھ رہی تھی۔ کسی مصور کی ایسی خوب صورت پینٹنگ کی طرح نظر آتی تھی جس کی طرف دل خود بخود کھنچتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایسے سادہ مگر جاں گسل حسن کی مالک تھی کہ کسی بھی مضبوط سے مضبوط مرد کے لیے اسے دیکھ کر سہنا اور برداشت کرنا ایک مشکل امر تھا۔ میں نے کئی بار سوچا تھا، حسن کے ملکی اور بین الاقوامی مقابلے ہوتے ہیں لیکن وہ صرف ان لڑکیوں میں ہوتے ہیں جو مقابلے کے لیے دستیاب ہوتی ہیں۔ گمنام شہروں کی گمنام گلیوں میں...... دور دراز بستیوں میں اور پہاڑوں کی اَن دیکھی آبادیوں میں نجانے کتنے ایسے چاند چھپے ہوتے ہیں جن کے سامنے عالمی حسیناؤں کے ستارے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

تاجور کے حُسن میں کچھ تھا۔ کچھ سب سے جدا...... سب سے علیحدہ...... یونہی تو ملک کی "طاقتور دارابِ فیملی" کا صاحب زادہ سو جان سے اس پر فدا نہیں ہوا تھا۔ ایسے بھونرے تو پھول پھول پر منڈلاتے ہیں...... وہ شادی کے بندھن کو کب قبول کرتے ہیں، لیکن تاجور کے سلسلے میں دارج یہ بندھن قبول کرنے کو بھی تیار تھا اور بات صرف دارج کی ہی نہیں تھی، اسے تو جو ایک بار دیکھتا تھا گرویدہ ہو جاتا تھا، پہلوان حشمت ٹھیک ہی کہا کرتا تھا، وہ چاند گڑھی کا چاند تھی۔ وہاں کے ہر باسی کی آنکھ کا تارا تھی۔ پھر میرا دھیان تاجور کے پہلے منگیتر اسحاق کی طرف چلا گیا۔ کیسا بدنصیب تھا وہ۔ چاند گڑھی کے گمنام گاؤں میں دھرتی کا یہ بے مثل چاند اس کے حصے میں آیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے قابل بنانے کی کوشش کرتا تو شاید یہ تحفہ اس کو مل ہی

جاتا۔ لیکن وہ تو عالمگیر جیسے مشیروں کی وجہ سے اپنی ہی مردانہ اکڑفوں میں گھرا ہوا تھا۔ پستیوں میں گرتا چلا جارہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ تاجور تو گھڑے کی مچھلی ہے، وہ جب چاہے گا، ہاتھ ڈال کر دبوچ لے گا۔

میں سوچ رہا تھا اور کھڑکی میں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں اس کے گیلے بالوں پر چمک رہی تھیں۔ جی چاہا کہ خاموشی سے جاکر اس کے پہلو میں جا بیٹھوں۔ اپنا چہرہ اس کے نم ریشمی بالوں پر رکھ دوں اور ان کی وہ ساری مہک اپنے اندر اتارلوں جو ایک مدت سے مجھ سے بچھڑی ہوئی تھی۔ وہ شام...... وہ زرد دھوپ اور وہ گم صم بیٹھی تاجور سب کچھ دیکھنے کے قابل تھا۔ میں کوئی شاعر یا مصور نہیں تھا ورنہ اس غم آمیز خوب صورتی کو دیکھ کر ضرور کوئی شاہکار تخلیق کردیتا۔

اسی دوران میں دھوپ مکمل طور پر اوجھل ہوگئی۔ اس نے دونوں بازو اٹھا کر اپنے بال سمیٹے اور اندر چلی گئی۔

میں تاجور کی جاسوسی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں وہ اپنی شرم اور جھجک کے سبب کوئی ایسی پردہ داری نہ کرے جو ہم دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوجائے۔ شام کو جب تاجور کپڑے بدلنے کے لیے چند منٹ کے واسطے واش روم گئی تو میں نے اپنا ننھا پن ہول کیمرا کامن روم میں ایک وال کلاک کی نچلی سائڈ پر چسپاں کردیا۔ تین چار ملی میٹر کے اس مہین کیمرے نے وال کلاک کے رنگ کے ساتھ یوں مناسبت پیدا کی کہ بالکل اوجھل ہوگیا۔ اس کیمرے کو لگانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ کل سارا دن مجھے گھر سے باہر رہنا تھا۔ پہلوان حشمت بھی ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ ایسے میں تاجور گھر میں اکیلی تھی۔

اس روز رات کو ہی میں نے ان چیزوں کی لسٹ تیار کرلی جو اگلے چند روز میں ہمارے لیے ضروری تھیں۔ ایک گدا، کمبل، کچھ کپڑے، جوتوں کے دو تین جوڑے، تھوڑی سی جیولری، چوڑیاں، میک اَپ کا مختصر سامان، واش روم میں رکھی جانے والی اشیا اور اس قسم کی دیگر چیزیں۔

صبح دس بجے کے لگ بھگ میں راجا بازار جانے کے لیے گھر سے روانہ ہوگیا۔ شرافت کی ہائی روف سوزوکی میرے استعمال میں تھی۔ اپنی بدلی ہوئی شباہت کے ساتھ مجھے پولیس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا، نہ ہی ٹیکساری گینگ اور داراہیوں کی طرف سے۔ پھر بھی میں باہر نکلتے وقت پی کیپ اور ہلکے کلر کے گلاسز استعمال کررہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی نے بھی مجھے کافی حد تک کیموفلاج کردیا تھا۔

میرے کیمرے کا رابطہ میرے سیل فون سے تھا۔ اگلے چار پانچ گھنٹے میں، میں نے گاہے بگاہے کیمرے کے ذریعے تاجور کی خیر خیریت جاننے کی کوشش کی۔ ایک بار وہ کیمرے کے فریم میں نظر بھی آئی۔ وہ سہ پہر کی چائے پی رہی تھی۔ کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دیتی تھی۔ شام پانچ بجے کے لگ بھگ میں جیولری مارکیٹ پہنچا۔ میرے بس میں ہوتا تو اس موقع پر تاجور کو سر سے پاؤں تک سونے اور جواہرات سے ڈھانپ دیتا لیکن فی الوقت یہ دھوم دھام ممکن نہیں تھی۔ اس کام کو میں نے پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھا۔ میں نے اس کے لیے جیولری کے چند ضروری آئٹم خریدے۔ (اور یہ سب میری وہی حلال کی کمائی تھی جو میں نے چند سال پہلے ایم ایم اے کے پروفیشنل کھلاڑی کی حیثیت سے جوڑی تھی) زیورات کی مارکیٹ یعنی صرافہ بازار سے نکل کر مجھے کچھ ریڈی میڈ کپڑے خریدنا تھے۔ تاجور کا ناپ بھی میرے پاس موجود تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے پھر سیل فون کے ذریعے کیمرا چیک کیا اور مجھے یوں لگا جیسے کسی بچھو نے ڈنک ماردیا ہو۔ میں ہکا بکا اسکرین کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کامن روم میں ٹیوب لائٹ آن تھی اور اس روشنی میں مجھے وہاں انیق بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔

''اوہ گاڈ!'' میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

میری نگاہیں اسکرین پر مرکوز رہیں۔ میں نے آڈیو کا والیم تھوڑا سا بڑھایا۔ مدھم آوازیں میرے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ انیق کا جو پہلا فقرہ میرے کانوں سے ٹکرایا، وہی دھماکا خیز تھا۔ وہ بولا۔ ''تاجور! شاہ زیب بھائی کی موت کا غم اپنی جگہ ہے...... ان کی ذات کے اتنے اچھے پہلو تھے کہ ہم گنتے جائیں اور وہ ختم ہونے میں نہ آئیں مگر شاید سچ ہی کہتے ہیں کہ کوئی انسان فرشتہ نہیں ہوتا جو انسان ہے، اس میں کہیں نہ کہیں خامی کوتاہی تو ہوتی ہے۔''

تاجور کا رخ کیمرے کی طرف تھا اور اُس کا چہرہ زیادہ واضح دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر رنج والم کی ایک ایسی کیفیت تھی جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ دل فگار لہجے میں بولی۔ ''مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا انیق، وہ ایسا کس طرح کرسکتے تھے...... کس طرح؟''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا، لیکن ہم حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے۔ بہرحال اب ان باتوں سے کوئی فائدہ تو نہیں ہے۔ نہ اب سیف دنیا میں ہے، نہ وہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی

خطائیں معاف کرے اور ہماری بھی۔ شاید میں آپ کو یہ سب کچھ بتاتا ہی نہیں لیکن جب آپ سے فون پر رابطہ ہوا تو پھر باتوں سے بات نکل آئی۔ بلکہ...... اب مجھے اس کا افسوس بھی ہو رہا ہے۔'' انیق نے افسردہ لہجے میں کہا۔

مجھے انیق کے چہرے کی ایک سائڈ نظر آرہی تھی اور ایک کندھا، باقی جسم نظروں سے اوجھل تھا۔ اس کی گردن پر ابھی تک ایک بینڈ تیج موجود تھی۔ یہ ان چوٹوں کی نشانی تھی جو چند روز پہلے اسے گوجرانوالہ کے خونی واقعے میں آئی تھیں۔

اگلے چند منٹ میں مجھ پر یہ ناقابلِ یقین انکشاف ہوا کہ انیق اور تاجور میں پچھلے دو تین روز سے ٹیلی فونک رابطہ موجود تھا اور یہ بھی کہ انیق نے تاجور کے سامنے ایک نہایت خوفناک بات کہہ دی تھی۔ بے شک یہ بات جھوٹی نہیں تھی لیکن اتنی تلخ اور نقصان دہ تھی کہ میں نتیجے کا سوچ کر سرتاپا لرز گیا۔ انیق، تاجور کو اس امر سے آگاہ کرچکا تھا کہ سیف کو مارنے والا کوئی اور نہیں میں ہوں، میں نے اسے زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔

کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں، جب کانوں سے سن کر اور آنکھوں سے دیکھ کر بھی کسی بات پر یقین کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ میرے سامنے موبائل اسکرین پر انیق بیٹھا نظر آرہا تھا جو میرا بہترین دوست اور ساتھی تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر خطرناک ترین حالات کا سامنا کیا تھا اور کئی موقعوں پر ایک دوسرے کی ڈھال بھی بنے تھے۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ میں انیق پر اتنا ہی اعتماد کرسکتا ہوں جتنا اپنی ذات پر...... اور آج وہی انیق...... جو ہر وقت میرے لیے جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، میری ''موت'' کے بعد ایک بالکل نئے روپ میں نظر آرہا تھا۔ وہ ایک نہایت نازک موقع پر تاجور کے سامنے ایک ایسا انکشاف کررہا تھا جو تاجور کے سامنے میرے کردار کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔ وہ کیوں کررہا تھا ایسا؟ اور کیا واقعی اس نے ایسا کیا تھا یا یہ میرا 'تصور' تھا جو مجھے ایک بھیانک منظر دکھا رہا تھا۔

تاجور نے جیسے سسک کر کہا۔ ''کیا ان دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا تھا انیق؟''

''نہیں جھگڑا تو نہیں تھا لیکن ایک دبی دبی سی رنجش تو ان دونوں میں پائی ہی جاتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے جاپان روانہ ہونے سے پہلے ہی شاہ زیب بھائی یہ جان گئے تھے کہ سکھیرا گاؤں میں جس نوجوان سے آپ کی شادی ہونے والی ہے، وہ سیف ہی ہے۔ انہوں نے سیف کے پاس آپ کی تصویر دیکھی تھی اور پھر ساری بات کھل گئی تھی۔ جب لیہ میں سیف نے اصرار کیا کہ وہ ہمارے ساتھ جاپان جائے گا تو میں اس پر رضامند نہیں تھا۔ شاہ زیب بھائی بھی نہیں تھے، لیکن پھر بعد میں وہ راضی ہوگئے۔ شاہ زیب بھائی یوں تو دل کے بہت بڑے تھے، لیکن مجھے لگتا ہے تاجور کہ آپ کے حوالے سے شاید ان کا دل زیادہ بڑا نہیں تھا۔''

''تم...... کیا کہنا چاہتے ہو؟'' تاجور کی بھیگی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''مجھے لگتا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود وہ سیف سے کچھ رقابت محسوس کرنے لگے تھے۔ انہوں نے سیف کے موبائل فون میں آپ کی بہت سی تصویریں دیکھیں، آپ دونوں کی گفتگو بھی سنی۔ ان ساری چیزوں نے ان کے دل پر اثر کیا تھا لیکن یہ اثر اس حد تک ہوگا یہ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا جس طرح آپ کو یقین نہیں آرہا، مجھے بھی بھروسا نہیں ہوا تھا کہ...... انہوں نے...... اپنے ہاتھوں سے سیف کو زہر دیا ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تاجور! آپ کو شاہ زیب بھائی نے اس بارے میں کیا بتایا تھا؟''

تاجور کی آواز جیسے کسی گہری کنوئیں میں سے آرہی تھی۔ وہ ویسے بھی کیمرے سے تھوڑا سا دور تھی۔ آواز بمشکل میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''مجھے بھی وہی کچھ پتا ہے جو دوسروں کو۔ انہوں نے کہا تھا کہ ٹاپو پر پکڑے جانے کے بعد امریکی افسر نے ان پر تشدد کی انتہا کردی تھی۔ سیف اس تشدد کی تاب نہ لا پایا۔ اسے خون کی الٹیاں ہوئیں اور وہ دم توڑ گیا...... لیکن انیق......'' تاجور کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

انیق سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ تاجور کی آنکھوں میں جیسے درد کا دریا بہہ رہا تھا۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''انیق...... میں کیا کروں؟ میرا دل ابھی بھی نہیں مان رہا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے......؟''

انیق نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ ''ثبوت دیکھ کر کیا کریں گی...... ویسے ثبوت بھی ہے میرے پاس۔''

اس نے اپنا سیل فون نکالا۔ کچھ دیر اس کے ''کی پیڈ'' پر انگلیاں چلاتا رہا۔ تب فون کے وائس ریکارڈر میں سے ایک آواز نکل کر میرے کانوں تک پہنچی۔ میں ششدر رہ گیا۔ بے شک یہ میری ہی آواز تھی۔ لونگ کے ٹمپریچر سیل میں جب میں اپنی زندگی کی بدترین اذیت سہنے کے بعد اور

ہڈیوں کا زخمی ڈھانچا بن کر واپس اپنے لوگوں میں پہنچا تھا تو جاماجی میں ناظم ہاذان کے گھر میں انیق سے میری گفتگو ہوئی تھی جس میں، میں نے اسے ٹاپو پر گزرنے والی قیامت کا احوال سنایا تھا۔ انیق نے باتوں کو محفوظ کرنے کی غرض سے ریکارڈ کرلیا تھا لیکن اب وہ اس گفتگو کا جو حصہ تاجور کو سنا رہا تھا، وہ سیاق و سباق سے ہٹ کر تھا۔ اس نے صرف وہی پورشن پلے کیا تھا جس میں، میں نے اسے بتایا تھا کہ میں نے ماڈل گرل جاناں کی انگوٹھی سے نکلنے والا زہر اپنی قمیص کی سلائی میں سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے یہی زہر کپ میں ڈال کر سیف کو نیم بے ہوشی کی حالت میں پلا دیا۔

میرے کان شائیں شائیں کر رہے تھے۔ یہ انیق کیا کر رہا تھا؟ یہ اس کا کیسا روپ میرے سامنے آیا تھا؟ میری ''زندگی'' میں وہ کیا تھا اور میری ''موت'' کے بعد یہ اس نے کس طرح کی ناقابلِ یقین حرکت کر ڈالی تھی۔ کیا اس کے پیچھے کوئی مقصد تھا؟

تاجور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی تھی۔ اب اس کا چہرہ کیمرے کے فریم میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ کچھ بولی بھی تھی مگر آواز ریکارڈ نہیں ہوئی تھی۔ اچانک سیٹی کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ الیکٹرک کیتلی کی سیٹی تھی۔ تاجور نے شاید انیق کے لیے چائے بنائی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ انیق چند سیکنڈ وہیں بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لنگڑاتے ہوئے، آٹھ دس قدم کمرے میں ہی چہل قدمی کی اور مختلف چیزوں کا سرسری جائزہ لیا۔ میں اس کی تیز نگاہی کا قائل تھا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ وال کلاک کے نچلے حصے سے چپکا ہوا ''منی کیمرا'' دیکھ ہی نہ لے۔ بہرحال خیریت گزری۔ وہ پہلے والی پوزیشن پر دوبارہ بیٹھ گیا اور اپنے سیل فون سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ سیل فون کا رخ ایسا تھا کہ اس کی اسکرین کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک اسکرین پر کسی لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ مجھے واضح دکھائی نہیں دیا لیکن میری چھٹی حس نے تائید کی کہ یہ تاجور کا ہی کوئی کیمرا شاٹ ہے۔

انیق محویت سے اُسے دیکھنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی پرستار اپنی محبوب شخصیت کی دلکشی کو چپکے چپکے اپنی آنکھوں میں سمیٹتا ہے۔ اتنے میں قدموں کی چاپ ابھری اور انیق نے جیسے ٹھٹک کر تصویر کو اوجھل کر دیا۔ میں سناٹے کی سی کیفیت میں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اتنی جلدی انیق کے بارے میں اور اس کے خیالات کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل تھا لیکن جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے آرہا تھا، وہ ہلا دینے والا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ...... ہم تینوں کے مسلسل ساتھ کی وجہ سے انیق نے تاجور کے حوالے سے کوئی نرم گوشہ رکھنا شروع کر دیا ہو۔ جب تک میں اس کے آس پاس موجود تھا اس نے یہ سب کچھ اپنے دل کی گہرائی میں چھپائے رکھا ہو، اور اب جبکہ میں اس کی نظروں میں ''دنیا میں نہیں رہا تھا'' اس نے تاجور سے اپنی وابستگی کو ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ کچھ دن پہلے وہ سکھیرا میں بھی تاجور کے آس پاس منڈلاتا رہا تھا اور دارج داراب سے ٹکر لینے پر بھی آمادہ نظر آتا تھا۔ کیا وہ سب اسی وجہ سے تھا کہ وہ تاجور کے متعلق کسی اور انداز سے سوچنے لگا تھا؟

مجھے یہ سب کچھ اتنا عجیب محسوس ہوا کہ میں نے اپنے سر کو شدت سے نفی میں ہلایا اور ان خیالوں کو ذہن سے نکال باہر کیا۔ دل و دماغ یہ سب کچھ تسلیم ہی نہیں کر رہے تھے، لیکن دوسری طرف میں اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ زندگی انسان کو اپنے ایسے ایسے روپ دکھاتی ہے جن کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔

انیق جلدی جلدی چائے پی رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ داراب کے بارے میں گفتگو بھی کر رہا تھا۔ وہ تاجور کو سمجھا رہا تھا کہ اسے بے حد احتیاط کی ضرورت ہے اور اس نے دارج داراب کے چنگل سے نکل کر ایک بہت اہم اور قابلِ تعریف قدم اٹھایا ہے۔ وہ اسے ہر طرح سے اپنی مدد اور تعاون کا یقین بھی دلا رہا تھا۔ تاجور اس کی باتیں سن تو رہی تھی لیکن اس کا ذہن جیسے کہیں اور تھا۔ اسکرین پر تصویر بہت واضح نہیں تھی پھر بھی تاجور کا چہرہ دیکھ کر ہی میں بتا سکتا تھا کہ وہ شدید کرب میں جتلا ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ انیق اپنی چائے ختم کر کے جلد سے جلد یہاں سے اٹھ جائے۔

میرے ذہن میں جو کئی سوال اودھم مچا رہے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آخر انیق، سجاول کے گھر سے یہاں تاجور کے پاس کیسے اور کیونکر پہنچا؟ کیا اس کی ذہانت اور حاضر دماغی نے خود تاجور کا سراغ لگایا یا پھر تاجور کی طرف سے ہی کوئی غلطی ہوئی۔ اب یہ بات بھی اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی کہ تین دن سے تاجور کیوں مسلسل گم صم ہے...... کس بے نام اضطراب نے اسے ڈھانپا ہوا ہے؟

میں سوچنے لگا ...... ایسا تو نہیں ہوا ہوگا کہ تاجور سے ٹیلی فونک رابطہ ہوتے ساتھ ہی انیق نے اسے سیف والی بات بتا دی ہو۔ پہلے ان کے درمیان عام نوعیت کی گفتگو

ہوئی ہوگی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ تاجور نے مجھے اس ''رابطے'' کے متعلق بالکل بے خبر رکھا تھا؟ بہت سے سوال تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دل گواہی دے رہا تھا کہ آخر ذہن میں پرورش پانے والے بے نام اندیشے درست ثابت ہو گئے ہیں...... میری اور تاجور کی زندگی ایک بار پھر تلاطم کا شکار ہونے والی ہے۔

اب کچھ بھی خریدنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں پھر بھی یونہی اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور انیق کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے ایک جگہ رک کر سجاول سیالکوٹی کو فون کیا، فوراً ہی اس کی پاٹ دار آواز میرے کان میں گونجی۔ ''بڑی لمبی عمر ہے تمہاری، میں بھی ابھی تمہیں ہی فون کرنے والا تھا۔''

''کس سلسلے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''یار تمہارے نکاح کے سلسلے میں اور دوسری تیاریوں کے سلسلے میں۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ خورسنہ اور تاجور کا رابطہ کراؤ۔ وہ ایک دوسرے کو اچھے مشورے دے سکتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پرسوں تاجور نے رابطہ کیا تو تھا مگر بات نہیں ہو سکی۔ شاید نیٹ ورک میں خرابی تھی۔ خورسنہ کی آواز تاجور تک نہیں پہنچ رہی تھی۔''

''چلو کوئی بات نہیں، ابھی بات کرا دیتے ہیں۔ کہاں ہے تمہاری ہونے والی؟'' سجاول اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''میں ابھی گھر سے باہر ہوں، گھر جاؤں گا تو پھر دیکھ لیں گے۔''

''اور ہاں شاہی! وہ تمہارا لنگو شہزادہ میرے منع کرنے کے باوجود یہاں سے نکل گیا ہے۔ ایک نمبر کا ڈھیٹ ہے۔ میں نے کہا بھی کہ ابھی تمہارا پاؤں پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا لیکن نہیں مانا، کہہ رہا تھا کہ داؤد بھاؤ سے میرا رابطہ نہیں ہو رہا، ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ اب پتا نہیں کیا ارادے ہیں اُس کے۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کے ضدی پن سے تو تم بھی واقف ہو، کہیں ٹیکساری والوں کو ڈھونڈنے نہ نکل پڑا ہو۔ اپنے ساتھی مختار جبارا کی موت کا بھی بڑا دکھ ہے اُسے۔''

سجاول غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ انیق، ٹیکساری گینگ وغیرہ کے پیچھے نہیں تھا۔ وہ تو سیدھا یہاں راولپنڈی پہنچا تھا اور ایک اور ہی طرح کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ بہرحال ابھی میں نے سجاول کو اس بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

گفتگو کے آخر میں سجاول نے مجھ سے کہا۔ ''کیا بات ہے تم کچھ بجھے بجھے سے لگ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔'' اِدھر اُدھر کی بات کر کے میں نے اسے مطمئن کر دیا۔

میں جان بوجھ کر ذرا دیر سے گھر پہنچا۔ انیق تب تک جا چکا تھا۔ شرافت بھی واپس آ چکا تھا۔ میں نے خریدا ہوا سامان فی الوقت گاڑی میں ہی رہنے دیا۔ اندر پہنچا تو تاجور حسبِ توقع بہت گم صم دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے تاجور؟'' میں نے پوچھا۔

''سر میں درد ہے۔ دو گولیاں بھی کھائی ہیں لیکن ابھی طبیعت سنبھلی نہیں۔''

''ڈاکٹر کو دکھا لیتے ہیں۔''

''نہیں، شاید آرام کرنے سے ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ کھانا کتنے بجے کھائیں گے؟''

''بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔ تم آرام کرو، اگر ضرورت پڑی تو بتا دوں گا۔''

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ شاید اس وقت میں اس کے نزدیک دنیا کا خود غرض ترین انسان تھا جس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے دل میں رقابت کو پروان چڑھایا اور موقع تاک کر ایک بے گناہ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جو مستقبل میں اس کی خواہش کے راستے میں آ سکتا تھا پھر اس کی موت کے بارے میں سفید جھوٹ گھڑا کہ وہ غیر ملکیوں کے تشدد کا شکار ہوا۔

میرے ذہن میں بار بار یہ سوال اٹھ رہا تھا۔ کیا میں تاجور کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں؟ اسے بتاؤں کہ مجھے سیف کے حوالے سے جھوٹ کیوں بولنا پڑا ہے۔ کیا وہ میری صفائی کو مانے گی۔ یا اس کا ذہن اس بات کو تسلیم کر لے گا کہ میں تو لیڈر ہونے کے باوجود امریکیوں کے تشدد سے بچ کر واپس پاکستان پہنچ گیا اور سیف میرا صرف ساتھی ہونے کی وجہ سے مار دیا گیا؟ پتا نہیں کیوں دل میں ایک عجیب سی مزاحمت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی تو پھر اسے مجھ پر بھروسا بھی کرنا چاہیے تھا۔ پیار کرنے والے تو خاموشی کی زبان بھی سمجھتے ہیں اور ان کے دلوں کے درمیان ایک ایسی راہ ہوتی ہے جو اُن کے درمیان کوئی فاصلہ کوئی پردہ رہنے ہی نہیں دیتی۔ میں وہ تھا جس نے

پوری طرح دسترس رکھنے کے باوجود تاجور کو اس کے منشا کے بغیر حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، پھر اب میں اس کو پانے کے لیے اتنا گھناؤنا کھیل کیوں کھیلتا۔ یہ سب باتیں تاجور کے سوچنے کی تھیں۔ دوسرے روز پہلوان حشمت بھی دندناتا ہوا راولپنڈی واپس آ گیا۔ وہ نکاح کے لیے بہت سے چھوہارے اور خشک میوہ لے کر آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے آتے ساتھ ہی مجھے یہ مژدہ سنایا کہ وہ میرے لیے شاعری بھی کر کے آیا ہے۔ اس نے کوئی سہرا قسم کی چیز لکھی تھی۔ تشویشناک بات صرف یہ نہیں تھی کہ یہ ''شاعری'' کافی لمبی تھی بلکہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھے فوری طور پر سنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اسے بمشکل ٹالا۔

اس نے تاجور کو بتایا۔ ''بٹیا! گاؤں میں سب خیریت ہے۔ ویسے ابھی تک یہ بات بالکل راز ہی ہے کہ تم اسلام آباد والے گھر میں اپنے دوسرے گھر والوں کے ساتھ موجود ناہیں ہو۔ کچھ لوگ تو یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ دارابی اپنے ارادوں سے پیچھے ہٹنے والے ناہیں ہیں۔ دارج دارابی اب تک تم کو اپنے نکاح میں لے چکا ہوگا۔''

تاجور نے پژمردہ لہجے میں پوچھا۔ ''چاچا جی! آپ سکھیرا بھی گئے؟''

''ناہیں بٹیا! وہاں تو نہ جا سکا مگر چودھری بشیر کے گھر کی خیر خبر میں نے پتا کرا لی ہے۔ تمہاری سہیلی شازیہ بھی ٹھیک ہے۔ غم کتنا بھی بڑا ہو آہستہ آہستہ بندے کے دل کو سکون آنا شروع ہو ہی جاوت ہے۔ ہاں سیف کا والد چوہدری بشیر کچھ بیمار ہے۔ اس کو ہلکا سا فالج ہوا تھا پر اب چلتا پھرتا ہے۔''

تاجور کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا کر گزر گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہ مجھ سے ملی۔ مجھے اس خاموش نگاہ میں اَن گنت شکوے نظر آئے۔ کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر پہلوان نے پوچھا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے تاجور بٹیا؟''

تاجور نے ایک بار پھر سر درد کا عذر پیش کیا لیکن کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد جب پہلوان حشمت، تاجور سے اکیلے میں مل کر میرے پاس آیا تو بولا۔ ''شاہ زیب! پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی نہ کر لی جاوے؟''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''تاجور بٹیا کی طبیعت کچھ ٹھیک ناہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سنبھلنے میں تین چار دن لگ جاویں۔ ایسے خوشی کے موقع خوشی سے اور صحت کے ساتھ ہی منائے جاویں تو اچھا ہووت ہے۔ ویسے بھی میں سمجھت ہوں کہ تاجور بٹیا ابھی تک گھر چھوڑنے کے دکھ سے پوری طرح سنبھل ناہیں پائی ہے۔ اگر نکاح کی رسم چھ سات روز آگے کر لی جاوے تو کیا خیال ہے تمہارا؟''

میرے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ میں جانتا تھا کہ بات اتنی سادہ نہیں ہے جتنی سادہ پہلوان حشمت تک پہنچی ہے۔ تاجور کے اندر بہت بڑی ہلچل تھی۔ ''محبت'' سوال و جواب اور تفتیش کے کٹہرے میں آ رہی تھی اور ایک طرح سے یہ بھی محبت کی توہین ہی تھی۔

میں نے پہلوان سے کہا۔ ''ان حالات میں دیر کرنا مناسب تو نہیں ہے، دارابی ہمارے اردگرد منڈلا رہے ہیں، کچھ بھی ہو سکتا ہے......''

پہلوان نے ایک توقف کے بعد کہا۔ ''تو پھر؟...... اگر تم کہوت ہو تو میں بٹیا سے ایک بار پھر بات کر لیتا ہوں؟''

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''نہیں چاچا حشمت! رہنے دیں، اس طرح پتا نہیں وہ کیا سمجھے گی۔''

☆☆☆

میرا دل کہہ رہا تھا کہ انیق یہاں تاجور کے آس پاس ہی موجود ہے۔ وہ راولپنڈی میں ہی تھا اور کسی بھی وقت تاجور سے دوبارہ رابطہ کر سکتا تھا۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ وہ رابطہ کرے۔ تاجور کے کمرے میں میرا ''منی کیمرا'' نصب تھا اور مجھے ان دونوں کی گفتگو تک رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس رات میں گم صم سا اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ ساتھ والے کمرے میں تاجور تھی۔ ہم دونوں کے درمیان بس ایک دیوار تھی۔ دو دن پہلے تک یہ دیوار بالکل بے معنی اور عارضی چیز محسوس ہوتی تھی، لیکن اب یہ اپنے اصل وجود سے بیسیوں گنا موٹی اور اونچی ہو چکی تھی...... یوں لگتا تھا کہ اس نے اپنے اندر صدیوں کے فاصلے سمیٹ لیے ہیں۔ سوچتے سوچتے خیالوں کا دھارا اس ٹیکسٹ میسج کی طرف چلا گیا جو اس دن مجھے اپنے دوست فخر کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ وہ ایک بڑا سنسنی خیز پیغام تھا لیکن میں اب اس جیسے سارے پیغاموں اور رابطوں سے خود کو بالکل الگ رکھنا چاہتا تھا۔ اب میرے مسائل، میری راحتیں اور میرے دکھ کچھ اور نوعیت کے تھے۔

میری توقع کے عین مطابق رات گیارہ بجے کے لگ بھگ تاجور اور انیق میں پھر فون پر بات ہوئی۔ مگر تاجور اتنے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی کہ اس کا ایک لفظ بھی میرے لیے قابلِ سماعت نہیں ہو سکا۔ ویسے بھی یہ ایک مختصر

گفتگو تھی...... مشکل سے دو تین منٹ کی۔ بہرحال مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ فون پر دوسری طرف انیق ہی تھا۔

اگلے روز میں نے جان بوجھ کر پہلوان حشمت کو کچھ خریداری کرنے کے لیے صدر کے علاقے میں بھیج دیا۔ اس کی واپسی شام سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ میں خود بھی گھر سے نکل گیا۔ میں نے تاجور کو بتایا کہ میں کرائے کا کوئی مناسب مکان ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ بس بہانہ ہی تھا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ اگر انیق دوبارہ تاجور سے ملنا چاہتا ہے تو اس کے لیے موقع پیدا ہو سکے۔ میں انیق کے طریقہ کار کو اچھی طرح جانتا تھا، عین ممکن تھا کہ اس نے کسی طریقے سے اس گھر پر بھی نظر رکھی ہوئی ہو اور اسے معلوم ہو کہ گھر سے کون گیا ہے اور کون موجود ہے۔ (ابھی تک مجھے انیق کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی)

میں نے لنچ قریباً ڈھائی بجے کے لگ بھگ ایک درمیانے درجے کے ریستوران میں کیا۔ میں پولیس کو مطلوب تھا، داراہیوں کو بھی اور ٹیکساری گینگ کو بھی۔ مگر اپنے بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ میں شہر میں گھوم پھر رہا تھا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا میری زندگی کا۔ میں وقتاً فوقتاً اپنے سیل فون کی اسکرین بھی چیک کر رہا تھا۔ ابھی منی کیمرے والا کمرا خالی تھا۔ ابھی میں لنچ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کمرے کا ''خالی پن'' ختم ہو گیا...... پہلے کال بیل کی مدھم آواز سنائی دی تھی۔ پھر قریباً ایک منٹ بعد تاجور اور انیق آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ تاجور کچھ برہم نظر آ رہی تھی۔ اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''انیق! میں نے تم سے کہا بھی تھا یہاں تمہارا آنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ بعد میں ہم کہیں کسی اور جگہ بھی مل سکتے ہیں مگر فی الحال میری مشکلوں میں اضافہ نہ کرو۔''

وہ بولا۔ ''بس یہ ایک بار ہے، آئندہ نہیں آؤں گا۔ پھر جیسا آپ کہیں گی، ویسا کر لیں گے۔ لیکن اب پلیز اپنا موڈ ٹھیک رکھیں۔ یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں پلیز انکار نہ کیجیے گا۔'' اس نے جھک کر کوئی چیز میز پر رکھ دی۔

اس وقت تو مجھے نظر نہیں آیا، بعد میں پتا چلا کہ یہ گلاب کے پھولوں کا دستہ تھا، وہ بولا۔ ''یہ آپ کی جرأت اور دلیری کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ہے اور یقین کریں یہ میں آپ کو دل کی گہرائی سے دے رہا ہوں۔''

شاید تاجور نے بے دلی سے شکریہ کا لفظ کہا تھا لیکن مجھ تک بس اس کی منمناہٹ ہی پہنچ سکی۔

وہ دونوں بیٹھ گئے تھے۔ کیمرے کے سامنے اُن کا اینگل پرسوں والا ہی تھا۔ انیق کا بس ایک کندھا اور چہرے کی دائیں سائیڈ دکھائی دیتی تھی۔ تاجور سامنے تھی اور اس کا چہرہ زیادہ واضح دکھائی دیتا تھا۔ انیق کی گفتگو ایک بار پھر میری ''موت'' کے حوالے سے ہی تھی۔ اس نے چند پُرملال فقرے ادا کیے۔ آخر میں بولا۔ ''آپ یقین کریں وہ آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ کی خاطر ہر حد تک جانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ شاید کسی وقت اپنے اصولوں سے بھی سمجھوتا کر گزرتے تھے۔ یہ سیف والا معاملہ بھی تو ایسے ہی ہوا۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے انیق...... کہ وہ امریکیوں کے تشدد اور ان کی بے رحمی والی بات غلط تھی؟'' تاجور نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

''پوری طرح تو غلط نہیں تھی۔ وہاں پریشان کن صورتِ حال کا خطرہ موجود تھا لیکن فوری طور پر تو...... خیر...... ان باتوں کو چھوڑیں تاجور...... ان سے کچھ حاصل نہیں...... آپ مجھے یہ بتائیں کہ اب آئندہ کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

وہ لمبے توقف کے بعد بولی۔ ''ابھی سوچ رہی ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے پناہ دی ہے۔ ہر طرح میری مدد کر رہے ہیں۔ فوری طور پر تو یہی جگہ محفوظ نظر آ رہی ہے۔''

''آپ کہہ رہی ہیں کہ یہ دونوں یعنی شرافت اور وقاص...... شاہ زیب بھائی کے دوست ہیں...... لیکن میں تو ان ناموں سے واقف نہیں ہوں۔ ابھی ساتھ والے کمرے میں، میں نے شرافت کی تصویر بھی دیکھی ہے، میرے لیے تو وہ اجنبی ہے۔''

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جس طرح تمہارے کئی دوستوں کا شاہ زیب کو پتا نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں بھی ان کے کچھ دوستوں کا پتا نہ ہو۔''

اگلے آٹھ دس منٹ میں انیق نے تاجور سے جو گفتگو کی، وہ کم از کم میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس گفتگو میں واضح طور پر تاجور کی طرف جھکاؤ اور لگاوٹ کا عنصر نظر آتا تھا۔ وہ بڑے ٹھوس لہجے میں تاجور کو یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی طرح کمزور اور بے بس محسوس نہ کرے۔ اگر شاہ زیب بھائی نہیں تو کیا ہوا وہ ان کی جگہ کھڑا ہو کر اس کی طرف آنے والی ہر مصیبت کا راستہ روکے گا۔ منی کیمرے کا آڈیو بہت حساس تھا اس کے باوجود کئی فقرے وضاحت سے مجھ تک نہیں پہنچ رہے تھے تاہم لُبِ لباب سمجھ میں آ رہا تھا۔

پتا نہیں کہ تاجور اس کی گفتگو کے اینگل کو محسوس کر رہی تھی یا نہیں مگر وہ پریشان اور کسی حد تک بیزار ضرور دکھائی دیتی تھی۔ وہ بھی یہ چاہتی تھی کہ انیق اب جلد از جلد یہاں سے چلا جائے۔

یہ انیق کیا چیز تھا؟ شاید ٹھیک طرح سے آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ وہ عورت اور رومانس وغیرہ کے بارے میں بالکل اور طرح کا رویہ رکھتا تھا۔ اتنے عرصے کے ساتھ کے باوجود میں آج تک جان نہیں سکا تھا کہ کبھی صنفِ نازک سے اس کا کوئی تعلق رہا ہے یا نہیں۔ میری نگاہوں کے سامنے ماضی قریب اور ماضی بعید کے واقعات گھومنے لگے۔ مجھے کئی ایسے مناظر یاد آئے جب تاجور کے حوالے سے انیق کی تھوڑی بہت وابستگی کا اظہار ہوا تھا۔ یوں تو ایک موقع پر وہ تاجور کو آپی بھی کہتا رہا تھا لیکن ایسا کچھ ہی عرصے کے لیے ہوا تھا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ ٹاپو پر پیش آنے والے واقعات کے بعد سے اس نے تاجور کو شاید اس لقب سے نہیں پکارا تھا۔

تاجور نے اس سے کہا تھا کہ وہ آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے۔ وہ جلد ہی وہاں سے چلا گیا۔ تاجور اسی کمرے میں چپ چاپ بیٹھی رہ گئی۔ رنج و الم کی تصویر۔ میرے ذہن میں جو سب سے اہم سوال گردش کر رہا تھا، وہ یہی تھا کہ انیق اور تاجور کا رابطہ ہوا کس طرح ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے کچھ ہی دیر بعد مل گیا۔ سوزدکی ہائی روف میں بیٹھے بیٹھے میں اپنی تہلکہ خیز سوچوں سے برسرِپیکار تھا کہ سجاول کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ انیق ابھی تک واپس لالہ موسیٰ نہیں آیا...... نہ ہی فون پر اس سے رابطہ ہو پا رہا ہے۔ کہنے لگا۔ ''شاہی! یہ عجیب و غریب شے پال رکھی ہے تم نے۔ میں تمہیں سچ کہتا ہوں، کسی وقت دھوکا دے گا، یہ جتنا زمین سے اوپر ہے اتنا ہی نیچے بھی ہے۔''

میں خاموش رہا لیکن سینے میں گھٹن سی ضرور محسوس ہوئی۔

سجاول بولا۔ ''لو تمہاری مریدنی بھی تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔''

چند سیکنڈ بعد خورسنہ کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''جی شاہ زیب صاحب! کہاں چھپتے پھر رہے ہیں آپ...... اور آپ کی ہونے والی بھی؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، ذرا مصروف تھا۔''

وہ بولی۔ ''مصروف تو یقیناً ہوں گے جناب...... دولہا والے بھی خود ہیں آپ اور دلہن والے بھی۔ دونوں طرف کا کام کرنا ہوگا۔ اور ہاں آپ کی ہونے والی مسز صاحبہ سے ابھی تک میری بات نہیں ہوئی۔ آج بھی دو تین بار کال کی انہوں نے فون ہی نہیں اٹھایا۔ کیا آپ کے ہاں دلہنیں اتنا زیادہ شرماتی ہیں؟ اگر اتنا زیادہ شرماتی ہیں تو پھر شادی کے بعد تو دولہا کا بہت برا حال ہوتا ہوگا۔''

میں نے اس کے مزاح کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے وہ تم کو فون کرتی رہی، تم نے نہیں اٹھایا۔ اب شاید اس کو پتا نہیں چل رہا۔''

''میں نے کب نہیں اٹھایا جی؟ بدھ کے روز شاید ایک بار ان کی کال آئی تھی، میں اس وقت نہا رہی تھی۔ بیل سن کر آپ کے دوست انیق نے کال ریسیو کی تھی مگر اتنے میں فون بند ہو گیا۔ بعد میں، میں نے ٹرائی کیا لیکن جواب نہیں آیا۔''

میرے سر میں جھماکا سا ہوا...... تاجور نے یہاں سے خورسنہ کو کال کی تھی...... خورسنہ کے بجائے یہ کال انیق نے سنی تھی جو زخمی ہونے کے بعد سے سجاول کے گھر میں موجود تھا...... تو کیا اس نے فون پر تاجور کی آواز پہچان لی تھی؟ یقیناً ایسا ہی تھا۔ اس جیسے ہوشیار...... بیدار مغز شخص کے لیے یہ مشکل نہیں تھا۔ پھر کیا ہوا تھا......؟ پھر وہ خاموش رہا تھا اور اس نے فون بند کر دیا تھا۔

ایک ایک کر کے کڑیاں میرے ذہن میں جڑ رہی تھیں اور زنجیر مکمل ہو رہی تھی۔ انیق، ''بھاؤ گینگ'' کے چالاک ترین ارکان میں سے ایک تھا۔ اسے اور مختار جھارا کو داؤد بھاؤ کا دستِ راست کہا جاتا تھا بلکہ کئی طرح سے انیق کی حیثیت مختار جھارا سے بڑھ کر تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ ہر فیلڈ کے لوگوں سے اس کے تعلقات تھے۔ ہر محکمے میں گھس جاتا تھا۔ دیواروں میں در بنانے کا فن اس میں یکتا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ اس نے وہ جگہ پوائنٹ آؤٹ کرائی تھی جہاں سے تاجور نے کال کی تھی اور پھر وہ لالہ موسیٰ میں سجاول کی میزبانی کو خیرآباد کہہ کر یہاں راولپنڈی پہنچ گیا تھا۔

یہاں پہنچ کر اس نے ٹھیک ٹھیک ''نشانہ'' کیسے لگایا؟ مطلب یہ کہ عین شرافت فورمین کے گھر تک کیسے پہنچا؟ یہ بھی اہم سوال تھا لیکن انیق جیسے باتدبیر بندے سے کچھ ناممکن نہیں تھا۔ جب کسی سیل فون سے رابطہ ہو اور کال جاری ہو تو ٹھیک ٹھیک لوکیشن بھی معلوم کی جا سکتی ہے۔

خورسنہ کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا، وہ

بولی۔ ''آپ بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتے ہیں۔ کل سجاول بھی بتا رہے تھے کہ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں، اگر کوئی مسئلہ ہے تو پلیز ہمیں بتائیں، آپ کے لیے ہماری جان بھی حاضر ہے۔''

''نہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ بس تاجور کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ دوا وغیرہ لے رہی ہے۔ سر کا درد بتاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ نکاح کی تقریب چند دن لیٹ کر لی جائے۔''

''نہ یہ غضب نہ کریں جناب! ہم تو ایک ایک پل گن گن کر گزار رہے ہیں اور پھر آپ کے اردگرد حالات بھی تو زیادہ اچھے نہیں ہیں، نیک کام جتنی جلدی ہو جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ ذرا چہک کر بولی۔ ''آپ سست پڑیں گے تو پھر ''نی میل'' تو ہوتی ہی سست ہیں اور ''نی میل'' بھی پاکستان کی۔ آپ جناب! سجاول سے گائڈ لائن کیوں نہیں لیتے۔ دیکھیں کتنی تیز رفتاری دکھائی ہے حضرت نے۔ میں یہاں صرف سیر و تفریح کے لیے آئی تھی مگر ایسے پیچھے پڑے کہ شادی کا جوڑا پہنا کے چھوڑا۔''

میں اُسے کیسے بتاتا کہ تیز رفتاری تو گاڑی کے دونوں پہیوں سے ہوتی ہے، یہاں تو ایک پہیا ساتھ ہی چھوڑ رہا تھا۔

میں گھر پہنچا تو تاجور کا وہی موڈ تھا جو ہونا چاہیے تھا، بالکل گم صم، آنکھیں ورم زدہ، چہرہ اترا ہوا۔ اس نے وہی طبیعت کی ناسازی اور سر درد کا بہانہ بنایا۔ بہرحال گھر کے سارے کام وہ اسی طرح کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ سطح آب پُرسکون ہے لیکن نیچے ایک طوفان ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہاں کوئی آیا تھا تاجور؟''

''نہیں تو۔'' وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''یونہی خوشبو سی محسوس ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔

اس نے میرے فقرے کو نظر انداز کیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ دراصل انہی سرخ گلابوں کی خوشبو تھی جو بقول انیق، وہ تاجور کو اس کی جرأت پر خراج پیش کرنے کے لیے لایا تھا۔ (اگلے روز یہ گلدستہ مجھے ڈسٹ بن میں کوڑے کے نیچے پڑا نظر آیا تھا)

پتا نہیں کیوں ایک بار پھر جی میں آئی کہ اپنا دل کھول کر تاجور کے سامنے رکھ دوں۔ اسے بتاؤں کہ مجھے سیف کے ساتھ وہ اَن چاہا سلوک کیوں اور کن حالات میں کرنا پڑا۔ اور کیا وجہ تھی جس کے سبب مجھے دوسروں سے اس بارے میں جھوٹ بولنا پڑا۔ لیکن یہاں سوال یہ تھا کہ کیا وہ میری دی ہوئی صفائی پر یقین کرے گی۔ اگر وہ نہ کرتی تو پھر میرے دل میں بھی گرہ پڑ جاتی تھی اور یہ گرہ پڑ جاتی تو فاصلے کئی گنا بڑھ جاتے۔ میں سخت تذبذب میں تھا۔

درحقیقت میرے اور تاجور کے درمیان عجیب بے اعتمادی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنا پڑتے ہیں اور کبھی کبھی کئی جھوٹ بولنے کے بعد بھی شک کی دراڑیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نے ابھی تک تاجور کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ انیق ٹیکساری والوں کے حملے میں زخمی ہوا ہے اور لالہ موسیٰ میں سجاول کے پاس قیام پذیر رہا ہے۔ میں نے سجاول اور خورسنہ سے بھی یہی کہا تھا کہ وہ بھی لالہ موسیٰ میں انیق کی موجودگی کے بارے میں تاجور کو کچھ نہ بتائیں۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہوئی تھی کہ اتفاقاً انیق نے تاجور کا فون سن لیا تھا اور اس کا کھوج لگا کر یہاں راولپنڈی پہنچ گیا تھا۔ یقیناً اس نے تاجور کو بھی بتایا ہوگا کہ وہ لالہ موسیٰ میں سجاول کا مہمان رہا ہے۔ اگر وہ پچھلے چند روز سے سجاول کا مہمان تھا تو پھر یقیناً مجھے بھی اس بارے میں پتا تھا۔ تاجور کے ذہن میں پہلا سوال یہی پیدا ہوتا تھا کہ میں نے اس سے انیق والی اطلاع کیوں چھپائی۔

رہی سہی کسر تاجور کی ذہانت نے پوری کر دی۔ دوپہر کو پہلوان حشمت اپنے زخمی جبڑے پر زیتون کے تیل کی مالش کرتا ہوا میرے کمرے میں آیا تو رازداری کے لہجے میں بولا۔ ''مجھ کو لگت ہے تاجور بٹیا کو تمہارے بارے میں کسی طرح کا شک ہو گیا ہے شاید۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو چاچا حشمت؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے بٹیا مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ جس رات شاہ زیب رات کو گھر میں نہیں تھے..... اور صبح پہنچے تھے، وہ کون سا دن تھا۔''

''پھر؟'' میں ذرا چونک گیا۔

پہلوان بولا۔ ''میں سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کچھ ''مسور'' کی دال ہے۔ مجھے پتا تھا لیکن میں نے گول مول جواب دیا۔ تاجور بٹیا کیلنڈر دیکھنے لگی اور انگلیوں پر حساب جوڑ کر بولی کہ وہ اتوار کی رات تھی۔ میں نے کہا بٹیا رانی تم کیا حساب جوڑت ہو؟ کہنے لگی کوئی خاص بات نا ہیں۔''

پہلوان حشمت یقیناً ایک تشویش ناک اطلاع دے رہا تھا۔ ٹیکساری گینگ کے گوجرانوالہ والے حملے کی خبر میں نے تاجور تک نہیں پہنچنے دی تھی، گھر میں ٹی وی چلتا تھا اور نہ اخبار آتا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں تاجور اس حملے میں اور میرے رات بھر غائب رہنے میں کوئی تعلق نہ ڈھونڈ لے لیکن اب اس تعلق کے افشا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا بلکہ شاید یہ افشا ہو ہی گیا تھا۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ میں نے تاجور سے جو وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے پُر ہنگام اور خطرناک ماضی کو خیر آباد کہہ رہا ہوں اور اپنے نئے روپ میں ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا ہوں فقط ایک دھوکا تھا اور میں نے اس رات بھی سجاول کے ساتھ مل کر گوجرانوالہ میں ٹیکساری گینگ کے ساتھ ٹکر لی ہے اور انیق کو وہاں سے نکالا ہے۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ میں تاجور سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا..... سب کچھ صاف صاف کہہ دوں گا۔ مجھے ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنا پڑ رہے تھے اور ہمارے درمیان بداعتمادی کی فضا تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی۔ اگر وہ میری محبت پر یقین رکھتی تھی تو پھر اسے مجھ پر بھی یقین آ جانا چاہیے تھا۔ کہتے ہیں کہ پیار کرنے والے دلوں کو ایک دوسرے سے راہ ہوتی ہے۔ اگر واقعی یہ راہ ہوتی ہے تو پھر اس کو نظر بھی آنا چاہیے تھا۔

اچھے ماحول میں بات کی جائے تو اس کے اثرات بھی اچھے ہوتے ہیں۔ میں اس اہم ترین گفتگو کے لیے اچھا ماحول چاہ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شام کے وقت جب تاجور کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی، میں بھی وہاں جا کر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ چونک گئی پھر میری طرف دیکھے بغیر افسردہ لہجے میں بولی۔ ''آپ جائیے، میں بنا لوں گی۔''

''کئی دن سے تم ہمیں پکا پکا کر کھلا رہی ہو، اگر آج میں تھوڑی سی مدد کر دوں گا تو کیا ہو جائے گا؟''

وہ خاموش رہی۔ میں سلاد بنانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ شاید پہلوان حشمت کی فرمائش پر چکن کے شامی کباب بنا رہی تھی۔ اس نے اپنے ریشمی بالوں کا جوڑا کس کر باندھا ہوا تھا۔ اپنی ہلکی براؤن قمیص کی آستینیں اڑسی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے کام میں پوری طرح منہمک تھی۔ سلاد بنانے کے بعد میں نے چٹنی بنانے کے لیے پیاز اور پودینہ وغیرہ گرائنڈ کیا۔ کبھی کبھی میں چور نظر سے اس کی طرف دیکھ بھی لیتا تھا۔ وہ کسی بھی حلیے میں ہوتی تھی، اس کی اندرونی دلکشی اس کے سراپا کے گرد ایک غیر مرئی ہالا سا بنائے رکھتی تھی۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک نے اس کے بدن کی مہک کے ساتھ مل کر کچن کی بے رنگ فضا میں عجیب رنگ بھر دیے۔

وہ اب شامی کباب، فرائی کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کتنے انڈے توڑوں؟''

''پانچ چھ۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں انڈے توڑ کر انہیں فینٹ کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ میں سوچ رہا تھا، محبت انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ وہ کیا کیا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، میں مارشل آرٹ کا چیمپئن جو رنگ میں اترتے ہی اپنے حریفوں کے ہوش اُڑا دیتا تھا، جو مار دھاڑ پر اترتا تھا تو چھوٹے موٹے گینگسٹر چوہوں کی طرح اپنے بلوں میں گھس جاتے تھے، کچن میں کھڑا انڈے پھینٹ رہا تھا اور سلاد بنا رہا تھا..... اس کے ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی زندگی کی اہم ترین ہستی سے کس طرح اور کیا بات کرنی ہے۔

ڈنر تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تاجور! آج میرا دل چاہتا ہے کہ ہم اندر والے ٹیرس پر بیٹھ کر کھانا کھائیں، میں تم سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

پہلوان حشمت لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ ''دیکھو بھئی، میں یہاں تاجور بٹیا کے سرپرست کی حیثیت سے موجود ہوں۔ نکاح سے چند دن پہلے لڑکے لڑکی کا اس طرح ملنا اچھا نا ہیں سمجھا جاتا، بلکہ پہلے وقتوں میں تو وہ ایک دوسرے کو دیکھتے بھی نا ہیں تھے۔ بہرحال اگر تم مجھ سے باقاعدہ اجازت مانگو تو میں اس بارے میں سوچ سکت ہوں۔''

اگر پہلوان حشمت یہ سمجھتا تھا کہ اس کی اس ہلکی پھلکی بات پر تاجور کے چہرے پر مسکراہٹ آئے گی تو اس کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ تاجور نے سنجیدگی سے کہا۔ ''چاچا جی! آپ کبابوں کے ساتھ چاول لیں گے یا پراٹھا؟''

پہلوان بولا۔ ''تم مشکل میں ڈال دیتی ہو۔ گندم میں طاقت زیادہ ہووت ہے لیکن جبڑا ٹھیک نا ہیں ہے اس لیے تھوڑے بہت چاول بھی کھا لوں گا۔''

پہلوان حشمت کا کھانا اس کے کمرے میں لگا کر تاجور واپس کچن میں آ گئی۔ اس کے آنے تک میں نے اپنا اور تاجور کا کھانا نکال لیا تھا۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے ٹرے اٹھائی اور کہا۔ ''آ جاؤ، اوپر چلتے ہیں۔''

اس نے بالوں کی لٹوں کو پیشانی سے ہٹایا اور میرے

پیچھے پیچھے سیڑھیوں کی طرف آگئی۔ ہم ٹیرس میں رکھی میز کے گرد جا بیٹھے، اس ٹیرس کا رخ اس گھر کے مختصر صحن کی طرف تھا۔ ایک بون بیل نے ٹیرس کے جنگلے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

کھانے کے دوران میں ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے میں تاجور سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ اس نے بدستور طبیعت کی خرابی کی آڑ لے رکھی تھی۔ وہ بار بار دونوں چھوٹے بھائیوں کی بات کر رہی تھی اور اپنی والدہ کی بھی۔

میں نے کہا۔ ”تاجور! شکر کا مقام ہے کہ خالہ جان اتنا بیمار ہونے کے باوجود اسپتال سے ڈسچارج ہوگئی ہیں اور اب پھر سے چل پھر رہی ہیں۔“

”لیکن اُن کے دل پر پتا نہیں کیا بیت رہی ہوگی۔ اباجی ان کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ وہ یہی کہیں گے کہ میرے اس طرح گھر سے نکل جانے میں ان کا ہاتھ ہے، ان کی تربیت کا قصور ہے۔“

”اس کی فکر نہ کرو تاجور، تمہارے خاندان اور عزیز و اقارب میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو اُن کی ہاں میں ہاں ملائے گا اور مجھے یقین ہے تاجور، تمہارے ماموں حبیب صاحب نے تو سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا، تمہارا خط ملنے کے بعد۔“

”لیکن پتا نہیں کہ ان کو خط ملا بھی ہے یا نہیں؟“

”نہ ملنے کی کوئی وجہ نہیں تاجور! تم اس طرح کے وہم نہ کرو، آج تم سے ایک دو بہت اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں بلکہ میں یوں کہوں گا کہ میں اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد تم میرے بارے میں جو بھی رائے قائم کروگی، مجھے قبول ہوگی۔“

”ایسی خاص بات اب کیا رہ گئی ہے؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ہیں کچھ باتیں ..... اور ..... تمہیں بھی پتا ہے کہ وہ ہیں۔“

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ تاجور کے بے لچک لہجے کی وجہ سے میں اپنے اندر بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ تاہم میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تاجور! پچھلے دو تین دن میں نے بڑی کشمکش میں گزارے ہیں، کبھی تو دل چاہتا تھا کہ تم سے کچھ بھی نہ کہوں، صرف اپنے جذبے اور اپنے سچ کی طاقت دیکھوں، یہ دیکھوں کہ کیا تم میرے اندر کی محبت اور سچائی کو میرے کہے بغیر محسوس کرتی ہو یا نہیں۔ لیکن پھر دل نے کہا..... کہ ان افسانوی باتوں پر نہ جاؤ۔ جو زبان سے کہنے والی بات ہے اسے کہہ دو، کہیں بعد میں زندگی بھر یہ پچھتاوا نہ رہے کہ تم نے کہہ دیا ہوتا......“

اس کی انگلیاں بے ساختہ اس کی چوڑیوں سے اُلجھ رہی تھیں۔ ٹیرس میں موتیے کی خوشبو تھی اور پوری رات کا چاند سفیدے کے ایک درخت کے عقب سے جھلک دکھا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ دل سے نکلنے والی بات دل پر اثر کرے گی اور جب میں پورے جذب کے ساتھ بات کروں گا تو اس کے دل میں پڑنے والی گرہیں کھل جائیں گی۔

گفتگو کی شروعات اچھی تھی لیکن پھر ایک ایسی بات ہوئی جس نے ماحول کو بری طرح متاثر کیا اور مجھے یہ اہم ترین بات چیت ملتوی کرنا پڑی، سیڑھیوں پر پہلوان حشمت کے بھاری قدموں کی تھپ تھپ سنائی دی۔ وہ اوپر آیا تو اس کا سانس پھولا ہوا اور رنگت اُڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”سکھیرا سے اچھی خبر نہیں ہے؟“

”کیا ہوا؟“ تاجور سہم کر بولی۔

”شازیہ کے والد چوہدری بشیر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔“

میں دم بخود پہلوان حشمت کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ تاجور کا رنگ بھی بالکل زرد ہو گیا۔ اس کے ہونٹ بے ساختہ تھرائے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پہلوان جی، کس نے بتایا آپ کو؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی ابھی سکھیرا سے فون آیا ہے۔“ پہلوان غمزدہ آہنگ میں بولا۔ ”بشیر کو ایک ہلکا اٹیک تو چند روز پہلے بھی ہوا تھا، آج دوسرا ہوا اور بایاں پہلو بالکل بے جان ہو گیا۔ اسپتال کے راستے میں ہی اس نے دم توڑ دیا۔“

تاجور سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کا چہرہ کرب کی آماجگاہ تھا۔ پہلوان نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ”بیٹے سیف کی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی ..... رہی سہی کسر بیوی کی جدائی نے پوری کر دی۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے چلا گیا۔“

تاجور اٹھ کھڑی ہوئی اور روتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ وہ پہلے ہی سہیلی شازیہ اور اس کے اباجی کی خیریت کے بارے میں بڑی فکر مند تھی۔ آج اس کے اندیشے درست ثابت ہو گئے تھے۔ مجھے بھی اپنے دل پر گہری چوٹ محسوس ہوئی۔ کبھی کبھی ایک فرد کو پیش آنے والا واقعہ اس کے پورے گھرانے کی زندگی کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ کاش وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا اور اگر ہونا ہی تھا تو پھر میں اس میں یوں

بُری طرح ملوث نہ ہوتا، میں اوپر چھت پر چلا گیا۔ خنک ہوا میں دیر تک چھت پر ٹہلتا رہا اور اس صدمے کو خود میں جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حالات عجیب پینترے دکھا رہے تھے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی وقت سب کچھ بکھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ تب میرا دھیان ایک بار پھر انیق اور اس کے رویے کی طرف چلا گیا۔ سینے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کیا انسان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کے اردگرد والے اسی طرح اپنے روپ بدل لیتے ہیں۔ حالات کا رخ یہی بتا رہا تھا کہ انیق کے دل کی گہرائی میں کہیں تاجور کے لیے پسندیدگی اور چاہت کا گوشہ موجود تھا..... اب چونکہ اس کے نزدیک میں اس ”دنیا میں نہیں“ تھا، لہٰذا اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اور میری چاہت کو تاجور کے ذہن سے کھرچنے کے لیے ایک نہایت اوچھا ہتھکنڈا اور بھدے طریقے سے استعمال کیا تھا۔

رات دس بجے کے قریب میں نے تاجور کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر ادھ کھلی کھڑکی میں سے دیکھا، وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کو یوں غم زدہ دیکھ کر دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ جاتا تھا۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یوں ہی خاموش رہ کر ہار نہیں مانوں گا۔ حالات کا پوری طرح سامنا کروں گا اور اپنی طرف سے تاجور کا دل صاف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔ جب کہتے ہیں کہ سچ کو آنچ نہیں تو پھر میرے پاس تو سچ ہی تھا۔

کچھ دیر بعد میں دوبارہ اس کے کمرے میں پہنچا۔ میں نے اسے بتایا کہ چاچا حشمت ہم سب کی نمائندگی کرتے ہوئے بشیر صاحب کی آخری رسوم میں شریک ہونے کے لیے سکھیرا چلا گیا ہے۔

وہ سسکی۔ ”پتا نہیں شازیہ اور اس کی دونوں بہنوں کا کیا حال ہوگا، وہ تو اب بالکل بے آسرا رہ گئی ہیں۔“

میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی رہی۔ جب وہ کچھ نارمل محسوس ہوئی تو میں اپنے کمرے میں آگیا۔ رات کو وہ دیر تک جاگتی رہی۔ اس کے کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔

بہرحال وہ گفتگو سنائی نہیں دی جو وہ فون پر بہت مدھم آواز میں کرتی تھی۔ شرافت کی گاڑی بدستور میرے استعمال میں تھی۔ (وہ اول درجے کا ”یار باش“ اور مہمان نواز شخص ثابت ہو رہا تھا) گاڑی کی اسٹارٹنگ میں کوئی مسئلہ آ رہا تھا۔ میں اسے چیک کرانے کے لیے ورکشاپ چلا گیا۔ واپسی پر

مارچ 2018ء کے بدلتے موسم میں سسپنس کا
خوب صورت شمارہ دلنشین کہانیاں ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید
محفل شعر و سخن، خطوط،
مرزا امجد بیگ کی وکالت کہانی

حریف
نظروں سے اوجھل دل سے قریب کی تفسیر..... عقل اور جذبات کے درمیان عجب کھیل۔ آخری صفحات پر **نشور ھادی** کا تحفہ

رنگ آسماں
بدلتے آسماں کے رنگوں میں سے ایک دلکش رنگ.....
خانہ بدوشوں کا قافلہ اپنے خطرناک عزائم کے ساتھ محو سفر ہے۔ **ایم۔ آر۔ راجپوت** کے قلم کا جادو

وقت
ماں جیسی ہستی سے بچھڑنے کا عذاب سہنے والے بیٹے کے غموں کا حساب..... وقت کی پڑتال میں اپنے پرائے سب حساب دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ **حسام بٹ** کے قلم کی روانی

اس کے علاوہ
تنویر ریاض۔ منظر امام۔ شاکر لطیف۔ ناہید سلطانہ اختر
نعمان اسحاق اور مظہر سلیم ہاشمی کی سحرانگیز تحریریں آپ کی منتظر

مجھے مین مارکیٹ سے کچھ سودا سلف بھی لینا تھا۔ میں نے تاجور کو احتیاطاً سے دروازے بند رکھنے کا کہا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب میں اسے اس گھر میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ مجھ سے بہت دور جا چکی ہو گی۔

مجھے گاڑی ٹھیک کرانے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ پھر میں مین مارکیٹ چلا گیا۔ بالوں کی کٹنگ کرائی اور وہیں بیٹھ کر کئی دن بعد اخبار بھی پڑھا۔ کچھ شاپنگ کر کے میں ڈھائی بجے کے لگ بھگ واپس روانہ ہوا۔ میرا اسمارٹ کیمرا ابھی تک گھر کے کامن روم میں وال کلاک کے ساتھ چسپاں تھا...... مگر کل شام سے اس کی چارجنگ ختم ہو چکی تھی اور اسے اتار کر "اڈاپٹر" کے ساتھ لگانے کی ضرورت تھی۔ ابھی میں گھر کے سامنے ہی پہنچا تھا کہ مجھے پہلوان حشمت کی پریشان صورت دکھائی دی، اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا..... وہ غالباً ابھی کچھ ہی دیر پہلے سکھیرا اکاؤں سے واپس آیا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "میں تم کو ہی فون کلانے لگا تھا۔ تاجور بٹیا کہاں ہے؟"

"کیوں؟ گھر میں نہیں ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ بولا۔ "یہ باہر والا دروازہ لاک تھا۔ میرے پاس چابی ہے۔ میں کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید تم دونوں کہیں گئے ہو۔"

میرے سینے میں جیسے کسی نے ایک زوردار گھونسا رسید کیا۔ میں تیزی سے گھر میں داخل ہوا، سیدھا تاجور والے کمرے میں پہنچا۔ میری چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے کوئی بہت اہم فیصلہ کر لیا ہے اور یہاں سے چلی گئی ہے۔

اگلے چار پانچ منٹ میں اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ جا چکی تھی۔ اسی دوران میں شرافت علی بھی آ گیا۔ ہماری پریشان صورتیں دیکھ کر اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ "کیا ہوا وقاص صاحب؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں تاجور نے کوئی فون وغیرہ تو نہیں کیا؟" میں نے الٹا اس سے استفسار کیا۔

"نہیں جی، کیا تاجور بہن گھر میں نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں جواب دیا اور ایک بار پھر تاجور کے سیل فون پر کال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے...... یہ مایوس کن فقرہ بار بار کانوں میں گونجتا رہا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ الماری کھولی، میرے کپڑے کے دو تین جوڑے بڑی نفاست سے استری کر کے ہینگروں میں لٹکا دیے گئے تھے۔ کمرا صاف ستھرا تھا اور ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ واش روم میں بھی تولیا، صابن وغیرہ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی۔ غالباً میرے جانے کے بعد وہ یہی کچھ کرتی رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جہاں بھی گئی ہے، اپنی مرضی سے گئی ہے۔ لیکن کہاں گئی ہے؟ یہ سوال اہم ترین تھا اور نہایت تشویشناک بھی۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ میری غیر موجودگی میں انیق پھر یہاں آیا ہو اور وہ اس کے ساتھ چلی گئی ہو یا پھر وہ نہ آیا ہو مگر دونوں کے درمیان فون پر ہی کچھ طے ہو گیا ہو اور وہ یہاں سے روانہ ہو گئی ہو۔ دوسرا امکان زیادہ پریشان کن تھا اور وہ یہ تھا کہ کہیں وہ اپنے والد کے پاس واپس نہ چلی گئی ہو۔ سونے کے اس پنجرے میں بند ہونے کے لیے جہاں اسے ہمیشہ کے لیے پھڑ پھڑانا ہی تھا۔

پہلوان حشمت بے حد حیران تھا۔ اُسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تاجور اس طرح خاموشی کے ساتھ یہاں سے جا سکتی ہے۔ یہاں تو اس کے نکاح کی تیاری ہو رہی تھی۔ ایک ایک دن گنا جا رہا تھا۔ پہلوان کو اس چکر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا جو کئی دن سے یہاں چل رہا تھا۔ انیق بڑی خاموشی سے دو دفعہ یہاں آ چکا تھا۔ اس بارے میں بھی پہلوان کو کچھ خبر نہیں تھی اور پھر وہ کاری ضرب جو انیق نے مجھ پر اور میرے کردار پر لگائی تھی، وہ بھی پہلوان حشمت سمیت کسی کے علم میں نہیں تھی، حتیٰ کہ میں نے ابھی تک سجاول کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

شام تک اس بات کی امید رہی کہ شاید تاجور اچانک کہیں سے واپس آ جائے اور وہ تمام بدترین اندیشے غلط ثابت ہو جائیں جو مسلسل میرے دل و دماغ کو چھید رہے تھے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا فون مسلسل آن تھا اور میں وقفے وقفے سے تاجور کو کال بھی کر رہا تھا۔ اس نے اپنا فون بند کر چھوڑا تھا۔

راولپنڈی میں بھی داؤد بھاؤ کا ایک ٹھکانا موجود تھا۔ ایک مرتبہ انیق نے خود بھی اس کا ذکر کیا تھا اور اس کا حدودِ اربع بتایا تھا، تاہم ٹھیک ایڈریس مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے داؤد بھاؤ سے رابطے کی کوشش شروع کر دی۔ چند دن پہلے کی طرح اب بھی ناکامی ہوئی۔ ٹیکساری گینگ والے واقعے سے پہلے ہی وہ اپنے کسی چکر میں زیرِ زمین تھا۔ انیق کی صورت رہ رہ کر میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی اور ایک

عجیب طرح کا طیش اس کے حوالے سے محسوس ہوتا تھا۔ بہرحال یہ بات تو میں کسی صورت بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ تاجور نے انیق کے بارے میں کسی دوسرے انداز میں سوچا ہو گا۔ وہ اس کے لیے صرف اور صرف ایک بھائی بلکہ چھوٹے بھائی کی حیثیت رکھتا تھا۔

رات نو بجے کے لگ بھگ میں نے فردوس سے ٹیلی فونک رابطے کی تگ و دو شروع کر دی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ سارے فون بند ہیں جن سے میں رابطہ کرنے ...کی کوشش کر رہا ہوں۔ فردوس کے فون پر پہلے تو بیل جاتی رہی پھر وہ بھی بند ہو گیا۔ میری جھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ بہرحال دس بجے کے لگ بھگ اچانک فردوس سے رابطہ ہو گیا۔ اس کی آواز سن کر ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہ اسلام آباد والے نیم سرکاری بنگلے کے کسی واش روم سے بول رہی ہے۔ اس نے کوئی نل بھی کھول رکھا تھا۔ تاکہ پانی گرنے کی آواز میں اس کی آواز دب جائے۔

"کیا بات ہے بھرا وقاص؟" وہ ڈری اور قدرے جھنجلائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا؟" میں نے غصے سے کہا۔

"اس ویلے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اب بھی بڑی مشکل سے موقع نکالا ہے۔"

"یہ مت سمجھنا کہ تم فون نہ سنو گی تو میں چپ کر کے بیٹھا رہوں گا، میں جا پہنچوں گا تمہارے پاس...... اور پھر جو کچھ ہو گا اس کی ذمے دار تم خود ہو گی۔"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "تم کو جو کہنا ہے جلدی کہو، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

"تاجور کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں پر ہی ہے، اور کہاں جانا ہے اس نے۔" وہ حسبِ سابق بولی۔ اس نے کبھی یہ بات تسلیم نہیں کی تھی کہ چند روز پہلے تاجور اچانک اسلام آباد کے اس نیم سرکاری بنگلے سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی اسی تناظر میں بات کر رہی تھی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "فردوس! تم بال بچوں والی ہو اور تم نے ایک بال بچے دار شخص سے ناجائز تعلق بنایا ہوا ہے۔ میرے پاس تمہارے اور ہاشو کے کرتوت کی تصویریں ہیں۔ میں تمہیں برباد کر ڈالوں گا اگر تم نے سچ نہ بولا تو۔"

وہ جیسے سرتا پا لرز کر بولی۔ "میں نے کیا کہہ دیا ہے وقاص بھائی، جو تم پوچھ رہے ہو بتا تو رہی ہوں۔"

"تم نے پہلے بھی جھوٹ بولا تھا اور اب بھی اپنے مالکوں کی پردہ داریاں کر رہی ہو۔ پچھلی دفعہ میں نے تم کو فون کیا تھا تو تم نے کیا کہا تھا؟"

"کک...... کیا کہا تھا؟"

"تم نے کہا تھا کہ تاجور بی بی وہاں بنگلے پر ہی ہے...... اور اس کا نکاح ابھی اس لیے نہیں ہو سکا کہ اس کی والدہ اسپتال میں ہے حالانکہ اس وقت تاجور بنگلے پر موجود ہی نہیں تھی۔ وہ نکل چکی تھی وہاں سے اور سارے گھر والے اسے جگہ جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے...... ڈھونڈ رہے تھے یا نہیں؟" میں نے کڑک دار لہجے میں پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ بس اس کے ہانپتے ہوئے سانسوں کی آواز ہی آ رہی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا سا مزید دھمکایا تو وہ روہانسی ہو گئی۔ منت کرنے لگی کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں، ورنہ یہ لوگ اس کی کھال اتروا کر اس میں توڑی (بھس) بھروا دیں گے۔

میں نے کہا۔ "چھوڑ دوں گا پیچھا...... بلکہ انعام بھی اتنا دوں گا جو تم نے سوچا نہ ہو گا لیکن میں جب بھی فون کروں، میرا فون سننا ہو گا اور مجھے سب کچھ صاف صاف بتانا ہو گا۔ ورنہ وہ سب کچھ ہو گا جو میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

اس کے سسکنے کی آواز آتی رہی۔ میں نے کہا۔ "بتاؤ اب...... کہاں ہے تمہاری تاجور بی بی؟"

"وہ...... آج ہی...... واپس آئی ہے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے۔" فردوس نے کہا اور میرے سینے میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

آخر وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ وہ انیق کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ واپس اپنے قید خانے میں چلی گئی تھی اور یہ بدترین صورت حال تھی۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے فردوس سے پوچھا۔ "کیا بتایا ہے اس نے؟ کہاں گئی تھی اور کہاں سے آئی ہے؟"

"ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔ پر پورے بنگلے میں تھرتھلی سی مچی ہوئی ہے۔ تاجور بی بی کے سسرال والے بھی آئے ہوئے ہیں وڈی وڈی گاڑیوں میں۔ سب اندر والے لمبے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دروازے شروازے بھی بند ہیں۔"

"وہ اکیلی آئی تھی؟"

"آہو، وڈی چادر لی ہوئی تھی اور نقاب کیا ہوا تھا۔ ٹیکسی سے اتری تھی۔ گیٹ پر چوکیدار اُسے دیکھ کر حیران رہ

گئے پھر پورے بنگلے وچ بھاگ دوڑ مچ گئی۔"

اب سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ فی الوقت فردوس سے گفتگو کو طول دینا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور موقع دیکھ کر مجھے یہاں کی صورتِ حال بتاتی رہے۔ میرا فون ہر وقت آن رہے گا۔

میرے دماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دو چار دن میں ہی عرش سے فرش پر آن گرا ہوں۔ اور یہ جو کچھ ہوا تھا اس کی بڑی وجہ انیق ہی تھا۔ میرا دوست' میرا عزیز از جان ساتھی۔

میرا دل گواہی دینے لگا کہ اب جو کچھ ہوگا بڑی جلدی ہوگا۔ تاجور نے اپنے والد کے قدموں میں سر رکھ دیا ہوگا اور روتے ہوئے اپنی "غلطی" کی معافی مانگ لی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہوگا کہ وہ اُن کے ہر فیصلے کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔ اور دارج شکاری تو پہلے ہی تیار تھا۔ شکار کو یوں بے دست و پا دیکھ کر اور رضامند جان کر اس نے ایک دن کی دیر بھی نہیں کرنا تھی۔ تیاری تو پہلے سے موجود تھی اب راستے میں اور کیا رکاوٹ ہوسکتی تھی۔ ایک دم مجھے لگا کہ میں محبت کی اس لڑائی میں ہار رہا ہوں..... اور یہ ہار غیروں کے سبب نہیں، اپنوں کی وجہ سے ہی میری جانب بڑھ رہی ہے۔

میں نے رات گئے سجاول کو فون کیا۔ میں نے ابھی تک اسے یہاں انیق کی آمد اور اس کی سنگین مداخلت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ اب بتانا چاہتا تھا۔ بے شک انیق سے ایک غلطی ہوئی تھی اور بہت بڑی ہوئی تھی لیکن اب بھی مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ اسے سجاول کی طرف سے کوئی بڑا نقصان پہنچ جائے۔ اس کے اور سجاول کے تعلقات پہلے بھی کچھ بہت اچھے نہیں تھے۔ اگر سجاول کے علم میں یہ سارا معاملہ آجاتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ وہ اسے شوٹ ہی کر ڈالتا۔

میری کال پر سجاول کے اس لالہ موسیٰ والے گھر میں بیل ہوئی۔ پانچویں چھٹی بیل پر اس نے فون اٹھا لیا۔ "کیا بات ہے، تمہیں اتنی رات گئے بھی چین نہیں ہے؟" سجاول نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ساتھ ہی خورسنہ کی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ یقیناً وہ اس کے پاس ہی موجود تھی۔

"کوئی بات نہیں، اگر ڈسٹرب ہو رہے ہو تو صبح بات کرلیں گے۔" میں نے کہا۔

اسی دوران میں خورسنہ نے غالباً سجاول کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا۔ شوخ آواز میں بولی۔ "ہم تو ڈسٹرب نہیں ہوئے لیکن آپ بہت ڈسٹرب لگ رہے ہیں۔ انتظار کے یہ دو چار دن کاٹنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ میں نے آپ کے ان دوست صاحب (سجاول) کی حالت دیکھی تھی۔" اس کی کھنکتی ہنسی سنائی دی۔ وہ اپنے اور سجاول کے حوالے سے کافی بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پاکستان سے باہر پلی بڑھی تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہارا کیا حال ہے خورسنہ؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ کے یہ دوست ٹھیک نہیں ہیں۔ بالکل الو بانٹے ہو گئے ہیں، رات رات بھر جاگنے والے۔" اس نے پھر ہنسی کا جلترنگ بجایا۔

خورسنہ سے ایک دو رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور تب اس نے فون ایک بار پھر سجاول کو تھما دیا۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے سجاول، ابھی تم آرام کرو کل بات کریں گے۔"

تب تک سجاول جان چکا تھا کہ میں کوئی عام نہیں خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔ کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں جن سے اندازہ ہوا کہ سجاول بیڈ روم سے باہر نکل رہا ہے۔ چند سیکنڈ بعد وہ بولا۔ "ہاں..... اب بتاؤ شاہی! میں دوسرے کمرے میں ہوں، کوئی خاص گل ہے؟"

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ "ہاں سجاول! گل تو خاص ہی ہے بلکہ کافی سے زیادہ خاص۔"

"اوئے کچھ بتاؤ بھی، تاجور تو ٹھیک ہے ناں؟"

"ہاں وہ ٹھیک ہے لیکن یہاں سے چلی گئی ہے۔ واپس اپنے باپ کے پاس..... اسی گھر میں جہاں سے ہم اُسے نکال کر لائے تھے، اور..... مجھے لگتا ہے کہ اب وہ واپس نہیں آئے گی۔"

فون لائن پر چند لمحے سناٹا رہا پھر سجاول کی پریشان آواز سنائی دی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو یار! یہ کیسے ہوسکتا ہے، کیا اس جھلی کو پتا نہیں کہ اس کے واپس جانے کا مطلب کیا ہے، وہ تو اس کا حشر نشر کردیں گے، اس کا نکاح ہو رہا ہے تم سے۔ وہ اس طرح کی حرکت کیسے کرسکتی ہے؟"

"بس جو بھی ہے سجاول! یہ حرکت ہوگئی ہے۔ وہ چلی گئی ہے یہاں سے۔ اپنی مرضی سے گئی ہے اور نہ آنے کے لیے گئی ہے۔"

"یار! یہ کوئی گڈی گڈے کی کھیڈ ہے۔ کوئی مذاق ہے؟" سجاول کا لہجہ آتشیں ہوگیا۔ "تم نے کیوں جانے دیا اُسے؟ کب گئی ہے وہ؟"

میں نے کہا۔ "تمہیں بتایا تھا ناں، وہ دو تین دن سے بالکل گم صم تھی۔ سر درد کا بہانہ کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس کے اندر کیا چل رہا تھا۔ بار بار والدہ اور چھوٹے بھائیوں کا ذکر بھی کرتی تھی۔ لگتا ہے کہ اس نے سوچ بچار کی اور اپنا فیصلہ بدل لیا۔" (میں نے انیق والی ساری بات کو گول رکھا)

سجاول کی بھنائی ہوئی مگر مدھم آواز سنائی دی۔ "میں نے تمہیں جاماجی جانے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا ناں شاہی کہ تم بے وقوفی کر رہے ہو۔ وہاں کوٹلی والے ڈیرے پر یہ تمہارے پاس تھی۔ ہر طرح تمہارے بس میں تھی۔ تم جو کہتے وہ مان بھی سکتی تھی لیکن تم نے اسے واپس جانے دیا بلکہ خود اسے اس کے پیو کے پاس چھوڑ کر آئے..... عورت ذات کا ڈنگا پن سامنے ضرور آتا ہے۔ اس کو جتنی ڈھیل دیتے جاؤ، لیتی چلی جاتی ہے۔ بندے کی مت مار کے رکھ دیتی ہے۔ اس کو ترسا تڑپا کر خوش ہوتی ہے اور خوش ہوتے ہوتے کسی وقت سب کچھ برباد کر بیٹھتی ہے۔" غصے کے عالم میں اس کے منہ میں جو بھی آرہا تھا، بولتا چلا جا رہا تھا، تاہم آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ دوسرے کمرے میں خورسنہ تک پہنچ جاتی۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "سجاول! جو کچھ قسمت میں ہوتا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے اگر وہ میری......"

"چھڈ یار۔" اس نے جھلا کر میری بات کاٹی۔ "اب قسمت کو لے کر بیٹھ جا..... قسمت بھی تو ہم خود ہی بناتے ہیں۔ اب میرے والے معاملے کو دیکھ لے۔ یہاں بھی عورت کا ڈنگا پن تھا کہ نہیں؟ میں اسے چاہتا تھا اور وہ بھی چاہتی تھی۔ میرے ساتھ زندگی گزارنے کے ارادے تھے۔ میرے پیچھے یہاں پاکستان آئی۔ پر صرف سیر سپاٹے کے لیے۔ شادی کے پروگرام بعد کے تھے۔ اگر میں اسے جانے دیتا تو یہ اس وقت جاماجی میں آنکھیں گیلی کر رہی ہوتی اور میں یہاں سوکھ رہا ہوتا۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں سجاول! لیکن یہاں بات کچھ اور طرح ہے....."

"کوئی اور طرح نہیں۔" اس نے پھر میری بات کاٹی۔ "میں تو صاف صاف کہوں گا تجھے۔ اس موقع پر اگر تو فلمی ہیرو بن کر بیٹھ گیا ناں تو سب کچھ نکل جائے گا تیرے ہاتھوں سے۔ اب اس کو جانے نہ دے۔ چیز وہی اپنی ہوتی ہے جسے بندہ آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں میں کرلیتا ہے۔ اگر تجھ سے ہمت نہیں ہو رہی تو مجھے بتا۔ میں کرلیتا ہوں سب کچھ۔ ایسی کی تیسی اس کنجر دارج کی اور اس کے ہوتوں سوتوں کی۔ مکھن کے بال کی طرح نکال کر اُسے لے آؤں گا واپس تیرے پاس۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سجاول! زبردستی نہیں کرنی ہے ہم نے..... جو کچھ بھی کریں گے، سوچ سمجھ کر کریں گے۔"

"لیکن زیادہ سوچنے کا ٹائم نہیں ہے تیرے پاس، اگر وہ واقعی اس بنگلے میں واپس پہنچ گئی ہے تو پھر سب کچھ بڑی جھٹ پٹ ہوجانا ہے۔"

میں نے سجاول سے کہا کہ ابھی میں فون رکھ رہا ہوں، وہ بھی آرام کرلے۔ صبح میں دوبارہ کال کروں گا۔ وہ بہت سٹپٹایا ہوا تھا۔ میں اس کی دلی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

وہ رات سخت بے قراری میں گزری۔ اگلے روز اتوار تھا۔ دوپہر کے بعد میں فردوس سے فون پر رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ حسبِ معمول بنگلے کے کسی واش روم میں چھپ کر بات کر رہی تھی۔ ٹب یا بالٹی میں پانی گرنے کی مدھم آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ فردوس نے وہی کچھ کہا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے بتایا۔ "تاجور بی بی نے رو رو کر میاں جی سے معافی مانگی ہے اور انہوں نے اسے معاف کردیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ وہی کچھ کرے گی جو میاں جی کہیں گے۔" میاں جی سے فردوس کی مراد تاجور کے ابا جی چوہدری دین محمد تھے۔

میں نے فردوس سے پوچھا۔ "کئی دن گھر سے غائب رہنے کے بارے میں اس نے کیا بتایا ہے؟"

"یہی کہ وہ پریشان ہو کر لاہور میں اپنی سہیلی فرح کے پاس چلی گئی تھی اور اب وہیں سے واپس آئی ہے۔ اس کی سہیلی فرح بھی کل اس کے ساتھ ہی یہاں بنگلے میں آئی تھی۔"

یہ فرح، تاجور کی وہی دوست تھی جس سے شروع شروع میں لاہور میں میری ملاقات ہوئی تھی۔ (ایک طرح سے فرح نے ہی مجھے اور تاجور کو ایک راہ پر ڈالا تھا اور میں تاجور کو اس کے آوارہ منگیتر اسحاق سے بچانے کے لیے چاند گڑھی پہنچا تھا)

فردوس جو کچھ بتا رہی تھی، اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے چھوڑنے سے ایک دو دن پہلے ہی تاجور نے حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔ اس نے فون پر اپنی اس سہیلی فرح سے بھی رابطہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی بنگلے پر واپس لوٹی تھی۔

میں نے فردوس سے پوچھا۔ "اب کیا پروگرام ہے ان لوگوں کا؟"

وہ دبی آواز میں بولی۔ ''کل سارا دن مشورے ہوتے رہے ہیں۔ اب بھی وڈی وڈی گاڑیوں میں لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان میں تاجور کی ہونے والی ساس بھی ہیں۔ میں نے بتایا تھا ناں کہ یہ بڑی رعب دار اور ڈھادی عورت ہیں، سنا ہے کہ......'' وہ بتاتے بتاتے چپ ہوگئی۔

میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ اپنی زبان کو بریک نہ لگایا کرے۔ بات پوری کیا کرے۔

وہ ذرا ہکلا کر کہنے لگی۔ ''پتا چلا ہے کہ تاجور کی ہونے والی ساس کل بڑے غصے میں تھیں۔ ان کو شاید شک تھا کہ تاجور غلط کہہ رہی ہے۔ وہ لاہور میں اپنی سہیلی کے پاس نہیں تھی...... اگر تھی بھی تو کیوں تھی؟ اس نے گھر چھوڑ کر جانے کی ہمت کیسے کی؟ انوری نے بتایا ہے کہ کل کوئی جھگڑا شکوا بھی ہوا ہے۔''

''جھگڑا...... کس کے درمیان؟''

''خیر اس کو جھگڑا تو نہیں کہہ سکتے۔ تاجور کی ہونے والی ساس نے ہی غصہ دکھایا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ تاجور بی بی کا نکاح کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میاں جی نے اس کا ترلا منت کر کے اسے کچھ ٹھنڈا کیا۔ بعد میں بند کمرے کے اندر ماں بیٹے میں بھی کچھ گرما گرمی ہوئی۔''

''کون ماں بیٹا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی تاجور کی ہونے والی ساس اور وارج صاحب...... پتا چلا ہے کہ وارج صاحب نے بھی ماں کو سمجھایا بجھایا اور ٹھنڈا کیا۔ وارج صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ ایک غلطی ہوئی ہے لیکن اگر صبح کا بھولا شام ڈھلے گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔''

فردوس کی باتیں سن کر میرا سلگتا ہوا سینہ کچھ اور بھی سلگنے لگا۔ تاجور اپنے ہاتھوں سے ایک ایسا طوق گلے میں پہن رہی تھی جس سے اسے دکھ تکلیف اور توہین کے سوا اور کچھ نہیں ملنا تھا۔ وارج جس درگزر اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا، اس کے پیچھے یقیناً اس کی جلتی ہوئی خواہشات ہی تھیں۔ وہ بس ایک شکاری تھا اور کسی بھی طرح شکار کو اپنے دام میں لانا چاہتا تھا۔

فردوس کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا، وہ بولی۔ ''ہائے میں مرگئی۔ میاں جی مجھے آوازیں دے رہے ہیں۔ وہ پہلے ہی بڑے غصے میں ہیں۔ انہوں نے میری شامت لے آنی ہے۔''

''اچھا...... جانے سے پہلے ایک بات بتاؤ، کب ہونا ہے یہ نکاح والا کام؟''

''ابھی تو کچھ پتا نہیں ہے وقاص بھائی، کم از کم مجھے تو کچھ پتا نہیں۔ ویسے پہلے وہی مہندی والا کام ہوگا۔ میں نے اُڑتی اُڑتی سی گل سنی ہے۔ کل شاید مہندی ہوگی اور پرسوں نکاح اور رخصتی...... اچھا اب میں جاتی ہوں۔'' اس نے پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں بولا۔ اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔

میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ہر چیز کی ٹائمنگ غلط ہو رہی تھی۔ چار روز پہلے رات کے کھانے کے بعد، ٹیرس میں بیٹھ کر میں نے تاجور سے تفصیلی اور حتمی گفتگو کرنا تھی، میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا تھا اور ممکن تھا کہ میرے دل سے نکلنے والی آواز اس کے دل پر اثر بھی کر جاتی مگر پھر سیف کے والد چوہدری بشیر کے انتقال کا غم ناک واقعہ ہو گیا تھا اور اس واقعے نے تاجور کے احساسات سمیت جیسے سب کچھ بدل کر رکھ دیا تھا۔

پہلوان حشمت برآمدے میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ ایک تو اسے بھی تاجور کے چلے جانے کی پریشانی تھی۔ دوسرے اسے بھوک بھی ستا رہی تھی۔ ڈھائی بج چکے تھے اور ابھی تک ہم میں سے کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ ناشتے میں بھی پہلوان نے بس چند بسکٹ اور چائے لی تھی۔ اس سے پہلے یہاں تاجور نے ہی کچن سنبھال رکھا تھا۔ اب باقی گھر کی طرح کچن بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

میں نے پرس نکالا تا کہ پہلوان حشمت سے کہوں کہ وہ کسی قریبی ریسٹورنٹ سے کھانا لے آئے۔ میں نے پرس کھولا تو سب سے پہلے میری نگاہ ایک تازہ تازہ تہ کیے ہوئے سفید کاغذ پر پڑی۔ یہ لیٹر پیڈ کا کاغذ تھا۔ میں نے چونک کر کاغذ نکالا تحریر دیکھتے ہی میں پہچان گیا یہ تاجور کی تھی۔ میری دھڑکن ایک دم دگنی ہوگئی۔ خود کو نارمل رکھتے ہوئے میں نے پہلوان کو کچھ پیسے دیے تا کہ وہ کھانا لے آئے۔ شرافت اور پہلوان باہر نکل گئے تو میں نے بند کمرے میں خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط تاجور نے گھر چھوڑنے سے پہلے لکھا تھا۔ تحریر یوں تھی:

''شاہ زیب! یہ الفاظ لکھتے ہوئے میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں اور میں انہیں بار بار پونچھ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں ایک بار پھر آپ کو دکھ دے رہی ہوں لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے اور ہر بار ایک ہی جواب

ذہن میں آیا ہے۔ مجھے اس رات اپنے ماں باپ اور گھر والوں کو اتنا بڑا دکھ دے کر اس گھر سے نکلنا نہیں چاہیے تھا۔ میں نے اس کی بہت دلیلیں سوچی ہیں لیکن کوئی ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو میری اس حرکت کو جائز بنا سکے۔ میں اپنی خوشیوں کے لیے اپنے پیدا کرنے والوں کو اتنا بڑا دکھ نہیں دے سکتی۔ میں ابا جان کے قدموں میں اپنا سر رکھنے کے لیے جا رہی ہوں۔

میں جانتی ہوں شاہ زیب! آپ ڈرنے والے نہیں ہیں۔ آپ میرے لیے ہر بڑی سے بڑی دیوار کو گرانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور اسے گرا بھی سکتے ہیں لیکن آپ ایسا نہ کرنا...... پلیز ایسا نہ کرنا۔ کیونکہ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ میں آپ کے پاس نہیں لوٹوں گی۔ میں نے اپنی سب سے پیاری ہستی اپنی ماں کے سر کی قسم کھائی ہے۔ مجھے اب واپس نہیں آنا۔ اگر آپ زبردستی یا پھر کسی بھی حیلے سے مجھے اپنے پاس لے آئیں گے تو وہ میں نہیں میری لاش ہوگی۔ اور یہ لاش آپ کے کسی کام کی نہیں ہوگی۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار آپ سے ایک درخواست کر رہی ہوں اور وہ یہی ہے کہ میرا خیال ہمیشہ کے لیے اپنے دماغ سے نکال دیں۔''

خط جس طرح بغیر کسی تمہید کے شروع ہوا تھا اسی طرح بغیر کسی رسمی جملے کے، روکھے پھیکے طریقے سے ختم ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ بولے ہوئے الفاظ ہی نہیں، کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ بھی اپنے لکھنے والے کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور پتا نہیں کیوں یہ الفاظ دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ ان کے پیچھے حتمی ارادہ اور چٹان کی طرح مضبوط فیصلہ ہے۔ میں بے دم سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں لگ جیسے تاجور نے کھڑے کھڑے میرے دونوں ہاتھ توڑ دیے ہیں اور کسی تیز دھار کٹار سے میرے دونوں پاؤں قلم کر دیے ہیں۔ میرا یقین تھا کہ دنیا بھر کی دولت، طاقت اور جاہ و حشمت، ایک عورت کی دلی چاہ کو خریدنا چاہے تو نہیں خرید سکتی اور مجھے یہی لگ رہا تھا کہ آج میں اس چاہ سے محروم ہو گیا ہوں۔

اپنے اس خط میں تاجور نے کہیں بھی مجھ پر سیف کے حوالے سے کوئی الزام نہیں دھرا تھا۔ کہیں سیف کا نام نہیں آیا تھا لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خط میں شروع سے آخر تک بس سیف ہی کا ذکر ہے اور اس کی اندوہناک موت کی رُوداد ہے۔

سینہ جل اٹھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس ہوئی۔ دل نے جیسے پکار کر تاجور سے پوچھا۔ کیا اتنی کمزور تھی تمہاری محبت۔ ایک جھوٹ سے فریب کھا گئی۔ سچ کو نہ دیکھ سکی۔

''خوبی''

دکاندار نے ریڈی میڈ سوٹ شاہد کو دیتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ آپ کو اس طرح فٹ آئے گا جیسے ہاتھ پر دستانہ۔''

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سوٹ میں پتلون چار ٹانگوں والی تھی اور کوٹ ایک آستین والا۔

''دل''

کارڈیو ویسکولر کی ایک ایمبولینس کا ڈرائیور ایمبولینس لے کر اسپتال پہنچا تو اس نے دیکھا اسپتال کے دو سرجن ہاہر فٹ پاتھ پر سڑک کے کنارے کنارے کچھ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

''کیا آپ کا کچھ کھو گیا ہے؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''نہیں...ہم ایک انکم ٹیکس انسپکٹر کا تبدیلی قلب کا آپریشن کر رہے ہیں۔ اس کے سینے میں رکھنے کے لیے کوئی معقول سا پتھر نہیں مل رہا۔'' ایک سرجن نے بتایا۔

میری آنکھوں کی گہرائی میں نہ جھانک سکی۔ پیار کرنے والے تو خاموشی کی زبان بھی سمجھتے ہیں۔ میں نے تو تمہیں بتایا...... اور کئی بار بتایا کہ میری زندگی کا حاصل تمہاری محبت ہے اور میں اس محبت کو کبھی بھی جھوٹ کے چھینٹوں سے داغ دار نہیں کر سکتا۔

اسی دوران میں گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ سجاول سیالکوٹی کسی تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ وہ آج کل پینٹ شرٹ پہن رہا تھا اور کلین شیوڈ تھا پھر بھی اس کا دبنگ انداز اپنی جگہ تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ میرے ساتھ سیدھا کمرے میں آیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''وہ سؤر وارج ہمارے ہاتھوں سے تاجور کو چھین کر لے جائے، میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں آگ لگا دوں گا اس سارے شہر میں۔''

اس کے اندر وہی پرانا سجاول سیالکوٹی بول رہا تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے تک پورے پنجاب میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سجاول! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے......''

''بکواس نہ کر۔ نہیں ہے یہ تیرا ذاتی معاملہ۔ اپنا منہ دیکھ...... اپنا رنگ دیکھ، لگ رہا ہے، مہینوں کا بیمار ہے۔ میں کسی کو تیرا خون چوسنے نہیں دوں گا۔ وارج کی آندریں (انتڑیاں) نکال دوں گا اور تاجور کو تیری جھولی میں لا کر ڈالوں گا۔ دیکھتا ہوں کون راستہ روکتا ہے سجاول کا۔''

''سب سے پہلے تو میں ہی روکوں گا۔'' میں نے پھیکی

ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ تاجور کو میری جھولی میں ڈالتے ڈالتے تم خورسند سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو۔ اس سے شادی کے وقت تم نے عہد کیا تھا کہ اپنی مار دھاڑ والی زندگی سے الگ ہو جاؤ گے۔“

”یہ شوقیہ مار دھاڑ نہیں ہے شاہی۔ تمہاری زندگی کا سوال ہے اور میں تمہارا دوست ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک دوست کے طور پر میری عزت اور آن کو بھی للکارا گیا ہے۔“

”کسی نے نہیں للکارا سجاول، اگر کسی نے للکارا ہوتا تو ہم اس کی للکار کا جواب دیتے۔ یہاں تو وہی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے جس کے لیے لڑنا تھا، مرنا تھا اور جینا تھا۔ وہ اب نہیں آئے گی سجاول...... اور اُسے زبردستی لانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

خط میز پر پڑا تھا۔ اس پر سجاول کی نظر پڑ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، وہ خط اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اس کے چوڑے ماتھے کی سلوٹیں بے ساختہ گہری ہونے لگیں۔ خط میری جھولی میں پھینک کر پکارا۔ ”وہی عورت کا ڈِنگا پن۔ تمہیں کہا تھا ناں کہ ان زنانیوں کی عقل ہی اور طرح کی ہوتی ہے۔ آنکھیں کہیں لگاتی ہیں شادیاں کہیں کرتی ہیں۔ ہزاروں میں کوئی دس بیس ہوں گی لگانے والی اور نبھانے والی۔“

سجاول طیش میں بولتا جا رہا تھا اور وہ اس بے حد کڑوی حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ اگر تاجور نے یہ سب کچھ کیا ہے تو اس کے پیچھے وجہ کیا ہے۔ انیق کی یہاں آمد اور اس کی زہر افشانی کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور میں اسے بتانا چاہتا بھی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انیق کا خون کر ڈالے گا یا پھر انیق کی طرف سے کوئی نقصان اٹھا بیٹھے گا۔

میں نے بڑے تحمل کے ساتھ سجاول کو سمجھایا کہ میں اس کے جذبات کی بے حد قدر کرتا ہوں، لیکن یہ معاملہ کچھ اس طرح کا ہے کہ میں اس میں کسی بھی طرح طاقت کا استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ وہ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ طاقت کے استعمال سے اگر وہ میرے پاس آ بھی گئی تو اس کی حیثیت ایک لاش کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔

میری بات سن کر سجاول نے نفی میں سر ہلایا اور پھنکارا۔ ”یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں شاہی۔ عورت کی مرضی ہو یا نہ ہو لیکن وہ جس مرد کے پاس ہوتی ہے آہستہ آہستہ اسی کی ہو جاتی ہے اور جب بچے ہو جاتے ہیں تو پھر ساری اُڑانیں بھول جاتی ہیں۔ بڑی بڑی ٹیکھی زنانیاں دیکھی ہیں میں نے، بندہ پاس جاتا تھا تو وہ اپنی جان لینے کی دھمکیاں دیتی تھیں لیکن پھر آہستہ آہستہ ہنسی خوشی ان ہی مردوں کے بچے پیدا کرنے لگیں۔“

”تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے سجاول مگر زبردستی والا یہ قانون ہر جگہ ہر کسی پر لاگو نہیں ہوتا۔ ہر بندے کی سوچ اور اس کے معاملات الگ ہوتے ہیں۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں سجاول کہ اس معاملے کا سامنا مجھے اپنے طور پر کرنے دو۔“

”اپنے طور پر تم نے خاک کرنا ہے۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے رہو گے کہ کوئی انہونا کام ہو جائے۔ وہ دروازہ کھولے اور دوڑ کر تمہاری چھاتی سی چمٹ جائے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا دیکھ لینا۔“

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں سجاول! میں یہاں بیٹھ کر کسی انہونی کا انتظار نہیں کروں گا۔ میں اسے روکنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ کوشش میں اپنے طور پر کروں گا اور اپنے طریقے سے۔“ میں نے سجاول کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور التجائیہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری دوستی کی بہت قدر کرتا ہوں سجاول اور اسی دوستی کے ناتے میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ اس معاملے میں نہ آؤ۔“

سجاول اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں کے ساتھ چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا پھر اس نے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ اپنے سامنے پڑی ہوئی میز کو...... ہاتھ کی حرکت سے دور پھینکا اور طیش میں بڑبڑاتا ہوا تند بگولے کی طرح دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میز پر پڑے ہوئے چائے کے کچھ برتن ٹوٹ گئے تھے اور کچھ الٹ پلٹ ہو گئے تھے۔

شکر کا مقام تھا کہ سجاول نے اپنا مُکا استعمال کر کے میز کو چکنا چور نہیں کر ڈالا تھا۔ میرے ذہن سے ابھی تک وہ واقعہ محو نہیں ہوا تھا جب اپنے ڈیرے پر اسی طرح غصے میں آ کر سجاول نے ایک نہایت مضبوط چوبی میز کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اور اسی طرح ایک موقع پر اس نے جامانی میں خورسند کے بھیجے ہوئے تاج محل کے ماڈل کا بھی یہی حشر کیا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک تنہائی میں خوب سوچ بچار کرنے کے بعد میں نے فردوس سے رابطہ کیا۔ اس مرتبہ وہ چھت پر واقع سرونٹ روم میں تھی۔ ”کیا پوزیشن ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”رات کو مہندی کی تیاری ہو رہی ہے۔ وارج صاحب کی والدہ مہندی کا بہت مہنگا جوڑا لے کر آئی ہیں۔

سب کی آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ سونے کے تاروں کا کام ہے اس پر...... کہتے ہیں کہ اٹھارہ وی لاکھ سے کم کا نہیں ہو گا۔“

کسی کمرے میں ڈھولک بجنے کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی اور سینے میں انگارے دہک اٹھے۔ ”تاجور کہاں ہے اس وقت؟“ میں نے پوچھا۔

”نیچے بڑے کمرے میں۔ کوئی بہت وڈا دکاندار راولپنڈی سے آیا ہوا ہے...... گھر والوں کو پسند کرانے کے لیے گہنے لایا ہے۔ لاہور سے آیا ہوا ایک اور وڈا سنیارا بیٹھک میں بیٹھا اپنی واری اڈیک رہا ہے۔ ویسے مجھ کو ایک بات سچی سچی بتاؤ وقاص بھائی، تاجور بی بی پچھلے ہفتے یہاں بنگلے سے نکل کر کہاں گئی تھی؟“

”تیری کھوپڑی میں شک دوڑ رہا ہے کہ شاید وہ میرے پاس آئی تھی۔ میرے پاس نہیں آئی تھی۔ اگر آئی ہوتی تو ”خالی“ نہ جانے دیتا اس کو...... اور تو ایویں اِدھر اُدھر کی باتیں نہ مار۔ میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے۔ ابھی اسی وقت تجھے ایک کام کرنا ہے میرا۔“

”نہیں وقاص نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اپنے کانوں کو ہاتھ لگا۔ اب وہ بات نہیں کر سکتی تجھ سے۔ کرنا چاہے تو بھی نہیں کر سکتی۔ بس اب پیچھا چھوڑ دو اس کا۔ نہیں تو بہت بری طرح پچھتاؤ گے۔“

”پوری بات سنا کر۔“ میں نے اسے جھاڑا۔ ”مجھے پتا ہے وہ بات نہیں کر سکتی اور ابھی میں نے بات کرنی بھی نہیں۔ اپنے فون پر میسج پڑھ لیتی ہے ناں تو؟“

”وہی جو خط والی تصویر کے ساتھ لکھا ہوا آتا ہے؟“ فردوس نے پوچھا۔

”ہاں وہی، میں تاجور کے لیے ایک میسج بھیج رہا ہوں۔ یہ تمہارے فون پر آئے گا۔ تم نے آج کسی بھی وقت شام سے پہلے یہ اسے دکھا دینا ہے اور دیکھ فردوس! یہ آخری کام ہے جو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔ لیکن آج یہ کام تجھے ہر صورت کرنا ہے۔ بول کرے گی؟“

”تم نے پہلے بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب کبھی مجھے تنگ نہیں کرو گے پر......“

”آج میرے کہے ہوئے کا اعتبار کر۔ سمجھ لے پتھر پر لکیر کھینچ رہا ہوں۔ تیری اور ہاشو کی وہ وڈیو بھی تیرے سامنے صاف کر دوں گا۔“

فردوس کو پوری طرح آمادہ کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے بعد میں نے اردو ٹیکسٹ میں تاجور کے لیے ایک طویل میسج لکھا۔ ظاہر ہے یہ براہِ راست گفتگو نہیں تھی، میں اس میں ڈھکے چھپے لفظوں میں ہی مدعا بیان کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تاجور میری پوری بات سمجھے گی۔ یہ پیغام کچھ اس طرح تھا۔

”سوچتا ہوں، کہیں دل میں یہ حسرت ہی نہ رہے کہ میں نے تمہارے سامنے کھل کر اپنی صفائی پیش کیوں نہیں کی۔ جو حقیقت ہے وہ میں تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیتا ہوں، اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ میری اس سو فیصد سچائی کو تسلیم کرتی ہو یا نہیں۔ میں جانتا ہوں یہاں پنڈی والے اس گھر میں ایک شخص میری غیر موجودگی میں دو بار تم سے ملنے آیا ہے۔ اس شخص نے پہلے کبھی کوئی اس طرح کا کام نہیں کیا اور ہم سب کو ہمیشہ اس سے بہت اچھی امید ہی رہی ہے۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ اس نے تمہارے سامنے میرے بارے میں اس طرح کی باتیں کیں، میں تفصیل میں نہیں جا سکتا صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اس شخص نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے، وہ سو فیصد غلط ہے۔ وہ شخص بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے اس شخص کو زہر کیوں دیا تھا جب وہ زہر دیا گیا اس وقت ہم اپنے قاتلوں کے بدترین شکنجے میں تھے۔ ہمارے زندہ رہنے کی ایک فیصد امید بھی بہت بڑی خوش فہمی کہلائی جا سکتی تھی۔ اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی غیر انسانی تشدد کی تاب نہ لا کر اپنی زبان کھول دیتا تو ہمارے ساتھ ساتھ ان سب ساتھیوں کو بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑتا جو ڈرے سہمے زیرِ زمین موجود تھے۔ وہ اپنے لیے رو رو کر سلامتی کی جو دعائیں بھی مانگ رہے تھے، وہ اس بات سے مشروط تھیں کہ ہم اپنی زبان بند رکھیں اور پھر وہ اسٹیج آئی تھی جب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ زیرِ عتاب شخص اپنی چپ برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ میں نے اس کی موت آسان کرنے کے لیے اور باقیوں کو بچانے کے لیے اپنے دل پر بہت بڑا پتھر رکھا تھا۔ کوئی اور جانے یا نہ جانے لیکن میں جانتا ہوں اور میرا خدا جانتا ہے کہ اس کی موت میں نے کس طرح جھیلی تھی۔ بے شک میں نے اس بارے میں تم سے جھوٹ بولا لیکن صرف اس اندیشے سے کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو جائے۔ میں مانتا ہوں کہ میری یہ غلط بیانی میری غلطی تھی۔

”وہ شخص جو میری غیر موجودگی میں دو بار تمہارے پاس آیا اس نے تمہیں میری ریکارڈ شدہ آواز بھی سنائی تھی مگر اس نے اس ساری گفتگو کا صرف وہ حصہ تمہیں سنایا جس

میں، میں زہر دینے والی بات کرتا سنائی دیتا ہوں۔ پتا نہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔ مجھے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی اور میرے خیال میں تمہیں بھی نہیں تھی کہ اس کا ایسا روپ سامنے آئے گا۔

میں جانتا ہوں کہ میں جو صفائی دے رہا ہوں اس کے لیے شاید بہت دیر ہو چکی ہے لیکن یہ تسلی تو کم از کم ہے کہ میں نے اپنی آواز تم تک پہنچا دی ہے۔ اب جو فیصلہ کرنا ہے، تم کو کرنا ہے۔ اگر میری صفائی قبول کر کے مجھے آواز بھی دینی ہے تو تم کو دینی ہے۔ میری طرف سے میرے یہ آخری الفاظ ہیں، میری طرف سے اگر کچھ غلطیاں ہیں تو انہیں معاف کر دینا۔"

یہ الفاظ میں نے میسج کے ذریعے فردوس کو ارسال کر دیے اور اس کو مل گئے۔ اپنی اس تحریر میں، میں نے پوری احتیاط برتی تھی اور کہیں بھی، اپنا یا تاجور کا اور سیف کا نام نہیں لکھا تھا۔

بمشکل آدھ گھنٹا گزرا تھا کہ فردوس کا فون آ گیا۔ وہ حسبِ معمول اس مرتبہ واش روم میں تھی۔ اس کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اترا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "وقاص بھائی! اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میں نے تمہارا یہ کام بھی کر دیا ہے۔ تمہارا وہ خط میں نے تاجور بی بی تک پہنچا دیا ہے۔"

"خط صرف پہنچا ہی ہے یا اس نے پڑھا بھی ہے؟"

"آہو جی، وہ اوپر چھت پر ہی آ گئی تھیں۔ اوپر سے نیچے تک سارا پڑھا ہے انہوں نے...... اور نہ صرف پڑھا ہے بلکہ ڈیلیٹ (ڈیلیٹ) بھی کر دیا ہے۔"

"خط پڑھنے کے بعد اس نے کچھ کہا؟"

"نہیں وقاص بھائی، کہا تو کچھ نہیں، بس جلدی سے نیچے چلی گئی تھیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے فردوس، اب تم سکون میں آ جاؤ۔ لگتا ہے کہ اب تمہیں کبھی پریشان کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ شاید ایک آدھ بار اور فون کروں گا اور پھر ختم۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ فردوس جو کچھ کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔ میری بات بالآخر تاجور تک پہنچ گئی ہے۔ اب میں کم از کم یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ میں نے تاجور سے کچھ بھی چھپایا نہیں۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ بے شک یہ بڑا نازک وقت تھا۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے چل رہی تھیں اور وقت کی طنابیں کھنچتی چلی جا رہی تھیں۔ اگر تاجور چاہتی تو اب بھی سب کچھ بدلا جا سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں سب کچھ بدل سکتا ہوں۔ یہ نوکروں کی فوج ظفر موج، یہ سیکورٹی گارڈز، یہ پولیس کے دستے...... میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے لیکن اصل بات تو یہی تھی کہ اس کے دل میں سے آواز ابھرتی۔ اتنا بڑا اور نا قابلِ واپسی قدم اٹھانے سے پہلے وہ سوچتی کہ اسے مجھے چھوڑنا ہے یا نہیں۔ میرے لیے زندگی کے دروازے بند کرنے ہیں یا نہیں۔

سجاول مجھ سے بہت ناراض تھا۔ اتنا ناراض کہ مجھ سے بات کرنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے وہسکی کی آدھی بوتل بغیر کچھ ملائے اپنے اندر انڈیلی تھی اور ٹن ہو کر ساتھ والے کمرے میں لیٹ گیا تھا۔ وہ میری زندگی کی ایک مشکل ترین شام تھی۔ پہلوان حشمت بھی بے حد افسردہ تھا۔ میرے اور تاجور کے متوقع نکاح نے اسے بے حد سرشار کیا تھا۔ اس نے میرے لیے باقاعدہ سہرا بھی لکھ لیا تھا۔ اب اسے بھی معلوم ہو چکا تھا کہ تاجور یہاں سے اچانک کہاں گئی ہے اور اب اسلام آباد کے اس شاندار بنگلے میں کیا ہو رہا ہے۔

اس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ ہمیں یہ "زبردستی کا نکاح" رکوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ یہ زبردستی کا نکاح نہیں ہے۔ اب یہ رضامندی والا نکاح ہو چکا ہے۔

وہ بگڑ کر بولا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ کس طرح کی رضامندی ہے۔ بٹیا کو ضرور کسی نہ کسی طریقے سے مجبور کیا گیا ہے، دباؤ ڈالا گیا ہے۔"

ہمارے درمیان گفتگو کوئی ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہوئی تھی۔ شام کے بعد وہ پھر میرے پاس آ گیا۔ "مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا شاہ زیب، میں فون کرنے لگا ہوں مولوی حبیب اللہ صاحب کو...... میں انہیں بتانے لگا ہوں کہ اسلام آباد میں کیا ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بتا دو ان کو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اور یہ بھی بتا دو کہ میں ابھی "مرا" نہیں زندہ ہوں اور یہ بھی کہ تاجور جو کئی دن گھر سے غائب رہی ہے یہاں میرے پاس ہی ٹھہری ہوئی تھی۔"

"نا ہیں، تمہارے بارے میں کچھ نا ہیں بتاؤں گا۔ تم سے پکا عہد کر رکھا ہے اس بات کا۔ لیکن مجھے مولوی جی کو یہ تو بتانے دو کہ ان کی بھانجی کے ساتھ کتنا بڑا 'ظلم' ہو رہا ہے۔"

"یہ سب کچھ ان سے چھپا ہوا نہیں ہے۔" میں نے پھر پہلوان کی بات کاٹی۔ "وہ بھی مجبور ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ جب گاؤں میں چوہدری دین محمد کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلی تو اسلام آباد میں کیسے چلے گی۔ اب جو کچھ ہو رہا

ہے، اسے ہونے دو۔''

کہنے کو تو میں یہ کہہ رہا تھا لیکن آس تو ٹوٹی نہیں تھی۔ امید کی ایک پتلی سی ڈور اب بھی بندھی ہوئی تھی۔ ابھی اس کے نکاح میں...... اور اس کے غیر ہو جانے میں چوبیس گھنٹے بلکہ اس سے بھی زیادہ باقی تھے، کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری سب سے توانا امید کا تعلق سیل فون سے تھا۔ اس سیل فون پر کسی بھی وقت فردوس یا تاجور کی طرف سے کوئی ایسا پیغام آسکتا تھا جو حالات کی اس قاتل برف میں کوئی دراڑ پیدا کر دیتا جس نے مجھے چاروں طرف سے منجمد کر رکھا تھا۔ شاید امیدیں ایسے ہی نقطہ انجماد سے سیکڑوں درجے نیچے کی مایوسی میں بھی زندہ رہتی ہیں۔

ہاں...... وہ میری زندگی کی ایک مشکل ترین شام تھی...... آخر وال کلاک کی سوئیاں دیکھ کر مجھے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ اسلام آباد کے اس بنگلے میں روشنیوں رنگوں اور شوخ قہقہوں کے درمیان تاجور کی رسم حنا ادا ہو چکی ہے۔

مجھ سے رہا نہیں گیا۔ رات بارہ بجے کے قریب میں نے پھر فردوس کو فون کیا۔ وہ بھی ابھی فنکشن سے فارغ ہو کر اپنے سرونٹ روم میں پہنچی تھی۔ انوری بھی اس کے ساتھ سوتی تھی لیکن آج وہ نہیں تھی۔ میں نے بدلی ہوئی (وقاص والی) آواز میں اس سے کہا۔ ''ہاں بن گئی تیری تاجور... لاڈلی... شہزادی؟''

''ہاں۔'' وہ دبی آواز میں لحاف کے اندر منہ گھسا کر بول رہی تھی۔

''کیسی لگ رہی تھی؟''

''بالکل چمن کا ٹوٹا۔ پر وقاص بھائی! اب تم اس کا خیال دل سے نکال دو۔ سچی کہتی ہوں کبھی کبھی مجھے تم پر ترس آتا ہے۔''

''جس کو ترس آنا چاہیے، اس کو نہیں آیا تو تمہارے ترس کا کیا فائدہ؟'' میں نے ڈرائیور وقاص کا لہجہ برقرار رکھا۔ پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ''سب کچھ خیر خیریت سے ہو گیا؟''

''ہاں...... ہو گیا۔'' وہ ذرا اٹک کر بولی۔

مجھے ذرا شک ہوا۔ میں نے کچھ کریدا تو وہ بولی۔

''بڑی کمزور ہو گئی ہیں تاجور بی بی۔ منہ اتنا سوہنا دیا ہے اللہ نے پر اس پر جیسے ہلدی کا رنگ پھرا ہوا تھا۔ ہال کمرے کی طرف آتے ہوئے چکر آگیا تھا، تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش سی ہو گئی تھیں لیکن پھر اللہ سوہنے نے کرم کیا۔''

مجھے وہ سین یاد آگیا جب میں چند روز پہلے تاجور کو اسی بنگلے سے نکال کر لایا تھا۔ وہ تب بھی کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید یہ برداشت کی انتہا تھی۔ وہ نازک جان لڑکی حالات کے ساتھ ہی نہیں...... اپنے احساسات کے ساتھ اور اپنے ساتھ بھی ایک جنگ لڑ رہی تھی۔

''اب کیسی ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک بڑی وزیر جو لیڈی ڈاکٹر بھی ہے، اس نے بی بی کو دیکھا تھا۔ دوا وغیرہ دے دی ہے اب وہ ٹھیک ہیں۔ مجھے لگتا ہے، سو رہی ہیں۔''

بیک گراؤنڈ میں پولیس گاڑیوں کے مدھم سائرن بھی گاہے بگاہے سنائی دینے لگتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس دفعہ مہندی کی اس رسم پر غیر معمولی حفاظتی انتظام کیے گئے تھے۔ (یہ بات عین ممکن تھی کہ چالاک ہوشیار داراہیوں نے ڈائنامائٹ والے دھماکوں اور تاجور کے گھر سے اوجھل ہونے میں کوئی ناتا ڈھونڈ لیا ہو اور ابھی صرف مصلحت کے تحت چپ ہوں)

''نکاح کل کتنے بجے ہونا ہے؟'' میں نے فردوس سے دریافت کیا۔

''ٹھیک ویلے کا تو پتا نہیں پر یہی کوئی رات نو دس بجے کا وقت ہوگا۔''

شاید میں کچھ اور بھی پوچھتا لیکن اسی دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ قریبی کمرے میں سجاول کسی سے مصروف گفتگو ہے۔ میں نے فردوس سے بات ختم کر کے فون جیب میں ڈالا اور اس کمرے کی طرف گیا جہاں سجاول ٹھہرا ہوا تھا۔ اب رات کا تقریباً ایک بجنے والا تھا اور سجاول کی سرگوشی نما آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگایا۔ مدھم آواز مجھ تک پہنچنے لگی۔ سجاول پُرتپش لہجے میں کسی سے مخاطب تھا۔ ''باقی باتیں چھوڑ دو نادرے! کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گے شکر پڑیاں تک؟''

جواب میں کچھ کہا گیا، جس کے ردِعمل کے طور پر سجاول نے ایک گندی گالی بکی اور پھنکارا۔ ''اپنی ماں کی گودی میں وڑ کر نہ بیٹھ ابھی نکل ...... ابھی اسی وقت۔ اگر تو اپنے بندوں کے ساتھ ایک گھنٹے میں شکر پڑیاں نہ پہنچا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

دوسری طرف سے کوئی بات پوچھی گئی جس کے جواب میں سجاول اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''باقر چھوٹا بھی بس پہنچنے والا ہوگا آدھے گھنٹے میں۔ کالی ٹویوٹا گڈی ہے اُن کی، ہری نمبر پلیٹ والی۔''

میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں اس باقر کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سجاول کے خطرناک ترین بندوں میں سے ایک تھا اور جہاں اس کا نام آتا تھا، مطلب یہی ہوتا تھا کہ کوئی خاص کارروائی ہونے والی ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ سجاول کی یہ خفیہ سرگرمی صرف اور صرف میرے حوالے سے ہے۔ اس نے کل کہا تھا کہ وہ ان داراہیوں کو اتنی آسانی سے میری محبت پر ڈاکا مارنے نہیں دے گا۔

میرے سینے میں اُبال سا آیا اور میں کمرے کے دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔ سجاول نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی طور پر سرخ تھیں۔ پورے کمرے میں الکحل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے فون کے ''ماؤتھ ایریا'' پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ کیا بات ہے۔ یہ کس کام کی تیاری ہو رہی ہے؟''

''کسی کام کی تیاری نہیں ہو رہی۔'' وہ پھنکارا۔ ''تم جاؤ اپنے کمرے میں اور رضائی لے کر لیٹو۔''

''نہیں سجاول، میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔ میں یہ سب نہیں چاہتا۔ اگر میں یہ چاہتا...... تو تمہیں پتا ہے، میں اپنے طور پر بھی اس خطرے میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔ میری بات کا برا نہ ماننا سجاول! مجھے تاجور کے سلسلے میں تمہاری کسی طرح کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بکواس بند کرو۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔ میں ان حرام زادوں کو اس طرح تم سے جیتنے نہیں دوں گا، جاؤ یہاں سے۔''

میں نے جھپٹ کر سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بند کر دیا۔ ''سجاول! یہ جو کچھ بھی ہے، اسے یہیں روک دو۔''

وہ چنگھاڑا۔ ''تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو، میں اپنی مرضی کا آپ مالک ہوں، تم جاؤ اپنے کمرے میں ورنہ مجھ سے بن لو گے کچھ۔''

سجاول کی گرج برس سن کر پہلوان حشمت بھی گھبرایا ہوا سا وہاں آگیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''سجاول! میں پھر اپنے کمرے میں نہیں جاؤں گا۔ اس گھر سے ہی چلا جاؤں گا اور قسم کھا کر جاؤں گا کہ تم کبھی میری شکل نہیں دیکھو گے۔ یہ دوستی آج ہی جگہ اسی گھر میں دفن ہو جائے گی اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ ہوگا اس کے ذمے دار تم ہو گے۔''

میرے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس نے سجاول جیسے کرخت شخص کو بھی چونکا دیا۔ وہ ذرا سا ڈھیلا پڑتا دکھائی دیا۔

میرے سینے میں واقعی گاڑھا سیاہ دھواں بھرا ہوا تھا۔ سجاول کے جذبات اپنی جگہ لیکن وہ میرے دکھ سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔ میں نے یہ لڑائی اس طرح جیتنا ہوتی تو کب کا جیت چکا ہوتا۔ اس طرح کی جیت میرے لیے ہار سے بھی بدتر تھی۔

سجاول چند سیکنڈ تک جلتی سرخ آنکھوں سے میری جانب دیکھتا رہا۔ اُس کے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور آہنی چہرہ تمتما رہا تھا۔ آخر اس نے سیل فون میرے ہاتھ سے واپس لیا۔ اسے دیوار پر پٹخ کر ریزہ ریزہ کیا اور ''جاؤ جہنم میں۔'' کہتا ہوا تند بگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

پہلوان حشمت بھی اپنی جگہ جامد کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ سجاول کا یوں چلے جانا اسے اچھا لگا ہے یا نہیں۔

اگلا سارا دن ایک قیامت کا سا دورانیہ تھا۔ آس مر کر بھی نہیں مر رہی تھی۔ امید کی ایک پتلی سی ڈور اب بھی بندھی ہوئی تھی۔ پہلوان حشمت نے پھر اصرار کیا تھا کہ وہ لاہور میں مولانا حبیب اللہ کو تاجور کے حوالے سے اطلاع دیتا ہے لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا اور کہا کہ ہمارے اطلاع دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بے خبر نہیں ہیں۔ اس کے باوجود مجھے شک تھا کہ پہلوان حشمت نے مولانا تک اتنی اطلاع تو پہنچا ہی دی ہوگی کہ آج تاجور کا نکاح ہے۔ سجاول رات کو ہی یہاں سے واپس روانہ ہو گیا تھا۔ یقیناً لالہ موسیٰ ہی گیا تھا۔

☆☆☆

شام تک کا وقت جیسے سُولی پر ہی کٹا تھا۔ وہ عام شاموں جیسی ہی ایک خنک شام تھی لیکن میرے لیے عام نہیں تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر فرد کے لیے ہر وقت اور ہر منظر اپنے لیے ایک علیحدہ معنی رکھتا ہے۔ چاندنی رات کتنی بھی سہانی، دلکش اور خوشبودار ہو مگر جس شخص نے صبح چار پانچ بجے پھانسی پانا ہوتی ہے اس کے لیے وہ رات کسی اور ڈھنگ سے آتی ہے۔ آخر دس بجے کے لگ بھگ مجھ تک یہ خبر پہنچ گئی کہ وہاں اسلام آباد کے اس نیم سرکاری بنگلے میں سب کچھ بخیر و خوبی انجام پا گیا ہے۔

پہلوان حشمت نے ساتھ والے کمرے میں ٹی وی کی کاٹی ہوئی کیبل کو دوبارہ جوڑ لیا تھا اور ٹی وی آن کر رکھا تھا۔ ٹی وی کی ایک چھوٹی سی خبر میں یہ بتایا گیا بلکہ اپنے ناظرین پر انکشاف کیا گیا کہ معروف سیاسی خاندان کے چشم و چراغ

اور شکیل داراب کے کزن دارج داراب آج شام رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے ہیں۔ ان کی شادی نہایت سادگی سے ابھی کچھ دیر پہلے اسلام آباد کے سیکٹر نمبر چار کے بنگلے میں انجام پائی ہے۔ خاندانی ذرائع کے مطابق کچھ دن بعد شاندار طریقے سے ولیمے کی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔"

خبر پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ پہلوان حشمت نے کھٹاک سے ٹی وی آف کر دیا۔

میں نے ایک طویل اور سلگتی ہوئی سانس لی۔ سیل فون سامنے ہی میز پر حسرت کی تصویر بنا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ مارگلہ کی پہاڑیوں کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا نے میرا استقبال کیا۔ دور کچھ فاصلے پر اسلام آباد کی ہزاروں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ان ہی روشنیوں میں سے کچھ بے رحم روشنیاں یقیناً اس عمارت کی بھی تھیں جہاں آج رات تاجور دلہن بنی تھی اور اس نے سرخ جوڑا پہنا تھا۔

میں نے اپنے سیل فون سے اپنے دوست فخر زمان کو کال کی۔ یہ طویل فاصلے کی کال لندن کے لیے تھی۔ تیسری چوتھی بیل پر فخر کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے دو تین بار ہیلو کہا پھر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "آپ جناب کی تشریف میں کون سا کانٹا چبھ گیا ہے جو حضور والا نے اس وقت مجھے اپنا خاندانی ڈاکٹر جان کر میرے "آرام" کی جھیل میں "خلل" کا یہ پتھر مارا ہے؟" وہ انگلش میں بولا تھا۔

میں نے گہری سانس لی اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "ہیلو فخر! میرا خیال ہے تم میری آواز پہچان لو گے۔"

دوسری طرف چند لمحے گہرا سناٹا رہا پھر فخر کی ہیجانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "ہیلو...... کون...... ہیلو؟"

"میں شاہ زیب بول رہا ہوں فخر! اپنا جو شک تمہیں بہت پیارا تھا، وہ غلط نہیں تھا، میں ابھی زندہ ہوں...... اسی دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔"

فخر ایک نہایت مضبوط شخص کا نام تھا لیکن جو اطلاع اس کو مل رہی تھی، وہ اتنی تہلکہ خیز تھی کہ وہ اپنی بنیادوں تک ہل گیا۔ اس نے دو تین بار بوکھلائے ہوئے انداز میں ہیلو...... ہیلو کہا پھر لرزاں آواز میں بولا۔ "مجھے ابھی تک...... یقین نہیں...... آ رہا...... کہیں میں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا...... تت...... تم شاہ زیب ہی ہو؟"

"ہاں یار، میں زندہ ہوں ابھی...... لیکن جس طرح زندہ ہوں مزید زندہ رہنے کو کچھ زیادہ دل نہیں چاہتا۔ تمہارا میسج مجھے مل گیا تھا مگر اُس وقت فوری جواب نہ دے سکا۔ جونہی اس قابل ہوا کہ تمہیں جواب دے سکوں، جواب دے رہا ہوں۔ بہت بڑی خبر دی ہے تم نے تھائی لینڈ والی۔ یقیناً ہم ٹیکساری گینگ کو تارے دکھا سکتے ہیں۔" میرے لہجے میں اپنے آپ ہی ایک آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔

فخر کا لہجہ بدستور ہیجانی تھا۔ وہ بولا۔ "شاہ زیب اتم...... شاید تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں۔ اگر میں بتانا چاہوں تو میرے پاس وہ لفظ ہی نہیں ہیں کہ بتا سکوں۔ تم کہاں ہو یار، مجھے بتاؤ...... میں ابھی...... تمہارے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنے ہاتھوں سے چھونا چاہتا ہوں شاہی۔"

"میں اتنا پاس نہیں ہوں یار! لندن سے راولپنڈی کا فاصلہ کافی زیادہ ہے۔"

"راولپنڈی...... یعنی پاکستان...... لیکن کوئی فاصلہ نہیں...... بالکل بھی نہیں۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے پندرہ منٹ میں تیار ہو رہا ہوں اور کوئی فلائٹ پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے کون سا ویزا لگوانا ہے۔ آئی ایم ریڈی۔"

"اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے فخر، حوصلے سے آؤ...... اور اگر نہ بھی آؤ تو ہم فون پر تو رابطے میں ہی ہیں۔ تم دو تین دن میں لندن سے ہی تھائی لینڈ پہنچ جاؤ، میں بھی پہنچ جاتا ہوں۔"

"نہیں شاہ زیب، اب تمہارے اس خاکسار سے صبر نہیں ہو گا۔ میں یہاں سے نکل رہا ہوں۔ تم ابھی مجھے اپنا مکمل ایڈریس Sond کرو اور اگر......"

"دیکھو فخر، تم ہمیشہ کے جلد باز ہو، بہرحال سب سے پہلی بات تو میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں بہت سے لوگوں کے لیے "مر" چکا ہوں۔ لہٰذا میرے حیات ہونے کی خبر صرف اور صرف تم تک رہنی چاہیے۔"

"بے فکر رہو میرے جگر! میں جلد باز تو ہوں لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ سینہ ایک صندوق ہے۔ اس میں جو بند ہو گیا سو ہو گیا۔"

میرے اور فخر کے درمیان دو چار منٹ مزید گفتگو ہوئی۔ میں اس سے تھائی لینڈ کے حوالے سے کچھ جاننا چاہتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ والس وائے جیسے شخص کا مل جانا ہماری بہت بڑی خوش قسمتی اور خطرناک ٹیکساری گینگ کی بہت بڑی بدبختی تھی۔ اگر اس موقع کو اچھی طرح استعمال کیا جا سکتا تو ٹیکساری کی اور اس کے ڈیتھ اسکواڈ کی اینٹ سے اینٹ

بج سکتی تھی۔ بہرحال فوری طور پر تو فخر سے اس بارے میں زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ میرے حیات ہونے کی خبر نے اسے اتنا جذباتی کیا تھا کہ وہ ڈھنگ سے کوئی دوسری بات کر ہی نہیں پا رہا تھا۔

فون کرنے کے بعد میں چھت سے نیچے آ گیا۔ دل و دماغ میں کھلبلی سی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی گہرا تاریک گوشہ ہو جس میں منہ دے کر آنکھیں بند کر لوں اور بیس تیس گھنٹوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں۔ اسی دوران میں لالہ موسیٰ سے کال آ گئی۔ یہ خورسنہ کی کال تھی۔ یقیناً اسے بھی سجاول کی زبانی سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اس کی آواز دکھ کی شدت سے جیسے ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ٹی وی پر وہ مختصر خبر سنی تھی جس میں شکیل داراب کے کزن دارج داراب کی شادی انجام پانے کا تذکرہ تھا۔

خورسنہ نے کہا۔ "کیا تاجور کی طبیعت خراب ہے شاہ زیب صاحب؟"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اگر تاجور کی رخصتی ملتوی ہوئی ہے تو پھر طبیعت زیادہ خراب ہی ہو گی ناں۔"

"رخصتی......؟ کیا مطلب...... رخصتی نہیں ہوئی؟"

"شاید آپ نے ٹی وی والی خبر نہیں سنی۔ اس خبر میں تو یہی بتایا گیا تھا۔"

خورسنہ کی طلاع نے کچھ ٹھٹکا دیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب ٹی وی پر خبر چل رہی تھی تو پہلوان نے پوری خبر سنے بغیر ہی ٹی وی بند کر دیا تھا۔

میں نے خورسنہ کو بتایا کہ مجھے اس بارے میں معلوم نہیں۔

وہ بولی۔ "ٹی وی والی خبر میں، میں نے بس اتنا جملہ سنا تھا کہ رخصتی بعد میں ہو گی...... پھر مجھے یاد آیا کہ تاجور کی طبیعت بھی تو کچھ خراب تھی۔ میں نے اس کی رخصتی نہ ہونے کو اس کی طبیعت کی خرابی سے جوڑ دیا......"

خورسنہ سے بات جلدی ختم کر کے میں نے فردوس سے رابطے کی کوشش کی۔ اب آدھی رات گزر چکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق فردوس اس وقت اسلام آباد والے بنگلے میں اپنے بالائی منزل والے سرونٹ روم میں سو رہی تھی۔ میں نے تین چار بار کال کی۔ آخر اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون؟"

"وقاص بول رہا ہوں۔" میں نے بدلی ہوئی آواز میں ایکسنٹ کر کہا۔

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ مارچ 2018ء کی جھلکیاں

مہل میر

ڈاکٹر ساجد امجد کی لاجواب تحریر
ایک پیر کامل کی زندگی کے واقعات

تلاش

زویا اعجاز کے ثمر بار قلم کا شہکار
ایک بڑی شاعرہ کی حالاتِ زندگی

بلبلِ بنگال

انور فرہاد کی ایک دلچسپ تحریر،
پاکستان کی مشہور گلوکارہ کا احوال

مزارِ بیکسی

اس شاعر کا تذکرہ جو والی ہند تھا مگر اسے بے بسی کی موت ملی

پچھتاوا

نضہ خان کی ایک ایسی
سچ بیانی جو برسوں یاد رہے گی

"شمشال سے ٹورنٹو" ندیم اقبال کا ایک دلچسپ سفرنامہ۔ "ناسور" ایک لہو رنگ آپ بیتی اور بھی بہت سے سچے واقعات، دلچسپ سچ بیانیاں

دوسری طرف خاموشی رہی۔ یوں لگا کہ وہ شاید جھلاہٹ سے فون بند کردے گی مگر پھر وہ مری مری آواز میں بولی۔ ”ہاں کیا بات ہے؟“

”ہوگیا نکاح شکاح؟“

”ہاں ہوگیا ہے۔“

”رخصتی کب ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک سے تو پتا نہیں، پر ہفتے کے دن ویسے کا کہہ رہے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ رخصتی تو پہلے ہی ہوگی ناں۔“ اس نے جماہی لے کر بیزاری سے کہا۔

”تاجور کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”دوپہر کے بعد سے تو ہوش میں ہے۔ ایک بڑی سیانی ڈاکٹر اس کو دیکھ رہی ہے۔ ابھی دو تین گھنٹے پہلے تک وہ بھی یہیں پر تھی۔“

میں نے فردوس کو ذرا کریدا تو خورشنہ والی بات بالکل درست ثابت ہوگئی۔ کل دوپہر تاجور کو پھر چکر آیا تھا اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس وقت ساتھ والے کمرے میں ڈھولک بجائی جارہی تھی۔ تاجور کے گرنے کی آواز نے انوری کو چونکایا۔ اس نے دیکھا تو تاجور پہلو کے بل صوفے پر پڑی تھی۔ اس کے گرنے سے کارنس پر رکھے ہوئے کچھ ڈیکوریشن پیس بھی ٹوٹ گئے تھے۔ بعدازاں وہ ہوش میں تو آگئی مگر رنگ ہلدی کی طرح زرد رہا۔ فوری طور پر دو ڈاکٹرز کو بنگلے پر ہی بلایا گیا اور انہوں نے تاجور کو ٹریٹ منٹ دی۔ تب ہی یہ فیصلہ...بھی ہوا کہ چونکہ نکاح کی تیاری مکمل ہے۔ اس لیے نکاح تو شام کے بعد ہوجائے گا مگر رخصتی دو چار روز ٹھہر کر ہوگی۔

فردوس سے بات کرنے کے بعد میں بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ تاجور کی خرابیٔ صحت نے فکرمند کیا تھا مگر اس کی رخصتی کا نہ ہونا مجھے ایک مثبت خبر کی طرح لگ رہا تھا۔ حالانکہ یہ بھی مثبت خبر کہاں تھی، وہ شادی شدہ تو ہو ہی چکی تھی۔ یہاں میں اپنے دل و دماغ کی کیفیت کو خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ دل دیوانے والی بات مجھ پر صادق آرہی تھی۔ سچ بیان کروں تو وہ یہی ہے کہ اس وقت دل و دماغ میں لاشعوری طور پر یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ تاجور فوراً صحت یاب نہ ہو، وہ جتنی دیر تک اس شکاری جانور کے جبڑوں کی زد سے بچ سکتی ہے، بچی رہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شاید پہلوان کی بھی تھی۔ اس کو بھی پتا چل گیا کہ تاجور کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اُس کے زرد چہرے پر ہلکی سی سرخی دیکھی۔ کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد بولا۔ ”کبھی جوانی کے دنوں میں دو شعر کہے تھے، آج وہ ایک دم یاد آئے ہیں۔

وہ مہمان ہیں ہمارے اور بیمار بھی ہیں کچھ روز سے
سو ہم یہ تمنا کرتے ہیں یارو، پورے زور سے
کتنا اچھا ہو کہ ہم کچھ دن اُن کے ناز اٹھائیں
کتنا چنگا ہو کہ وہ ابھی چنگے نہ ہو پائیں

شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ ڈوبتے کی آنکھ میں تنکے کا سہارا ہووت ہے۔ حالانکہ یہ سہارا غلط ہووت ہے...... بلکہ......شاید یہ محاورہ بھی غلط ہوگیا ہے۔ ڈوبتے کی آنکھ میں تنکے کا......“ پہلوان حشمت گڑبڑا سا گیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا......

اگلے روز رات چار بجے کے لگ بھگ فخر کسی طوفان کی طرح راولپنڈی کے اس گھر میں آدھمکا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ویک اینڈ تھا۔ شرافت اپنی بیوی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ اسے کل شام کو آنا تھا۔ میں اور پہلوان گھر میں اکیلے تھے۔ فخر روشن چہرے والا ایک خوش شکل اور مضبوط نوجوان تھا۔ قد چھ فٹ سے بھی ایک آدھ انچ اوپر ہی ہوگا۔ چوڑی چھاتی، فولادی بازو، کبھی کبھی طنزیہ انداز میں بھی بات کرتا تھا۔ فخر کے سینے میں شیر کا دل تھا۔

اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے اسے بتادیا تھا کہ میں نے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے کاسمیٹک سرجری کرائی ہے۔ اس اطلاع کے باوجود وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا اور مجھے پوری طرح پہچاننے میں اسے چند سیکنڈ لگے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے لپٹ گیا اور چٹاچٹ میرے رخساروں اور ماتھے کے کئی بوسے لیے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں، میں نے شاید ہی کبھی نمی دیکھی ہو، لیکن آج میں دیکھ رہا تھا۔ پہلوان حشمت سے فخر کا غائبانہ تعارف موجود تھا۔ وہ اس سے بھی بغلگیر ہوا اور حال احوال دریافت کیا۔

اب صبح ہونے والی تھی۔ پہلوان نے فخر کے آنے سے پہلے ہی ایک ہیوی قسم کا دیسی ناشتا تیار کرلیا تھا۔ فخر تھکا ہوا تھا۔ ناشتے کے بعد اسے سوجانا چاہیے تھا مگر اس کے اندر تو جیسے اُبال سے اٹھ رہے تھے۔ ہم نے بند کمرے کے اندر گفتگو شروع کی اور پھر یہ گفتگو طویل تر ہوتی چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ تاش کے کھلاڑیوں کو وقت گزرنے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کچھ ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا۔ تب ہوش آیا جب پہلوان نے مسکین سی صورت بنا کر کمرے میں جھانکا اور بولا۔ ”اب تو شام کی چائے کا وقت بھی گزرتا جاوے ہے کچھ کھانا بھی ہے یا ناہیں؟“

فخر افسردہ لہجے میں بولا۔ ”یہاں کے حالات جان کر بھوک ہی مرگئی ہے پہلوان جی۔“

پہلوان نے اپنی طرف سے ماحول کو کچھ خوشگوار بنانے کی کوشش کی اور بولا۔ ”پیٹ کی مشین تو چلتی ہی رہوت ہے۔ کہتے ہیں کہ بھوک مرجاوے تو پھر بندہ بھی زندہ ناہیں رہتا۔ میرا خیال ہے کہ اب ٹائم زیادہ ہوگیا ہے۔ ہم کو ”لنچائی“ کرلینی چاہیے۔“

”لنچائی؟ یہ کیا ہے؟“

”یہ ہم نے ایک لفظ بنایا ہوا ہے، جیسے برنچ ہوتا ہے۔ اس طرح لنچ اور ٹی کو ملا کر لنچائی بھی تو ہوسکتا ہے۔“ پہلوان نے مسکرانے کی کوشش کی اور پھر زخمی جبڑے کی وجہ سے اس کوشش کو ادھورا چھوڑ دیا۔

فخر نے کہا۔ ”کیوں نا کہیں باہر چل کر کھالیں۔“

”ناہیں ناہیں۔ کھانوں میں جس طرح کے تیل استعمال ہوتے ہیں...“ پہلوان نے جھرجھری سی لی اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”سب کچھ تیار ہے۔ بس تم لوگوں کے فارغ ہونے کا انتظار کررہا تھا میں۔“

”لیکن آپ نے خود تو کھالیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”بس مجھے اچھا ناہیں لگا۔“

”ٹھیک ہے پھر لے آئیں، میں بھی آپ کی مدد کرتا ہوں سرو کرنے میں۔“

”ناہیں ناہیں، تم لوگ بیٹھو۔ اتنے عرصے بعد ملے ہو۔“ پہلوان اپنے بھاری جسم کو جھلاتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے کبھی کھایا نہیں ہوگا لیکن چکھتے چکھنے میں ایک تہائی کھانا تو صاف کر ہی گیا ہوگا۔ دکھ میں اسے زیادہ بھوک لگتی تھی۔

فخر کا ہر دم شوخ نظر آنے والا چہرہ کچھ بجھا بجھا تھا۔ وہ میرے ان غیر ملکی دوستوں میں سے تھا جن سے میں وقتاً فوقتاً اپنے حالات شیئر کرتا رہتا تھا۔ فخر کو بھی جاماکی اور چاند گڑھی کے بہت سے حالات کا پتا تھا مگر پھر لاہور والے دھماکے کے بعد اس کے لیے بالکل بلیک آؤٹ ہوگیا تھا۔ فخر بھی مجھے سترّاسی فیصد تو ”مردہ“ سمجھ ہی چکا تھا۔ اسے اب یہاں آکر معلوم ہوا تھا کہ تاجور میرے بہت قریب آنے کے بعد ایک بار پھر دور چلی گئی ہے۔

اب بھی اس کے چہرے پر ایک دکھ آمیز سوچ تھی، بولا۔ ”یقین نہیں آرہا کہ انیق جیسا تمہارا قریبی دوست یہ کچھ کرسکتا ہے۔ تمہاری باتیں سن کر صاف پتا چلتا ہے کہ تاجور کے یہاں سے جانے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انیق نے اس کے کانوں میں سیف والی بات ڈالی ہے اور ایسے موقع پر ڈالی ہے جب سیف کی والدہ کے بعد اس کے والد بھی چل بسے تھے۔ یقیناً اس کا بہت زیادہ ...... بہت زیادہ امپیکٹ ہوا ہے اس پر۔ اور شاید رہی سہی کسر اس دوسرے واقعے سے پوری ہوگئی۔“

دوسرے واقعے سے فخر کی مراد وہی گوجرانوالہ کے تصادم کا انکشاف تھا۔ اس تصادم کا انکشاف تاجور پر چند روز بعد ہوا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ میرے رات کو غائب رہنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے سجاول کے ساتھ مل کر لیکساری گینگ سے دو دو ہاتھ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس سلسلے میں اپنے وعدے سے انحراف کیا تھا۔

”اب کیا ہوگا شاہ زیب؟“ فخر نے آزردہ لہجے میں پوچھا۔

”جو ہونا تھا، وہ تو ہوچکا۔“

”لیکن رخصتی تو اب بھی باقی ہے۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا فخر۔ جب اُس نے ”قبول ہے“ کہہ دیا تو پھر سب کچھ ختم ہوگیا۔ اسی وقت حالات جیت گئے اور ہماری محبت ہار گئی۔ ابھی جسمانی طور پر نہ سہی لیکن وہ وارج کی بیوی اور داراب خاندان کی بہو بن چکی ہے اور مکمل بیوی بننے میں بھی اب کون سی دیر ہے۔ شاید کل یا پھر پرسوں وہ رخصت بھی ہوجائے گی۔“

”اور تم اسی طرح منہ دیکھتے رہو گے؟“

”میں نے کہا ہے ناں فخر۔ اِٹ از آل اوور ناؤ۔ میرے لیے اب یہ سب کچھ بے معنی ہے۔“

اسی دوران میں میرے سیل فون پر کال کے سگنل آئے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ریسیو نہ کروں لیکن پھر ANSWER کا بٹن دبا دیا۔ دوسری طرف سے سب سے پہلے خورشنہ ہی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو شاہ زیب صاحب ...... ہیلو۔“ اس نے ہیجانی انداز میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بری طرح کھانسی۔

ابھی میں کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اندھادھند فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ یہ آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک ہتھیاروں کی فائرنگ تھی۔

”خورشنہ، یہ کیا ہورہا ہے، کہاں ہو تم؟“

”بچاؤ ...... خدا کے لیے بچاؤ۔“ خورشنہ کی چلاتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں سرتاپا لرز گیا۔

”کیا ہوا خورشنہ...... سجاول کہاں ہے، خورشنہ؟“ میں پھر پکارا۔

میرے کانوں میں نوعمر ذیشان کے پکارنے اور

چلانے کی آواز پڑی۔ پھر ایک برسٹ چلا۔ مجھے فون پر خورسنہ کی دردبھری کراہ صاف سنائی دی۔ پھر وہ شاید گر گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جہاں وہ گری ہے وہاں شعلے پھنکار رہے ہیں۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟ اس ہنستے بستے گھر پر کیا قیامت ٹوٹی تھی۔ سجاول کہاں تھا؟ سجاول نے تو سب سے الگ تھلگ لالہ موسیٰ کی ایک گمنام نواحی آبادی میں ایک چھوٹی سی دنیا بسائی تھی۔ اس کے گروہ کے اپنے ساتھیوں میں سے بھی کسی کو اس کے اس ٹھکانے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ فقط ایک یونس پمپ والا تھا جو جانتا تھا کہ سجاول سیالکوٹی کہاں رہتا ہے۔

فائرنگ کی آوازیں اب رک گئی تھیں۔ بس وقفے وقفے سے کسی فائر کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ پھر ایک دم سیل فون خاموش ہوگیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ خورسنہ نے اپنے فون سے کال کی تھی۔ میں نے فوراً سجاول کا نمبر پریس کیا۔ فخر اور پہلوان ہکا بکا میرا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ فائرنگ اور خورسنہ کی دردناک آوازیں انہوں نے بھی سن لی تھیں۔ سجاول کا نمبر بند جارہا تھا۔ میں نے جھلا کر دوسری اور پھر تیسری بار کال کی، نتیجہ صفر نکلا۔ میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اچانک مجھے یونس پمپ والا کا خیال آیا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ وہ شاید کار میں سفر کر رہا تھا۔ ہلکا میوزک سنائی دے رہا تھا۔ کوئی پنجابی فلمی نغمہ تھا۔

”یونس! کہاں ہو تم؟“ میں نے تقریباً دھاڑ کر پوچھا۔ میں نے آواز بدل لی تھی۔

”کک کیا ہوا قاسم صاحب؟“

”مجھے بتاؤ کہاں ہو تم؟“ میں پھر گرجا۔

”میں لاہور پہنچا ہوں، ابھی ابھی راوی کا پل پار کیا ہے۔“

”سجاول کا کچھ پتا ہے، کہاں ہے وہ؟“

”انہوں نے ایک یا دو دن کے لیے کوٹلی جانا تھا۔ اپنی والدہ اور گھر والوں سے ملنے کے لیے۔ لیکن خیریت تو ہے، آپ کی آواز ...“

”خیریت نہیں ہے۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے سجاول کے گھر۔ تم فوراً گاڑی موڑو۔ واپس لالہ موسیٰ۔ میں بھی آرہا ہوں۔ اگر لالہ موسیٰ میں یا اس آبادی میں کوئی باخبر بندہ ہے تو اس سے پوچھو کہ وہاں کن لوگوں نے فائرنگ کی ہے، کیا ہوا ہے وہاں۔ میرا فون آن ہے رابطے میں رہو۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے فون بند کردیا۔

صرف دس منٹ بعد ہم شرافت کی سوزوکی ہائی روف پر آندھی کی رفتار سے لالہ موسیٰ کی جانب رواں تھے۔ راولپنڈی سے لالہ موسیٰ کا فاصلہ 145 کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ جی ٹی روڈ پر اچھی رفتار سے یہ سفر قریباً 2 گھنٹے میں طے کیا جاسکتا ہے۔ ڈرائیونگ فخر نے سنبھال لی تھی۔ پہلوان پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں بار بار سجاول کے نمبر پر رابطہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کا نمبر مسلسل بند تھا۔ یونس پمپ والا سے گاہے بگاہے رابطہ ہو رہا تھا، وہ بھی تیزی سے لالہ موسیٰ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سے صرف اتنی سن گن ملی کہ شاید خورسنہ اور سجاول میں کوئی معمولی نوعیت کا گھریلو جھگڑا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ سجاول کا فون بند ہونے کی وجہ بھی ہو کہ وہ ناراض موڈ میں گھر سے نکلا تھا۔ شاید اس کو ابھی تک پتا نہیں تھا کہ اس کے پیچھے اس کی چاردیواری میں کیا قیامت گزر چکی ہے۔

سجاول کے بے شمار دشمن تھے لیکن اس کے موجودہ ٹھکانے کی بھنک کسی کو نہیں تھی۔

رات کے نو بج چکے تھے جب ہم لالہ موسیٰ کی حدود میں داخل ہوئے۔ تب تک سجاول سے رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔ تاہم یونس پمپ والا کو کسی ذریعے سے اتنا پتا چل چکا تھا کہ جس محلے میں سجاول اور خورسنہ کی رہائش تھی، وہاں ایک سنگین واقعہ ہوا ہے، کچھ لوگوں نے ایک گھر میں داخل ہوکر اندھادھند فائرنگ کی ہے۔ ایک عورت کو گولیاں ماردی ہیں اور ایک بچے کو اغوا کرلیا ہے۔

جس عورت کا ذکر تھا، وہ یقیناً خورسنہ ہی ہوسکتی تھی۔ ہاں یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ زخمی ہے یا مرگئی ہے۔ بچے کے ذکر پر دھیان صرف نوعمر خوبرو ذیشان کی طرف ہی جاتا تھا۔ میرا سینہ جیسے غم سے پھٹنے لگا۔

اچانک پہلوان حشمت کی دہاڑ نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ وہ ایک دم پکارا تھا۔ ”وہ دیکھو... وہ دیکھو۔“ اس نے سامنے سے آنے والی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”کون تھا؟“ میں نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

”انیق تھا، میں نے اچھی طرح دیکھا ہے... انیق ہی تھا۔ کالے شیشوں والی گاڑی تھی۔ بہت زیادہ اسپیڈ کے ساتھ گئی ہے وہ گاڑی...“

انیق کا نام سن کر میرے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

لالچ

تنویر ریاض

ایک کام کرتے ہوئے دوسرے کام کی خواہش کا اُبھرنا درپردہ ضرورت ہی کی دستک ہوتی ہے... بعض اوقات یہ دستک ایسے وقت پر ہوتی ہے کہ سوچنے اور انتظار کے لمحات میسر نہیں آتے... اس کے در پر بھی ایسی ہی دستک ہورہی تھی... اس نے اپنی ضرورت... حق تلفی کو پیشِ نظر رکھا... اور انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا...

زیادہ اور زیادہ کی دلدل میں الجھ کر گرجانے والوں کا دردناک احوال.....

وہ میری ملازمت کا پہلا دن تھا۔ میں وقت سے آدھ گھنٹا پہلے یعنی ساڑھے سات بجے ہی میچنگ مینشن کے دفتر پہنچ گئی۔ عمارت کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے کمرہ نمبر چھ میں رپورٹ کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ لہٰذا میں نے دروازے پر دستک دی۔ وہاں ایک پختہ عمر کی عورت استقبالیہ میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سنہرے بالوں والی اس عورت نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور وہ کچھ کاغذات دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے انہیں ایک فولڈر میں رکھا اور

بولی۔

''کون...... اچھا تم ہو، جسے عارضی طور پر رکھا گیا ہے؟''

میرا نام لارا ابیرم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''معذرت خواہ ہوں کہ میں تمہارے کام میں مخل ہوئی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ دباتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہمارا دفتر آٹھ بجے شروع ہوتا ہے۔''

''نئی ملازمت شروع ہونے پر میں وقت سے پہلے آجاتی ہوں۔'' میں نے جواب دیا پھر میری نظر دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان پر گئی جس کی اونچائی چھ فٹ تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے اس مکان کے ستون سفید اور دروازے سیاہ رنگ کے تھے۔

''بہت خوب صورت ہے۔'' میں نے ستائشی انداز میں کہا۔ ''گویا تم اپنے گاہکوں کے لیے مکانوں کے ماڈل بھی بناتی ہو؟''

''یہ ماڈل نہیں بلکہ مکان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم پُرآسائش ڈاگ ہاؤسز بناتے ہیں۔ اس مالک کا اپنا مکان فلاڈیلفیا میں ہے اور یہ اس کی ہوبہو نقل ہے۔ ہم بلیوں کے لیے بھی اعلیٰ درجے کی رہائش گاہ بناتے ہیں لیکن ہماری خاص پہچان ڈاگ ہاؤسز ہی ہیں۔ میرا نام ایلی سینڈرز ہے اور میں یہاں منیجر ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم ہماری مدد کرسکتی ہو کیونکہ سیکریٹری کو فلو ہوگیا ہے اور ہمیں کام میں کچھ مشکلات پیش آرہی ہیں۔ میں تمہیں اپنی ٹیم میں خوش آمدید کہتی ہوں۔''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری ذمے داریاں سمجھانے لگی۔ ''تمہیں میری اور اکاؤنٹنٹ کی کالز بھی سننا ہوں گی۔ جب تم فارغ ہوجاؤ تو سیل فون لے کر ورک روم میں چلی جانا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ کس طرح ہماری مدد کرسکتی ہو۔ اُمید ہے کہ تمہیں یہاں کام کرنے میں مزہ آئے گا۔ تم ایک بجے لنچ کے لیے جاسکتی ہو۔ ناش ایونیو پر چند اچھے ریستوران ہیں۔''

''شکریہ..... میں اپنا لنچ لے کر آئی ہوں۔ یہاں کوئی بریک روم ہے؟''

''ہاں.....'' اس کی آنکھیں میرے لنچ بکس پر جم گئیں۔ ''اس میں کوئی چاکلیٹ بھی ہے؟''

''ہاں.....'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میری بیٹی نے براؤنیز بنائی ہیں، کیا تم لینا پسند کروگی؟''

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی، پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''نہیں لیکن میں تمہاری نگرانی بھی کرتی رہوں گی۔ اس عمارت میں یہ گندگی برداشت نہیں کرسکتی۔ تم اسی وقت یہ براؤنیز اپنی کار میں رکھ دو۔ چھ منٹ بعد ورک روم میں اسٹاف میٹنگ ہے، اپنے ساتھ نوٹ پیڈ لے کر آنا۔''

میں نے کار کی طرف دوڑ لگائی۔ اس میں براؤنیز رکھیں اور بہ مشکل تمام وقت پر ورک روم پہنچی جہاں درجن بھر ملازمین میٹنگ کے لیے جمع ہوچکے تھے، ایلی ایک میز کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کیں۔ گہرے گہرے سانس لیے پھر آنکھیں کھول کر مسکرانے لگی۔

''صبح بخیر۔'' اس نے کہا۔ ''تم لوگوں سے مل کر اچھا لگ رہا ہے۔ اب ہم میٹنگ شروع کرتے ہیں۔ برائن مسٹر فلیمنگ نے ستمبر کی اکاؤنٹنگ رپورٹ کے بارے میں پوچھا ہے۔ کیا وہ تیار ہے؟''

ایک نیلی آنکھوں والا نوجوان شخص اپنے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تقریباً لیکن ابھی کچھ چیزیں شامل کرنا باقی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایلی نے کہا۔ ''جو کرسکتے ہو وہ کرو اور لنچ کے بعد سب چیزیں لے کر میرے پاس آؤ۔ بقیہ کام میں پورا کردوں گی۔ یہ رپورٹ ہر حال میں پانچ بجے سے پہلے جانی ہے۔'' ''ٹام پریسکوٹ ہاؤس کی کیا پوزیشن ہے؟''

''بہت اچھی۔'' وہ لمبے قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا اور اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان تھی۔ ''لیزا نے کل گلاس ونڈوز بنادی تھیں۔ میں نے وائرنگ کا کام مکمل کرلیا ہے اور آتش دان بنا رہا ہوں لیکن ہمیں ڈیوڑھی کے لیے لکڑی کے فرش کی ضرورت ہوگی۔ کیا تم نے اس کا آرڈر دے دیا ہے؟''

''ہاں تم نے جتنا مانگا تھا لیکن تم سے کاٹنے میں غلطی ہوئی یا کچھ مال اِدھر اُدھر ہوگیا۔ اب مجھے مزید آرڈر دینا ہوگا لیکن اس میں خرچہ بھی بڑھے گا اور دیر بھی ہوگی۔ لیزا رابرٹسن ماڈل کب تک تیار ہوجائیں گے؟''

اس نے ایک چھوٹے قد کی سنہرے بالوں والی عورت کی طرف دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چینی کا پیالہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں چھوٹا سا رنگ کرنے والا برش۔ اس کی نظریں میز پر رکھی ہوئی ایک قدیم طرز کی چائے کی پیالی پر تھیں اور وہ اسی پیٹرن پر کتے کے پیالے پر رنگ کررہی تھی۔

لیزا نے کام روکے بغیر کہا۔ ''آدھا گھنٹہ۔''

''لوئیس کے ولا کا کیا بنا؟'' ایک عورت نے پوچھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور اس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ ''کیا انہوں نے ہمارا ڈیزائن منظور کرلیا؟''

ایلی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، وہ کسی اور جگہ سے کام کروا رہے ہیں۔''

اس عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ تیز آواز میں بولی۔ ''تم مذاق کررہی ہو...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میرا ڈیزائن ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ کیا تم نے انہیں بتایا نہیں۔''

''میں نے انہیں ہر بات بتائی لیکن مسز لوئیس کو وہ ڈیزائن پسند نہیں آیا، وہ اسے بدصورت سمجھتی ہیں۔'' ایلی نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ اسٹیلی تمہیں اپنے کام پر توجہ دینا ہوگی، ہم اس طرح مواقع ضائع نہیں کرسکتے۔ مسٹر فلیمنگ کو اگست کے اعداد و شمار پسند نہیں آئے۔''

اسٹیلی منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''اسے کیا پروا ہوگی، وہ اپنے شکاگو کے دفتر میں بیٹھا پیسے کما رہا ہے لیکن ہمیں اس کمائی میں سے کچھ نہیں ملتا جبکہ سارا کام ہم لوگ ہی کرتے ہیں۔''

''تمہیں معاوضے کی شکایت کرنے کے بجائے یہ فکر ہونی چاہیے کہ اگلے مہینے یہ بھی ملے گا یا نہیں۔ ان دنوں بہت سے ڈیزائنر کام کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور میں شرطیہ کہتی ہوں کہ ان میں زیادہ تر تم سے آدھی تنخواہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ اب ہم آج کے شیڈول پر بات کرتے ہیں۔''

وہ ہر کارکن سے سوالات کرتی اور انہیں احکامات دیتی رہی۔ بہت کم مواقع پر اس نے مثبت انداز اختیار کیا یا کسی کی تعریف کی۔ اسٹیلی کے بارے میں اس کے تبصرے خاصے توہین آمیز تھے جبکہ برائن کے لیے اس کا لہجہ ہمدردانہ تھا جو کہ مجھے کچھ عجیب لگا کیونکہ ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ اپنا کام ٹھیک طرح سے کررہا ہے۔

''مجھے ایک اور معاملے پر بھی بات کرنی ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے دو عدد ریپر نکالے اور انہیں دکھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ مجھے گزشتہ روز بریک روم کی ٹوکری سے ملا ہے جبکہ دوسرا ہال کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ کوئی شخص اس عمارت میں کینڈی لے کر آرہا ہے۔ کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میں اسے برداشت نہیں کرسکتی۔ تمہیں یاد ہے کہ ایریکا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں کبھی اس کی یہ حرکت نہیں پکڑ سکوں گی لیکن وہ پکڑی گئی اور میں نے اسے کھڑے، کھڑے فارغ کردیا۔ اب یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا ہے، میں گزشتہ روز نصف شب تک رکی رہی، میں نے تمام لاکرز اور کام کرنے کی جگہوں کی تلاشی لی، مجھے کچھ نہیں ملا۔ لیکن جب کبھی کوئی ایسی چیز میرے ہاتھ آئی تو میں متعلقہ شخص کو فوراً فارغ کردوں گی۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ وہ کون ہے اور کتنے عرصے سے یہاں کام کررہا ہے۔''

میٹنگ کے فارغ ہوکر میں نے ان کاموں کی فہرست پر نظر ڈالی جو مجھے کرنے تھے۔ سب سے پہلے میں نے آرڈر فارموں کی فائل اٹھائی، کئی ایک میں قلم کے ذریعے تبدیلی بھی کی گئی تھی اور سامان کی رقم بڑھادی گئی تھی۔ شاید ایلی اس وقت یہی کام کررہی تھی جب میں صبح اس کے پاس آئی۔ لوگ اکثر سامان ختم ہونے کی شکایت کرتے ہیں اس لیے وہ احتیاطاً یہ کام کررہی تھی۔

مشکل سے ایک گھنٹا گزرا ہوگا کہ برائن..... اپنے کمرے سے فائلوں کا ایک پلندا لیے ہوئے برآمد ہوا۔ ''میں اپنی بیوی کو لنچ پر لے جارہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ فائلیں ایلی کو دے دینا جب وہ لنچ پر جانے لگے اور اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں کب گیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹے بعد ایلی نے انٹرکام پر مجھ سے کہا۔ ''مجھے انڈیکس کارڈز چاہئیں۔ اسٹور روم دو دروازے چھوڑ کر ہے۔''

اسٹور روم کی لمبائی زیادہ اور چوڑائی کم تھی۔ دیواروں کے ساتھ لوہے کے شیلف لگے ہوئے تھے جن میں اوزار اور سامان ترتیب سے رکھا تھا۔ مجھے انڈیکس کارڈز تلاش کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ میں انہیں لے کر واپس آئی تو ایلی میری میز پر کھڑی ان فائلوں پر انگلی مار رہی تھی جو برائن رکھ کر گیا تھا۔

''تو وہ یہ میرے لیے چھوڑ گیا ہے۔'' ایلی نے کہا۔

''وہ کب گیا تھا؟''

''تھوڑی دیر پہلے...'' مجھے امید تھی کہ وہ تفصیل نہیں پوچھے گی۔

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ ہر مہینے یہی کرتا ہے،

کوئی بات نہیں، ہم سہ پہر میں اس پر کام کریں گے۔ ابھی میں جارہی ہوں۔ مجھے لنچ سے پہلے کچھ کام کرنے ہیں، تم بھی ورک روم میں چلی جاؤ... اگر کسی کے پاس کینڈی نظر آئے تو مجھے بتانا۔"

دفتر کے مقابلے میں ورک روم میں کافی ہلچل تھی۔ لوگ کام کے ساتھ، ساتھ ہنسی مذاق اور باتیں بھی کررہے تھے۔ میں نے لیزا کو کارڈ بورڈ پر ہتھوڑی مارتے دیکھا تو اس کے پاس چلی گئی۔

"ایلی نے مجھ سے تم لوگوں کی مدد کرنے کے لیے کہا ہے۔" میں بولی۔ "میں تمہیں یہ کام کرتے دیکھ کر حیران ہورہی ہوں، میرا خیال تھا کہ تم پینٹر ہو۔"

"لیزا ہر کام کرلیتی ہے۔" ٹام نے کہا۔ "یہ یہاں تیس سال سے ہے اور اسے ہر بات کا پتا ہے۔ تم ہماری مدد کرنے آئی ہو۔ پلمبنگ کا کام کرسکتی ہو؟"

میں نے سوچا کہ ڈاگ ہاؤس میں پلمبنگ کی کیا ضرورت ہے، وہاں لوگ پوسٹر مولڈ کی کاسٹنگ اور ٹائلوں کے درمیان سیمنٹ کی بھرائی کررہے تھے۔ میں ان کی کیا مدد کرسکتی تھی۔ بہت سوچ کر میں نے کہا۔ "میں سلائی کرسکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے مجھے آف وائٹ پردے پکڑاتے ہوئے کہا۔ "ان پر بارڈر لگانا ہے۔ معاف کرنا مجھے تمہارا نام معلوم نہیں ہوسکا۔"

"لارا..." میں نے کہا۔ "یہ بہت دلچسپ جگہ ہے۔"

اسٹیلی نے کمپیوٹر پر سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بولی۔ "اگر دلچسپ سے تمہاری مراد مضحکہ خیز ہے تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"ہم جو کچھ کررہے ہیں، وہ مضحکہ خیز نہیں ہے۔" ٹام بولا۔ "مجھے کتوں سے محبت ہے اگر لوگ عمدہ مکانوں میں رہ سکتے ہیں تو ہمارے یہ دوست کیوں نہیں؟"

لیزا کیل ٹھونکتے ہوئے بولی۔ "ہم یہ مکان کتوں کے لیے نہیں بنا رہے، کیا تمہیں اب تک یہ اندازہ نہیں ہوا۔ کتے تو کہیں بھی رہ سکتے ہیں، یہ مکان دراصل ان مالکوں کے لیے ہیں جنہیں اپنی امارت کا مظاہرہ کرکے تسکین ملتی ہے، کچھ لوگوں کے پاس اتنا پیسا ہے کہ وہ اسے خرچ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔"

"میرا شوہر بے روزگار ہوجائے گا اگر لوگ ان چیزوں پر پیسے خرچ نہ کریں جن کی انہیں ضرورت نہیں۔" میں نے سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ آرڈر پر لان کے لیے آرائشی اشیا بناتا ہے جو بے حد خوب صورت ہوتی ہیں لیکن ہر ایک کو ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"حالانکہ یہ ایک دلچسپ چیلنج ہے۔" ٹام بولا۔ "وہ اس فیلڈ میں کیسے آگیا؟"

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک مجسمہ ساز ہے لیکن کوئی بھی اس کے شاہکار مجسمے نہیں خریدتا۔ اس لیے اسے گزر اوقات کے لیے یہ کام شروع کرنا پڑا۔"

"میری طرح..." اسٹیلی نے کہا۔ "میں نے آرکیٹکچر اور انٹیریئر ڈیزائن میں ماسٹرز کیا ہے اور میں کتوں کے گھر ڈیزائن کررہی ہوں۔ غیر تربیت یافتہ لوگ ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں۔ فنکاروں کی کوئی قدر نہیں۔"

"تمہارے کام کی قدر کتے کریں گے۔" ٹام بولا۔ "ذرا سوچو کہ جب وہ..."

لیزا جھلاتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہیں اس کام سے محبت ہے اور تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو کبھی ایلی کو چیلنج مت کرنا، اگر کوئی چیز ختم ہوجائے تو یہ مت کہنا کہ اس نے مناسب مقدار میں آرڈر نہیں دیا تھا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ کبھی تمہارے پاس چاکلیٹ نہ دیکھے۔"

"وہ چاکلیٹ کے بارے میں اتنی پریشان کیوں رہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا آغاز گزشتہ برس ہوا جب اسے دل کا دورہ پڑا تھا گو کہ اتنا شدید نہیں تھا لیکن وہ خوف زدہ ہوگئی ہے۔"

ٹام بولا۔ "اس کے والدین بھی جوانی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے اور ایلی جانتی ہے کہ اسے یہ مرض ورثے میں ملا ہے۔ اس لیے وہ محتاط ہوگئی ہے اور دل کا دورہ پڑنے کے بعد اس نے میٹھی چیزوں سے پرہیز کرنا شروع کردیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنا وزن بھی کافی کم کرلیا ہے۔"

"ہاں، ان دنوں وہ صرف ایک ہی میٹھی چیز کو برداشت کررہی ہے اور وہ ہے برائن۔" اسٹیلی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "وزن کم کرنے کے بعد ہی اس نے اسے ملازمت دی ہے۔"

ٹام نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "برائن شادی شدہ ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کچھ نہ کچھ تو ہے۔" اسٹیلی بولی۔ "ورنہ وہ اسے

اکاؤنٹنٹ نہ رکھتی جو دس تک گنتی پڑھتے ہوئے بھی دو دفعہ اٹکتا ہے۔" پھر وہ میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "لارا، یہ وہ ڈیزائن ہے جو میں نے لوئیس ولا کے تیار کیا تھا۔ کیا یہ بدصورت لگ رہا ہے؟"

میں نے اس کے کمپیوٹر اسکرین پر دیکھا۔ اس کے ڈیزائن میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کسی اچھے مکان میں ہونی چاہئیں۔ سرخ اینٹوں کی دیواریں، باوقار محرابیں؟ ڈھلوان چھت اور لوہے کے تاروں کی باڑ۔

"بہت خوب صورت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتی کہ گاہک نے اسے کیوں پسند نہیں کیا۔"

"کیونکہ ایلی ناکام سیلز وومن ہے۔" اسٹیلی نے کہا۔ "چیزیں اسی وقت بہتر ہوسکتی ہیں، جب سیلز پر توجہ دی جائے۔ لیزا تمہیں اس وقت ضرور افسوس ہوا ہوگا جب مسز فلیمنگ نے تمہیں ترقی دینے کے بجائے ایلی کو منیجر رکھ لیا۔"

لیزا ہتھوڑی چلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے کبھی منیجر بننے کے بارے میں نہیں سوچا۔ ایلی نے ایم بی اے کیا ہوا ہے جبکہ میں صرف گریجویٹ ہوں، یہ اور بات ہے کہ میں تیس سال سے محنت کررہی ہوں۔"

"تم شام کی کلاس میں داخلہ کیوں نہیں لے لیتیں۔" ٹام نے کہا۔ "میں بھی یہی کررہا ہوں۔"

لیزا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک سی ہی رہتی ہے۔"

اس کے بعد ہم لوگ اپنے، اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ ایک بجے میں لنچ کے لیے بریک روم میں چلی گئی۔ شام تک کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے چار بج رہے تھے، گھر جانے میں آدھ گھنٹا باقی تھا۔ میں نے سوچا وقت گزاری کے لیے اپنے نوٹس مکمل کرلوں کہ اچانک مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ میں ہال میں آئی تو دیکھا کہ ایک نئی لڑکی اسٹور روم کے باہر کھڑی ہوئی تھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا رکھا تھا۔ لیزا بھی اس طرف بھاگی۔ اس نے اسٹور میں جھانک کر دیکھا اور کسی کو کھینچنے لگی۔ وہ ایلی تھی جو کمر کے بل بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔

میں اس کی جانب دوڑی۔ دوسرے لوگ بھی جمع ہوگئے۔ وہ سب مختلف سوالات کررہے تھے۔ ایلی اب ہال کے فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا جسم بے حس وحرکت تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ٹام نے اس کی نبض دیکھی اور اسے مصنوعی تنفس دینے لگا۔ میں نے اسٹور روم کی طرف دیکھا۔ چند گھنٹے پہلے وہاں ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی لیکن اب وہاں سب کچھ درہم برہم ہوچکا تھا۔

میں نے ایک بار پھر ایلی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "کیا کسی نے نو گیارہ کو فون کیا؟"

لیزا نے اپنا فون نکالا اور بولی۔ "ایلی کے دفتر سے برقی آلۂ قلب لے کر آؤ۔ اسے برقی جھٹکے دینا ہوں گے۔"

لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ کچھ دیر بعد طبی عملہ بھی آگیا۔ انہوں نے ایلی کو اسٹریچر پر ڈالا اور اپنی کارروائی کرنے لگے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بھی زیادہ پُرامید نہیں تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنا کارڈ برائن کو دیا اور بولا۔ "ہمیں یہاں پر موجود تمام لوگوں کے نام اور فون نمبرز فیکس کردینا۔ ممکن ہے کہ پولیس والے کچھ سوالات کرنا چاہیں۔"

ان کے جانے کے بعد لیزا بولی۔ "میں فیکس کرنے میں لارا کی مدد کروں گی۔ شاید سب لوگ گھر جانا چاہیں، میں نہیں سمجھتی کہ آج کوئی کام کرسکے گا۔"

"ایک منٹ..." برائن اپنی ٹائی سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ "میں ایلی کی غیر موجودگی میں یہاں کا انچارج ہوں اور کسی کو بھی وقت سے پہلے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں لارا کی مدد درکار ہوگی۔ لیزا تم اس کے ساتھ مل کر جلدی سے فیکس کردو، میں مسز فلیمنگ کو اطلاع دے رہا ہوں۔ باقی سب لوگ اپنے کام پر جائیں۔"

اس کی زبان سے ایلی کے بارے میں افسوس کا ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔ بہرحال ہم نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ لیزا نے ملازمین کا رجسٹر اٹھایا اور میرے ساتھ بیٹھ کر فیکس کرنے لگی۔ جیسے ہی میں فارغ ہوئی، برائن اپنے کمرے سے نکل آیا۔

"تمہارا کام ختم ہوگیا۔" اس نے کہا۔ "تم سیف بکس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"یہ سوفٹ ویئر اکاؤنٹنگ پروگرام ہے۔" میں نے کہا۔ "کئی سال پہلے میں نے اس پر تھوڑا سا کام کیا تھا لیکن اس کے بعد شاید یہ کچھ تبدیل ہوگیا ہو۔"

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ مکمل طور پر تبدیل ہوگیا ہے۔ بہرحال اکاؤنٹنگ کی فائلیں ایلی کی میز پر ہیں۔

تم ان میں سے ہر گروپ کے اعداد و شمار اکٹھے کر کے انہیں ترتیب دو پھر ہم دیکھیں گے کہ ان معلومات کو کس طرح پروگرام میں ڈالنا ہے۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔"

وہ چلا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ کہاں اور کیوں جارہا ہے۔ میں فائلیں لینے کے لیے ایلی کے کمرے میں گئی۔ اس کا پرس میز پر پڑا ہوا تھا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ایلی نے ابھی تک فائلوں پر کام شروع نہیں کیا۔ اس کی ای میل بھی کھلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ای میل پڑھتے پڑھتے اچانک اسٹور روم میں کیوں چلی گئی۔

اگلے ایک گھنٹے تک میں فائلوں میں سر کھپاتی رہی۔ ان میں رسیدیں، انوائسز اور ڈپازٹ سلپ سب گڈمڈ ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ برائن ہر مہینے یہی کرتا ہوگا اور انہیں الگ الگ کرنے اور ترتیب دینے کا کام ایلی کو کرنا پڑتا تھا پھر مجھے اسٹیلی کی بات یاد آئی لیکن برائن نے ایلی کے بارے میں کوئی جذباتی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی رومانی تعلق نہیں تھا۔

برائن واپس آیا تو اس نے میرے ساتھ مل کر رپورٹ تیار کی جو کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ منافع کم اور پیداواری لاگت بہت زیادہ تھی لیکن اس نے رپورٹ آگے بھیج دی۔

"شکر ہے کہ یہ کام بھی ہوگیا۔" اس نے کہا۔ "اب میرے پین کی سیاہی بھی ختم ہوگئی ہے۔ تم مجھے اسٹور سے کچھ نئے پین لادو پھر میں چلا جاؤں گا۔ تم پانچ بجے دفتر بند کر دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے ایلی کے بارے میں کچھ سنا؟"

"ہاں اس کی موت واقع ہوچکی ہے۔" اس نے عام سے انداز میں کہا۔ "تم پین لے کر آؤ۔"

"لگتا ہے کہ اس کے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔" میں نے سوچا اور اسٹور روم چلی گئی۔

وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس جگہ کچھ دیر پہلے ایک عورت کی موت ہوئی ہے۔ میں نے پین نکالے اور واپس آگئی۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ احساس ہورہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔

میں اپنے گھر کے عقبی لان میں سام اور اپنی بیٹیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی کہ میں نے ڈرائیو وے میں لیفٹیننٹ بروک کی گاڑی دیکھی۔ وہ ہماری طرف ہی آرہا تھا۔

"ہائے مسز ابیرم تم عقبی صحن میں پکنک منا رہی ہو۔"

"آج نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم کہہ سکتے ہو کہ ہم کل رات اور اس کے بعد آنے والی چھ راتوں کی تیاری کر رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ یہودیوں کا تہوار 'سکوٹ' ہے۔"

"مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے لیکن پہلے میں مسٹر ابیرم اور لڑکیوں کو ہیلو کہہ لوں۔" سارہ اور راکیل دوڑتی ہوئی اس سے ملنے آئیں۔ بروک سے ان کی ملاقات گزشتہ سال ایک ڈنر پر ہوئی تھی اور تب سے ہی وہ اسے پسند کرنے لگی تھیں۔ سام نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا لیکن تھوڑا سا فکرمند نظر آنے لگا۔ بروک بھی صرف ہیلو کہنے نہیں آتا تھا اور میں پہلے ہی سام کو ایلی کے بارے میں بتا چکی تھی۔

بروک نے صحن میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں اندازہ ہوگیا ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

"ایلی سینڈرز کے بارے میں بات کرنے؟ لیکن اس کی موت تو دل کا دورہ پڑنے کے سبب ہوئی۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"یقیناً ایسا ہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسے یہ دورہ کیوں پڑا؟ مجھے معلوم ہے کہ اسے گزشتہ برس دل کا دورہ پڑا تھا لیکن میڈیکل ایگزامنر نے کچھ ایسی چیزیں دیکھی ہیں جن سے پتا چلا ہے کہ اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہے۔ اس کے ہاتھوں پر سرخی اور چھالے دیکھے گئے۔ پہلے تو میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب میں نے وہاں موجود افراد کی فہرست میں تمہارا نام دیکھا تو اس معاملے کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ایلی کرنٹ لگنے سے مری ہے لیکن کیسے؟"

"اچھا سوال ہے۔ میں پہلے میچنگ مینشن ہی گیا تھا۔ اندر جا کر وہاں کا جائزہ لیا۔ نگراں نے بتایا کہ بجلی کے تار چھت میں سے گزر رہے ہیں اور وہ ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اسٹور روم میں کوئی سیڑھی بھی نہیں دیکھی۔"

"کیا وہ لوہے کے شیلف پر نہیں چڑھ سکتی تھی؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس کا وزن سہار سکتے ہیں اور وہ ایسا کیوں کرتی؟ اگر اسے بجلی کا کرنٹ لگا ہے تو اس

کے لیے کسی نے دستی برقی آلہ استعمال کیا ہے جیسے کوئی برقی ہتھیار یا بجلی کی کیتلی کو برقی رو پہنچانے والی راڈ......"

میں نے اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ چیزیں مہلک نہیں اور کوئی انہیں کیسے حاصل کرسکتا ہے؟"

"آج کل سب کچھ آن لائن خریدا جاسکتا ہے۔ میں اس کے گھر بھی گیا تھا۔ اس نے ایک کمرے میں دفتر بنا رکھا ہے۔ وہاں ایک میز پڑی ہوئی ہے لیکن کوئی کمپیوٹر نہیں تھا اور فائلوں والی دراز بھی خالی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے پاس لیپ ٹاپ تھا اور کوئی فائلوں کے ساتھ اسے لے گیا۔"

"لیکن کوئی ایسا کیوں کرے گا اور اس کا ایلی کی موت سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ نقب زنی کی واردات لگتی ہے؟"

"مجھے صرف عقبی دروازے کے تالے پر کچھ نشانات نظر آئے تھے۔ ممکن ہے کہ کوئی تالا توڑ کر اندر آیا ہو یا اس کے پاس اضافی چابی ہو، تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی۔ اس سے پہلے بھی تمہاری وجہ سے ہمیں کافی مدد ملی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں لیکن وہ آج صبح کی میٹنگ میں کافی برہم تھی۔ ویسے تو یہ بڑی احمقانہ بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس نے دفتر میں چاکلیٹ لانے پر پابندی لگادی تھی۔ اسے کچھ ریپرز پڑے ہوئے ملے جس پر وہ اتنی ناراض ہوئی کہ اس سے ٹھیک طرح بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ وہ غیر معمولی طور پر جذباتی نظر آرہی تھی۔ ممکن ہے کہ اسی وجہ سے اسے دل کا دورہ پڑا ہو۔"

"شاید لیکن اس کے ہاتھوں پر پڑے ہوئے چھالے اور سرخی کو میں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ مجھے اس معاملے کو دیکھنا ہوگا۔ شاید دوسرے لوگوں سے بات کرنے کے لیے کل کمپنی کے دفتر آؤں لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور تم اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے تہوار کا نام کیا بتایا تھا؟"

"سکوٹ۔" میں نے کہا۔ "اس سے مراد جھونپڑیاں ہیں، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، سام نے ایک جھونپڑی بنایا ہے اور ہماری بیٹیاں سجانے میں اس کی مدد کررہی ہیں۔"

میں نے اس ڈھانچے کی طرف اشارہ کیا جو سام نے آج صبح بنایا تھا۔ وہ آٹھ ضرب بارہ کا لکڑی کا فریم تھا جس کے تین طرف لکڑی کی جالی دار دیواریں جبکہ چھت درخت کی شاخوں سے بنائی گئی تھی۔ لڑکیوں نے دیواروں پر ڈرائنگ چسپاں کردی تھیں اور اب ان پر سیب کی ٹہنیاں، انگوروں کے گچھے، گاجریں، پھلیاں اور سرخ و سبز مرچیں لگانے کی کوشش کررہی تھیں۔

"بہت عمدہ......!" بروک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور تم لوگ اس جھونپڑی میں پورا ہفتہ پکنک مناؤ گے؟ کیوں؟"

"اس کی دو وجوہ ہیں۔" پہلی یہ کہ یہ جھونپڑی ان خیموں کی یاد دلاتے ہیں جن میں یہودیوں نے مصر سے کنعان کی جانب سفر کرتے ہوئے قیام کیا تھا۔ وہ شام کو یہ خیمے نصب کرتے اور صبح روانگی کے وقت انہیں باندھ لیتے۔ وہ ان عارضی خیموں میں چالیس برس تک رہے اور ہمیں صرف سات دن رہنا ہے۔ اس طرح اس تجربے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو ہزاروں سال پہلے ہمارے بزرگوں کو ہوا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ فصل کی کٹائی کا موسم ہے۔ اس لیے ہم جھونپڑی کو سبزیوں اور پھلوں سے سجاتے ہیں۔ یہ گویا اظہارِ تشکر ہے کہ خداوند نے ہمیں کن نعمتوں سے نوازا ہے۔"

بروک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور تہوار ختم ہونے پر تمہاری لڑکیاں اس جھونپڑی کو پلے ہاؤس کے طور پر استعمال کریں گی۔"

"نہیں...... تہوار کے ختم ہونے پر یہ جھونپڑی ہٹا دیا جائے گا۔ جس طرح بنی اسرائیل اپنے خیمے لپیٹ کر اگلی منزل کی جانب چل دیتے تھے۔"

"یعنی تمہیں ہر بار نئے سرے سے جھونپڑی بنانا پڑتا ہے؟"

"نہیں، سام نے کئی سال پہلے اس فریم کے لیے لکڑی کے ٹکڑے کاٹ کر رکھ لیے تھے۔ ہر سال وہ تہوار کے موقع پر انہیں جوڑ کر جھونپڑی بنا لیتا ہے اور اس کے خاتمے پر انہیں علیحدہ کرکے تہ خانہ میں رکھ لیتا ہے۔"

بروک کے جانے کے بعد سام نے پوچھا۔ "یہ یہاں کیوں آیا تھا؟"

"بچیاں سو جائیں پھر بتاؤں گی۔"

جب میں دوسرے دن آفس پہنچی تو برائن کافی سرگرم دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق اسٹاف کی میٹنگ بلائی۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ ایلی کے بارے میں کچھ کہے گا لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری مسٹر فلیمنگ سے بات ہوگئی ہے۔ انہوں نے مجھے منیجر مقرر کیا ہے، ممکن ہے کہ اس میں کوئی بہتری ہو... اس لیے ہمیں بہت

محنت سے کام کرنا ہوگا۔‘‘

اس نے جیب سے ایک چاکلیٹ نکالی، اس کا ریپر علیحدہ کیا اور منہ میں رکھ لی۔ کچھ لوگ احمقانہ انداز میں ہنس دیے۔ اسٹیلی بھی بناوٹی انداز میں مسکرانے لگی۔

’’پہلی بات۔‘‘ برائن نے کہا۔ ’’مسٹر فلیمنگ زیادہ منافع چاہتے ہیں اس لیے اسٹیلی تمہیں اپنے ڈیزائن بہتر بنانا ہوں گے اور سب لوگوں کو بھی محنت سے کام کرنا ہوگا۔ پہلے ایلی سیلز کا کام دیکھ رہی تھی۔ اب کسی اور کو یہ ذمے داری لینا ہوگی۔ میں منیجر ہوتے ہوئے اکاؤنٹس کے ساتھ سیلز کا کام نہیں دیکھ سکتا۔ کیا تم میں سے کسی کے پاس سیلز کا تجربہ ہے؟‘‘

’’لیزا یہ کام کرسکتی ہے۔‘‘ اسٹیلی نے کہا۔ ’’ایلی کے آنے سے پہلے وہی سیلز کا کام دیکھ رہی تھی۔ وہ میرے ڈیزائن بھی سمجھتی ہے اور وہ انہیں بہ آسانی فروخت کرسکتی ہے۔‘‘

’’بالکل۔‘‘ لیزا نے کہا۔ ’’بعض اوقات کلائنٹ ڈیزائن کو مسترد بھی کر دیتا ہے لیکن اس طرح نہیں جیسا کہ گزشتہ سال اکثر بار ہوا۔‘‘

برائن چاکلیٹ چباتے ہوئے بولا۔ ’’میں زیادہ آمدنی کی بات نہیں کر رہا۔ ہمیں لاگت کم کرنی ہے۔ کیا تم اپنے موجودہ کام کے ساتھ ساتھ سیلز کی ذمے داری بھی سنبھال سکتی ہو؟‘‘

’’ہاں بالکل......‘‘ لیزا نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

اس کے بعد ایجنڈے کے دوسرے نکات پر گفتگو ہونے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی ذمے داریاں دوسروں پر ڈال رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ سست آدمی ہے اور اس کی نااہلی میں گزشتہ روز دیکھ چکی تھی۔ اب تک ایلی نے اس پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ کیا وہ اس سے محبت کرتی تھی؟ کیا وہ اس تعلق کا خاتمہ چاہتا تھا اور اس نے اسے راستے سے ہٹانے کے لیے قتل کر دیا اور اس کی جگہ منیجر بن کر بیٹھ گیا؟

’’ٹھیک ہے، سب لوگ اپنے کام پر جائیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’لارا تم کچھ گتے کے ڈبے لے کر آؤ اور ایلی کی ذاتی اشیا ان میں ڈال دو۔‘‘

جب میں ڈبے لے کر آئی تو وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ’’میں ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تک ایلی کی تمام چیزیں یہاں سے ہٹا دی جائیں۔ میرے لیے نیا سامان لے کر آؤ۔ میں پرانی پنسلوں اور زنگ آلود پیپر کلپ سے نئی جاب نہیں شروع کرنا چاہتا۔‘‘

اگر مجھے قاتل کا انتخاب کرنا ہوتا تو میرے ذہن میں پہلا نام برائن کا ہی آتا لیکن محض اس لیے اس پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ میں اسے ناپسند کرتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کے پاس قتل کا کوئی محرک ہو لیکن دوسرے بھی اس سے مبرّا نہیں تھے۔ میں ایلی کی میز پر جا کر اس کی ذاتی اشیا ایک باکس اور استعمال شدہ دفتری چیزیں دوسرے ڈبے میں رکھ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ اسٹیلی کو ایلی پسند نہیں تھی۔ لیزا شاید اس سے کسی بات پر ناراض تھی اور ٹام کو ڈر تھا کہ وہ احتیاط سے سامان استعمال نہ کرنے پر اسے نکال دے گی۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہ تھی جو اس کے قتل کا محرک بنتی۔

پھر میرے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ ممکن ہے کہ ایلی نے اس شخص کو پکڑ لیا ہو جو عمارت میں کینڈی کے ریپر پھینک رہا تھا اور اسے ایلی نے ملازمت سے برطرف کرنے کی دھمکی دی۔ وہ اسے کسی بہانے اسٹور روم میں لے گیا یا لے گئی اور کسی برقی آلے کے ذریعے اسے کو بجلی کا شاک دے کر ہلاک کر دیا۔ بے شک یہ ایک مکمل منصوبہ تھا لیکن کون ایسا بے وقوف ہوسکتا ہے جو ایسی جگہوں پر ریپر پھینکے جہاں ایلی کی نظر ان پر پڑ سکتی تھی۔

میں نے ان شاپنگ بیگز کی جانب توجہ دی جو دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ ایک میں کشمیری سویٹر اور سلک کا اسکارف تھا۔ دونوں چیزیں بہت خوب صورت اور قیمتی لگ رہی تھیں۔ دوسرے بیگ میں ایک کمپیوٹر پروگرام تھا۔ میری سمجھ میں اس کا مقصد نہیں آیا۔ دفتر کے پاس اپنا سیف بکس کا جدید ترین ورژن موجود تھا پھر ایلی کو ایک اور کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا اسے ذاتی حساب کتاب کے لیے اس کی ضرورت تھی۔

میں برائن کے پاس جانے ہی والی تھی کہ ایلی کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور بولی۔ ’’ہیچنگ مینشن۔‘‘

’’میں جارج لوئیس بول رہا ہوں۔‘‘ ایک مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ’’کیا ایلی سے بات ہوسکتی ہے؟‘‘

مجھے یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگا پھر بھی میں نے پوچھ ہی لیا۔ ’’کیا تم اس کے فیملی ممبر ہو یا ذاتی دوست؟‘‘

’’نہیں کاروباری تعلق ہے، کیا وہ موجود ہے؟‘‘

’’مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ گزشتہ روز اس کا انتقال ہوگیا۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔‘‘

’’اوہ میرے خدا۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’بہت بُری خبر ہے۔ میں نے گزشتہ رات اسے سیل فون پر کئی مرتبہ فون کیا لیکن جواب نہیں ملا۔ اس لیے مجبوراً مجھے اس نمبر پر فون کرنا پڑا۔ حالانکہ اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ اس کے بجائے ہمیشہ اس سے سیل فون پر بات کیا کروں۔‘‘

وہ یہ خبر سن کر کافی پریشان ہوگیا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’اگر تم چاہو تو میں کسی اور سے تمہاری بات کروا سکتی ہوں۔ مسٹر برائن لینڈل نے منیجر کا چارج سنبھال لیا ہے۔ اس وقت وہ باہر ہیں لیکن......‘‘

’’نہیں ٹھیک ہے۔‘‘ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ’’کیا تمہارے پاس ایلی کے دوست پیٹر کا نمبر ہے؟‘‘

’’پیٹر!‘‘ میں نے زیرِلب دہرایا۔ لیزا نے مجھے گزشتہ روز ملازمین کا رجسٹر دکھایا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’اس نام کا کوئی شخص ہمارے اسٹاف میں نہیں ہے۔‘‘

’’وہ یہاں کام نہیں کرتا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید ایلی نے تمہیں اس کے بارے میں بتایا ہو۔‘‘

’’میں نے کل سے ہی کام شروع کیا ہے۔ اگر تم اس کا پورا نام بتاؤ تو میں ایلی کی ایڈریس بک میں چیک کرلیتی ہوں۔‘‘

’’اس میں بھی یہ نمبر نہیں ہوگا۔‘‘ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے کچھ اور سوچنا ہوگا۔‘‘

ریسیور رکھنے کے بعد میں سوچنے لگی کہ پیٹر کون ہے اور یہ لوئیس۔ اس کا نام میں نے کہاں سنا تھا۔ اس کا ایلی اور اس پُراسرار پیٹر سے کیا تعلق ہے؟ اچانک ہی مجھے گزشتہ روز ہونے والی اسٹاف میٹنگ یاد آگئی جس میں اسٹیلی نے شکوہ کیا تھا کہ کلائنٹ نے اس کا ڈیزائن کیوں مسترد کر دیا۔ اس پر ایلی نے جواب دیا کہ مسز لوئیس کے خیال میں وہ بدصورت تھا۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں گزشتہ روز ایلی کے کمرے میں آئی تو وہ مجھے دیکھ کر چونک گئی تھی۔ اس وقت وہ آرڈر کے فارم دیکھ رہی تھی اور میرا خیال ہے کہ اس نے ان میں رد و بدل کیا تھا۔ ٹام سامان ختم ہونے کی شکایت کر رہا تھا۔ گاہک شاندار ڈیزائن مسترد کر رہے تھے اور جب میں نے برائن کے ساتھ مل کر رپورٹ تیار کی تو مجھے اس میں بھی غلط اعداد و شمار دکھائی دیے۔

کتے

اہلِ مغرب کو تو کتوں کے ساتھ اس وجہ رغبت ہے کہ اگر شوہر اور کتے میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا موقع آجائے تو بیوی کتے کو ترجیح دیتی ہے جبکہ ہمارے ہاں اس قسم کی صورت حال میں بہرحال شوہر کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ امریکا میں ایک بی بی نے جو ہمسائے میں رہتی تھی، اپنے شوہر سے طلاق لے لی کیونکہ وہ آتے جاتے کتے کو جھڑکتا تھا۔ یہ بی بی طلاق کے بعد بہت خوش تھی۔ کہتی تھی اس روز سے سکھ کی نیند سو رہی ہوں کیونکہ ’’ٹونی‘‘ سوتے میں خراٹے تو نہیں لیتا!

مشتاق احمد یوسفی کی تصنیف چراغ تلے سے انتخاب

ماحول سوگوار سا ہے۔ ڈرائنگ روم میں دو دوست بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک اچانک اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے، دوسرا میز کو بجاتے ہوئے اس سے پوچھتا ہے۔ ’’اب تم غم زدہ کیوں ہو؟ تم نے اپنی خالہ کی زندگی میں اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ اب وہ مر گئی ہے تو آہیں بھرتے ہو۔‘‘

دوسرا ٹہلنا بند کر کے کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ’’میں نے پانچ سال تک بڑی بی کو پاگل خانے میں رکھا تھا اور وہ اپنی ساری جائداد کا مالک مجھے بنا گئی ہے۔ اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ کیسے ثابت کروں کہ وہ صحیح الدماغ تھی۔‘‘

صائمہ عندلیب، لاہور کا مسکان بھرا استفسار

والدین اپنے بچے کے لیے گاڑی خریدنے گئے۔ انہوں نے گاڑی خرید کر اس میں اپنے بچے کو بٹھا دیا اور سڑک پر چلاتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جو کوئی ملتا، گاڑی کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ میاں بیوی حیران تھے کہ بات کیا ہے۔ آخرکار انہوں نے دیکھا کہ گاڑی پر دکان کا لیبل اب تک چسپاں ہے جس پر لکھا تھا۔ ’’یہ ہمارے کارخانے کی ایجاد ہے۔‘‘

مرسلہ: ایم شاہد عرشی، سیالکوٹ

ان سب باتوں سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ایلی کمپنی کا بزنس چرا رہی تھی۔ لگتا یہی ہے کہ جب گاہکوں کو کمپنی کے بنائے ہوئے مکانوں کی قیمت زیادہ معلوم ہوتی تو وہ انہیں قائل کرنے کے بجائے پیٹر کا پتا بتا دیتی جو ویسا ہی مکان کم قیمت پر بنا رہا تھا اور یہ اسی لیے ممکن تھا کہ ایلی اسے اسٹیلی کے بنائے ہوئے ڈیزائن اور کمپنی سے چرایا ہوا سامان فراہم کر رہی تھی۔ ظاہر یہ کیا جا رہا تھا کہ گاہک کمپنی کے ڈیزائن مسترد کر رہے ہیں لیکن اس بہانے ایلی اور پیٹر اپنے کاروبار کو وسعت دے رہے تھے۔ شاید اسی لیے ایلی کو سیف بکس کی ایک اور کاپی کی ضرورت پیش آ گئی تا کہ وہ اپنے ہوم کمپیوٹر پر حساب کتاب رکھ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک نااہل اور سست اکاؤنٹنٹ رکھا ہوا تھا کیونکہ اگر آپ چوری کر رہے ہیں تو حساب کتاب رکھنے کے لیے کسی تیز اور ہوشیار آدمی کی ضرورت نہیں۔

اس کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ سب باتیں قتل کا محرک کیسے بن سکتی ہیں۔ میں نے سر کو جھٹکا اور برائن کی مطلوبہ چیزیں لینے اسٹور روم کی طرف چل دی۔ مجھے سراغ رساں بننے کی ضرورت نہیں۔۔ بلکہ اپنے کام پر توجہ دینی چاہیے۔ جیسے ہی میں اسٹور روم میں پہنچی میری توجہ ایک بار پھر بٹ گئی۔ میرے ذہن میں سام کا خیال آیا جو سیڑھی پر چڑھ کر سکاہ، کی چھت پر درخت کی ٹہنیاں ڈال رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اسٹور روم میں بھی سکاہ کی طرح چھت سے کوئی چیز لٹکتی ہوئی دیکھی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ جب لوگ اسٹور روم کی طرف دوڑ رہے تھے اور لیزا، ایلی کو کھینچ کر ہال میں لے آئی تھی تو میں نے اسٹور کی چھت سے کوئی چیز لٹکتی ہوئی دیکھی اور اس کے علاوہ بھی فرش کے وسط میں کوئی چیز تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اسٹور روم کی طرف دیکھتی، کسی نے وہاں کا دروازہ بند کر دیا۔

پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا لیکن میں نے اسے مسترد کر دیا۔ اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی ایسا بندوبست کر سکتا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے گھر میں بنے ہوئے بوتھ (سکاہ) کے بارے میں سوچا اور شیلف کا جائزہ لینے لگی۔ وہاں جگہ جگہ مختلف سائز اور رنگوں کے کارڈ بورڈ رکھے ہوئے تھے۔ میں دروازے تک گئی اور باہر ہال میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور اس کے آگے رنگ کے بھاری ڈبے رکھ دیے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے کام کے دوران اندر آئے۔

میں نے تین منٹ میں اپنا کام مکمل کر لیا۔ رنگ کے ڈبے ہٹائے اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ سامنے سے برائن چلا آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”میرے کمرے میں ساری چیزیں رکھ دیں؟“

”نہیں، ابھی مجھے اسٹور سے نکالنی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے میں اپنی دوائیں لے آؤں، کار میں رکھی ہیں۔“

میں نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور تیز تیز قدموں سے کار کی طرف چل دی۔ کار میں بیٹھ کر میں نے اپنا سیل فون نکالا۔ ”لیفٹیننٹ بروک“ میں نے کہا۔ ”جو کچھ میں بتا رہی ہوں تمہیں اس پر یقین نہیں آئے گا۔“

ایک گھنٹے بعد وہ دو باوردی پولیس والوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ اس نے برائن کو اپنا شناختی کارڈ دکھا کر تمام ملازمین کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے لیے کہا۔ فوراً ہی ہم سب ورک روم میں پہنچ گئے۔

”میرے پاس ایک بُری خبر ہے۔“ بروک نے ہم سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میڈیکل ایگزامنر نے کچھ سوالات اٹھائے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں ہے کہ مس ایلی کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی ہے۔“

”اسے پہلے بھی دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔“ اسٹیلی نے کہا۔

”ہم جانتے ہیں۔“ بروک بولا۔ ”اسے دل کا دورہ پڑا تھا لیکن ہم اس کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی ناجائز حرکت بھی شامل ہو سکتی ہے۔“

ٹام تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”ناجائز حرکت؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”بہتر ہے کہ میں اس بارے میں زیادہ بات نہ کروں۔ تم میں سے کسی نے گزشتہ روز کوئی عجیب بات نوٹ کی؟“

سب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ سب لوگوں کی موجودگی میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے میں ہر ایک سے الگ الگ علیحدگی میں بات کروں گا لیکن پہلے ہم عمارت کی تلاشی لیں گے۔ اسٹور سے شروع کرتے ہیں۔ شاید ہمیں میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کی حمایت میں کوئی

ثبوت مل جائے۔“

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے ابھی ابھی میچنگ مینشن کے کیس پر کام شروع کیا ہے۔ کیا یہ بہت ضروری ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔“

اس نے فون جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک مسئلہ آ گیا ہے۔ ہم دو تین گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔“

ایک بجے کھانے کا وقفہ ہوا۔ اس دوران بھی میں یہی سوچتی رہی کہ کیا ہونے والا ہے۔ اگر ایلی کو واقعی قتل کیا گیا ہے تو میں جان گئی تھی کہ یہ کیسے ہوا ہوگا۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ کیوں اور کس نے یہ قتل کیا۔ میری خواہش تھی کہ سام سے اس بارے میں بات کروں۔ وہ اس گتھی کو سلجھانے میں میری مدد کر سکتا ہے لیکن اس وقت وہ کسی میٹنگ میں مصروف تھا پھر مجھے کتے اور ہڈی والی کہانی یاد آ گئی جو مجھے ایک دفعہ سام نے سنائی تھی۔ ایک کتے نے منہ میں ہڈی دبائی ہوئی تھی۔ اس نے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو سمجھا کہ یہ کوئی دوسرا کتا ہے۔ اس کے دل میں لالچ آیا اور اس نے دوسرے کتے کی ہڈی چھیننے کے لیے منہ کھولا تو اس کی اپنی ہڈی بھی پانی میں جا گری۔

اگر اس قتل کا محرک بھی یہی تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد بریک روم کا دروازہ کھلا اور بروک نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا اندازہ درست تھا۔ ہم نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔“

”کیا وہ لیزا ہی ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

رات کو بروک میرے گھر ڈنر پر مدعو تھا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد بچیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا لیزا نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا؟“

”اسے آدھا اعتراف سمجھو۔“ بروک نے اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔ ”اس نے جال بچھانے کا اقرار تو کر لیا ہے اور وہ اس سے مکر نہیں سکتی کیونکہ آفیسر کورٹز نے اس وقت وہاں کیمرے نصب کر دیے تھے جب میں تم لوگوں سے ورک روم میں باتیں کر رہا تھا اور اس ویڈیو میں لیزا کو چپکے سے وہ لکڑی کے ٹکڑے اسٹور روم سے لے جاتے دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کی کبھی بھی ایلی کو قتل کرنے کی نیت نہیں تھی۔ وہ صرف اسے ڈرانا چاہتی تھی تا کہ اسے ایک جھٹکا دیا جائے، شاید جیوری اس کی بات پر یقین کرے لیکن مجھے نہیں ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھ سکا۔“ سام نے کہا۔ ”تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ ایلی کمپنی سے بے ایمانی کر رہی تھی اور لیزا اس کی مدد کر رہی تھی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیفٹیننٹ بروک، اگر میں غلطی پر ہوں تو میری تصحیح کر دینا۔ میرا خیال ہے کہ اسٹیلی کا تیار کردہ ڈیزائن گاہک کو پسند تو آیا لیکن قیمت پر معاملہ اٹک گیا۔ اور ایلی نے اسے قائل کرنے کے بجائے پیٹر کا حوالے دے دیا جو کم قیمت پر ڈاگ ہاؤس بنا سکتا تھا لیکن درحقیقت پیٹر کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کی اصل پارٹنر لیزا تھی۔“

”اس نے لیزا کو ہی پارٹنر کیوں بنایا؟“ سام نے پوچھا۔ ”برائن، اسٹیلی یا ٹام کو کیوں نہیں۔“

”کیونکہ وہ ہر ایک پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ برائن نااہل ہے جبکہ اسٹیلی اور ٹام صرف اپنا کام کر سکتے ہیں لیکن لیزا ہرفن مولا ہے اور وہ سب کام کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایلی نے لیزا کو ساتھ ملا کر کمپنی کا بزنس چرانا شروع کر دیا پھر لیزا کے دل میں لالچ آ گیا۔ وہ منافع میں برابر کا حصہ مانگنے لگی جس کا یہ انجام ہوا۔“

”لیزا نے اس سے بالکل مختلف کہانی سنائی ہے۔“ بروک نے کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ ایلی کے دل میں لالچ آ گیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ ایلی کا ہی آئیڈیا تھا۔ پہلے انہوں نے چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا۔ وہ صرف ڈیزائن چوری کرتی تھیں پھر ایلی کو معمولی سا ہارٹ اٹیک ہوا تو انہوں نے زیادہ منافع کے لالچ میں کمپنی سے سامان چوری کرنا بھی شروع کر دیا اور ایسے گاہکوں کا حساب کتاب الگ رکھنے لگیں۔“

”لیزا کا کہنا ہے کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ تھک گئی تھی اور خوف بھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ چھٹی کے بعد اپنے فارغ وقت میں ایلی کے لیے کام کرتی جس کی وجہ سے اسے بہت محنت کرنا پڑ رہی تھی جبکہ ایلی بڑے غیر محتاط طریقے سے سامان چوری کرنے اور حساب کتاب میں ہیرا پھیری کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ لیزا کو ڈر تھا کہ اگر وہ پکڑی گئیں تو نہ صرف نوکری سے نکال دی جائیں گی بلکہ انہیں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑے گی۔“

”مجھے یہ امکان نظر آتا ہے کہ لیزا خوف زدہ ہو گئی

ہو۔" میں نے کہا۔ "اس نے ساری زندگی اسی کمپنی میں گزار دی اور اپنے کام میں مہارت حاصل کی لیکن کسی دوسری جگہ اس کا یہ تجربہ کام نہیں آتا اور نہ ہی اس کے خوف کو اس کے فعل کا جواز بنایا جاسکتا ہے۔"

"اس نے یہ کام کس طرح انجام دیا؟" سام نے پوچھا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ بوتھ کا خیال آتے ہی تمہیں یہ اندازہ لگانے میں مدد ملی کہ اس نے کس طرح ایلی کو قتل کیا ہو گا۔ میں یہ بات سمجھ نہیں سکا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پریشانی ہوئی لیکن لڑکیوں کے سامنے کھل کر بات نہیں کرسکتی تھی۔ لیفٹیننٹ بروک نے مجھے بتایا کہ غالباً ایلی کو بجلی کا کرنٹ لگا تھا۔ بجلی کی تاریں اسٹور روم کی چھت سے گزر رہی ہیں اور وہاں کوئی سیڑھی بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی ایلی کو وینٹل تک پہنچنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر مجھے کینڈی کے ریپر یاد آگئے۔"

سام نے پوچھا۔ "وہ ریپر جو ایلی کو فرش پر پڑے ہوئے ملے تھے؟"

"ہاں۔" بروک نے کہا۔ "لیزا نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر ایسی جگہ پھینکے تھے کہ ایلی کی نظر ان پر پڑے۔ وہ جانتی تھی کہ ایلی چھپائی گئی کینڈی تلاش کرے گی۔ جیسا کہ وہ پہلے بھی کرچکی تھی جب اسے اسی طرح کینڈی کے ریپر پڑے ہوئے ملے تھے۔ اسی نے ایلی کو بتایا کہ اسٹور روم میں بھی کینڈی کے ریپر پڑے ہوئے ہیں۔"

"کیا لیزا نے پہلے سے اسٹور روم میں سارا بندوبست کررکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

بروک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس نے چھت میں نصب وینٹل کو لٹکا ہوا چھوڑ دیا اور دیوار کے ساتھ سیڑھی کھسکا دی۔"

سام بولا۔ "لارا کا کہنا ہے کہ وہاں کوئی سیڑھی نہیں تھی۔"

"ہاں، واقعی وہاں سیڑھی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں نے شیلف میں ایسے تختے دیکھے جن میں دندانے بنے ہوئے تھے۔ اس نے انہی کو جوڑ کر سیڑھی بنائی ہوگی۔ جس طرح تم نے بوتھ کے لیے پہلے سے لکڑی کے ٹکڑے کاٹ کر رکھے ہوئے ہیں۔ اور انہیں ہر سال جوڑ کر استعمال کرتے ہو۔"

"مجھے اندازہ لگانے دو۔" سام بولا۔ "ایلی نے اوپر دیکھا تو اسے وہاں کینڈی کی تھیلی نظر آئی اور وہ اسے اٹھانے کے لیے اوپر چڑھ گئی۔"

"بالکل ٹھیک۔" بروک بولا۔ "لیزا نے تار چھیل کر ننگے کردیے اور انہیں کینڈی کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ ڈاگ ہاؤس میں بجلی کا کام کرچکی ہے۔ اس لیے جانتی تھی کہ وہ کیا کررہی ہے۔ ایلی یہ جھٹکا برداشت نہ کرسکی جبکہ بقول لیزا وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ شاک مہلک نہیں ہوگا۔ چاہے تم یقین کرو یا نہیں۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن لیزا یقیناً سیل میں اضافہ کی خواہش مند تھی لیکن ایلی کو راستے سے ہٹائے بغیر وہ گاہکوں سے براہِ راست رسائی نہیں کرسکتی تھی۔ اس حادثے کے بعد اس نے بڑی تیزی دکھائی اور فوراً ہی ایلی کو کھینچ کر اسٹور روم سے باہر نکال لیا تاکہ ہم میں سے کوئی اندر جاکر سیڑھی اور کھلے ہوئے وینٹل کو نہ دیکھ سکے۔ مجھے یقین ہے کہ اسٹور روم کا دروازہ بھی اسی نے بند کیا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ اسٹور روم کو واپس پہلی حالت میں لے آئے گی۔ کیا اس نے ان سب باتوں کا اعتراف کرلیا؟"

"ہاں اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ اس نے ایلی کے گھر کا تالا توڑ کر اس کا لیپ ٹاپ اور فائلیں نکال لیں۔ اس کا خیال تھا کہ ایلی نے غیر قانونی کاروبار کا ریکارڈ گھر پر رکھا ہوگا۔ ہم نے یہ ریکارڈ اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اس سلسلے میں مسٹر لوئیس اور دوسرے گاہکوں سے بھی بات کی ہے۔ ان تمام ثبوتوں اور شہادتوں کو جمع کرکے ہم لیزا کے خلاف ایک مضبوط کیس بنانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ مسز ابیرم، میں تمہارے تعاون اور مدد کے لیے شکر گزار ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ مالکان نے لیزا کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ اسی لیے وہ ایلی کا ساتھ دینے پر رضا مند ہوگئی۔" میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ممکن ہے کہ محض لالچ کی بنا پر اس نے یہ سب کیا ہو۔ بہرحال ساتھ کام کرنے والے تو اس کی بھی عزت کرتے تھے۔" بروک نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن خالی عزت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ لیزا کو وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ مستحق تھی۔ تاہم اس نے ایلی کے ساتھ جو کیا۔ وہ بھی ٹھیک نہیں تھا، اسے اس جرم کی سزا تو ملنی ہی چاہیے۔"

تصویر کی تلاش

نسرین منصور

دوستوں کے درمیان وجۂ دوستی عنایت... محبت... اعتبار اور خلوص و یگانگت ہوتی ہے... جذبات کی یہ زنجیریں ایک دوسرے کو اس طرح جکڑے رکھتی ہیں کہ ایک کڑی ٹوٹنے سے باقی کڑیاں بھی بکھرتی چلی جاتی ہیں... دوستوں کی ایسی ہی بیٹھک... شروعات تو بہت اچھی ہوئی تھی... مگر آہستہ آہستہ انجام پذیر ہوتے ہوئے واقعات نے ایسی انگڑائی لی کہ جذباتی بندھنوں میں بھی رخنہ پیدا ہوتا چلا گیا...

جستجو و لالچ کا طویل ہوتا سفر...... ایک تصویر کی تلاش کا ذکر

ٹریوس ریڈمین عرف ریڈ ایک جھٹکے کے ساتھ نیند سے بیدار ہوگیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اپارٹمنٹ کی عمارت لرز رہی ہے۔ "یہ کیا مصیبت ہے" اس نے سوچا۔ نیویارک سٹی میں زلزلے نہیں آتے۔ اسے جسم سے خیال آیا کہ شاید گرج چمک کے ساتھ طوفان آیا ہو۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا تاہم اس نے بستر میں ہی لیٹے رہنے کو ترجیح دی لیکن سائرن کی آواز نے اسے کھڑکی تک جانے پر مجبور کردیا۔ کچھ فاصلے پر آسمان شعلوں سے سرخ ہو رہا تھا اور

گھرے دھوئیں کے بادل فضا پر چھائے ہوئے تھے۔

مورس کو کافی عرصے سے کوئی کام نہیں ملا تھا اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کئی سالوں بعد یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اسے کسی کو گولی مارنے یا کسی اہم شخصیت کے گناہ چھپانے کے لیے نہیں کہا گیا۔ اس کی زندگی بدل چکی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ اپنے آپ کو بدل رہا تھا۔ اب اس کی کچھ ذمے داریاں تھیں۔ اس نے کچھ وعدے کر رکھے تھے۔ اس سے توقعات وابستہ کر لی گئی تھیں اس لیے وہ پہلے سے زیادہ کمانا چاہتا تھا۔

اس کے دوست بوبی بیسٹ کی سالگرہ تھی۔ وہ اپنی گرل فرینڈ اسٹارلا سے ملنے وہاں پہنچ گیا۔ جہاں اس کی نظر ایک دراز قد اور سانولے رنگ کی خوب صورت لڑکی پر گئی۔ اس نے چست سرخ لباس اور سیاہ رنگ کے جالی دار موزے پہن رکھے تھے اور وہ اسی میز کے گرد منڈلا رہی تھی جہاں مورس اور اس کے دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر بوبی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس نے احتجاجاً کہا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی یہاں آرہے ہو۔ بہتر ہو گا کہ میری میز سے دور رہو۔"

مورس نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے بوبی۔ تم تو چارلس کو پہلی جماعت سے جانتے ہو؟"

"یہ پہلے جیسا نہیں دکھائی دے رہا۔" بوبی نے جواب دیا۔

"ہاں، اب میں ایسا ہی نظر آرہا ہوں۔" چارلس بولا۔ "لہٰذا تم بھی اس کے عادی ہو جاؤ۔"

جب بوبی نے چارلس کو دوسرے مہمانوں سے گلے ملتے دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔ اس نے مورس سے کہا۔ "تم نے اسے کیوں مدعو کیا؟"

"وہ ہمارا دوست ہے۔"

مورس کے نیویارک سٹی آنے کے کچھ ہی عرصے بعد چارلس بھی وہاں آگیا تھا۔ وہ بھی انہی تارکینِ وطن میں تھا جو نارتھ کیرولینا کے دیہی علاقوں میں ہونے والے نسلی تعصب سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب مورس نے اسے نیویارک میں دیکھا تو پہچان نہ سکا۔ وہ ڈالٹن کلب میں رقص کر رہا تھا اور اس زنانہ روپ میں کسی کو بھی اس کی جنس پر شک نہ ہوتا۔

چارلس کی طرح بوبی بھی اس کے بچپن کا بہترین دوست تھا۔ بوبی نے وقتی طور پر چارلس کو بلانے پر اعتراض ضرور کیا جواب اپنے آپ کو چارلین کہلوانا پسند کرتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ چارلس اپنی اس شناخت سے مطمئن ہے تو اس نے اسے مسئلہ نہیں بنایا لیکن اب بھی اس کی نظریں چارلس پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"مجھے ایک بات بتاؤ چارلس۔" اس نے قدرے مدھم لیکن خفگی سے کہا۔ "تم اپنے آپ کو عورت کے روپ میں کیوں ظاہر کرنا چاہتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا بوبی۔" چارلس نے معصومیت سے کہا۔ "شاید یہ بالکل ایسا ہی ہے جس طرح تم اپنے آپ کو ایک مرد کے طور پر ظاہر کرتے ہو۔"

سب لوگ زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ بوبی یہ طنز برداشت نہ کر سکا اور غصے میں آکر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ بوبی۔" مورس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "چارلس ایک ہاتھ سے تمہارے پیٹ پر ضرب لگا سکتا ہے پھر تمہیں کیسا لگے گا؟"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے بنی۔ میں لڑکیوں کی طرح نہیں لڑتا۔"

بوبی نے ادھر اُدھر دیکھا اور خاموشی سے بیٹھ کر مشروب کے گھونٹ لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اسٹارلا بھی اس گروپ میں شامل ہو گئی اور سب دوست کچھ دیر پہلے کی تلخی بھلا کر موسیقی کی دھن پر رقص کرنے لگے۔ رات گئے یہ محفل اختتام کو پہنچی اور سب لوگ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہونے لگے۔ ڈالٹن کلب کے باہر ٹیکسیاں ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ تبھی ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز مورس اور اسٹارلا کے پاس آکر رکی۔ چارلس بھی ان کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔

"مسٹر ریڈمین۔" ایک جانی پہچانی آواز نے مورس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مجھے یہ اعزاز بخشو گے کہ میں تمہیں اور ان خوب صورت خواتین کو منزل تک پہنچا سکوں؟"

"یقیناً نک، کیوں نہیں۔" مورس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ نک کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نک کی چھوٹی سے چھوٹی پیشکش کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔

"مورس، ایک بات تو بتاؤ۔" نک نے کہا۔ "تم بڑے خوش قسمت ہو کہ دو خوب صورت عورتوں کے ساتھ گھوم رہے ہو جبکہ میں اکیلا ہوں۔"

"یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔" مورس نے خوش مزاجی

سے کہا۔

نک نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے مجھے یہ شخص پسند ہے اسٹارلا۔ تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی اور یہ دوسری خاتون کون ہیں۔ مجھے یاد نہیں۔"

"ہم مل چکے ہیں لیکن باضابطہ نہیں۔" چارلس نے جواب دیا۔

"معاف کرنا۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ہماری ملاقات ہوئی ہو۔"

"میں کلب میں ڈانس کر رہی تھی جہاں ہر کوئی نکولس کو جانتا ہے لیکن میں اتنی خوش قسمت نہیں کہ ذاتی طور پر تم سے ملاقات کر پاتی۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ رات کے دو بجے ڈالٹن کے باہر تمہاری موجودگی محض ایک اتفاق ہے۔" مورس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ اسے چارلس کے ساتھ نک کی بے تکلفی بالکل اچھی نہیں لگی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے دوست۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" اس نے اپنے برابر والی نشست پر مورس کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے دریا کے کنارے ویئرہاؤس میں آتش زدگی کے بارے میں سنا ہوگا؟"

"ہاں، میں اپنے اپارٹمنٹ سے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔" مورس نے جواب دیا۔

"میرا بھی اس ویئرہاؤس سے مفاد وابستہ ہے۔" اس نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا تاکہ صرف مورس ہی اس کی بات سمجھ سکے۔ "فائر ڈپارٹمنٹ نے تصدیق کر دی ہے کہ یہ حادثہ نہیں تھا لہٰذا میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔"

مورس بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارے کئی دوست اونچی جگہوں پر بیٹھے ہیں اور وہ اس معاملے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔"

نک بناوٹی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر میرے لیے کام کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ہر بار میری مدد کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ پولیس والوں کو ویئرہاؤس سے ایک شخص کی لاش ملی ہے۔"

"اخبارات میں لکھا ہے کہ اس حادثے میں کوئی زخمی ہوا، اور نہ ہی کسی کی جان گئی۔"

"اخبارات میں لکھی ہوئی ہر بات کا یقین مت کرو۔" نک نے کہا۔ "پولیس نے کچھ باتیں ابھی تک ظاہر نہیں کی ہیں۔ مرنے والا سیاہ فام تھا اور اس کی شناخت نہیں ہو سکی۔ تم ان لوگوں سے بہت قریب ہو اور میرا اندازہ ہے کہ اس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہو۔ اگر تم کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہارا مشکور ہوں گا۔"

نک نے معاوضہ دینے کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے نزدیک پیسا دوستی کو خراب کر دیتا ہے حالانکہ وہ دوست نہیں تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ نک کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ بہرحال وہ یہ معلومات حاصل کرے گا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایسا کرنا اس کے لیے سودمند ہو گا چاہے نک زبان سے کچھ بھی کہتا رہے۔

کار اس کے اپارٹمنٹ کی عمارت کے باہر آکر رکی۔ وہ اور اسٹارلا گاڑی سے باہر آئے تو اس نے دیکھا کہ چارلس، نک کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے چارلس سے کہا۔

"تم ہمارے ساتھ اوپر نہیں چلو گی چارلین؟"

"بالکل نہیں، اب میں بڑی ہو گئی ہوں اور اپنے معاملات خود دیکھ سکتی ہوں۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ نک بحفاظت گھر تک پہنچا دے گا۔"

"بالکل، تمہیں اس بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" نک نے کہا۔

ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود مورس کو اس واقعے کے بارے میں معلومات نہیں مل سکی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بارے میں کس سے دریافت کرے۔ اس روز وہ ہنری بوزمین سے عام گفتگو کر رہا تھا جو ڈالٹن میں آنے والے گاہکوں کے لیے سہ پہر کے لیے فری ڈرنک کے انتظام میں لگا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں اس واقعے میں مرنے والے کا ذکر نکل آیا۔

"تمہیں اس کا کیسے پتا چلا؟" مورس نے بے چینی سے پوچھا کیونکہ نک نے بتایا تھا کہ پولیس نے اس کی موت ظاہر نہیں کی تھی۔

"میں چند لڑکوں کو جانتا ہوں جو اس وقت وہاں موجود تھے جب اس کی لاش ویئرہاؤس سے نکالی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ لاش پوری طرح جل گیا تھا لیکن اس کی موت اس وجہ سے واقع نہیں ہوئی۔"

"پھر وہ کیسے مر گیا؟"

"اس کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔"

"تم یہ کیسے جانتے ہو؟"

"وہ اسے ہارلیم اسپتال لے گئے تھے۔ وہاں

میرے کچھ جاننے والے کام کرتے ہیں۔ اس میں کوئی راز ہے۔ انہوں نے اس کی لاش کو چھپایا اور کسی کو بھی اسے دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ شاید اس کے گھر والوں کو بھی معلوم نہیں کہ وہ مر چکا ہے۔"

"وہ ویئر ہاؤس میں کیا کر رہا تھا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"وہ یہیں قریب میں رہتا تھا؟"

"کبھی کبھی اس کی شکل نظر آتی تھی۔ وہ بھی میری ہی طرح تھا۔ اچھے وقت میں وہ اچھا ہو جاتا تھا اور جب وقت مہربان نہ ہو تو......"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر بولا۔ "میں نے اسے ایک ہفتے پہلے دیکھا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ میرے ساتھ تاش کھیلنے دوسرے شہر چلے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اسے ملازمت مل گئی ہے۔"

"کس قسم کی ملازمت؟"

"ہم جیسے لوگوں کو کس قسم کی ملازمت مل سکتی ہے۔ میں نے اسے افریقن چرچ کی صفائی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

مورس نے ہنری کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ مرنے والا شخص لی کوئی ڈول اس چرچ میں کام کر رہا تھا جس کا انتظام ڈیسوٹا نائر کے ہاتھ میں تھا۔

ہنری کو اچانک ایک خیال آیا، اس نے مورس سے پوچھا۔ "تم نے آخری بار چارلس کو کب دیکھا تھا؟"

"ایک ہفتے پہلے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں نے گزشتہ رات جوا کھیلنے کے لیے اس کے گھر سے کچھ لڑکے بلائے تھے لیکن وہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ کچھ دنوں سے نظر نہیں آ رہا۔"

"میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" مورس نے کہا۔ اس نے چارلس کو سمجھایا بھی تھا کہ تک کے ساتھ یہ کھیل نہ کھیلے لیکن وہ باز نہ آیا۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کی قدر و قیمت کا اندازہ اخبار میں اس کے بارے میں شائع ہونے والی خبر سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو لی کوئی ڈول کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ کیونکہ اس کا نام کبھی اخبار میں نہیں آیا۔ ایک اور ہفتہ گزرنے کے بعد آتش زنی کے بارے میں شائع ہونے والی خبر آخری صفحے کے چھوٹے سے کالم تک سمٹ کر رہ گئی جب نیویارک ڈیلی مرر نے بتایا کہ مرنے والے کی باقیات ویئر ہاؤس سے ملی تھیں۔

"یہ تصویر دیکھو۔" اسٹارلا نے مرر کی ایک کاپی مورس کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ویئر ہاؤس میں لگنے والی آگ کی یہ تصویر کافی فاصلے سے لی گئی تھی۔ اس میں شعلے سرد پڑ گئے تھے اور صرف دھواں اٹھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے کسی کے زخمی نہ ہونے کی خبر دی تھی۔" اسٹارلا نے کہا۔

"یہ سچ نہیں ہے۔" مورس نے جواب دیا۔ "اس واقعے میں ایک شخص مارا گیا لیکن وہ اسے چھپا رہے ہیں۔"

"پھر اتنی ساری ایمبولینس کیوں آئی ہوئی ہیں؟"

مورس نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس تصویر میں ایک سے زیادہ ایمبولینس گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور یہ تصویر بھی آگ بجھنے کے کافی دیر بعد لی گئی تھی۔ اگر کوئی زخمی ہوا ہوتا تو اس وقت تک اس کا پتا چل جاتا۔ پھر یہ ایمبولینس گاڑیاں وہاں کیوں کھڑی ہوئی تھیں؟

مورس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور بولا۔ "میں تھوڑی دیر میں واپس آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"کیا دو گے؟" اس آدمی نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" مورس نے کہا۔

"میں نے پوچھا ہے کہ کیا دو گے؟"

"تم غلط آدمی سے بات کر رہے ہو۔" مورس نے جواب دیا۔ "میں تو محض ایک کارندہ ہوں۔ تمہیں یہ سوال مسٹر تک سے کرنا چاہیے۔"

اس موٹی گردن والے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بولا۔ "تم مسٹر تک کے لیے کام کرتے ہو؟"

"ہاں، کیا میں نے بتایا نہیں؟ اس نے کہا ہے کہ تم لوگ کچھ معلومات اخبار والوں سے چھپا رہے ہو اور میں حیران ہوں کہ تم کب تک اس معاملے کو دبائے رکھو گے؟"

"دیکھو، میں ایک معمولی افسر ہوں۔ میری وہاں تک رسائی نہیں ہے۔"

"ابھی تم مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کتنے پیسے دو گے اگر تمہاری رسائی نہیں ہے تو پیسے کس بات کے مانگ رہے تھے؟"

"میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ میرا تعلق ہوی سائڈ سے نہیں ہے۔"

"جو جانتے ہو وہی بتا دو۔" مورس نے پُرسکون انداز میں کہا۔

"مرنے والے کا نام لی کوئی ڈول ہے اور وہ سیاہ فام تھا۔"

"یہ میں پہلے سے جانتا ہوں۔"

"وہ جل گیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی اسے کسی نے گولی مار دی۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں۔"

"پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

"کیونکہ میں یہ نہیں جانتا کہ اسے کس نے گولی ماری اور کیوں؟"

"تمہارا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں؟"

"تم اس جگہ بیٹھے ہو، شاید تم نے کچھ سنا ہو۔"

"میں نے یہ بات نہیں سنی کہ اس کا قاتل کون ہے۔"

"مجھے وہ بات بتاؤ جو ہم نہیں جانتے۔"

پولیس آفیسر نے ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد کہا۔ "وہ کسی ایتھوپین کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ انہیں اس کے بارے میں معلوم ہوگا کہ وہ کون ہے۔ انہیں مردہ شخص کے پاس سے ایک رقعہ ملا جس پر لکھا تھا۔ 'ایتھوپین کو تلاش کرو' بس میں اتنا ہی جانتا ہوں اگر تمہیں مزید معلومات درکار ہیں تو وہ تمہیں کیپٹن لاردسا سے مل سکتی ہیں۔"

مورس کیپٹن لاردسا کو جانتا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ تک اسے پسند کرے گا یا نہیں۔ بہتر ہوگا کہ تک خود ہی ذاتی طور پر اس سے پوچھ لے۔

☆☆☆

"بے بی۔ دیکھو کون آیا ہے؟"

مورس اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ چھوٹے قد اور سیاہ جلد والا شخص کاؤچ سے اٹھا تو مورس نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"مسٹر ڈی سوٹا نائر۔ کافی عرصے بعد تمہیں دیکھا ہے۔ شہر کے اس حصے کی طرف کیسے آنا ہوا؟"

"پرانے دوستوں کو اجنبی نہیں ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب وہ اتنے قریب رہتے ہوں۔" نائر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسٹارلا سے میری بات ہوتی رہتی ہے۔ تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"ہم ڈنر پر بہت سی باتیں کریں گے۔" اسٹارلا نے کہا۔

"آج نہیں پھر کبھی۔" نائر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "فی الوقت مجھے مورس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" اسٹارلا نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میرے حلقے کے ایک آدمی کے معاملات دیکھ رہے ہو؟" نائر نے کہا۔

"ہاں، یہ سچ ہے۔"

"کس کے کہنے پر؟"

"نکولس جینورس۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے؟"

"تم بتا دو۔"

"وہ قاتل ہے۔ اس میں شیطان کی روح بھری ہوئی ہے۔"

"تمہاری طرح۔" مورس نے اس پر طنز کیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے یہ کہنے کی؟"

مورس پُرسکون انداز میں بولا۔ "تم مجھے اس کا کوئی ایک کام بتا دو جو تم نے نہیں کیا۔"

"میں نے کسی مقصد کے تحت لوگوں کو مارا۔ سفید فام لوگوں نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا اور ہمیں غلام بنا لیا۔ اچھے لوگوں نے انہیں کانگو سے نکالنے کے لیے اپنا خون بہایا۔ میں نے سچائی اور عزت کے لیے لوگوں کو مارا جبکہ وہ......"

"پیسوں کے لیے قتل کرتا ہے۔" مورس اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "خیر تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

نائر نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "تم بہت بدل گئے ہو۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ تم نے اخلاقی قدروں کو بھلا دیا ہے جبکہ تم اس کے عادی تھے اور انہی کے ساتھ بڑے ہوئے ہو۔ ایک بامقصد زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔"

"میں تک کے لیے معلومات جمع کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ ان کا کیا کرے گا لیکن اس کا کوئی مقصد ضرور ہے اور مجھے شبہ ہے کہ تم بھی اسی سلسلے میں آئے ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ ویئر ہاؤس میں آگ کس نے لگائی تھی؟"

"شاید وہ تک ہی ہو سکتا ہے؟"

"اسے ویئر ہاؤس میں رکھی ہوئی کوئی چیز چاہیے تھی۔ وہ اسے تباہ کرنے کا خطرہ کیوں مول لے گا جو اس کے لیے اتنی قیمتی ہو۔ اب میرا ایک سوال ہے کہ تمہارا آدمی ویئر ہاؤس میں کیا کر رہا تھا اور تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"یہ تو دو سوال ہو گئے۔" نائر نے کہا۔

"تم ان میں سے ایک چن لو اور اس کا جواب دو۔"

’’میں جاننا چاہتا ہوں کہ لی کولی ڈول کو کس نے قتل کیا؟‘‘

’’مجھے تم پر یقین نہیں ہے۔‘‘

’’میں بھی تم پر بھروسا نہیں کرتا۔‘‘ نائر نے جوابی وار کیا۔

’’پھر میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں خود ہی کچھ سوچنا ہوگا۔ یہ اتھوچین کون ہے؟‘‘

’’میں کسی اتھوچین کو نہیں جانتا۔‘‘ نائر نے کہا۔

’’ڈول کے پاس سے ایک رقعہ ملا ہے جس پر لکھا تھا ’اتھوچین کو تلاش کرو۔‘ اس کا کیا مطلب ہے؟‘‘

’’میں نہیں جانتا۔ بہرحال مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے کام میں مداخلت کی۔ مجھے اب جانا چاہیے۔‘‘

’’دوست مداخلت نہیں کرتے۔‘‘ موریس نے پُرخلوص انداز میں کہا۔ ’’تمہارے پاس میرا فون نمبر ہے اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔‘‘

’’شاید۔‘‘ نائر نے جواب دیا۔

وہ ہال میں کھڑا نائر کو لفٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ نائر پوری طرح اس معاملے میں ملوث ہے اور لی کولی کی طرح اسے بھی اتھوچین کی تلاش ہے۔ موریس ایک بار پھر پولیس ہیڈ کوارٹر گیا۔ اس مرتبہ اس نے ایک نوجوان آفیسر کو گھیرنے کی کوشش کی۔

’’میں ویئر ہاؤس والے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔‘‘ آفیسر نے کہا۔ ’’اس روز میں ڈیوٹی پر نہیں تھا۔‘‘

’’اس تصویر کو دیکھو۔‘‘ موریس نے اخبار کا تراشا اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ’’آگ بجھ چکی ہے اور ویئر ہاؤس میں کسی کی موجودگی کا امکان نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہاں دو ایمبولینس گاڑیاں کھڑی ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟‘‘

’’میں نہیں جانتا کہ تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہ رہے ہو۔‘‘

’’میں تم سے کچھ کہلوانا نہیں چاہ رہا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس تصویر کو غور سے دیکھو۔ ایک پولیس والے کی آنکھ سے۔ تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟‘‘

آفیسر بہت دیر تک اس تصویر کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ’’یہ گاڑیاں مقامی نہیں ہیں۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’ہاں یہ مقامی نہیں ہیں۔ اندھیرے کی وجہ سے میں کچھ پڑھ نہیں سکتا لیکن ان پر جو لوگو بنا ہوا ہے وہ کسی مقامی سروس کا نہیں۔ اس طرح کے لوگو میں نے شمالی علاقوں میں دیکھے ہیں لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا۔‘‘

’’اگر زیادہ بڑی آگ ہو تو کیا تم دوسرے شہروں سے بھی ایمبولینس منگواتے ہو؟‘‘

’’میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ مقامی سروس کے پاس کافی گاڑیاں ہیں۔‘‘

موریس نے تصویر جیب میں رکھی اور بولا۔ ’’میں مسٹر تک کو بتادوں گا کہ تم نے میری کتنی مدد کی۔‘‘

عمارت کے باہر تک کا ڈرائیور گاڑی سمیت موجود تھا۔ موریس نے پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے اسے ڈیلی مرر کے دفتر چلنے کے لیے کہا۔

’’کیا مسٹر نکول جانتے ہیں کہ تم اخبارات سے رابطے میں ہو؟‘‘

’’تم اسے فون کر کے بتا کیوں نہیں دیتے؟‘‘ موریس نے جل کر کہا۔

موریس اپنے شبہے کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اخبار کے فوٹو گرافر کو چوری کیا ہوا پولیس بیج دکھایا تو وہ اس سے تعاون پر آمادہ ہوگیا۔ اس رات اس نے کئی تصویریں کھینچی تھیں۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ ایک لاش کو لے جانے کے لیے ایمبولینس بلائی گئی تھی۔ اسے یہ بات بھی عجیب سی لگی کیونکہ وہاں پہلے سے دو ایمبولینس گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔

وہ اسے ایک کے بعد ایک تصویر دکھاتا رہا پھر اچانک ایک تصویر پر اس کی نگاہ اٹک گئی اور وہ بے اختیار بولا۔ ’’تم نے دیکھا؟‘‘

’’کیا؟‘‘ فوٹو گرافر نے پوچھا۔

ایک گاڑی پر بڑے بڑے حروف میں ایمبولینس سروس لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔

’’یہ نمبر کہاں کا ہے؟‘‘

’’میں نہیں جانتا۔ شاید شمال میں واقع کسی شہر کا ہو۔‘‘

’’اس پر فون کرو۔‘‘

اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے نمبر ملایا اور چند منٹ باتیں کرنے کے بعد فون رکھ دیا۔

’’کچھ معلوم ہوا؟‘‘ موریس نے پوچھا۔

’’آگ لگنے سے ایک ہفتے پہلے ایمل ہال نامی شخص نے یہ دو گاڑیاں کرائے پر لی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ چند خاص تقریبات منعقد ہونے والی ہیں اور شہر میں مزید

ایمبولینس گاڑیوں کی ضرورت ہوگی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انہیں صرف گاڑیاں چاہئیں۔ ضرورت پڑنے پر ان میں سامان نصب کردیا جائے گا۔‘‘

’’کیا یہ غیر معمولی بات نہیں ہے؟‘‘ موریس نے کہا۔

’’تمہارے خیال میں کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ کیا اس میں بھی کوئی کہانی ہے؟‘‘

’’ممکن ہے۔‘‘ موریس نے کہا۔ ’’کیا تم نے کبھی ایمل ہال کا نام سنا ہے؟‘‘

’’ہاں، وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے لیے کام کرتا ہے۔‘‘

☆☆☆

وہ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ برابر میں ایک پولیس کار آکر رکی اور اس میں سے ایک پولیس والا اتر کر ان کے پاس آیا۔

’’کیا مسئلہ ہے آفیسر؟‘‘ ڈرائیور نے پوچھا۔

’’تم نے گاڑی غلط جگہ پارک کی ہے۔ لائسنس دکھاؤ۔‘‘

ڈرائیور نے لائسنس نکال کر اس کے حوالے کیا لیکن آفیسر نے اسے دیکھا تک نہیں بلکہ پچھلی نشست کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’تم ٹریوس ریڈ مین ہو؟‘‘

موریس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

’’کار سے باہر آجاؤ۔‘‘

’’تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔‘‘ ڈرائیور نے احتجاج کیا لیکن موریس نے اس کی کمر پر ہاتھ مار کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آفیسر اسے ساتھ لے کر اپنی پٹرول کار کی طرف بڑھا۔ اس کی پچھلی سیٹ پر درمیانی عمر کا ایک خوش لباس شخص بیٹھا ہوا تھا۔ موریس نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ اس کی تصویر اخبار میں دیکھ چکا تھا۔

’’مسٹر ریڈ مین۔ بالآخر ہماری ملاقات ہو ہی گئی۔ تم مجھے جانتے ہو؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ موریس نے مختصر سا جواب دیا۔ ’’تم پولیس کمشنر ہو۔‘‘

’’دیکھو ریڈ مین۔ میں جانتا ہوں کہ تم کس کے لیے کام کررہے ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم میرے آفیسر سے باتیں کرتے رہے ہو۔ مجھے تم جیسے معمولی شخص کی پروا نہیں ہے لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ گھٹیا قسم کے لوگ میرے ڈپارٹمنٹ میں اثرورسوخ بڑھانے کی کوشش کریں۔ اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے تو اچھا ہے۔ ورنہ وہ حشر کروں گا کہ تم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکو گے۔‘‘

’’میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم نے مجھے سڑک پر کیوں روکا اور اس پٹرول کار میں بٹھا کر کیا باتیں کرنا چاہ رہے ہو؟‘‘

’’کچھ باتیں ایسی ہیں جو تم نہیں سمجھتے۔ بہت نازک معاملات ہیں جن کی وجہ سے تحقیقات متاثر ہوسکتی ہے۔‘‘

’’اور یہ بات تم ایک ایسے شخص کو بتارہے ہو جس کے بارے میں تمہیں معلوم ہے کہ وہ ایک بدمعاش کے لیے کام کرتا ہے، آخر کیوں؟‘‘

’’میں تمہیں غائب کرواسکتا ہوں۔‘‘

’’اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس شہر میں روزانہ لوگ غائب ہوتے رہتے ہیں۔ میں جارہا ہوں۔ اگر کچھ کرسکتے ہو تو کرلو۔‘‘

موریس پٹرول کار سے باہر آیا اور پولیس آفیسر کے پاس سے گزرتا ہوا اپنی کار میں جاکر بیٹھ گیا۔ ’’کیا کہہ رہا تھا؟‘‘ ڈرائیور نے پوچھا۔

موریس نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا فربہ اندام شخص تھا جو غیر اہم ہوتے ہوئے بھی اپنی اہمیت جتانا چاہتا تھا۔

’’تمہارا نام کیا ہے؟‘‘ موریس نے پوچھا۔

’’فالکو۔ جان فالکو۔‘‘

’’دیکھو فالکو۔‘‘ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ’’تم مجھے نہیں جانتے اور امید ہے کہ جاننا بھی نہیں چاہو گے۔ بس تم مجھے گھر پر اتار دو۔ تک سے کہنا کہ میں اس سے کل بات کروں گا۔‘‘

سچ تو یہ ہے کہ موریس خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کمشنر نے یہ باتیں کیوں کہیں۔ اگر اسے یہ پریشانی تھی کہ کچھ لوگ اس کے ڈپارٹمنٹ میں گھس رہے ہیں تو ایسے لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ موریس نے تو صرف پولیس سے تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو کمشنر کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

☆☆☆

’’میں تمہارے لیے پریشان ہورہا تھا۔‘‘ نکولس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا میں نے تمہیں کبھی مایوس کیا؟‘‘ موریس نے پوچھا۔

’’ابھی تک تو نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کمشنر سے تمہارا ٹاکرا ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ملاقات تمہارے اطمینان کے مطابق ختم ہوئی ہوگی۔‘‘

’’یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔ جو کچھ میں معلوم کرسکا ہوں

وہ یہ کہ مرنے والا شخص کلیسائی حلقے سے تعلق رکھتا تھا اور ایک سو پچیسویں اسٹریٹ پر واقع ٹمپل آف لائف میں جایا کرتا تھا۔"

"اس کا انتظام تو ڈی سوتا نائر کے پاس ہے۔" نک بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "وہ تمہارا دوست ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"میں اسے جانتا ہوں۔" مورس نے اعتراف کیا۔

"کیا وہ بھی اس کھیل میں شامل ہے؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ اس نے آگ لگائی ہوگی۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ وہاں پہلے سے دوسرے شہر سے منگائی ہوئی ایمبولینس گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں لیکن انہوں نے لاش لے جانے کے لیے ایک اور ایمبولینس بلائی۔"

"وہ گاڑیاں ایمل ہال نے کرائے پر لی تھیں۔"

"تم اسے جانتے ہو؟" مورس نے پوچھا۔ "وہ پولیس کے لیے کام کرتا ہے۔"

"اور وہ کمشنر کا چہیتا بھی ہے۔"

"میں کل اس سے ملنے جاؤں گا اور......"

"اس کی ضرورت نہیں۔" نک نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور.... ایک موٹا لفافہ اسے پکڑا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" مورس نے پوچھا۔

"تم نے اپنا کام پورا کر دیا اور مجھے مایوس نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ معاوضہ معقول لگے گا۔ اس کے بعد کا کام میں خود کرلوں گا۔"

ایک ہفتے بعد اس نے اخبار میں پڑھا کہ ایمل ہال کی لاش ایسٹ ریور سے ملی ہے تو اسے اس خبر پر بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر ہال کو نک کی گم شدہ قیمتی چیزوں کے بارے میں پتا تھا تو اس کا یہی انجام ہونا تھا۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ نائر ایک بار پھر اس سے ملنے چلا آیا۔ اسے مورس کی ضرورت تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ مورس اپنی گن کے ساتھ آئے۔

مورس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "میں کیوں دوبارہ اس زندگی میں واپس جاؤں؟"

"کیونکہ ہم دوست ہیں۔" نائر نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ ماضی میں نائر نے اس کی بہت مدد کی تھی اور بدلے میں کچھ نہیں مانگا لیکن وہ بہت پرانی بات تھی اور ان کی دوستی فضا میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہو چکی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ اتھوپین کہاں ہے۔" نائر نے کہا۔

"میں کیوں اس کی پروا کروں؟"

"کیونکہ یہ بہت اہم ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ کسی اتھوپین کو نہیں جانتے۔"

"میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم پر بھروسا کرسکتا ہوں۔"

"اب ایسی کیا بات ہوگئی کہ تم مجھ پر بھروسا کرنے لگے؟"

"میں مایوس ہوگیا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسا کرنا ہی ہوگا۔"

"بہرحال یہ اتھوپین کون ہے؟"

"کون نہیں بلکہ یہ پوچھو کہ اتھوپین کیا ہے؟" نائر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایک نادر تصویر ہے جو کسی زمانے میں شاہ ہیل سلاسی کے محل میں آویزاں تھی۔"

"شاہ ہیل لاسی۔" مورس نے حیرت سے یہ نام دہرایا۔

"انہوں نے ہم سے سب کچھ چھین لیا۔"

"وہ کون؟"

"جب اٹلی نے 1935ء میں اتھوپیا پر حملہ کیا تو انہوں نے اسے ایک اطالوی صوبہ قرار دے دیا۔ انہوں نے کیمیائی اسپرے کے ذریعے لاتعداد مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ ہزاروں مویشی مار دیے۔ ان کا منصوبہ پوری آبادی کو ختم کرنے کا تھا اور جب انہیں وہاں سے نکلنا پڑا تو وہ اپنے ساتھ تمام قیمتی اشیا لے گئے جو وہ لے جاسکتے تھے۔ ان میں سے کچھ یہاں ہیں اور ان کی مالیت لاکھوں ڈالر ہے۔"

"کیا وہ چیزیں ویٹز ہاؤس میں تھیں اور لی کولی ڈول انہیں تلاش کر رہا تھا؟"

"میں نے اسے اتھوپین، کی تلاش میں بھیجا تھا۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ میں فسطائیت اور شہنشاہیت کا دشمن ہوں۔ مجھے کچھ لوگوں نے رابطہ کرکے بتایا کہ اتھوپین، کو یہاں لایا گیا ہے۔ یہ ایک چھ فٹ کی لاجواب پینٹنگ ہے جو کیس قیراط سونے کے فریم میں جڑی ہوئی ہے۔ جس کسی کو یہ تصویر ملے گی، اسے باقی چیزیں بھی مل جائیں گی۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ اس نے وہ تصویر تلاش کرلی تھی؟"

"نہیں، کوئی اس سے پہلے ہی اسے لے گیا۔ میرے ذرائع نے بتایا ہے کہ جس عمارت میں آگ لگی، وہاں سے کچھ نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ آگ توجہ ہٹانے کے لیے لگائی گئی تھی۔ وہ تصویر وہاں نہیں تھی۔"

"کم از کم اس عمارت میں نہیں جہاں آگ لگی تھی۔" مورس نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کیا تم ان ایمبولینس گاڑیوں کے بارے میں جانتے ہو؟"

"کون سی ایمبولینس؟"

جب مورس نے اسے باہر سے آنے والی ایمبولینس گاڑیوں اور حال ہی میں ملنے والی ایمل ہال کی لاش کے بارے میں بتایا تو نائر نے وثوق سے کہا۔ "پھر تو ایک ہی جگہ ہے جہاں وہ تصویر ہوسکتی ہے۔"

مورس نے تیوری چڑھائی۔ وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔

"اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے میرے دوست۔" نائر نے کہا۔ "جب بادشاہ کو جلاوطنی پر مجبور کیا گیا تو امریکا کے تمام نیگرو چرچ نے اس کی حمایت کا عہد کیا۔ وہ ہمارا بھائی ہے۔ اس کی رگوں میں بھی ہمارا خون دوڑ رہا ہے۔" نائر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "خدا ہی جانتا ہے کہ تم اندر سے کیا ہو۔"

"تم اس کی خاطر مرنے کے لیے تیار ہو؟" مورس نے کہا۔

"موت ہمارے اختیار میں نہیں۔ یہ ایک انجام ہے اور میرا ماننا ہے کہ اس کا تعین میں نہیں کرسکتا۔"

☆☆☆

"میں مورس بول رہا ہوں۔ نک کہاں ہے؟"

"وہ یہاں موجود نہیں ہے اور میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں ملے گا۔" دوسری طرف سے فالکو نے جواب دیا۔

"دیکھو، میرے پاس کچھ معلومات ہیں جن کی آج رات نک کو ضرورت پڑے گی۔ تم مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے تاکہ میں اس سے بات کرسکوں۔"

"تم وہ معلومات مجھے دے دو۔ میں اسے پہنچا دوں گا۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔" مورس نے کہا۔ "نک نے مجھے اس کام کے لیے بیس ہزار ڈالر دیے تھے اور میں یہ معلومات ایک ایسے شخص کے حوالے کردوں جو اس کی کار چلاتا ہے۔"

"میں اسے فون کرتا ہوں۔"

"ضرور کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ یہ کہے گا کہ میں مورس سے بات کرنا نہیں چاہتا۔"

مورس جانتا تھا کہ فالکو کو سوچنے کا موقع دیے بغیر اس پر دباؤ ڈالنا ضروری ہے۔ اس نے کہا۔ "دیکھو اگر تمہاری وجہ سے نک کا ہزاروں ڈالر کا نقصان ہوا تو وہ خوش نہیں ہوگا اس لیے سوچنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مجھے اس کا پتا بتادو تاکہ میں یہ معلومات اس تک پہنچا دوں۔"

کئی سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد فالکو نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ نک اس وقت سمر ہاؤس میں ہے۔ "یہ کہاں پر ہے؟" مورس نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے؟"

"مجھ سے مت کھیلو فالکو۔ میں اس کے لیے کام کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ گھومتا پھرتا نہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ سفید مکان دی پوائنٹ پر واقع ہے۔

"مجھے اس کا نمبر نہیں معلوم لیکن وہ اس علاقے میں سب سے بڑا مکان ہے۔"

اس مکان کو تلاش کرنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ فالکو خود کبھی وہاں نہیں گیا تھا اور صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ وہ ایک بڑا سفید مکان ہے۔ لوگ ان مکانوں کو فیملی کے ناموں سے جانتے تھے اور سب کو معلوم تھا کہ ملبورن ہاؤس نک جینوویس نے خرید لیا ہے اور اب یہ جینوویس ہاؤس کہلاتا ہے۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟" نائر نے مکان کے باہر کھڑے ہوکر پوچھا۔

"میں سامنے کے دروازے سے اندر جاؤں گا۔" مورس نے کہا۔ "تم اندر آنے کے لیے دوسرا راستہ تلاش کرو لیکن زیادہ دیر مت لگانا۔"

مورس نے گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا گوکہ اندر روشنی ہو رہی تھی لیکن کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑھے ہوئے شیو والا شخص ہاتھ میں گن لیے برآمد ہوا۔ مورس کو بعد میں اس کا نام معلوم ہوا۔ وہ رسل تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں نک سے ملنے آیا ہوں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے؟"

"نہیں، تم مسٹر نک کو بتادو۔"

اتنی دیر میں نک خود ہی ڈیوڑھی میں آگیا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میرے پاس کچھ معلومات ہیں جو تم جاننا چاہو گے۔"

’’تمہیں یہاں کا پتا کس نے بتایا؟‘‘
’’فالکو نے۔‘‘ مورس نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔
’’وہ کیا معلومات ہیں جو تم سمجھتے ہو کہ مجھے ان کی ضرورت ہوگی؟‘‘
مورس نے اسے جلدی جلدی بتانا شروع کیا کہ کس طرح کمشنر کے آدمی نے ایمبولینس گاڑیاں حاصل کیں جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس سے نک کو اپنی تحقیقات میں مدد ملے گی۔
نک کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ’’مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم دل سے میرے لیے کام کر رہے ہو لیکن یہ ضروری نہیں تھا۔‘‘
وہ چلتا ہوا مورس کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے پہلے ہی اس بارے میں معلوم ہو چکا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کمشنر آج رات میرا مہمان ہے۔‘‘
وہ چلتے ہوئے لیونگ روم آگئے جہاں کمشنر ایک کاؤچ پر بیٹھا ہوا کافی مضطرب نظر آرہا تھا۔
’’تم کوئی مشروب لینا پسند کرو گے مورس؟‘‘ نک نے کہا۔ ’’کمشنر اور میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے کچھ ذاتی مقاصد ہیں جن کا ہر شخص کو حق ہے۔‘‘
’’مسٹر نک، میں وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔‘‘ کمشنر نے بیچ میں بولنا چاہا۔
’’میں بات کر رہا ہوں۔‘‘ نک نے مداخلت کی۔ ’’اور بدتہذیبی برداشت نہیں کرتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ کمشنر کے آدمی ویئر ہاؤس میں ممنوعہ اشیا تلاش کر رہے تھے کہ انہیں یہ سامان ملا جو میرے ایک کزن نے اٹلی سے بھیجا تھا۔‘‘
مورس نے کمشنر کو غور سے دیکھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کی ٹائی ڈھیلی ہو چکی تھی۔ دائیں آنکھ کے نیچے ایک زخم تھا۔ اور ناک کے نیچے خون جما ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے بہہ رہے تھے۔
’’یہ بڑے شرم کی بات ہے اگر ہم اپنے سرکاری ملازمین پر بھروسا نہ کر سکیں۔‘‘
نک کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مورس کو پریشان کر دیا۔ معاملہ کچھ گڑبڑ لگ رہا تھا۔ وہ وہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا کہ اچانک ہی نک نے اسے اپنی طرف کھینچا اور اس کے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔
’’یہ کیا حرکت ہے؟‘‘ مورس نے چلاتے ہوئے کہا۔
’’تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟‘‘ اس کے ساتھ ہی دو زوردار دھماکے ہوئے اور مورس زمین پر گر گیا جبکہ کمشنر دھڑام سے ایک جانب گرا۔ اس کا سر وقفے وقفے سے جھٹکے لے رہا تھا۔
’’میں نے تمہاری گن استعمال کی۔ تم نے برا تو نہیں منایا؟‘‘ نک نے مورس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
’’گن نیچے پھینک دو اور پیچھے ہٹ جاؤ۔‘‘ نائر کی آواز کمرے میں گونجی۔
رسل نے آواز کی سمت میں نشانہ لیا گو کہ وہ اپنی جگہ سے نائر کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ عین اسی وقت مورس نے لیٹے لیٹے کروٹ لی اور اپنے ٹخنے میں بندھے ہولسٹر سے پستول نکال کر رسل کو گولی ماردی پھر وہ تیزی سے نک کی جانب مڑا جو دروازے کے پاس پڑے ہوئے نائر کو دیکھ رہا تھا۔
’’میرا خیال ہے کہ اب میں اور تم ہی باقی رہ گئے ہیں۔‘‘
’’لگتا یہی ہے۔‘‘ نک نے جواب دیا۔
’’اب ہمیں کیا کرنا ہے؟‘‘ مورس نے پوچھا۔
نک ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ ’’تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے مورس۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم دوست ہیں لیکن یہ سب کیا ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ میں نوآموز ہوں۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تمہارے کلیسا کے دوست کے بارے میں جانتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ سے شک تھا کہ نائر اس تصویر کی تلاش میں ہے اور جب پولیس کو اس کے آدمی کی لاش ملی تو مجھے پکا یقین ہو گیا پھر جب تم نے معلومات حاصل کرنا شروع کیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ نائر نے وہ تصویر چوری نہیں کی لیکن جس شخص نے نائر کے آدمی کو قتل کیا، وہی چور بھی تھا اور وہ ہے ہمارا پولیس کمشنر۔ اس کے لوگوں نے میرا خزانہ تلاش کیا اور وہ اسے دوسرے ویئر ہاؤس میں لے گئے وہاں وہ اس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک وہ اسے کسی دوسری جگہ منتقل نہیں کر دیتے۔ کمشنر کے آدمیوں نے نائر کے بندے کو قتل کیا اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے آگ لگا دی تاکہ وہ اس کی آڑ میں میری چیزیں کسی محفوظ جگہ لے جا سکیں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں نے تمہارے اکیلے آنے کا یقین کر لیا تھا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ میں کبھی حیران نہیں ہوتا۔ اسے بتاؤ چارلس۔‘‘
مورس کا پورا جسم اکڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نک فریب نہیں دے رہا۔ اسے اپنے عقب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر ایک ہاتھ آگے بڑھا اور اس کی کلائی پکڑ لی۔
’’تم یہاں کیا کر رہے ہو چارلس؟‘‘ وہ بمشکل پوچھ پایا۔
’’بُرا آدمی جو ہوں۔‘‘ اس نے کہا اور فرش پر گرا ہوا

موسم بہار کے شگفتہ سلسلوں سے سجا ماہ مارچ 2018ء کا دل خوش کن شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے قسط وار ناول اہم دوراہے پر

محبت لفظ ہے لیکن ... حیا بخاری کی خوب صورت تحریر

عطیہ ہدایت اللہ، عقیلہ حق، اسما قادری کی خصوصی دلکش کہانیاں

نامور مصنفہ، شاعرہ اور
براڈ کاسٹر غزالہ رشید کی بزم
میں دل پزیرآمد

خوب صورت موڑ ... آصفہ ضیا کا مکمل ناول

اس کے علاوہ

افسر سلطانہ، عاصمہ عزیز، طیبہ عنصر، تہمینہ چوہدری،
تحسین اختر، دانیہ آفرین، پروین عذرا تشنہ ودیگر ماہر قلم کاروں کی متاثر کن تحریریں

شائستہ زریں کا خصوصی سروے ماہِ مارچ میں یومِ خواتین کے موقع پر

اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ مستقل سلسلے، رنگارنگ تراشے، دل موہ لینے والی شاعری، آزمودہ ترکیبیں اور بہت کچھ.....

پستول اٹھا کر نک کو دے دیا۔

اس وقت اس شخص میں چارلین کی کوئی جھلک نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے درزی کے ہاتھ کا سلا ہوا سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔

"چارلس کو اپنی شخصیت تبدیل کرنے میں کمال حاصل ہے اور میں اسے ایک قیمتی اثاثہ بھی سمجھتا ہوں۔ کمشنر میرے پاس شہر میں ہونے والی جرائم کی سرگرمیوں کے بارے میں مشورہ کرنے آیا تھا۔ تم اور تمہارا دوست اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آئے اور اسے مار دیا۔ بے چارہ رسل کمشنر کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا جب تم نے اسے قتل کیا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین منظرنامہ ہے۔ اس کے علاوہ ہاؤس کیپر بھی اس واقعے کی چشم دید گواہ ہے۔" اس نے چارلس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

"یہ سب میری غیر موجودگی میں ہوا، میں اپنے دوستوں کے ساتھ مین ہٹن کے اپارٹمنٹ میں تھا اس کے علاوہ یہاں چارلس کے سوا کوئی زندہ نہیں بچا جو گواہی دے سکے۔"

نک کی من گھڑت کہانی سن کر بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو کسی سے اپنی زندگی کی بھیک مانگیں۔ ویسے بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس نے نک پر نظریں گاڑ دیں.... اور اس کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا۔

"کیا تم اسے بھی مار دو گے؟" چارلس نے پوچھا۔

"نہیں، یہ کام تم کرو گے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک گن چارلس کو پکڑا دی۔

پھر موریس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ چارلس نے بائیں ہاتھ سے نک کے بال پکڑ کر اس کے سر کو پیچھے کی جانب جھٹکا دیا۔ نک کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور اس نے فائر کر دیا۔ چارلس نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور نک بل کھا کر کھانسنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر گن کا رخ چارلس کی طرف کیا لیکن اس بار گولی اس کی کلائی کو چھوتی ہوئی اس کی گردن میں لگی۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر فرش پر گر گئی اور اس کی گردن سے خون بہنے لگا۔ وہ آگے کی طرف لڑکھڑایا اور اس کے ہاتھ سے دوسری گن بھی گر گئی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے خون روکنے کی کوشش کی لیکن ٹھوکر کھا کر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

"چپ میں بہت طاقت ہے۔" چارلس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن موریس میرا دوست ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بہتر ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔ اس کے حمایتی یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"ہے۔" ایک غیر متوقع آواز نے انہیں ڈرا دیا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں زندہ ہوں۔"

"ٹائر۔" موریس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کہاں چوٹ لگی ہے؟ کیا تم چل سکتے ہو؟"

"ہاں لیکن میں وہ چیز لیے بغیر نہیں جاؤں گا جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔"

اس مکان کے عقب میں ایک مہمان خانہ تھا جس کے گیراج میں دو ایمبولینس گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ نک اور رسل نے کمشنر کو چوری شدہ مال سے دستبردار ہونے پر آمادہ کر لیا تھا۔ طاقت کے زعم میں انسان عجیب قسم کی حماقتیں کرتا ہے۔ کمشنر کی موت تو اسی وقت واقع ہو گئی تھی جب اس نے اپنے آدمیوں کو نک کی چیزیں چرانے کے لیے کہا۔ انہوں نے وہاں اپنی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا اور مکان سے چلے گئے جبکہ وہ تصویر جائز حق داروں کو مل گئی۔

چند روز بعد چارلس کی سالگرہ تھی۔ موریس، اسٹارلا اور بوبی سمیت سب دوست ڈالٹن میں جمع تھے۔ چارلس اب دوبارہ چارلین بن گئی تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اس موقع پر بوبی نے اسے ایک چھوٹا سا بکس تحفے میں دیا۔ ٹائر کا بایاں بازو پٹی میں جھول رہا تھا۔

اس نے ایک لفافہ موریس کو دیتے ہوئے کہا۔ "اس مشن میں شامل میرے دوستوں کی طرف سے اظہارِ تشکر کے طور پر نذرانہ پیشِ خدمت ہے۔"

موریس نے لفافہ کھولے بغیر اسے جیب میں رکھ لیا۔ تاہم اس کے وزن سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اس کی توقع سے بہت زیادہ ہے۔

بوبی نے حسبِ عادت چارلس پر طنز کیا تو اس نے شکایتی انداز میں موریس سے کہا۔ "اسے سمجھا لو ورنہ میں اسے کاٹ کر رکھ دوں گی۔"

"چارلس ٹھیک کہہ رہا ہے۔" موریس نے کہا۔ "بے شک اس نے عورت کا روپ دھار لیا ہے لیکن اندر سے وہ پورا مرد ہے بلکہ میں تو اسے ہیرو سمجھوں گا۔"

چارلس نے اشارے سے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور ویٹر کو مشروب کا آرڈر دیتے ہوئے بولا۔ "پارٹی تو اب شروع ہوئی ہے دوستو۔"

صلاحیتوں کے باوجود ناکامیاں ہی انسان کا مقدار ٹھہر جاتی ہیں... اس میں اس کی غربت کا دخل ہوتا ہے... بدقسمتی کا یا پھر دوسروں کے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے لالچ اور کینہ پروری کا... ایک ایسے ہی کھلاڑی کو پیش آنے والے حادثات... جنھوں نے اس کی زندگی کو تہ و بالا کر دیا...

کرکٹ کے کھلاڑیوں کے بیان...... ذہانت وخیانت کے وجدان

بڑا کھلاڑی

اعتزاز سلیم وصلی

اس شام ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کی نظر سامنے لگے ٹی وی پر جمی ہوئی تھی۔ لوگ سانس روکے میچ دیکھ رہے تھے۔ ویٹر میرے سامنے آ کر رکا۔

"جی سر کیا چاہیے؟" میں نے زبردست قسم کے کھانے کا آرڈر کیا اور دوبارہ میچ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پاکستان میں ہونے والے اس ڈومیسٹک ٹورنامنٹ کی کوریج ملک کا مشہور ترین اسپورٹس چینل کر رہا تھا۔ سب کی نگاہیں عالیان احمد پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی بیٹنگ دیکھ کر کرکٹ کے فینز اسے

مستقبل کا چمن ٹنڈولکر کہتے تھے۔ اس کے کھیلنے کا اسٹائل بالکل ٹنڈولکر جیسا تھا۔ بیس منٹ کی بریک کے بعد عالیان اور اس کا ساتھی اوپنر کریز پر آئے۔ میں اسے دیکھ کر مسکرایا۔ پہلے اوور کی پانچویں گیند کرنے کے لیے جیسے ہی باؤلر دوڑا، میری سانس اٹکنے لگی۔ فل لینتھ ڈلیوری تھوڑی سی سوئنگ ہوکر دائیں ہاتھ کے بیٹسمین عالیان کی مڈل اسٹمپ لے اُڑی۔ عالیان نے بہت کمزور انداز میں دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہنے کو تو یہ کھیل کا حصہ تھا۔ اچھے کھلاڑی بھی کبھی جلدی وکٹ گنوا بیٹھتے ہیں مگر......

اس دوران میں ایک طرف سے آواز آئی۔ ”یار اتنا بڑا کھلاڑی ہوکر اتنی کمزور شاٹ کھیلی ہے۔“

”خیر ہے ضروری نہیں ہر میچ میں سنچری اسکور کرے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ہاں بال بھی اچھی تھی۔“ پہلے والے نے کہا۔ ”ہاں اب ٹیم کا جیتنا مشکل ہے عالیان جیسے بڑے کھلاڑی کی وکٹ جلدی گرگئی اب ٹیم مشکل میں پڑ سکتی ہے۔“ دونوں کا تبصرہ جاری تھا مگر میرے ذہن میں بس دو الفاظ گونج رہے تھے۔

”بڑا کھلاڑی، بڑا کھلاڑی۔“

ہاں بیشک تھا وہ بہت بڑا کھلاڑی تھا کرکٹ کا بھی اور......

☆☆☆

کرکٹ کھیلنا میرا بچپن کا جنون تھا۔ ابو کی وفات کے بعد امی اور میں اکیلے رہ گئے۔ ابو کے رشتے داروں نے اُن کے جانے کے بعد کبھی ہماری خبر نہ لی۔ امی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں اس لیے نانا نانی کی وفات کے بعد ان کا میکا بالکل ختم ہوگیا۔ ابو گورنمنٹ کے ایک محکمے میں کلرک تھے۔ ان کی وفات کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے ملنے والی معمولی پنشن سے ہمارا گزارہ بمشکل ہوتا تھا۔ امی نے ابو کے چالیسویں کے بعد سلائی والی مشین لے لی اور محلے میں ورژن کے نام سے مشہور ہوگئیں۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنوں مگر میرا جنون کرکٹر بننا تھا۔ ہائی اسکول کی کرکٹ ٹیم میں بطور کپتان میری سلیکشن ہوئی حالانکہ میں تب ساتویں کا طالب علم تھا مگر میرے جنون اور محنت نے کھیل میں نکھار پیدا کر دیا۔ انہی دنوں ہمارے اسکول میں پولیس انسپکٹر علی احمد کے بیٹے عالیان احمد کی اینٹری ہوئی۔ مغرور اور بدمزاج عالیان بھی اسکول کا بہترین کرکٹر تھا۔ اس نے ٹرائل دیا اور اسکول کی ٹیم میں شامل ہوگیا۔ اتفاق سے اسے ہمارے محلے کے کسی لڑکے نے بتا دیا کہ میں ورژن کا بیٹا ہوں، وہ بڑی حقارت سے کہتا۔ ”میں اس ورژن کے بیٹے کی کپتانی میں نہیں کھیلوں گا۔“ مگر کوچ نے مجھے کپتان برقرار رکھا۔ میرا دھیان پڑھائی سے زیادہ کرکٹ پر تھا۔ قدرتی طور پر میں ذہین تھا لیکن میری تمام تر ذہانت کرکٹ پر مرکوز تھی۔ اسی لیے پڑھائی میں بس اوسط نمبر لے کر پاس ہوتا تھا۔ انہی دنوں عالیان احمد کے والد نے اپنے کسی دوست سے کہہ کر پرنسپل پر دباؤ ڈالا اور مجھے کپتانی سے ہٹوا دیا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا عالیان کتنا کینہ صفت ہے۔ خیر مجھے تو بس کرکٹ کھیلنا تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے وہ دن جب علاقائی سطح پر ہونے والے ہائی اسکولز کے مقابلوں میں ہماری کرکٹ ٹیم نے فائنل تک رسائی حاصل کی۔ فائنل میں دوسرے اسکول کی ٹیم نے مقررہ سولہ اوورز میں ایک سو اسی رنز کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ پچ آسان اور سلو تھی۔ ہماری طرف سے میں اور عالیان اوپنر آئے۔ عالیان اس ٹورنامنٹ میں مسلسل آؤٹ آف فارم تھا۔ آسان پچ دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی۔ پہلے اوور میں اس نے چار چوکے لگائے۔ پانچویں اور چھٹی گیند پر ایل بی ڈبلیو کی اپیل ہوئی مگر وہ بچ گیا۔ اگلے چند اوور میں مجھے اندازہ ہوا عالیان کو بال کی ٹائمنگ میں مشکل ہو رہی ہے۔ دوسری طرف سے میں نے گیند بازوں کی دھلائی شروع کر دی۔ پہلے چھ اوورز میں ہماری ٹیم کا اسکور نوّے تھا جس میں میرے اکیاون رنز شامل تھے۔ اگلے اوور کی پہلی گیند پر عالیان نے ایک فیلڈر کے بالکل سامنے شاٹ کھیل کر دوڑنا شروع کر دیا۔ کسی طرح سے بھی رن کا مکمل ہونا ممکن نہ تھا۔ اگر میں نہ دوڑتا تو عالیان کا رن آؤٹ ہونا یقینی تھا مگر میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ میں کریز سے کافی دور ہی تھا جب وکٹ کیپر نے وکٹیں اڑا دیں۔ میں آؤٹ ہو چکا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، عالیان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ شاید اس کی انا یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ ایک ورژن کا لڑکا اس سے زیادہ رنز بنا کر کامیاب کرا دے۔ اس میچ کے اختتام پر عالیان نے اسّی رنز اسکور کیے اور مین آف دی میچ بنا۔ میری پرفارمنس کی بھی کافی تعریف ہوئی۔

ہائی اسکول پاس کر کے مجھے کرکٹ کی بنیاد پر شہر کے بہترین کالج میں اعزازی طور پر داخلہ مل گیا۔ اس اسپورٹس اسکالرشپ کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اتفاق سے عالیان کسی اور کالج میں چلا گیا تھا۔ امی نے کبھی مجھے کرکٹ کھیلنے سے

نہیں روکا تھا۔ وہ بس مجھے بڑا آدمی بنا دیکھنا چاہتی تھیں۔ میں نے کالج کے دو سالوں میں بہترین کوچز کی موجودگی میں اپنا شوق خوب پورا کیا۔ ایف اے اوسط نمبروں سے پاس کرتے ہی ایک کرکٹ کلب میں میری سلیکشن ہوگئی۔ جب میں نے مختلف کالجز سے آئے منتخب ہونے والے لڑکوں کے نام پڑھے تو میرے نام کے عین نیچے عالیان احمد کا نام تھا۔ ایک بار پھر کپتانی میرے حصے میں آئی۔ اس بار عالیان کی کوئی سفارش کام نہ آئی۔ کلب کرکٹ کھیلتے ہوئے ہمیں ایک سال ہی گزرا تھا کہ پاکستان میں ہونے والے ڈومیسٹک کرکٹ ٹورنامنٹ کے لیے نئے کھلاڑیوں کی سلیکشن کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ سلیکشن کمیٹی اتوار کو ہمارے کلب آئی۔ بلّے بازوں کے ٹرائلز ہوئے اور انہوں نے پورے کلب میں بس مجھے اور دوسرے نمبر پر کھیلنے والے بائیں ہاتھ کے بلے باز ذیشان کا انتخاب کیا۔ عالیان کو ویٹنگ لسٹ میں جگہ ملی۔ جب یہ اعلان ہوا تو اس کے چہرے پر میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ امی نے مجھے اس خوشی میں جمع کیے گئے پیسوں سے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیک خرید کر دی تھی۔ میرے منتخب ہونے پر پورا محلہ بہت خوش تھا کیونکہ اس ڈومیسٹک ٹورنامنٹ سے پاکستان انٹرنیشنل ٹیم کے لیے بہت سے لڑکے منتخب ہونے تھے۔

☆☆☆

میرے سامنے رکھی ٹیبل پر ویٹر نے ہلکے سے ہاتھ مارا۔ میں چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا اور ماضی کی یادوں سے یکدم باہر آگیا۔

”سر یہ بل؟“ اس نے میرے سامنے بل رکھا۔ میں نے جلدی سے بل ادا کیا اور ٹی وی کی جانب دیکھا۔ عالیان کی ٹیم کی وکٹیں لگاتار گر رہی تھی۔

”کیوں کیا ایسا تم نے عالیان احمد؟“ میں بڑبڑایا۔

”مجھ سے کچھ کہا سر؟“ ویٹر نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور پانچ سو کا نوٹ بطور ٹپ نکال کر اسے دیا۔

”تھینکس سر۔“ وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔

میری نظروں کے سامنے پانچویں بال پر عالیان کا آؤٹ ہونا گردش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا میری الجھن کا حل صرف ایک شخص کے پاس تھا۔ وہ عالیان تھا۔ ہاں مجھے اس سے ملنا تھا۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچا۔ امی کی وفات کے بعد بھی یہ گھر میں نے نہیں بدلا تھا۔ میں چاہتا تو کسی بھی اچھی جگہ پر ایک فلیٹ خرید سکتا تھا مگر میں یادوں کے سہارے یہاں رہنا چاہتا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ یہ تین دن سے اسی جگہ اور اسی حالت میں پڑا تھا۔ بیگ کندھے سے لٹکا کر میں باہر آیا۔ شہر جانے والی بس پر سوار ہوا۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگائی اور ایک بار پھر ماضی کی یادوں میں گم ہوگیا۔

☆☆☆

وہ شام میری زندگی کی سیاہ ترین شام تھی۔ نئی بائیک لے کر میں دوستوں کی طرف نکل گیا تھا۔ واپسی پر محلے میں داخل ہونے والی سڑک سے ابھی مڑ رہا تھا کہ سامنے سے آنے والی کار نے فل اسپیڈ سے میری بائیک کو ٹکر ماری۔ اس کار کو میں بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ عالیان کے رشوت خور باپ انسپکٹر دلاور کی کار تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عالیان بیٹھا تھا۔ بائیک سے گرنے کے بعد میں بے ہوش ہوگیا۔ محلے والوں نے بعد میں بتایا کہ میں خون سے لت پت تھا۔ میرا زندہ بچ جانا ایک معجزہ تھا مگر ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر میری ماں کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ دو ماہ بعد جب میں اسپتال سے گھر آیا تو میری دنیا اجڑ چکی تھی۔ تعزیت کرنے والے آتے اور میں چپ چاپ ان کا منہ تکتا رہتا۔ کہنے کو بچا ہی کیا تھا۔ میری ماں جس نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا جس نے میرے لاڈ اٹھائے تھے، مجھ سے بچھڑ چکی تھی۔ ایک دن ذیشان نے آ کر بتایا کہ سٹی ٹیم نے کیمپ لگایا ہے جس میں وہ اور عالیان کھیلنے جا رہے تھے۔ عالیان کے خلاف میری نفرت انتہا کو پہنچ چکی تھی مگر میں بے بس تھا۔ اگلے ایک سال میں، میں نے کچھ نہیں کیا بس گھر میں پڑا رہتا۔ کرکٹ کے نام سے مجھے نفرت ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی عالیان کے بارے میں خبریں میری نظر سے گزرتی تھیں۔ اس نے اپنا نام بنا لیا تھا۔ سٹی ٹیم کی کپتانی اسے سونپ دی گئی تھی۔ پڑوس میں رہنے والی آنٹی شاہینہ اور اس کی بیٹی شاہین نے گھر کا سارا انتظام ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ ابو کی پنشن اور امی کی جمع پونجی کے علاوہ کلب کی طرف سے ملنے والے پیسے میری ضرورت سے زیادہ تھے۔

میرا دل کچھ بھی کرنے کو نہیں کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ شاہین اور آنٹی شاہینہ کے سہارے میں سنبھلنے لگا۔ اس حادثے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

میں کسی قسم کی جاب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن بس منفی انداز میں سوچتا تھا۔ میرا دل چاہتا کہ میں اس خود غرض معاشرے کو نقصان پہنچاؤں۔ جو ذہنیت کبھی کرکٹ میں

استعمال کرتا تھا میں اب وہی ذہنیت منفی انداز میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں اکثر محلے سے شہر آکر لوگوں کے درمیان گم رہتا۔ کچھ نہ کچھ کرنے کا سوچتا رہتا۔

وہ بھی ایسا ہی دن تھا جب میں یونہی ایک بلڈنگ کے باہر بینچ پر بیٹھا اردگرد کے ماحول پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک ایک لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ میں نے اس جانب دیکھا۔ ایک اسپورٹس کار کے پاس کھڑی لڑکی کو نامعلوم شخص ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔

میں دوڑ کر لڑکی کے پاس پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑوا دیا۔ اجنبی لڑکھڑا کر گرا۔ ابھی میں اس کی مزید مرمت کرنا چاہتا تھا کہ اچانک وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ چاقو کا خطرناک وار میرے بائیں کندھے میں آگ لگا گیا۔ ساتھ ہی میرا ذہن گھوم گیا۔ میں نے اس کے سینے پر زوردار لات رسید کی۔ وہ پیچھے گرا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا میں اس کے اوپر جا پڑا، اسے بے دریغ مارنے لگا۔ اسی دوران میں وہ لڑکی مجھے اس کے اوپر سے ہٹانے لگی۔ دو تین منٹ زبردست مار کھانے کے بعد اچانک اس نے مجھے دھکا دیا اور اٹھ کر گولی کی رفتار سے ایک جانب دوڑ لگا دی۔ میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی نے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

''آپ کا کندھا زخمی ہے پلیز۔'' اس نے التجا کی۔ میں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا اور کپڑے جھاڑ کر دوسری جانب جانے لگا۔

''سنیے آپ زخمی ہیں میرے ساتھ آئیں، میں آپ کی بینڈیج کرتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ میں رسماً بھی انکار نہیں کر سکا۔ پہلی بار میں نے اسے غور سے دیکھا۔ نازک گلابی ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں، سفید رنگت اور خوبصورت جسم کی مالک اس لڑکی کو اگر حسین ترین کہا جاتا تو کچھ غلط نہ تھا۔

اس نے اپنی اسپورٹس کار بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی کی اور تیز تیز قدم اٹھاتی میری جانب آئی۔ لفٹ کے ذریعے اوپر تیسری منزل تک جاتے وقت اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔

''میرا نام شازیہ ہے...... میرے ڈیڈی ملک کے مشہور بزنس مین ہیں ویسے تو ہم اسلام آباد میں رہتے ہیں مگر میں یہاں ایم بی بی ایس کر رہی ہوں اور اس بلڈنگ میں میرا فلیٹ ہے۔'' اس نے کہا پھر گہری سانس لے کر بات مکمل کی۔ ''جس شخص کو آپ نے مارا ہے یہ دو تین ہفتوں سے مجھے تنگ کر رہا تھا اور آج تو اس نے حد...... کر دی۔ بلڈنگ کا سکیورٹی گارڈ اس سے ڈرتا ہے شاید کوئی بدمعاش ٹائپ بندہ ہے پر چلو خیر ہے آج آپ نے اچھا سبق سکھایا اسے۔'' اس نے میری جانب تشکرانہ انداز میں دیکھا۔ میں نے بس مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ''اپنے بارے میں آپ کچھ بتانا پسند کریں گے مسٹر خاموش۔'' آخری الفاظ بول کر اس نے شرارتی نظروں سے مجھے گھورا۔

''میں مبین احمد ہوں۔ شہر سے تھوڑی دور ایک محلے میں رہتا ہوں۔ پہلے کلب کرکٹر تھا اب فری ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کرکٹر...... گڈ۔'' وہ بولی۔ اسی دوران اس کا فلیٹ آگیا۔

خوبصورتی سے سجا یہ فلیٹ اس کی نفاست پسند طبیعت کا گواہ تھا۔ مجھے ایک صوفے پر بٹھا کر وہ اندر چلی گئی۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ اس نے زبردستی میری شرٹ اتار کر زخم گرم پانی سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ میری جسامت دیکھ کر اس کی نظروں میں پسندیدگی کے جذبات اُبھرے تھے۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں مگر یہ سچ تھا کہ میرا جسم بہت مضبوط تھا۔ زیادہ تر وقت کرکٹ کھیلتے میں گزرا تھا شاید اسی لیے میری جسامت پروفیشنل اسپورٹس مین جیسی تھی۔ چہرے کے نقوش مناسب تھے۔ مجموعی طور پر میں پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ شازیہ نے دلجمعی سے میرا زخم صاف کر کے بینڈیج کر دی۔ میں نے شرٹ پہننا چاہی مگر اس نے منع کر دیا۔ ''ابھی رکو آدھا گھنٹا اسے کھلا چھوڑ دو۔''

کچھ دیر بعد وہ کافی بنا کر لائی۔ اکتوبر کی شام میں ہلکی سردی کا احساس مزہ دے رہا تھا۔ اسی دوران اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں چپ چاپ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ تابڑتوڑ برسنے والی بارش نے ہر چیز کو بھگو کر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے شازیہ سے جانے کی اجازت مانگی مگر اس نے ضد کر کے ڈنر پر روک لیا۔ کچھ موسم کا اثر اور کچھ اس کی شخصیت کا، میرا دل بھی جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے قریبی ریسٹورنٹ کال کر کے کھانا آرڈر کیا اور ہم گپیں لڑانے لگے۔ اسے کرکٹ سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے بتایا۔ ''میرا ایک بہت اچھا دوست بھی کرکٹر ہے۔'' کرکٹ کے ٹاپک سے میری بیزاری دیکھ کر اس نے ٹاپک بدل دیا۔ اچانک وہ بولی۔

''آپ کا شکریہ تو ادا نہیں کیا۔'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''کس لیے؟'' وہ ہنسی۔

''ارے آپ نے میری جان اس غنڈے سے چھڑوائی آپ نہ ہوتے تو پتا نہیں میرے ساتھ وہ کیا کرتا۔''

''اچھا چلو اب کہہ دیں شکریہ۔'' میں نے شوخی سے کہا۔

''ہم کس طرح بولوں۔'' اس نے ایک ادا سے کہا۔ ہم خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔ اچانک وہ اٹھی اور میرے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ میرے زخمی کاندھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''شکریہ مبین۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ اگلے کچھ لمحے بہت خوشگوار تھے۔

دروازے پر ہونے والی دستک سن کر وہ چونک گئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ہوٹل کا لڑکا کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے ٹیبل پر کھانا لگایا۔ ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھا کر میں نے اس سے جانے کی اجازت مانگی۔ اس نے اُداسی سے کہا۔

''میرا دل نہیں کر رہا اور موسم بھی خراب ہے، نہ جاؤ مبین۔''

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''ہمیں ملے صرف دو گھنٹے ہوئے ہیں اور تم ایک اجنبی کو فلیٹ پر رکنے کا کہہ رہی ہو؟''

''کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے برسوں ملاقاتیں ہوتی ہیں مگر دل کے لیے وہ اجنبی ہی رہتے ہیں اور کچھ لوگ صرف چند منٹوں میں دل اپنا بنا لیتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''اچھا فلسفہ ہے۔ اب اجازت ہے؟'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔

''نہیں۔'' اور ساتھ ہی میرے قریب آگئی۔ میں جانتا تھا اگلے کچھ لمحات میں کیا ہونے والا ہے۔ وہ رات بہت حسین تھی۔ موسم کی شرارتیں بھی جاری تھیں اور وہ میرے ساتھ تھی۔

☆☆☆

بس شہر کے اسٹاپ پر رکی۔ میں بس سے اُتر کر اس ہوٹل کی طرف بڑھا جہاں ٹیم ٹھہری ہوئی تھی۔ مجھے بہت کم امید تھی کہ عالیان سے ملاقات ہو پائے گی۔ ہوٹل کے گیٹ سے اینٹر ہوتے ہی سکیورٹی گارڈ نے مجھے روک لیا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس نے مجھے ''سکیورٹی پرابلم'' کہہ کر ہوٹل میں نہ داخل ہونے دیا۔ میں گیٹ پر ہی کھڑا تھا کہ باہر سے ایک بہت خوبصورت بس میں عالیان احمد اور دیگر کھلاڑیوں کی اینٹری ہوئی۔ وہ اسٹیڈیم سے واپس آرہے تھے۔ اتفاق سے عالیان نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ بس سے اترتے ہی میری جانب بڑھا۔ ''مجھے پتا تھا آج یا کل درزن کے بیٹے سے ضرور ملاقات ہوگی۔'' اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح طنزیہ تھا۔

''یاد نہیں، کچھ دن پہلے درزن کے بیٹے نے ہی تمہیں بچایا تھا۔'' میں نے اپنے اندر اٹھنے والے ابال کو مشکل سے کنٹرول کیا۔

''درزن کے بیٹے نے بچایا نہیں بس میرا ریٹ کچھ بڑھا دیا۔'' وہ مسکرایا۔

''مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''کل شام گراؤنڈ میں آجانا، پریکٹس کے بعد ملیں گے سب سوالوں کا جواب دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ مجھے پتا تھا، ضرور ملے گا۔ میں نے اس ہوٹل کے قریب ہی ایک دوسرے ہوٹل میں کمرا بک کروایا۔ کمرے میں جاتے وقت میرے دماغ میں شازیہ سے ہونے والی آخری ملاقات کے مناظر گھوم رہے تھے۔

☆☆☆

شازیہ سے ہونے والی پہلی ملاقات کے بعد اب ہم اکثر ملنے لگے تھے۔ ہفتے میں دو تین راتیں وہ میرے نام کرتی تھی۔ آنٹی شاہینہ اور شاہین خوش تھیں کہ میں سنبھلنے لگا ہوں۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ میں شہر جا کر کیا کرتا ہوں۔

اس رات بھی شازیہ نے مجھے کال کر کے بلایا تھا۔ ہم ایک دوسرے میں گم تھے کہ اچانک فلیٹ کے دروازے پر کسی نے زور زور سے دستک دی۔

شازیہ چونک کر مجھ سے الگ ہو گئی۔ ''اس وقت کون آگیا؟'' وہ بڑبڑائی۔ اس نے حلیہ درست کیا اور دروازے کی طرف جانے لگی۔ میں بیڈ پر ہی لیٹا باہر کی آوازوں پر کان جمائے بیٹھا تھا۔ دو منٹ بعد شازیہ کی آمد ہوئی، اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔

''مبین جی...... جلدی سے اٹھو۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا ہوا؟''

''عالیان آیا ہے۔'' اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کون عالیان؟'' میں نے پوچھا۔

"عالیان احمر سٹی ٹیم کا کیپٹن میرا بوائے فرینڈ۔"

مجھے ایسا لگا جیسے فلیٹ کی چھت مجھ پر آن گری ہو۔ میں جلدی سے کھڑا ہوا۔ اس نے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا، میں وہاں چلا گیا۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ قسمت ہمیں ایک بار پھر آمنے سامنے لے آئی تھی۔

شازیہ نے دروازہ کھولا۔ مجھے وہ منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ عالیان لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ اس نے شرابیوں جیسے انداز میں ہاتھ نچا کر کہا۔ "کہاں تھیں تم اتنی دیر سے میں باہر کھڑا ہوں۔"

"میں سو رہی تھی۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"تم جیسی لڑکیاں اتنی جلدی نہیں سوتیں۔" اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلا۔ میں حیرت کے سمندر میں گم تھا۔ شازیہ چپ چاپ گالیاں برداشت کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ وہ عالیان کو سہارا دے کر بیڈ روم کی جانب لے جا رہی تھی۔ عالیان نے اسے دروازہ بند کرنے کا وقت ہی نہ دیا۔ اس نے شازیہ کو بانہوں میں بھر لیا اور بیڈ روم کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی انہیں بیڈ روم میں گئے دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ فلیٹ کے کھلے دروازے سے دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پسٹل چمک رہا تھا۔ وہ دونوں محتاط انداز میں عالیان اور شازیہ کے بیڈ روم کی جانب بڑھے۔ میں بھی خاموشی سے ان کے پیچھے گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن گراؤنڈ میں مجھے عالیان سے ملنے کے لیے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو اس کی شرٹ پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ آگئی جو مجھے زہر لگتی تھی۔ "ہاں درزن کے بیٹے اب بتا کیا مسئلہ ہے؟" وہ بولا۔

"عالیان تمہیں پتا ہے میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر صرف ایک بات بتا دو میری الجھن سلجھا دو۔" میں نے اصل بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہی نا کہ ان ہکیر سے جان چھوٹنے کے بعد بھی میں پانچویں بال پر آؤٹ کیوں ہوا؟" وہ مسکرایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بیٹا یہ کرکٹ بہت پیسے والی گیم ہے، تیرے سامنے وہ مجھے پچاس لاکھ کہہ رہے تھے اور ساتھ میں ذرا دھمکا رہے تھے پر پتا ہے میچ سے ایک دن پہلے مجھے پورے ڈیڑھ کروڑ کی آفر ہوئی، آؤٹ ہی تو ہونا تھا اور میں ہو گیا۔ انہوں نے کروڑوں کما لیے اور میرا حصہ بھی مل گیا۔" وہ فخریہ انداز میں بولا۔

"تمہیں ڈر نہیں کہ میں یہ باتیں ریکارڈ کر کے کسی کو سنوا دوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، درزن کے بیٹے میں اتنی ہمت ہوتی تو مجھے تب قتل کر دیتا جب میں نے اسے اپنی گاڑی سے اڑایا تھا سنا ہے صدمے سے درزن بھی چل بسی۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

"عالیان ٹھہرو میرے پاس کچھ ہے تمہیں دکھانے کے لیے۔" وہ رک کر میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

☆☆☆

پانچ منٹ بعد عالیان اور شازیہ بیڈ روم میں صوفے پر بے بس سے بیٹھے تھے۔ میں بیڈ روم کے دروازے سے اندر جھانک رہا تھا۔ "عالیان صرف اس میچ میں پانچویں بال پر آؤٹ ہونا ہے پھر اس کے لیے پچاس لاکھ مل رہے ہیں۔" لمبے بالوں والا ایک شخص عالیان سے کہہ رہا تھا۔ دوسرا چپ چاپ ان پر پسٹل تانے کھڑا تھا۔

"نہیں میں کسی صورت فکسنگ نہیں کروں گا۔" عالیان نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا ذرا یہ دیکھو۔" لمبے بالوں والے نے جیب سے موبائل نکال کر دیا۔ اس میں موجود ویڈیو تو میں نہیں دیکھ سکا تھا مگر عالیان کے چہرے کے تاثرات سے بہت کچھ واضح ہو گیا تھا۔

"تم نے جمشید سے جو پیسے لیے تھے اس ڈیل کی ریکارڈنگ ہے یہ اس کے علاوہ اس موبائل میں تیری اس رکھیل کی اور تیری کافی ویڈیوز ہیں جو میڈیا کے لیے مرچ مصالحہ لگا کر دلچسپ اسٹوری بن جائیں گی۔" عالیان نے لبوں پر زبان پھیری۔ "عالیان ہم تمہیں بلیک میل بھی کر سکتے تھے مگر پیسے دے رہے ہیں۔ کیا خیال ہے پھر؟" لمبے بالوں کے ہاتھ میں ایک اور موبائل بھی تھا شاید وہ اس کی ریکارڈنگ کر رہا تھا۔

عالیان مجھے گہری سوچ میں دکھائی دیا۔ اچانک میرے دماغ میں ایک آئیڈیا آیا۔ میں نے دروازے کو ہلکے سے کھٹکھٹایا۔ سب چونک کر میری جانب متوجہ ہوئے۔ میں تیزی سے سائڈ پر ہوا۔ لمبے بالوں والا اٹھ کر باہر آیا۔ ابھی اس نے کمرے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میں نے گل دان سے اس کے سر پر وار کیا۔ آخری لمحات میں اس نے جھکائی دی اور گل دان اس کے کندھے پر لگا۔ تکلیف کی شدت سے وہ چلا اٹھا۔ میں تیزی سے بیڈ روم میں داخل

ہوا۔ دوسرے ساتھی نے تیزی سے پسٹل کا رخ میری جانب کیا ہی تھا کہ عالیان چلاتا ہوا اس پر جا پڑا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر پسٹل اٹھایا ہی تھا کہ اچانک پیچھے سے لمبے بالوں والے نے دھکا دیا۔ میں اور عالیان ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ وہ دونوں باہر کی جانب لپکے۔ ہمارے سنبھلنے تک وہ غائب ہو چکے تھے۔

"تم یہاں؟" عالیان مجھے پہچان کر حیران ہوا۔

"ہاں میں، اس سے پہلے وہ میڈیا کو خبر دیں یا واپس آئیں ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" میں نے کہا۔ ہم تینوں فلیٹ سے باہر آئے۔ لفٹ میں پہنچ کر اچانک میں نے شازیہ سے کہا۔

"میرا بیگ جس میں میرا موبائل اور کپڑے تھے وہ تو وہیں رہ گیا۔" اس نے مجھے فلیٹ کی چابی دی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے فلیٹ کی جانب بڑھا۔

میری واپسی پر شازیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ شاید عالیان نے اس سے میرے بارے میں پوچھا تھا۔ باہر آ کر عالیان اور شازیہ ایک گاڑی میں روانہ ہوئے اور میں بس کے ذریعے واپس گھر پہنچا۔

اگلے دن شازیہ نے مجھے کال کی۔ "سوری مبین میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا..... میں ایک ماڈل گرل تھی فلاپ ہونے کے بعد دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی تھی جب عالیان کا سہارا ملا۔ اس نے مجھے بہت سی آسائشیں دیں مگر وہ جنونی ہے مجھے گالیاں دیتا ہے اور مارتا پیٹتا ہے۔ اس لیے میں تمہاری جانب متوجہ ہوئی، تم واقعی بہت اچھے ہو۔ میں نے عالیان کو ہمارے بارے میں سب بتا دیا ہے اس نے مجھے گالیاں دے کر فلیٹ اور گاڑی وغیرہ سب کچھ چھین لیا ہے، مجھے اپنے پاس بلا لو مبین پلیز۔" میں نے اس کی ساری بات سننے کے بعد کال کاٹ دی۔

☆☆☆

"اب کیا دکھانے کو رہ گیا ہے درزن کے بیٹے... کیا وہ ویڈیوز ہیں جو میری گرل فرینڈ کے ساتھ راتیں گزارتے رہو۔" وہ غصے سے بھرے.... لہجے میں بولا۔

"نہیں۔" میں نے بیگ سے موبائل نکالا۔ یہ لمبے بالوں والے لڑکے کا موبائل تھا جو وہ بھاگتے وقت فلیٹ میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ یہ میں نے تب ہی اٹھا لیا تھا جب عالیان اور شازیہ لفٹ میں تھے اور میں اپنا سامان اٹھانے فلیٹ میں گیا تھا۔ اس ماڈرن موبائل کے بٹن پر ہاتھ لگاتے ہی عالیان کی ویڈیو شو ہونے لگی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔

"بند کرو اسے!" وہ چلایا۔ میں نے مسکراتے ہوئے بند کر دیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل چھیننے کی کوشش کی مگر میں نے ہاتھ پیچھے کیا۔ "نہ نہ عالیان صاحب یہ موبائل چھین کر توڑ بھی دو گے تو یہ ویڈیو میرے فیس بک پیج پر سیو ہیں۔" میں مسکرایا۔ اس نے غصے سے لال ہوتے چہرے کے ساتھ کہا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ زیادہ نہیں بس جو ڈیڑھ کروڑ لے کر پانچویں بال پر آؤٹ ہوئے تھے، اس کا ایک چیک۔" میں نے آرام سے کہا۔

"ناممکن..... نہیں دے سکتا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی مسئلہ نہیں، کوئی بھی میڈیا چینل ان ویڈیوز کے دس پندرہ لاکھ تو دے دے گا۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟" عالیان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"نہیں ایک درزن کے بیٹے میں اتنی ہمت کہاں؟" میرے لہجے میں دکھ تھا۔

"او کے ڈن شام کو چیک لے جانا اور کیا ثبوت ہے کہ تم یہ ویڈیوز ڈیلیٹ کر دو گے۔" اس نے ہار مان لی۔

"یقین رکھنا ہوگا عالیان جی ابھی بازی میرے ہاتھ میں ہے۔" عالیان کے چہرے کے تاثرات مجھے مزہ دے رہے تھے۔ وہ مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔

☆☆☆

اس شام عالیان سے ڈیڑھ کروڑ کا چیک لے کر میں شازیہ کے ساتھ بینک آیا۔ ہم نے چیک کیش کروایا۔ پچاس لاکھ میں نے شازیہ کو دیے۔

"اب تم آزاد ہو۔" بینک سے باہر آتے ہی میں نے کہا۔

"پلیز مبین مجھے خود سے جدا نہ کرو۔" اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"سوری شازیہ۔" میں یہ کہہ کر بس اسٹاپ پر اترا۔ گھر پہنچ کر میں نے جدید ماڈل کا لیپ ٹاپ آن کیا۔ یہ کچھ دن پہلے خرید کر رکھا تھا۔ انٹرنیٹ کنکشن آن ہوتے ہی عالیان کی ساری ویڈیوز سوشل میڈیا کی مختلف پیجز پر اپ لوڈ ہونے لگیں۔ "میرے کیریئر اور میری ماں کے قاتل تیرے لیے اتنی سزا ہی کافی ہے۔" میں بڑبڑایا۔

ابھی آنٹی شاہینہ سے شاہین کے رشتے کی بات کر لی تھی۔ آنے والے خوشگوار وقت کا تصور کر کے میں بیڈ پر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

قسط نمبر: 47

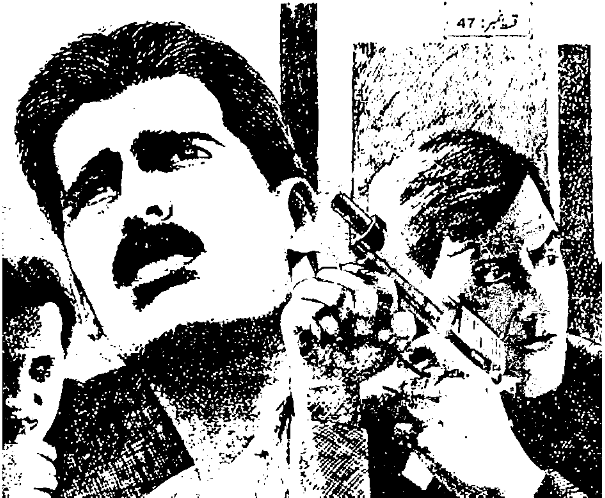

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی رو ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے حسن بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھو استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر، پاشا ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ الائیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک لورونتیا سیٹھ نوید ساچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے اصل باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر اور غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرانے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی الائیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام مجھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موہن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹکسی کے چندر ناتھ، شیام ہاور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیوٹکسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹکسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بولنگ کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی سنگین گرفتاریوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹکسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا

تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو مجبور کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "گلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ گلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نور لالا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں گلی منجارینا سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے گلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ مریم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ مریم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ نوید ساچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانا ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ وہ بینکاک ائیرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساپچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ وزیر جان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کرکے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپوکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کرکے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپوکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپوکو نے شہزی کا انتخاب کیا اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

باہر گاڑیوں کا مخصوص شور سنتے ہی میں چوکنا تو پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن جیسے ہی دروازے کو ایک دھماکے سے کھلتے اور گولی چلتے اس خوبرو نوجوان پولیس مین کو گرتے دیکھا تو پھر جیسے میری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو مثلِ پارہ کے گردش کرنے لگا اور میں نے اسی تیزی کے ساتھ ہی ہیک جمپ لی تھی۔ اگلے لمحے میں دوسرے کمرے کے دروازے کی بالکل چوکھٹ پر جا پڑا۔ ایک اور برسٹ چلا، جبکہ میں حملہ آوروں کے اگلے ہدف کا لامحالہ ادراک پہلے ہی سے رکھے ہوئے تھا۔ اسی سبب میں نے مذکورہ کمرے کی چوکھٹ پر گرتے ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چھلانگ لگائی تھی، ٹھیک اسی جگہ پر گولیوں کی بوچھار پڑی تھی مگر تب تک وہاں سے میں کمرے کے فرش پر تیزی سے لڑھکتا ہوا ایک دیوار کی آڑ لے چکا تھا۔

دستی کمرے میں جو شاید لاؤنج کے طور پر بھی مستعمل تھا، چیخ و پکار مچ گئی تھی۔ جوابی فائرنگ بھی سنائی دی تھی۔ میں نے دشمن سے چھینا ہوا اکلوتا پستول نکال لیا اور میری عقابی نظریں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔

فرش سے بہ سرعت اٹھ کر میں کمرے کی اس کھڑکی کے قریب آگیا جو لاؤنج میں ہی کھلتی تھی، ایک پٹ کی آڑ لیتے ہی مجھے ..... گرینڈ پا اور اس کی غصیلی مزاج بیٹی مارتھا کی خون میں لتھڑی لاشیں دکھائی دیں جس پر سے بروجیٹ کو پھلانگتے ہوئے اسی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کے ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کی ساتھی ایجنٹ کیٹ کو بھی میں نے دوسری سمت بڑھتے دیکھا۔ اس کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا، ان دونوں کو ان کے خیمے نما ہٹ سے فرار ہوتے وقت میں نے ہی زخمی کیا تھا۔

روڈلف کا کیا بنا تھا؟ میں نہیں جانتا تھا۔ شاید وہ بھی بروقت کسی محفوظ گوشے کی پناہ میں دوڑا تھا اور کیٹ اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اسی کے عقب میں مجھے دو مزید ایسی ہی چست لباس میں گن بردار دکھائی دیے تھے جو میرے لیے سردست اجنبی تھے۔ یعنی میں نے اس سے پہلے ان دونوں کو ان کے خیمے نما ہٹ میں نہیں دیکھا تھا، ممکن تھا ان کے باس اسٹاربک نے ڈیپو سے روانہ کیے ہوں۔

بروجیٹ پر نظر پڑتے ہی میں نے ایک نیم وا پٹ سے اپنے پستول کی نال نکال کر اس پر گولی چلانے کے لیے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ نوجوان بوبی مین (پولیس مین) اسی کی درندگی کا شکار ہوا تھا۔

میری چلائی ہوئی گولی اسپیکٹرم کے اس خطرناک ایجنٹ کے سر میں لگی تھی۔ وہ آواز نکالے بغیر تیورا کر اسی کمرے کے دروازے کے بالکل قریب گرا تھا جس کے اندر میں موجود تھا۔

پٹ نیم وا ہونے کی وجہ سے میں لاؤنج کا پورا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ تاہم بروجیٹ کو نشانہ بناتے ہی میں نے اس کے دونوں مذکورہ ساتھیوں کو نہایت پھرتی سے اسی کھڑکی کی طرف گنز کی نالوں کا رخ کرتے پایا اور میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ یہی وہ وقت تھا جب میری تلملی ہوئی سماعتوں میں بیک وقت دو خطرناک رائفلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی تھی۔ گولیوں کی اس مہیب بوچھاڑ نے کمرے کی کھڑکی کو چوکھٹ سمیت ہی اکھاڑ پھینکا تھا۔

خطرناک دشمنوں کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل جاری تھا۔ دروازے سے کھڑکی اور اب کھڑکی سے دروازے کی طرف چھلانگتے ہی میں نے بجائے سامنے کے، نیچے فرش پر خود لڑھک کر دروازے کی چوکھٹ سے لیٹے لیٹے ایک حملہ آور کا نشانہ لے کر فائر داغا۔

میری چلائی ہوئی گولی نے ان دو میں سے ایک کی پیشانی پھاڑ ڈالی تھی۔ یہ پسٹل بہت پاورفل تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا ساتھی اپنے ہم رکاب کا... یہ حشر دیکھ کر ایک لمحے کو بوکھلایا تھا اور ادھر ہی وہ مار کھا گیا۔ جب تک سنبھلتا، میں نے ایک اور گولی اس پر داغ دی۔

میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیا مگر گولی اس کے بروقت حرکت کرنے سے نشانے پر لگنے کے بجائے اس کے دائیں بازو پر پیوست ہوگئی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ خارج ہوگئی۔ مہیب تباہی بکھیرنے والی گن اس کے ہاتھ سے ڈگمگائی تو میں نے تیسرا فائر جھونک مارا۔ یہ گولی اس کے بائیں پہلو میں لگی اور پھر میرے مزید اپنی جگہ لیٹے رہنے کا جواز نہ رہا۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میں نے حرکت کی اور جب تک وہ سنبھلتا، میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل کا ٹھوس فولادی دستہ میں نے اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا اور اس کی گن میرے ہاتھ میں آگئی۔

”خبردار...... شہزی! گن پھینک دو...“

معاً ہی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں پلٹا اور بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا۔ وہ کیٹ تھی اور اس نے جان روڈلف کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔ کیٹ کا حسین چہرہ بھی

مجھے بری طرح تنتا ہوا نظر آرہا تھا۔ اپنے تین انتہائی تربیت یافتہ ساتھیوں کے باوصف اُسے خاطر خواہ کامیابی ہوتی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اس وقت بپھری ہوئی ناگن کے روپ میں نظر آرہی تھی جو میری ذرا سی غلط حرکت پر کچھ بھی کر ڈالنے کو تیار تھی۔

مجھے روڈلف کی فکر تھی۔ اس کا ساتھ میرے لیے انتہائی اہم تھا۔ میری متوقع امریکا یاترا کے اہم ترین مقاصد کے علاوہ اسپیکٹرم پر کاری ضرب لگانے کے لیے بھی۔ اس حقیقت سے اسٹاربک سمیت جوشوا بھی اچھی طرح سے واقف تھا اسی لیے بہت پہلے ہی سے انہوں نے روڈلف کو ہر قیمت پر ہلاک کر ڈالنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اب اسپکٹرم کی یہ ”چالاک بلی“ کیٹ، روڈلف کو چارے کے طور پر میرے خلاف استعمال کر رہی تھی۔

”وہ بچی کہاں ہے؟“ میں نے کسی دباؤ میں آئے بغیر کیٹ کے بپھرے ہوئے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے خوف ناک لہجے میں پوچھا۔

”اسے گن پھینک دو۔“ وہ جنگلی بلی کی طرح وحشیانہ انداز میں غرائی۔ اس کے چڑھے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ وہ روڈلف کو اب بلا تامل شوٹ کر دے گی۔ میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں رکھتے ہوئے جھک کر گن فرش پر رکھ دی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ روڈلف کو موت کے منہ میں دیکھ کر میرا دل جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔

”اے...... یو! باہر آؤ......“ کیٹ نے ذرا گردن موڑ کر غرا کے کہا تو بائیں جانب وہ بھول سا لمبے بالوں اور بڑھی ہوئی داڑھی والا شخص ڈرتے ڈرتے برآمد ہوا۔

”پاپا...... امت جاؤ...... یہ تمہیں مار ڈالیں گے۔“ مجھے اس آدمی کے عقب سے للی کی کپکپاتی آواز سنائی دی تھی۔

”خاموش رہو تم...... بچی!“ کیٹ نے للی کو جھڑکا جو نجانے کس گوشے میں اپنے باپ کے ساتھ محبوس تھی یا کر دی گئی تھی۔

گرینڈ پا اور مارتھا بدقسمتی سے شاید اس لیے ان کی بربریت کا شکار ہو گئے تھے کہ وہ سامنے کے رخ پر اور لیڈی پولیس آفیسر کے قریب کھڑے تھے۔ جبکہ وہ بھول سا آدمی اور اس کی ٹین ایج بیٹی للی ایک طرف کونے میں ڈرے سہمے چھپے کھڑے تھے اس لیے بچ گئے تھے۔

”وہ سامنے میرا ساتھی بے ہوش پڑا ہے، اسے پانی کے چھینٹے کے مار کے ہوش میں لاؤ۔“ کیٹ نے اسے اگلا حکم دیا۔ ”خبردار...... کوئی چالاکی مت کرنا، ورنہ اس بچی کو گولی مار دوں گی۔“ اس نے اپنی گن کی نال روڈلف کی کنپٹی سے ہٹا کر ایک طرف کونے میں سکڑی سہمی کھڑی للی کی طرف کرتے ہوئے اس کے باپ کو دھمکایا۔

میری عقابی نظریں کیٹ کی ایک ایک حرکات و سکنات پر جمی ہوئی تھیں، جیسے کوئی چیتا اپنے مغلوب پڑے شکار پر جھپٹنے کے لیے تیار ہو لیکن کیٹ نے بڑی چالاکی دکھائی تھی۔ اس نے روڈلف کی کنپٹی سے گن کی نال ہٹا تو دی تھی مگر اب اس کا رخ اس للی کی طرف تھا۔ میری ذرا سی غلط حرکت کیٹ کو ٹریگر دبانے کے غیر ارادی عمل پر مجبور کر سکتی تھی۔

کیٹ کی حالت اس وقت جلے پاؤں کی بلی جیسی ہو رہی تھی۔ اسے اپنی شکست کا اندازہ نہ تھا کہ وہ اپنے تین مسلح اور تربیت یافتہ ساتھیوں کے ساتھ یہاں ہلا بول کر مجھ پر قابو پانے کی حسرت میں وہ اپنے دو ساتھیوں کی جانیں بھی گنوا بیٹھے گی...... جبکہ چوتھا جاں بلب تھا۔ جلد ہی اس کی بھی تصدیق ہو گئی جب میرے کانوں سے للی کے بھول سے باپ کی لرزتی آواز ٹکرائی۔ ”یہ ختم ہو چکا ہے۔“

میں نے دیکھا اس اطلاع پر کیٹ کا حسین چہرہ شکست خوردگی کے باعث مسخ ہو کر رہ گیا۔ دوسری نظر میں وہ مجھے رونے والی دکھائی دینے لگی۔ وہ تنہا ہو گئی تھی۔ اس احساس نے اسے اندر سے ضرور تھوڑا دھچکا دیا ہوگا مگر وہ چہرے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہ رہی تھی۔

”مس کیٹ! میرا خیال ہے کہ کھیل ہم دونوں کا ہی ختم ہو چکا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ...... پولیس وغیرہ کے یہاں آنے سے پہلے ہم معاملات کی بات کر لیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ الجھ سی گئی مگر پوری طرح چوکس تھی۔

”وہ قیمتی مجسمہ جہاز پر موجود ہے اور ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنی رقم کا لالچ ہے اور بس......“ میں نے داؤ چلنے کی کوشش کی۔

”شٹ اپ......“ وہ غرائی۔ ”کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں اپنے اسکواڈ کی ٹاپ ایجنٹ ہوں۔ چاہوں تو چند سیکنڈوں میں تم دونوں کو ختم کر کے اس جزیرے سے بہ آسانی نکل جاؤں۔“ خود پسندی کی ماری اس پاگل بلی کے سر سے ابھی تک گھمنڈ نہیں اترا تھا۔ حالانکہ وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کے تین ساتھیوں کا کیا حشر ہوا تھا۔

”یقیناً! تم ہو گی ایسی......“ میں نے کہا۔ ”اسی لیے تو

میں تمہارے سامنے بے بس ہو چکا ہوں لیکن اس ہتھیار کی وجہ سے نہیں۔'' میں نے اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھنڈر فور راتفل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چالاکی سے کہا اور آگے بولا۔

''بلکہ... تمہارے حسن وشباب کے ہتھیار نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا ہے۔''

اس نے اپنی گن کی نال کا رخ میری جانب کر دیا۔ میری نبضیں دوڑنے لگیں لیکن گن کے بجائے اس کی زبان چلی۔

''اب اگر تم نے کوئی فضول بکواس کی تو میں تمہیں......'' اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا۔ اسی وقت تیز سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پہلے تو اس آواز پر بادلوں کے گرجنے کا گمان ہوا مگر جلد ہی عقدہ کھلا کہ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ کیٹ کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ خود میں بھی فکرمند سا ہوا اور سنجیدگی سے بولا۔

''یہ پولیس ہے، تھائی حکومت نے مجسمے کی چوری کے سلسلے میں انٹرپول سے مدد لے لی ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ ہم اس وقت دشمن نہیں بلکہ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔'' میں نے اس چالاک بلی کو چکر دینے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ جھانسے میں نہیں آئی۔ اس نے اپنے واچ ٹرانسمیٹر پر کسی سے رابطہ کیا۔ ان حالات نے اسے تھوڑا بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ فاتح ہونے کے باوجود وہ مفتوح تھی۔ حالات اس کی گرفت سے باہر تھے۔ جس کا اسے بھی احساس تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اس کے سارے ساتھی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے اور اسی لیے وہ مجھ سے زیادہ ہی خار کھائے ہوئے تھی۔

''لیس باس! کیٹ کالنگ یو...'' رابطہ ہوتے ہی اس نے ساری صورت حال اپنے باس جو یقیناً اسٹاربک ہی ہو سکتا تھا، مختصر الفاظ میں بتا ڈالی۔

''او کے...... باس! یہی کرنا پڑے اب... شہزی میرے قبضے میں ہے۔'' اس نے دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد کہا۔ میری عقابی نظریں جو اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بہ غور جائزہ لے رہی تھیں۔ صاف محسوس ہوا کہ اس رابطے کے بعد معاملہ خاصا اندوہناک ثابت ہونے والا ہے، کیونکہ اس کے منہ سے ادا ہونے والا یہ آخری جملہ...... ''باس! یہی کرنا پڑے گا اب... شہزی میرے قبضے میں ہے۔''

صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کال کے بعد کوئی آخری اور فیصلہ کن قدم اُٹھا سکتی تھی اور اس کی زد میں روڈلف ہی آنے والا تھا۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہی یکلخت میری نبضیں دوڑنے لگیں۔ میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر لحہ بہ لحہ اُترتی سفاکیت کو تاڑ رہی تھیں، کیونکہ دوسری جانب اسٹاربک سے ہدایت لینے کے بعد ہی اس کی نظریں ترچھی ہو کے روڈلف کے چہرے پر پڑی تھیں، صرف ایک لمحے کے لیے...... اور یہ اس کا لاشعوری اور غیر ارادی عمل تھا۔

میری چھٹی حس ممکنہ خطرے کو بھانپتے ہی پیش آئند لمحات سے نمٹنے کے لیے مجھے متنبہ کر چکی تھی۔ اسی سبب میرا دایاں پاؤں بہت غیر محسوس طریقے سے سرکتا ہوا اس تپائی تک رسائی حاصل کر چکا تھا جس پر دو چھوٹے سنگی شوپیس رکھے ہوئے تھے۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی اس نے اپنے ہونٹ فیصلہ کن انداز میں بھینچے تھے اور اپنی گن کا رخ روڈلف کی طرف کیا ہی تھا کہ میری داہنی ٹانگ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی۔ کیٹ کی اُنگلی گن کی لبلبی پر ذرا متحرک ہوئی تھی۔ اسی وقت میری ٹانگ تپائی کو کیٹ کی طرف اچھال چکی تھی جس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا تھا۔

میری کوشش تھی کہ تپائی کیٹ کے چہرے سے ٹکرائے مگر تھوڑی سی اندازے کی غلطی سے وہ چہرے کے بجائے اس کے سینے سے ٹکرائی۔ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی، جسے وہ بہ سرعت دوبارہ سنبھالنے کی کوشش میں تھی، لیکن میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا۔ تپائی اُچھالنے کے صرف دو ایک لمحے بعد ہی میں بھی اس پر اُچھلا۔

دیکھا دیکھی روڈلف نے بھی جنبش کی تھی۔ اس نے سنبھالا لیتے ہوئے کیٹ کے لات رسید کر دی، جو کیٹ کے پہلو پر لگی تھی۔ ضرب شاید زوردار ثابت ہوئی تھی کہ کیٹ بلبلائی۔ تب تک میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا اور ایک گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔

پے در پے ان حملوں نے اُسے بے دست و پا کر ڈالا۔ میں اور روڈلف اس پر پل پڑے۔ کیٹ نے شاید روڈلف کے زخمی بازو کو پہلے سے ہی تاڑ رکھا تھا اور اس نے اسی پر موقع دیکھ کر مکا رسید کیا۔ روڈلف کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوگئی۔ کیٹ کا دوسرا ہاتھ میری ناک پر آیا تھا کہ میں نے پھرتی سے اپنے ایک ہاتھ سے اس کا وار روکا اور دوسرے سے اس کے پیٹ پر گھونسا دے مارا، وہ چیخ کر چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑائی اور ایک کھانے کی میز کے

کونے سے اس کی پشت ٹکرا گئی۔ وہ لڑکھڑا کر بُری طرح تڑپ کر گری اور پھر نہ اُٹھ سکی۔ اس کے جسم میں جنبش ہو رہی تھی مگر میز کے کونے کی ضرب نے اسے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ کر اس کی گن اُچک کر اُٹھالی۔ کیٹ کی حالت ہنوز غیر تھی۔

''تم ٹھیک ہو روڈلف؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا زخمی بازو سہلا رہا تھا۔ کیٹ نے وہاں خاصی زوردار ضرب لگائی تھی۔ بندھی ہوئی بینڈیج سرخ ہونے لگی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ زخم کھل گیا۔

ادھر اچانک مجھے للی کے رونے سسکنے کی آواز آئی۔ وہ اپنی ماں اور گرینڈ پا کی خون آلودہ لاشوں کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے بار تھا اور اس کے باپ کی اس اندوہناک موت کا بے حد دکھ ہوا تھا جبکہ للی کا باپ خاصی ترش نظروں سے ہماری طرف گھورے جا رہا تھا۔

''کیا تم لوگوں کو خون ریزی پھیلانے کے لیے یہی گھر ملا تھا؟'' وہ میری طرف دیکھ کر برہمی سے بولا۔ ''کون ہو تم لوگ؟'' بھولے سے آدمی میں ایک دم نجانے کہاں سے اتنی جرأت آگئی تھی۔ وہ مجھ سے یہ کہہ کر اپنی بیٹی کو سنبھالنے کے لیے بڑھا۔

میں نے ابھی اس سے کوئی بات نہیں کی اور ہونٹ جبڑے بھینچے باہر کو لپکا۔ موسم کے تیور ایسے تھے کہ سہ پہر میں ہی شام کا گمان ہونے لگتا تھا۔ سردی زوروں کی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر ہنوز کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کے بعد فضا نکھری ستھری نظر آ رہی تھی مگر کہرے کی سی کیفیت ماحول پر طاری تھی۔

میں درحقیقت موسم دیکھنے نہیں بلکہ اس ہیلی کاپٹر کو دیکھنے کے لیے باہر نکلا تھا۔ جنوب کی سمت میں مجھے ایک ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا دکھائی دیا تھا مگر وہ دور جا چکا تھا۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور اندر آ گیا۔

خطرے کی کوئی بات نہ پا کر مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی۔

اندر روڈلف اپنی تکلیف بھلائے باپ بیٹی کو تسلیاں دے رہا تھا۔ اچھے بھلے پُرسکون گھرانے میں ہماری وجہ سے خون ریزی پھیل گئی تھی۔ اس بات کا مجھے ہی نہیں، شاید روڈلف کو بھی قلق تھا۔ للی اپنی ماں سے زیادہ اپنے گرینڈ پا کی لاش کے قریب بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ اس کا باپ اسے تسلیاں دیتے ہوئے پیار سے پچکارے جا رہا تھا۔

امن وسکون کے حامل اس گھر میں اب لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور یہ بڑا ہولناک منظر تھا۔

''میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔'' وہ بھولا سا شخص غم وغصے کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''فون ڈیڈ پڑا ہے۔ ہم خود بھی تھوڑی دیر پہلے ہی پولیس کو ایک خطرے سے آگاہ کرنے والے تھے۔'' میں نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' اس آدمی نے رکھائی سے کہا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ للی بھی ہم سے ناراض نظر آ رہی تھی۔

''بڈی! یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' روڈلف نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے اس کا مشورہ ماننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی اور ہم باہر آ گئے۔

باہر کاٹ دار سی یخ بستہ تیز ہوائیں گویا فراٹے بھر رہی تھیں۔ ہم دونوں سردی کے مارے بری طرح ٹھٹھر کر رہ گئے۔

''تم اپنے کھلے زخم کی مرہم پٹی تو کر لیتے؟'' میں نے باہر آ کر روڈلف اس سے کہا۔

''دیر ہو جائے گی۔ ہمیں جلد سے جلد کسی قریبی جگہ پہنچ کر مقامی پولیس کو انفارم کرنا ہوگا۔'' روڈلف بولا۔

''للی کے باپ نے کر تو دیا ہے فون پولیس کو...... وہ یہاں آ کر خود ہی سنبھال لیں گے یہ سب... اور اس جہاز کو بھی قبضے میں کر لیں گے۔ میں اسٹاربک اور جوشوا کو جہنم واصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

اسی وقت عقب سے آواز آئی۔ ہم دونوں ہی چونک کر مڑے۔

''ہے... ! فون ٹھیک ہو گیا ہے۔ رکو...... کوئی پولیس آفیسر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' یہ للی کا باپ تھا۔ روڈلف اور میں نے بیک وقت ہی گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں ادھ کھلے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ روڈلف اور میں نے رائے طلب انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آپس میں صلاح مشورہ کرنے کے بعد دوبارہ اس ''خون آلودہ'' گھر کے اندر آ گئے۔

کچھ سوچ کر میں نے سب سے پہلے کیٹ اور بروجیٹ وغیرہ کے جسموں کی تلاشی لی اور حسب توقع مجھے ان کے پاس سے اسپیکٹرم کے جاری کردہ مخصوص مونوگرام والے جس میں دو ہاتھوں پر دنیا کو اُٹھایا ہوا دکھایا گیا تھا اوپر ''سیف دی ورلڈ'' درج تھا۔ آئی ڈی کارڈز ملے۔ ایسا میں نے روڈلف کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ یہ اسی کا مشورہ تھا تاکہ پولیس کو ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر دنیا کو بھی اسپیکٹرم

کے کالے کرتوتوں کا پتا چل جائے۔ جوسف ہی ورلڈ کی آڑ میں پوری دنیا کو بے وقوف بنائے ہوئے تھی۔ ایک طرف ان سے خطیر رقمیں عالمی فنڈنگ کے نام پر بٹور رہی تھی تو دوسری طرف اس ''نیک نامی'' کی آڑ میں ہر قسم کا کالا دھندا کر رہی تھی جو قانون کی زد میں آتا تھا۔ روڈلف نے مجھے اسپیکٹرم کے ان آئی ڈی کارڈز کی ایک اور اہمیت کے بارے میں بھی بتایا تھا کہ اس کارڈ کو شوگر کے اسپیکٹرم کے اراکین اور ایجنٹ دنیا میں ہر جگہ خصوصی مراعات کے بھی حامل رہتے تھے۔

لہٰذا وہ کارڈ جس میں ان کی تصاویر بھی چسپاں تھیں میں نے دوبارہ ان لاشوں کے لباس میں ہی رکھ دیے۔

روڈلف نے ہی ریسیور اٹھایا اور بات کی۔ باہم مشورے کے مطابق اس نے مقامی پولیس آفیسر کو یہی بتایا کہ کچھ کرمنلوسیسا کاریوال بش طیارے میں بینکاک سے گوتم بدھا کا مجسمہ چرانے کے بعد یہاں اتر پڑے تھے۔ ہم اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلے ہیں، بہتر ہوگا کہ...... ہمارے تعاقب میں آنے کے بجائے مذکورہ طیارے کو فوری طور پر قبضے میں کرلیا جائے۔ انٹرپول بھی اسی طیارے کی کھوج میں ہے وغیرہ۔

پولیس نے اس کا نام پوچھنا چاہا تھا مگر روڈلف نے نہیں بتایا تاہم میری ہدایت کے مطابق اس نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اسپیکٹرم نے یہ مجسمہ بینکاک کے ایک بڑے کرمنل کاسپاکو کے ذریعے چوری کروایا تھا جو انہی کے ہاتھوں فروخت ہونا تھا جس کے بعد اسپیکٹرم وہ مجسمہ حاصل کر کے اپنی نیک نامی اور عالمی فنڈنگ کے حصول کے لیے اس مجسمے کو چوری شدہ ڈکلیئر کرنے کے بعد اسے باعزت طور پر تھائی لینڈ کے حوالے کر دیتی۔ گویا انہی کی چوری کی ہوئی چیز انہیں ہی واپس لوٹا کر اپنے سر پہ نیک نامی کا تاج سجانا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے پیسوں کے معاملے میں دونوں مذکورہ پارٹیوں کے درمیان ٹھن گئی۔

یہ سب کہنے کے بعد روڈلف نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا اور پلٹا۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ لی کے باپ کے چہرے پر اب برہمی اور ناراضی کی جگہ حیرت اور اُلجھن کے تاثرات تھے۔ روڈلف ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد میری طرف پلٹنے لگا تو اس آدمی نے آواز دی۔

''ہے...... مسٹر......؟''

''روڈلف......''

''کوپر۔'' اس نے بھی اپنا نام بتایا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ روڈلف نے ہاتھ ملایا۔

''تم لوگ کون ہو؟ اگر تم نے واقعی ان کرمنلز کا کوئی منصوبہ ناکام بنایا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ تم دونوں شاید کوئی گروپ ہو لیکن تھائی نہیں لگتے۔'' کوپر نے کہا پھر آخر میں اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''باہر کیا پولیس کے ہیلی کاپٹر ہیں؟''

''نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر تم نے تو رابطہ کرلیا پولیس سے؟ وہ پہنچنے والی ہوگی۔ لہٰذا اب ہمارا یہاں رکنا مناسب نہ ہوگا۔ باقی وہ سب سنبھال لے گی۔''

''بے شک آنے دو، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود گواہی دوں گا تمہارے حق میں...... گوتم بدھ جیسے مقدس بت کو تم دونوں نے ان چوروں کے ہاتھوں سے بچایا ہے، یہ تم دونوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔'' کوپر متاثر زدہ لہجے میں بول رہا تھا۔

''یقین کرو میرا...... تم دونوں کے اس کارنامے کو ہم لوگ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ ان کرمنلز کی ایک ساتھی ابھی زندہ ہے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔''

تھائی لینڈ کی طرح فلپائن میں بھی بدھ پرست تھے۔ لہٰذا اس کا ہم سے متاثر ہونا یقینی تھا۔ تاہم اس کی باتیں معقول تھیں اور ہمارے لیے قابل قبول بھی۔ لیکن ہم رک نہیں سکتے تھے۔ میرے بجائے روڈلف نے کوپر سے انہی خیالات کا اظہار کیا جو ہم دونوں کی ہی مشترکہ ترجمانی کرتے تھے۔ اس کے بعد اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''ہمیں ابھی اور بھی بہت سے کام انجام دینے ہیں مسٹر کوپر! یہ تو صرف معمولی کارکن ہیں۔ ابھی ان کے اصل لوگ زندہ ہیں۔ انہیں بھی کیفر کردار تک پہنچانا ضروری ہے۔ پولیس کے چکروں میں ہم پڑ گئے تو اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے اور مجرم راہِ فرار اختیار کرلیں گے، ہمیں ان کے ٹھکانے معلوم ہیں۔ آپ ہم سے صرف اسی قدر تعاون کریں کہ...... پولیس کو ہمارے بارے میں بالکل بھی کچھ نہ بتائیں نہ ہی ہمارے حلیوں کی تفصیل انہیں دیں۔ ورنہ ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔ ہمارے خاکے جاری کر دیے جائیں گے اور ہم ان مجرموں تک نہیں پہنچ سکیں گے جنہوں نے بینکاک کے تریخیٹر میوزیم سے نہ صرف بدھ کا مجسمہ بلکہ اور بھی کئی مقدس و قیمتی نوادرات کی حامل چیزیں چرائی ہیں۔''

روڈلف کا یہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔ وہ ایک جواں

مرد ہی نہیں بلکہ بلا کا ذہین آدمی بھی تھا۔ اس نے ان کے مذہب کی آڑ لے کر (جو ایسا غلط بھی نہ تھا) اس کے جذبات کو شہ دیتے ہوئے اپنا راستہ کلیئر کیا تھا۔ ورنہ یہ حقیقت تھی کہ ہم مشکل میں پڑ سکتے تھے اور لمبی چوڑی تفتیش وغیرہ کے چکروں میں پڑ جاتے، ہماری ڈھنڈیاں پڑ سکتی تھی۔ ٹی وی پر ہمارے خیالی خاکے جاری ہو سکتے تھے اور ہمیں بھی ان بین الاقوامی کرمنلز میں شمار کیا جاتا۔ روڈلف نے لوپر سے یہ بھی کہا کہ پولیس کو وہ صرف ہمارے بارے میں اتنا ہی بتائے کہ ہم تھائی ایشیائی جنس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا مجرموں کا آئندہ مشن بھی ناکام بنانے کی جستجو میں مصروف ہیں...... ہاں! ہمارے خاکے درست بتانے کی ضرورت نہیں، وغیرہ۔

میں نے روڈلف سے کچھ کہا اور اندر آ گئے۔

للی کی رو رو کر ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ گھر میں اس قدر خون ریزی کے باعث بارود اور خون کی ناباس پھیلی ہوئی تھی اور اندر بیٹھنا تو درکنار گھڑی بھر کے لیے ٹھہرنا تک محال ہو رہا تھا۔

ہم نے للی کو محبت بھرے انداز میں تسلیاں دیں اور پیار بھی کیا۔ اس کا باپ بھی اسے پیار کرتے ہوئے سمجھانے اور حوصلہ دینے لگا۔ للی کی سسکیاں کچھ کم ہوئیں۔

اس کے بعد ہم سب دوسرے کمرے میں آ گئے۔ باہر تیز برفیلی سی ہواؤں کا شرائے وار شور سنائی دے رہا تھا۔

میرے اندر آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہم کیٹ کورسن بستہ کرنا چاہتے تھے۔ پولیس آنے والی تھی۔ لوپر نے ہمیں مختلف کارآمد راستے بھی بتائے۔ اس نے بتایا کہ پہلے یہ گومبورا جزیرہ نما تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض جغرافیائی تبدیلیوں اور تغیر و تبدل کے باعث یہ جزیرہ بنتا چلا گیا۔ لہٰذا اس جزیرے میں جو گاڑیاں وغیرہ دیکھنے میں آتی تھیں، وہ کچھ تو پہلے سے ہی یہاں موجود تھیں اور باقی بعد میں یہاں آتی رہیں۔ اس کے لیے ایک بڑا سا بحری بیڑا کرائے پر ہر وقت دستیاب رہتا ہے جبکہ ہمیں اسکوائر سٹی تک پہنچنے کے لیے ایک نیلے رنگ کی مسافر لانچ میں سوار ہونا پڑے گا جو ہمیں گومبورا کے جنوب مشرقی ساحل تک پہنچا دے گی۔

لوپر نے یہ معلومات ہمیں بہم پہنچاتے ہوئے اپنے بارے میں بھی مختصراً یہی بتایا تھا کہ اس کی بیوی مارتھا ایک تیز مزاج غصیلی عورت تھی اور ہر وقت وہ اس پر اپنا حکم چلاتی رہتی تھی۔ اس کا باپ جو للی کا ''گرینڈ پا'' تھا۔ وہ بھی بیٹی کا پورا پورا ساتھ دیتا تھا۔ دونوں باپ بیٹی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور اس کی پیاری بیٹی للی سے بھی دور کر دیا تھا۔

یہ سارے معاملات طے کرنے کے بعد میں اور روڈلف للی کو بھی یہی ہدایات دے کر مکان سے باہر آ گئے۔

لوپر نے ہمیں زادِ راہ کے طور پر کچھ کھانے کے ڈبے اور گرم کپڑے وغیرہ دے دیے تھے۔ ہم دونوں ساحل کی طرف روانہ ہو گئے۔

لوپر کو ہم نے کیٹلاگ کے طور پر بھی استعمال کیا تھا، یعنی اس سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں کہ ہمیں اس جزیرے سے دوسرے جزیرے یا مین سٹی اور اندرون شہر کیسے اور کس طریقے سے سفر کرنا پڑے گا۔ وغیرہ۔ میں فلپائن کے انٹرنیشنل ائرپورٹ سے متعلق بھی لوپر سے معلومات لینا چاہتا تھا مگر روڈلف نے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔ بعد میں اس نے موقع دیکھ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا تھا کہ سارا پروگرام بتانا لوپر کو مناسب نہ ہوگا۔ باقی وہ سب جانتا ہے۔ صرف ایک بار گومبورا سے نکل کر ڈیواؤ پہنچ جائیں، اس کے بعد میں سنبھال لوں گا۔

میں تو ایسے ہوائی سفر اور فلپائن کے دیس سے بالکل ہی نابلد تھا مگر روڈلف کو ان کا تجربہ تھا۔ بہرکیف ہم دونوں لوپر اور اس کی بیٹی للی کی نیک تمناؤں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

سارا کھیل شاید اسٹاربک یا جوشوا کی وجہ سے بگڑا تھا۔ نجانے ان دونوں مہادیروں نے مشترکہ طور پر کیا پلان بنایا تھا کہ انہیں اچانک تبدیلی کرنا پڑ گئی تھی یا پھر چونکہ ان کی ابتدا سے ہی نیت خراب تھی اور یہ سب طے شدہ تھا۔ روڈلف کا یہی خیال تھا جبکہ کم و بیش میرا بھی اتنا ہی خیال تھا کہ یہ سب ان کے ماسٹر چیف لولوڈش کی موجودہ حالات کے مطابق کوئی نئی چال تھی جس سے وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف روڈلف کی ہلاکت، دوسری طرف مجھے قیدی بنانا تیسری جانب گوتم بدھ کے اس بیش قیمت مجسمے کو ہتھیانا تھا۔ بہرطور اب میں نے ساری چال انہی پر اُلٹ دی تھی، نہ صرف یہ بلکہ...... اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق میں نے اسپیکٹرم کا اصل اور مکروہ چہرہ بھی دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کا کریڈٹ بلاشبہ روڈلف کو بھی جاتا تھا۔

یوں چکر تو ہم نے بھی کاساپاکو کو خوب دیا تھا اور وہ میرے ہی کہنے پر دوبارہ ان سے (جوشوا سے) نئے سرے

سے سودے بازی پر رضامند ہوا تھا۔ اگر میں بروقت بیدار مغزی اور چابک دستی سے کام نہ لیتا تو لولوڈش اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا مگر اب چت بھی اس کی تھی اور پٹ بھی .....

بہرحال ان تمام باتوں سے قطع نظر اگرچہ فوری طور پر میرا امریکا یاترا والا اہم ترین معاملہ ایک بار پھر کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا لیکن کاساپاکو کو سلام پیش کروں گا جسے میں نے بڑی فن کاری کے ساتھ بے وقوف بنایا تھا اور جس نے اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر مجھے انویسٹر امیگریشن جیسی بھاری بھرکم ذاتی و انفرادی حیثیت عطا کرتے ہوئے ملٹی پل ویزا جاری کرا دیا تھا۔ تاہم اس سلسلے میں روڈلف کا کہنا تھا کہ مجھے اس خوش فہمی میں زیادہ دیر تک رہنے کی ضرورت نہیں۔ جیسے ہی کاساپاکو کو میری بلکہ ہم دونوں کی اصلیت کا علم ہوگا وہ کوئی بھی گڑبڑ کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں اسے تھوڑا وقت لگے گا۔ بینک اسٹیٹمنٹ شو میں جو خطیر رقم اس نے میرے ویسٹرن یونین بینک اکاؤنٹ میں منتقل کی تھی، اس کی واپسی کے لیے اسے کچھ عرصہ تک پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ وکیل اور امیگریشن کنسلٹنٹ سے روابط اور لمبے چوڑے کاغذی پلان میں اسے کافی وقت لگے گا۔ لہٰذا اس تناظر میں روڈلف نے مجھے ایک صائب مشورہ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے بین الاقوامی اکاؤنٹ کو کاساپاکو ''منجمد'' کرتا . میں تب تک ذاتی طور پر اتنی ہی رقم کا بندوبست کرتے ہوئے کاساپاکو کو وہ ساری رقم واپس لوٹا دوں یوں اس کا میرے خلاف کوئی بھی ایسا مقدمہ ازخود ہی کالعدم قرار پا جائے گا۔ یوں اکاؤنٹ اور ویزا وغیرہ کی کینسلیشن کا بھی کوئی ڈر نہ ہوگا۔ تاہم روڈلف کی ان ساری باتوں کے باوجود میری اپنی انتہائی کوشش یہی تھی کہ میں کاساپاکو سے تعلقات استوار رہنے دوں۔ اس کے لیے مجھے اپنے ذہن سے کچھ ایسی توجیہات کو بروئے کار لانا تھا جس سے کاساپاکو جیسا درندہ میری دوستی کے جال میں قابو رہتا۔

''لیکن بڈی!'' جان روڈلف یہ سب بتاتے ہوئے آخر میں بولا۔ ''یہ کام اسی وقت ہی کرنا جب ایسا کوئی متعلقہ بینک تمہیں نوٹس دے . . . اس کی ایک وجہ ہوگی ''

روڈلف اتنا کہہ کر ذرا رکا۔

ہم اس وقت لوپر کے مکان سے کافی دور آ گئے تھے اور روڈلف نے ایک شٹل روک کر کوچی کو ٹرمنل تھری چلنے کا کہا۔ (فلپائن کے ان جزیروں میں چلنے والی چھوٹی گاڑیوں کو 'کوچی' ہی کہا جاتا تھا۔ اللہ جانے اب یہ انگریزی لفظ کا کوئی شارٹ فارم تھا یا پھر فلپائنی لفظ...... ہم دونوں ہی اس سے نابلد تھے)

شٹل نے ہمیں ٹرمنل تھری اُتار دیا۔ لوپر سے حاصل کردہ معلومات ہمارے بے حد کام آ رہی تھیں۔ یہاں کافی مسافر لانچیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم ڈیواؤ جانے والی ایک لانچ میں سوار ہو گئے۔ نصف گھنٹے کے اندر اندر لانچ نے ہمیں ڈیواؤ کے ساحل پر اُتار دیا اور وہاں سے دیگر مسافروں کے ساتھ مل کر ہم بھی ایک نسبتاً بڑی شٹل میں سوار ہوئے۔ یہ شاید بڑے علاقے اور بڑے شہر کی وجہ تھی کہ یہاں...... جیپنی چلتی تھیں۔ جسے فلپائن زبان میں ''ڈیپنی'' (Dyipni) کہا جاتا تھا۔ چھوٹے عام جزیروں میں چلنے والی شٹل سے ذرا بڑی تھیں۔ اس کا اگلا حصہ کسی پرانے ماڈل کی جیپ جیسا ہوتا تھا اور پچھلا کسی وین یا منی بس کی طرح ذرا کھلا اور بڑا ہوتا تھا۔ اس پر چمک دار پٹیاں چسپاں ہوتی تھیں۔ اس جیپنی نے دس منٹ میں ہمیں اسکوائر سٹی کے ایک ریسٹورنٹ میں اُتار دیا۔ یہ عام سا ریسٹورنٹ تھا اور وہاں کھانا پینا ساتھ میں ''پینا پلاتا'' بھی چل رہا تھا۔ چنانچہ اگلے چند لمحوں بعد ہم ریسٹورنٹ میں آرام سے بیٹھے تھے۔ ہم نے اپنے حلیے مکان میں ہی بہتر بنا لیے تھے۔

روڈلف نے لیدر کی براؤن جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس سے بازو کی بینڈیج چھپ گئی تھی۔ گلے میں سفید رنگ کا گرم اُونی مفلر تھا۔ جینز کی ٹائٹ پینٹ میں وہ خاصا خوبرو اور اسمارٹ دکھائی دیتا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ وہ قد و قامت میں میرے جیسا ہی تھا۔ خود میں نے فل آستین کی گرم شرٹ اور چست سیاہ پینٹ چڑھا رکھی تھی اور اس پر لیدر کی سیاہ جیکٹ تھی۔ روڈلف نے تو اپنے ہلکے براؤن بالوں میں جل بھی لگا رکھا تھا جبکہ میں نے ہیئر لوشن چپڑ رکھا تھا۔ ایک گرم مفلر میں نے بھی گلے کے گرد ڈال رکھا تھا۔

اسکوائر سٹی کے اس ریسٹورنٹ میں کافی خوش فکرے لوگ نظر آتے تھے۔ کئی چنچل لڑکیاں ہماری طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنی مار کے شرارتاً کوئی جملہ کہتیں اور پھر ان کے نقرئی قہقہوں سے ماحول گنگنا اُٹھتا۔ خاصی چہل پہل دیکھنے میں آتی تھی۔

ہم یہاں کچھ کھانے پینے اور تھوڑا بہت وقت بتانے کے لیے آن بیٹھے تھے۔ سوچ بچار اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی ہمارے لیے ازبس ضروری تھا کہ ہم کچھ گھڑی سکون سے بیٹھیں۔ بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ روڈلف نے مجھے... میرا مذہب دیکھتے ہوئے حلال کھانے کا ہی

آرڈر دیا تھا۔ جس میں شرمپ ویجیٹیبل ڈش اور فرائیڈ فش تھی۔ رائس کی ڈش بھی تھی۔ فروٹ سلیڈ بھی تھا۔ تاہم میرے لیے کولڈ ڈرنک اور روڈلف نے اپنے لیے ریڈ وائن منگوائی تھی۔

''مثلاً......؟'' میں نے کانٹے سے فش کا ایک قتلہ منہ میں رکھتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس نے ریڈ وائن کا ایک گھونٹ بھرا اور جواباً بولا۔

''تم جب اپنے اکاؤنٹ سے ٹرانزیکشن کرواؤ گے تب ہی ایسی کسی صورتِ حال کا پتا چلے گا۔ اگر مخالف دعوے دار پارٹی کا کلیم قابلِ قبول ہوا تو اکاؤنٹ منجمد کر دیا جائے گا۔ تب ہی تم اپنا جواب تحریری طور پر جمع کرواؤ گے لیکن تب تک تمہیں اپنی تیاری مکمل رکھنا ہوگی......'' اس نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔

''جہاں تک میرا تجربہ ہے کہ کاسپاکو ابھی بینک کو کسی قسم کا شکایتی نوٹس نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس نے اپنی دولت اپنی مرضی سے تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کی ہے۔ نہ ہی وہ اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا بھی کر سکتا ہے۔ البتہ کسی وکیل سے مشورہ کر کے وہ کوئی ''شق'' استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہوا کہ تمہارا اکاؤنٹ سیل کروا دے تب تمہیں پہلی فرصت میں اس کی وہ تمام رقم لوٹانا ہوگی۔ معاملہ ادھر ہی ختم ہو جائے گا۔''

''اہم......'' میں نے اس کی بات کو بڑے غور سے سن کر ایک پُرسوچ سی ہنکاری بھری۔ پھر اسے وہی کچھ بتا دیا جو میں کاسپاکو جیسے درندہ صفت آدمی کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔

''کیا......؟'' میری بات پر روڈلف حیرت آمیز پریشانی سے بولا۔ ''کیا تم اب بھی کاسپاکو کو بے وقوف بنانے پر تلے ہوئے ہو؟ وہ اب تمہارے جھانسے میں نہیں آئے گا اور تمہیں یوں بھی اب کاسپاکو سے کیا لینا دینا؟ اس کی کہانی اب ختم سمجھو۔''

''نہیں روڈلف!'' میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا اور آگے بولا۔ 'میں جتنے دن بھی کاسپاکو کے قریب رہا ہوں مجھے اس کے پانی کا اندازہ اچھی طرح ہوتا رہا ہے۔ وہ بینکاک کا تو ادنیٰ نہیں ایک ہائی پروفائل لیول کا گینگسٹر ہے۔ بے شک اس کا گینگ محدود سہی لیکن اس کے تعلقات اپنے جیسوں انڈر ورلڈز کے ساتھ استوار ہیں۔ اس کی عام سی جھلک میں نے اپنے ان سفری کاغذوں کی تیاری میں بھی دیکھی ہے۔ بینکاک کی سرزمین پر اس نے مجھے الویسٹرز کی بنیاد پر ملٹی پل ویزا جاری کروایا، پھر ویسٹرن یونین اکاؤنٹ میں میری اجارہ داری، یہ سب کچھ اس نے محض اپنی بے بہا دولت کے بل بوتے پر ہی نہیں بلکہ اثر و رسوخ کے طفیل بھی کروایا ہے۔ ایسا اثر رسوخ جو تھائی لینڈ کی سرحدوں سے پار بھی اپنا اثر رکھے ہوئے ہے۔''

''کاسپاکو سے خوف زدہ ہو، بڈی!'' روڈلف نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا اور اس کے غلط تبصرے پر میرے ہونٹوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ عود کر آئی، پھر میں اسی لہجے میں بولا۔

''میں اس سے خوف زدہ ہوتا تو اس کی بغل میں نہیں بیٹھتا۔ میں بھیڑیوں کی کچھار میں گھس کر ان کے خلاف چالیں چلنے کا عادی ہوں مائی ڈیئر روڈلف!''

''لیکن اب تم اسے مزید کیونکر جل دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہو؟'' روڈلف تھوڑا پریشان سا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''دشمن کے خلاف دشمن جیسے ہی دانت اور ہتھیار استعمال کرنا چاہیے۔ پہلے مجھے ذرا جوشوا اور اسٹاربک سے نمٹنے دو، ابھی میں اپنی چال اور پلاننگ محفوظ رکھے ہوئے ہوں۔''

روڈلف ایک گہری ہنکاری بھر کے رہ گیا پھر ایک آنکھ میچ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''ویسے بڈی! آپس کی بات ہے...... کاسپاکو نے تمہیں بیٹھے بٹھائے اتنی دولت دے دی ہے کہ سمجھو بس تمہاری لاٹری ہی نکل آئی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اُسے اپنے ان چند لاکھ ڈالرز کی پروا بھی ہوگی لیکن دشمنی کی ایک نئی ابتدا الگ بات ہے۔''

''میں ایسے پیسوں کو حرام سمجھتا ہوں روڈلف!'' میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ٹھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔ ''میری یہی کوشش ہوگی کہ...... میں اس سے رابطہ کر کے اس کی ساری رقم لوٹا دوں۔ اس نے اپنے طور پر میرا جو کام کیا ہے وہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے، میرے لیے یہی کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ میں کاسپاکو کو ایک بار پھر چالاکی سے قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''ہوں ں...... بالکل ٹھیک کہا۔'' روڈلف کے منہ سے گومگو کے سے انداز میں برآمد ہوا۔

ریسٹورنٹ میں رونقیں عروج پر تھیں۔ اس میں موسم کا بھی دخل تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جزیرے کے لوگ سرد موسم سے گھبرانے کے بجائے اس سے انجوائے کر رہے تھے۔ خوب جام لنڈھا رہے تھے اور گرما گرم دھواں اور خوشبو

اُڑاتے لذیذ کھانوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔

یہ ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ تھا۔ اسٹو کھلے تھے اور انواع و اقسام کی ڈشز تیار کرنے والے شیف بھی لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر موڈ میں آئے ہوئے تھے۔ گرما گرم ڈشز پر تیل کا چھڑکاؤ کر کے آگ کے گولے اُڑا رہے تھے۔ جس کے باعث ریسٹورنٹ کا ماحول بھی گرم ہو رہا تھا۔ سردی میں نیم عریاں ویٹریس بھی ٹرے اور بڑی بڑی پلیٹیں اُٹھائے تھرکتی پھر رہی تھیں۔ ویٹرز بھی تھے لیکن ایک تتلی سی ویٹریس نے جگہ سنبھالتے ہی تیر کی طرح ہماری میز کا رخ کیا تھا۔ اب وہی ہمیں کافی دیر سے سرو کر رہی تھی اور بار بار ہماری میز پر آ کر ہمیں دلنشیں مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے ہماری ضرورت کا پوچھ جاتی تھی۔

روڈلف اس میں دلچسپی لیتا محسوس ہو رہا تھا جبکہ میرا ارادہ تھا کہ میں جلد از جلد کھانا کھا کر روانہ ہوں اور کسی طرح سے پاکستان زہرہ بانو سے رابطہ کر کے رقم کا بندوبست کروں کیونکہ اپنے ''الویسٹرز'' کی بنیاد پر بنے ہوئے ملٹی پل ویزا اور ویسٹرن یونین اکاؤنٹ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی رقم کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔

نیز اس سلسلے میں مجھے عارفہ سے بھی رابطہ کرنا تھا۔ اسٹاربک اور جوشوا کو بھی مجھے ٹھکانے لگانا تھا۔ وزیر جان کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بعد لولوش بوکھلایا ہوا تھا۔ میں جوشوا اور بالخصوص اسٹاربک کو ٹھکانے لگانے کے بعد اسے ایک اور ضرب لگانا چاہتا تھا۔

اسپیکٹرم کے ماسٹر چیف لولوش کو میں بتا دینا چاہتا تھا کہ میں اُسے دنیا کے ہر خطے میں ایسی ہی شکست دیتا رہوں گا۔

کھانا ختم ہو چکا تھا ہمارا لیکن روڈلف کا اُٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

''بڈی! ایک بوتل کا اور آرڈر دے دوں؟'' مجھے اس کی بے چارگی پر قابلِ رحم سی ہنسی آ گئی اس لیے کہ وہ جیبوں سے بالکل خالی تھا۔ میرے پاس خاصی رقم تھی۔ ظاہر ہے یہ کاسپاکو کے ہی دیے پیسے تھے۔ جو میں اسے لوٹانے والا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ روڈلف ریڈ وائن کی ایک بوتل اور کیوں منگوانا چاہتا ہے۔

دراصل اس نرم و نازک فلپائنی دوشیزہ کا لہک لہک کر ہمیں ''سرو'' کرنے کا انداز روڈلف کو بھا گیا تھا۔

''بکواس بند کرو۔ میں جانتا ہوں، تم کیوں ایک بوتل منگوانا چاہتے ہو۔ تمہیں وائن سے زیادہ اس کی لہکتی مٹکتی حسینہ کی احتیاج محسوس ہو رہی ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے مصنوعی غصے سے کہا۔ دل کی چوری پکڑے جانے پر روڈلف جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے مخصوص لہجے میں بولا۔

''ہے بڈی! سمجھ گئے ہو ناں...... تو اچھے دوستوں کی طرح مان لو میری فرمائش۔ دینے لگا ہوں آرڈر......'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے آنکھ ماری اور اسی حسینہ کو اشارہ کیا جو ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ ایک ذرا اشارہ پاتے ہی وہ جیسے کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی ہماری طرف... میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''ہے بے بی! ایک اسکاچ کا کوارٹر لے آؤ۔'' روڈلف نے اسے آرڈر دیا۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا یہ دوست وہسکی کو ہاتھ لگانا تو در کنار بوتل کی جانب دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کر رہا ہے۔'' بالآخر حسینہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے روڈلف سے حیرت بھرے لہجے میں کہا تو میں اس کی طرف ٹھنڈی ہوئی سنجیدہ نظروں سے دیکھنے لگا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

''بے بی! تمہیں کوئی اعتراض ہے اس پر......؟'' وہ بوکھلا گئی۔ جلدی سے بولی۔

''او...... نو نو سر! نیور مائنڈ پلیز...... ! میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' پھر وہ روڈلف کی طرف دیکھ کر جلدی سے بولی۔

''سر! میں ابھی آپ کا آرڈر سرو کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے لوٹ گئی۔

''دھت تیرے کی...... سارا مزہ کرکرا کر دیا۔'' روڈلف میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اس آرڈر کے بعد یہ لائن پر آنے والی تھی۔''

''روڈلف' ایک بات بتاؤ۔'' میں نے اس کی طرف متانت بھری نظروں سے دیکھا۔

''ہوم...... پوچھو۔''

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم شادی شدہ ہو اور تمہارے بچے بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یقیناً......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ بھی کہ تم اُن سے بہت محبت کرتے ہو؟''

''ہاں! مگر ان باتوں کا اس حسینہ سے کیا تعلق؟'' وہ حیران ہو کے میری طرف دیکھنے لگا۔

''کوئی تعلق نہیں......؟'' میں نے اس کی طرف

استفساریہ نظروں سے دیکھا۔ وہ جیسے میرا اشارہ بھانپتے ہوئے بولا۔

''دیکھو دوست! ان کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ میں اپنی بیوی سے کتنا عرصہ دور ہوں اور اس سے دوبارہ ملنے کے لیے ہی تو میرے اندر جینے کی اُمنگ اور حوصلہ جاگا تھا۔ ورنہ تو کاسپاکو جیسے درندے کے نرغے میں انسان موت کے سوا کیا سوچ سکتا ہے اور اس سے بچ بھی جاتا تو اپنے لوگ مجھے کب زندہ چھوڑنے والے تھے۔ یہ تم ہی تھے جس کی مدد اور حوصلہ دلانے پر میں نے ہمت باندھی اور اپنے بیوی بچوں سے ملنے اور انہیں دوبارہ دیکھنے کی چاہ میرے اندر شدت سے جاگی۔ یہی نہیں تم نے میرے آدمیوں سے بھی میری جان بچائی۔ ورنہ میں تو کاسپاکو سے اپنی جان بچانے کے بعد کیٹ اور بروجیٹ کے نرغے میں آہی چکا تھا۔''

''تو پھر اس کا مطلب کیا ہوا کہ تم اپنی بیوی سے چیٹنگ کرو......؟'' میں نے آنکھیں نکالیں۔ ''وہ بھی تو تم سے دور ہے۔ اگر وہ بھی یہی کچھ سوچ تو......؟''

میں جانتا تھا کہ میں اس سے ایک تلخ اور نازک بات کہہ رہا تھا۔ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کے میری مخالفت میں بھی اُتر سکتا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن چکے تھے۔ لیکن صاف اور کھری بات کہنا میری فطرت تھی اور میں اس سے مجبور تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر فوری ردِعمل کے طور پر...... سرخی کی لہر اُمڈی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ...... نرماہٹ نے لے لی۔ خجالت سے ہنس کر بولا۔

''وہ بھی یہی کچھ کر رہی ہوگی۔''

''شٹ اَپ......!'' میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بغیر ثبوت کے تمہیں اس کی کردار کشی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔'' میری بات پر روڈلف کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر ندامت کی رمق اُبھری جو جلد ہی شرمندگی کی سرخی میں بدلتی چلی گئی۔ وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے بولا۔

''چلو...!! اپنا کام نمٹاتے ہیں۔''

''اور جو آرڈر دیا ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟ وہ حسینہ تو تمہارا آرڈر فالو کرنے گئی ہوئی ہے۔'' میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ مگر اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

''بھاڑ میں جائے وہ اور اس کا آرڈر...... موڈ خراب ہوگیا ہے میرا۔ چلو اُٹھو۔'' اس نے جھلا کر کہا اور پھر میں بھی مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بل پے کیا جا چکا تھا۔ ہم باہر نکل آئے۔ وہ حسینہ ضرور ہمارے اس طرح اُٹھ کر چلے آنے پر حیران ہوئی ہوگی۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر ہم اسٹاربک اور جوشوا کے عارضی ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔ ہمیں رات کا انتظار تھا اور وہ آچکی تھی۔ وہ دونوں اسکوائر سٹی کے جس شاہانہ ریزورٹ میں مقیم تھے، وہ پام ریزورٹ (Palm Beach Resort) کے نام سے موسوم تھا۔ یہ ساحلِ سمندر کے قریب واقع تھا۔ آبادی سے دور اور الگ تھلگ مقام پر۔ وہاں تک جانے کے لیے ہمیں ایک ایسی گاڑی ملی تھی جسے عام فہم میں محدود زمین پر چلنے والی ''شٹل'' کہا جاتا ہے...... یا یوں کہہ لیں کہ چار پہیوں والی وہ چھوٹی سی گاڑی جو گولف کے میدانوں میں چلا کرتی ہے۔ ریسٹورنٹ میں تو ڈالر چل گئے تھے مگر گاڑی والا ہم سے فلپائنو پیسو (Philippines, Piso) ہی لینے پر بضد تھا۔ تاہم روڈلف کے سمجھانے بجھانے اور یہ لالچ دینے پر کہ ڈالر تمہارے ''پیسو'' سے زیادہ منافع بخش کرنسی رہے گی جسے تم فلپائن کے کسی بڑے شہر لے جا کر آسانی سے ایک بڑی رقم کی صورت میں حاصل کر سکتے ہو۔

خدا خدا کر کے یہ مسئلہ حل ہوا اور شٹل کے ڈرائیور نے ہمیں اس پام بیچ ریزورٹ کے قریب اُتار دیا۔ میں نے اسے دو ڈالر تھما دیے۔ روڈلف کے حساب سے یہ بھی زیادہ تھے لیکن میں نے پروا نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔

اسکوائر سٹی کے آسمان پر چھائے ہوئے بادل ایک بار پھر دھواں دھار بارش کا پتا دیتے تھے۔

روڈلف میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ میرے سامنے پام ریزورٹ کی پانچ منزلہ وسیع و عریض اور قوس کی شکل میں شاندار عمارت کسی فانوس کی طرح جگمگاتی نظر آرہی تھی۔ اس کے سامنے سوئمنگ پول تھا۔ کلب اور پب بھی اس کے وسیع و عریض احاطے میں نظر آتے تھے۔ پانی میں سوئمنگ پول کے کنارے کئی مرد عورتیں تیرتے ہوئے فلوٹنگ بیڈ پر شم دراز پینے پلانے میں مصروف نظر آتے تھے۔

میں اور روڈلف گیٹ کے قریب کھڑے تھے اور اندر داخلے کے سسٹم کو بغور دیکھ رہے تھے۔

''بڈی! اندر تو انٹرنس کارڈ پنچ سسٹم ہے۔ ہم نہیں جا سکتے۔'' روڈلف نے نیچی آواز میں مجھ سے کہا۔ میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ گیٹ پر دو باوردی گارڈز کھڑے تھے اور اندر

جانے والے کچھ لوگوں کو میں نے ایک مشین کی سلاٹ میں کارڈ گھماتے ہوئے دیکھا تھا۔

''یہ کارڈ ممبر شپ والوں کے لیے ہوسکتا ہے مگر گیسٹ کے داخلے کا بھی تو کوئی رول ہوگا۔'' میں نے کہا۔ روڈلف نے خوبصورت محرابی نیون سائن والے چمکتے دمکتے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھو کیا لکھا ہے، ممبرز آلوڈ اونلی......''

میں نے ان مذکورہ روشن الفاظ کو دیکھا اور سیٹی بجانے کے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ ''اس کا مطلب ہے جوشوا اور اسٹاربک کی پہلے سے یہاں ممبر شپ تھی۔''

''نہ بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا؟'' روڈلف کندھے اُچکا کر بولا۔ ''چند دنوں کے لیے چند ہزار ڈالرز قربان کرنا اسمگلرز کے ان دونوں ''بڑوں'' کے لیے کیا مشکل ہے۔''

''ہم......'' میرے منہ سے گومگو کے انداز میں برآمد ہوا۔

''کیا تم اتنی رقم خرچ کر سکتے ہو کہ چند روز کے لیے اس مہنگے ترین ریزورٹ میں قیام پذیر ہوں؟'' روڈلف میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

''ممکن تو ہوسکتا ہے، لیکن یہ ہمارے لیے یوں بھی مناسب نہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی چور راستہ دیکھنا پڑے گا۔''

''تو پھر اس طرف آجاؤ ذرا جلدی......'' روڈلف نے کہا۔ ''ایک گارڈ ہمیں اس طرح کھڑے دیکھ کر مشکوک نظروں سے گھور رہا ہے۔ ممکن ہے یہاں خفیہ کیمرے بھی نصب ہوں۔''

وہ ایک طرف کو ہولیا۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ آگے جا کر ہم دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے مین روڈ پر آگئے اور فٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔

''دیکھ رہے ہو ناں بڈی! سیکیورٹی کتنی سخت ہے۔'' روڈلف نے چلتے چلتے مجھ سے کہا۔ اس کی نظریں پام ریزورٹ کی شاہانہ عمارت کی باؤنڈری وال پر بنی کنکریٹ کے اس کیبن کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں مخصوص وردیوں میں تین گن بردار گارڈز موجود تھے۔ ایک اور ایسا ہی دوسرا کیبن ہمیں اس سے پچیس، تیس فٹ کے فاصلے پر بھی نظر آیا تھا۔ بیرونی عمارت کے ساتھ ساتھ پام کے درخت اور نصف قدِ آدم گارڈینا کی طویل باڑھ بھی لگی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ گویا پوری عمارت اس میں گھری ہوئی تھی۔

''کچھ خاص سیکیورٹی نہیں ہے۔ معمول کی ہی لگتی ہے۔'' میں نے بھی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے یہ کوئی جیل تو ہے نہیں، لیکن خاطر جمع رکھو...... یہ گارڈ اندر بیٹھے ریزورٹ کے ایک ایک گوشے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔'' روڈلف نے کہا۔

ہم آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ اس کے عقب میں آگئے۔ عقبی حصہ ہونے کے سبب یہاں کچھ سناٹا تھا۔ مین روڈ ہماری پشت سے گھوم کر دوسری جانب مڑ گئی تھی۔ ایک چھوٹی سڑک البتہ گزرتی تھی جس کا اختتام عمارت کی عقبی دیوار کی بالکل مخالف سمت میں ایک کھلی جگہ پر ہوتا تھا، جو قدرے عمودی اور سطح مرتفع پر تھی۔ وہاں پام کے درختوں کے عقب سے کچھ خوبصورت ہٹ نما اقامت گاہیں نظر آتی تھیں۔ اس طرف کافی تعداد میں گاڑیاں بھی کھڑی تھیں اور وہاں مدھم مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ شاید وہ کوئی چھوٹا سا پوش رہائشی علاقہ تھا۔ اس کے پیچھے سمندر کی موجوں کا شور سا سنائی دیتا تھا۔ چند ایک لانچوں کے بگل کے بکارنے کی آواز بھی ہمارے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

جہاں سے مذکورہ سڑک گھوم کر عمودی مقام پر بنی اس رہائشی علاقے کی طرف جاتی تھی۔ اسی مقام سے ایک اور سنگل بیلٹ روڈ نکل کر تاریکی میں غائب ہو رہی تھی۔ میں نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے روڈلف سے کہا۔

''اس طرف چلو......'' کہتے ہوئے میں نے قدم بڑھا دیے۔ ہم پیدل چلتے رہے۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر سڑک عمودی رخ پر گھوم گئی تھی لیکن ہم اس کی ذیلی سڑک پر سیدھا آگے ہی چلتے رہے۔ حتیٰ کہ تاریکی میں نکل آئے۔ ابھی ہم اس طرف پندرہ بیس قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ ہمیں رکنا پڑا۔

سامنے ٹمٹماتی روشنیاں چمکتی نظر آرہی تھیں۔ سنگل بیلٹ روڈ یہاں سمندر پر اختتام پذیر ہوتی تھی، سامنے لانچیں اور کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ روشنیاں ادھر سے ہی آرہی تھیں۔ اب ہمارے بائیں ہاتھ کی طرف ریزورٹ کی شمالی دیوار تھی، وہاں سمندری موجیں اس کی دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔

''کیا اس سخت سردی میں غوطہ خوری کا ارادہ ہے بڈی......؟'' روڈلف بولا۔

''یہی کرنا پڑے گا۔ وہاں مجھے سمندر کنارے کسی جوبلی پلیٹ فارم کے آثار نظر آرہے ہیں، ہوسکتا ہے وہاں کوئی کشتی دکھائی دے جائے۔'' میں نے اس طرف ہی نظریں جمائے رکھتے ہوئے روڈلف سے مزید کہا۔ ''دیکھو

وہاں...... غور سے...... ایک دیوار گیر سنگی ریلنگ کا زینہ جا رہا ہے۔ ہمیں اس زینے تک پہنچنا ہوگا۔‘‘

’’کک...... کیا؟‘‘ روڈلف گھبرا کر بولا۔

ہاں! اس زینے کا اختتام یقیناً کسی چور دروازے پر ہوتا ہوگا۔ وہاں تھوڑی سی کوشش سے ریزورٹ کے اندر گھسنے کا موقع مل سکے۔‘‘ میں نے اسی جانب بہ غور نظریں مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

’’تجویز تو تمہاری بُری نہیں لگتی، لیکن یہ کیسے پتا چلے کہ ہمارے دونوں شکار وہیں موجود ہیں کہ نہیں۔‘‘ روڈلف بولا۔

’’فضول سوال پر دھیان مت دو...... آجاؤ۔‘‘ میں نے کہا اور روڈلف ’’اوکے بڈی!‘‘ کہتا ہوا میرے ساتھ آگے بڑھا۔ ہمارے اطراف میں اب تاریکی اور ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ فضا میں سرد مرطوب ہوا گھلی ہوئی تھی۔ آسمان قدرے صاف لگتا تھا۔ کہیں کہیں تارے ٹمٹماتے نظر آجاتے تھے۔

ہم سمندر کی طرف تھوڑا اور آگے بڑھے تو آثار واضح ہونے لگے، قریب پہنچے تو میرا اندازہ ہی درست ثابت نہ ہوا بلکہ اُمید بھی بر آتی نظر آگئی۔ وہاں ایک سیلن زدہ سے چوبی پلیٹ فارم کے ایک تختے کے ساتھ لگی دو تین کشتیاں موجود تھیں۔ ان کی رسیاں پلیٹ فارم کے چوبی تختے کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ دو میں سے ایک ڈونگا کشتی تھی۔ ہم نے اسی کا ہی انتخاب کیا اور اس میں سوار ہوگئے۔ روڈلف رسی کھول چکا تھا، یہ چپوؤں سے چلتی تھی اور اندر دو چپو موجود تھے۔

گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہم عمارت کی شمالی دیوار جس کا کچھ حصہ سمندر میں ڈوبا نظر آرہا تھا، کی طرف جانے کے بجائے تھوڑا آگے تک تاریک سمندر میں چلے گئے۔ تاکہ اگر کوئی ساحل سے ہماری طرف دیکھ بھی رہا ہو تو وہ کسی شبے کا شکار نہ ہوسکے۔ اس تسلی کے بعد ہم نے تیز تیز چپو چلانے شروع کردیے اور شمالی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں سمندر سے آنے والی موجیں ریزورٹ کی شمالی دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ ہماری ڈونگا کشتی جب دیوار کے بجائے سطح آب سے تھوڑا ہی نیچے کسی سنگی فرش سے ٹکرائی تو ہمیں پتا چلا کہ یہاں پتھریلا پلیٹ فارم بھی بنایا گیا تھا جو سمندر کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔

یہاں ایک دو چوبی بالس بھی اُبھرے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے کشتی کی رسی اس کے گرد لپیٹ دی۔ اس کے بعد ہم کشتی چھوڑ کر اس پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ پانی ہمارے گھٹنوں تک آگیا تھا۔ ہم نے کشتی سے اترنے سے پہلے ہی لانگ بوٹ اُتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے اور گرم جرابیں بھی اُتار لی تھیں۔ پتلون کے پائنچے بھی اُوپر گھٹنوں تک لپیٹ لیے تھے، مبادا یہ سب گیلے ہو کے ٹھنڈک نہ پیدا کریں اور اندر کسی قسم کے نشان نہ چھوڑیں۔

سنگی زینے پر آتے ہی ہم نے پہلے گیلے پاؤں جھاڑے، اس کے بعد جرابیں اور بوٹ دوبارہ چڑھا لیے۔ پتلون کے پائنچے بھی نیچے کر دیے۔ تاہم پیروں میں ہنوز سیلن کا احساس ہوتا تھا لیکن اس کے مقابلے میں بہرحال کم ہی تھا جب ہم ایسا نہ کرتے اور اسی طرح ہی پانی میں اُتر جاتے۔

یہاں مکمل سناٹا تھا۔

’’بڈی! تمہاری ترکیب تو ٹھیک ہے، لیکن اب خدا کرے کہ اُوپر پہنچ کر ہمیں اندر داخلے کے لیے بھی کوئی راستہ مل جائے۔‘‘ روڈلف جوش سے بولا۔

’’ہو جائے گا کچھ نہ کچھ...... آؤ......‘‘ میں نے کہا اور پھر ہم دونوں محتاط روی کے ساتھ سنگی زینے چڑھنے لگے۔ چونکہ عمارت قوس کی صورت میں تھی اسی لیے زینہ بھی اپنی سنگی ریلنگ سمیت گول گھوم رہا تھا۔

زینہ تھوڑا عمودی جا کر سیدھا چلا گیا اور وہاں سے صرف چند ہی قدموں کے فاصلے پر ہی اس کا اختتام بھی ہوگیا اور اسی آخری سرے پر میری دھڑکتی ہوئی نظریں جمی رہ گئیں۔

اُمید بر آگئی تھی۔ وہاں...... ایک تقریباً چار فٹ قطر کی گولائی میں ایک فٹ گہرائی کے سوراخ کے اندر کی طرف ایک گول سا لکڑی کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس عجیب دروازے کو دیکھ کر ہمیں حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

’’یہ دروازہ اندر شاید بیسمنٹ میں یا اس کی پارکنگ میں کھلتا ہوگا اور صفائی وغیرہ یا یہاں سے کچرا نکال کر سمندر میں پھینکنے کے لیے بنایا گیا ہوگا۔‘‘ روڈلف نے سرگوشی میں تبصرہ کیا۔ میں نے بھی اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ یہاں کسی سیکیورٹی کے انتظام کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ بھلا کون یہاں سے اندر داخل ہونے کی زحمت کرتا اور کرتا بھی تو اپنے خراب حلیے سے اندر آ کے کرتا بھی کیا......؟ کیونکہ یہ کوئی ایسی جیل ٹائپ کی تو جگہ تھی نہیں۔ ایک اقامتی ہوٹل ہی تھا۔

ہم دونوں نے دروازے کی جانچ شروع کردی۔

ہمیں یہ دروازہ کسی کاغذی گتے سے زیادہ مضبوط نظر نہ آیا۔ اگرچہ لکڑی کا ہی تھا مگر کافی سالخوردہ ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کی مشترکہ طبع آزمائی کے بعد وہ کھل گیا۔

یہ سرنگ نما راستہ جو ہم نے جھکے جھکے سر کے ساتھ طے کیا بمشکل آٹھ، دس قدموں پر محیط تھا اس کے بعد ہم ایک ایسی نسبتاً کھلی مگر نیچی چھت والی جگہ پر کھڑے تھے، جو خاصے وسیع و عریض ہال سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔ وہاں ذرا ذرا فاصلے سے کئی ستون نظر آرہے تھے۔ کئی گاڑیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف ڈھلانی راستہ نظر آیا۔ روشنی کا انتظام تھا مگر بلب کم ہی روشن تھے۔ جس کے باعث کہیں اندھیرا اور کہیں روشنی تھی۔

ہم محتاط نظروں سے گھورتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ چند قدم چلے تھے کہ ایک بڑی سی روش آگے ڈھلان کی جانب اُترتی دکھائی دی۔ گاڑیاں شاید ادھر سے ہی آتی جاتی تھیں۔ اس سے آگے شاید ریزورٹ کا مین گیٹ تھا اور روڈلف اور میرے خیال کے مطابق وہاں بھی سیکیورٹی کا یہی انتظام ہوسکتا تھا۔ اسی وقت وہاں ایک روشنی اُبھری، ساتھ ہی کسی گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنائی دی۔ ہم جلدی سے ایک کار کے عقب میں ہوگئے۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ وہاں ایک زینہ اُوپر کی طرف جاتا تھا۔ وہ شاید اُوپر گراؤنڈ یا فرسٹ فلور کی طرف جاتا ہوگا۔

ہیڈ لائٹس اس لمبی سی کار کی تھیں جس پر جیپ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ وہ ایک قطار میں داخل ہو کر رک گئی۔ میں اور روڈلف اسی جانب تکنے لگے۔ اس کے اندر سے دو افراد بزنس سوٹ میں ملبوس باہر نکلے اور سیدھے زینے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ان کی چال میں عجلت پائی جاتی تھی۔ اس طرف سے ہم ان کے چہرے ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکے تھے۔ وہ ممبر کسٹر ہی ہوسکتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم بھی نکلے اور جب آہستہ روی کے ساتھ زینے کی جانب بڑھنے لگے تو روڈلف نے مجھ سے پوچھا۔

’’ہمیں اپنا حلیہ بدلنا چاہیے تھا۔ اسنار بک اور جوشوا ہمیں پہچان سکتے ہیں، بلکہ تمہارے مقابلے میں مجھے تو جلد ہی پہچان جائیں گے۔‘‘

’’دیکھا جائے گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہاں اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ تمہارے تو وہ دونوں دیکھے ہوئے ہیں نا...... تم بھی ذرا محتاط رہنا۔ کیا پتا وہ تمہیں پہلے نظر آجائیں۔‘‘

’’وہ دونوں یہاں سیر سپاٹے کی غرض سے نہیں آئے ہیں کہ فلش یا پوکر کھیلتے ہوئے نظر آئیں۔ یا کوئی حسینہ بغل میں دبائے کسی کنج میں بیٹھے ہوں۔‘‘ روڈلف بولا۔

’’وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہی محبوس ہوں گے۔‘‘

’’نجانے تازہ صورتِ حال اُن کے علم میں اب تک آچکی ہوگی یا نہیں......‘‘ میں نے گومگو سے لہجے میں کہا۔

’’اگر ٹی وی میں یہ خبر آرہی ہوگی تو وہ اب تک باخبر ہو چکے ہوں گے۔‘‘ روڈلف نے جواب دیا۔ ہم زینے طے کرنے لگے۔

ہم زینے طے کرنے کے بعد ایک ہال میں آگئے۔ یہاں کئی زرق برق لباسوں میں ملفوف مرد و عورتوں کی آوک جاوک دکھائی دی۔ مختلف راہداریاں اور کمرے دکھائی دیے۔ ایک ہال بھی نظر آیا۔ وہاں چھت پر بڑا سا فانوس جھول رہا تھا جس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

ہم دونوں نے بھی اب چوروں کا سا انداز ترک کردیا تھا۔ کیونکہ اب ہم اس شاہانہ اور مہنگے ترین ریزورٹ کے اندر تھے اور...... ظاہر ہے اب عملے کا کوئی فرد ہم سے ممبر شپ کے کارڈ دکھانے کا مطالبہ نہیں کرسکتا تھا۔ جو یوں بھی ان کے خلاف اُصول اور مہمانوں کی شان کے خلاف ہوگا۔ تاہم احتیاط پھر بھی ضروری تھی۔

میں نے دیکھا روڈلف کی نظریں تیزی سے اردگرد گردش کرنے لگی تھیں۔ وہ شکار تاڑ رہا تھا۔

’’کیا خیال ہے! استقبالیہ پر جا کر اُن دونوں کے بارے میں پوچھا جائے؟‘‘ میں نے روڈلف سے کہا۔

’’میں اسی پر غور کر رہا تھا مگر میرا نہیں خیال کہ وہ دونوں اپنے اصل ناموں سے فروکش ہوں۔‘‘ روڈلف بولا۔

’’پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو دیکھ لیتے ہیں، بہ صورت دیگر کوئی اور طریقہ سوچتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ روڈلف نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور پھر ہم استقبالیہ کی طرف بڑھ گئے۔

ہم گراؤنڈ فلور پر ہی تھے۔ یہاں سے شیشے کی ایک دیوار سے باہر کا جلترنگ منظر صاف نظر آتا تھا۔ سوئمنگ پول، وسیع لان اور کلب، پب اور لوگوں کا جمگھٹا۔

اچانک ایک کھنکتی سی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

’’کیا میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں سر......!‘‘

ہم دونوں نے چونک کر اس کی جانب ذرا گردن موڑ

کر دیکھا۔ وہ ملیشی ہی کی..... مخصوص وردی میں ملبوس ایک درمیانی عمر مگر پُرکشش سی عورت تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ڈبل پیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ کوٹ پر دائیں جانب سینے پر ایک مونوگرام چسپاں تھا، جس میں پام ریزورٹ کی عمارت کو مائیکرو کر کے دکھایا گیا تھا اور اس کے اوپر قوسِ قزح بنائی گئی تھی۔ یہ تصویری مونوگرام اس کے بے داغ اور مکلف کوٹ سوٹ پر لگا بہت بھلا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ گول اور گورا چمکتا ہوا سا تھا۔ بال خوب کس کر سلیقے سے گوندھ کے پیچھے کیے ہوئے تھے۔ آنکھیں اس کی گول اور کشادہ تھیں۔ ان میں ایک خاص قسم کی چمک اُتری ہوئی تھی۔ تاہم اس کے یاقوتی ہونٹوں پہ کاروبارانہ مسکراہٹ ضرور رقصاں تھی۔

''ہم کسی کے گیسٹ ہیں..... ہمیں واقعی مدد کی ضرورت تھی۔ آپ کا پوچھنا بہت اچھا لگا۔'' میں نے اس فلپائنی حسینہ کی طرف دیکھ کر خوش اخلاقی سے کہا۔

مقامی لہجے میں گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

''خوش آمدید کہوں گی میں آپ کو.....'' وہ اسی طرح مسکرا کر مگر اس بار قدرے خم ہو کے بولی۔ ''میں یقیناً آپ کی مدد کر سکتی ہوں اگر آپ اپنے میزبان کا نام بتا دیں.....''

''مسٹر جوشوا اینڈ اسٹاربک.....'' میں نے برملا یہ نام اس کے سامنے اُگل دیے۔ ایسے میں روڈلف کے چہرے سے میں بھانپ سکتا تھا کہ وہ..... اندر سے یقیناً حیرت آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا ہوگا۔

''اوہ.....'' اس کے یاقوتی ہونٹ سکڑ گئے جو بے حد سیکس اپیل محسوس ہوئے۔ ''ابھی تو تھوڑی دیر پہلے ان کے دو گیسٹ آئے تھے اور مجھے بھی انہوں نے انہی کے بارے میں کہہ رکھا تھا کہ..... وہ ان کا پوچھیں تو انہیں فوراً اوپر ان کے پاس روم نمبر.....'' وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکی۔ میری نبضیں دوڑنے لگیں۔

''آپ اپنا نام بتا دیں..... میں انہیں انٹرکوم پہ بتائے دیتی ہوں۔'' وہ کمرا بتاتے بتاتے رکی اور یک دم بات بدل ڈالی۔

''آپ صرف اُن کا کمرا نمبر بتا دیں۔ ہم خود ہی ان سے جا کر مل لیتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ البتہ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ اس کے خوش اور دمکتے چہرے سے بھی ایک دولحہ کے لیے شک کے گہرے سائے نمودار ہوئے تھے جس پر اس نے فوراً ہی اپنی روایتی خوش اخلاقی کی تہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

''سوری سر! دراصل مجھے ہوٹل انتظامیہ نے ہی انہیں سرو کرنے کے لیے ذاتی طور پر ہائر کیا ہے، میں اُن کی پہلے سے اجازت کے بغیر.....''

''مس.....'' دفعتاً روڈلف نے مداخلت کرتے ہوئے اس سے ٹھنڈی ہوئی متانت سے استفساریہ کہا۔

''مس علینہ.....'' اس نے روڈلف کی طرف دیکھ کر اپنی گھنی جھالروں سے ڈھکی ہوئی آنکھیں پٹپٹا کر دیکھتے ہوئے مسکرا کے اپنا نام بتایا۔

''یس مس علینہ! آپ بلاوجہ ہی ہمارا وقت ضائع کر رہی ہیں، جو ہم پہلے ہی انتظامیہ کی پوور ریپوٹیشن کی وجہ سے بہت گنوا چکے ہیں، مجال ہے جو کسی نے ہم سے مخاطب ہونے کی زحمت گوارا کی ہو۔ آدھے گھنٹے بعد آپ کی آواز سنی ہے ہم نے تو آپ اپنا راگ الاپ رہی ہیں خیر.....''

وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا اور پھر اِدھر اُدھر تکتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں کسی سے نہیں ملنا ہے، آپ پہلے ہماری ہیڈ سے بات کروا دیں۔'' آخری جملہ روڈلف نے خاصی ناراضگی اور غصے میں ادا کیا تھا۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ خاتون خاصی بوکھلاہٹ آمیز پریشانی کا شکار ہونے لگی تھی۔

''آ..... آپ ناراض نہ ہوں..... مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کو یہاں زحمت اُٹھانی پڑی۔ آپ فرسٹ فلور پر چلے جائیں، روم نمبر فورٹی ون میں.....''

''اِٹس او کے..... تھینکس.....'' روڈلف نے کہا اور تیزی سے نقشین اور فینسی اسٹائل کی ریلنگ والے زینے کی طرف بڑھتا چلا گیا اور میں روڈلف کی اس نازک وقت میں ذہانت کا قائل ہوتا اس کے ساتھ ہو لیا۔

''یہ بکواس کر رہی تھی کہ اسے ہوٹل انتظامیہ نے خاص طور پر ان کے لیے ہائر کیا ہے۔'' روڈلف نے میرے ساتھ زینے چڑھتے ہوئے ہولے سے کہا۔ ''خصوصی ٹپ پر یہ اپنی خدمات ہی نہیں خود کو بھی بیچ چکی ہوگی اور ہمیں بلف کر رہی تھی کہ اسے ہوٹل انتظامیہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ بڈی! ان شاہانہ ہوٹلوں کے ملازمین کی تنخواہ کم ہی رکھی جاتی ہے، کیونکہ یہ لوگ بھاری ٹپ سے بہت کما لیتے ہیں۔''

''اس کا تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟'' میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''اس طرح کہ وہ ایک دم میرے دباؤ اور دھمکی میں آ گئی تھی۔ بہ صورت دیگر یہ سچ ہوتا تو وہ اس وقت سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہمارے سامنے تنی کھڑی رہتی۔''

''اپنا یہ ذاتی فرض وہ اب بھی نبھا سکتی ہے بلکہ نبھا رہی

ہوگی۔'' میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ہمیں رخصت کرتے ہی فوراً جوشوا اور اسٹاربک کو فون پر ہمارے بارے میں مطلع کر رہی ہوگی اور میری طرح روڈلف کو بھی اسی خدشے کا اندازہ تھا۔

''مجھے معلوم ہے، اب آگے کی سچویشن تم سنبھالو، میں نے میدان صاف کر دیا ہے۔ یہی ایک راستہ تھا۔''

''ٹھیک ہے، چلو مگر محتاط ہو کر ذرا..... کیونکہ وہ بھی محتاط ہو گئے ہوں گے اور ان کے آنے والے وہ دو مذکورہ افراد بھی۔'' میں نے کہا۔ میرا اشارہ علینہ کے بتائے ہوئے ان دو ملاقاتیوں کی طرف تھا جو ہم سے تھوڑی دیر پہلے جوشوا اور اسٹاربک سے ملنے آئے تھے۔

لہٰذا اسی سچویشن کے پیشِ نگاہ میں زینے کے آخری سرے پر پہنچ کر وہیں رک گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہی زینہ فرسٹ فلور کے بعد اُوپری منزل کی طرف بھی جا رہا ہوگا تو میں فرسٹ فلور کے بجائے سیکنڈ فلور پر جا کر نیچے کی صورتِ حالات کا جائزہ لیتا، مگر لگتا تھا کہ جانے کس وجہ کے تحت ہر فلور کا الگ الگ زینہ اور دوسرے رخ پر بنایا گیا تھا۔ تاہم آخری سرے پر رک کر میں نے فلور پر ابھی قدم نہیں رکھا تھا اور سب سے پہلے اپنے سامنے والے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ جس پر کمرا نمبر 21 درج تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر فلور پہ بیس اقامتی کمرے تھے۔ تو جوشوا وغیرہ کا کمرا..... سب سے آخر میں ہو سکتا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو بڈی؟'' روڈلف نے میرے پیچھے رکے رہتے ہوئے ہولے سے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔

''ہمارے شکار کا کمرا اس کوریڈور کے سب سے آخر میں ہے اور ہمیں اس کوریڈور کو چھوڑ کر سامنے والے کوریڈور کا رخ کرنا چاہیے۔'' میں نے سامنے والے کمرا نمبر 21 کے ساتھ ایک راہداری کی جانب اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ دائیں جانب والے کوریڈور پر نگاہ ڈالتا ہوا میں اس راہداری میں گھس گیا۔

یہ راہداری نسبتاً مختصر تھی کیونکہ یہ اگلی زد کا ''شارٹ کٹ'' تھا۔ اس کے آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا اور روڈلف کو عقب میں نظر رکھنے کی ہدایت دی۔ اب اس رخ سے میرے سامنے..... ایک زینہ نیچے جاتا تھا جہاں ہم کھڑے تھے وہاں ہمارے سوا کوئی بھی نہ تھا اور نہ ہی سامنے والے زینے میں۔ البتہ چند ایک اٹکھیلیاں کرتے جوڑے دکھائی دیے تھے، جو آپس میں گلے لپٹے چہلیں کرتے، نیچے اور اُوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے۔

اُدھر سے ہی میں نے ذرا اپنی گردن موڑ کر دائیں جانب جھانکا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ میرا کمروں کی کیلکولیشن والا اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوا تھا۔ سب سے آخری کمرے کے باہر مجھے دو افراد اس طرح کھڑے نظر آگئے جو بڑے چوکنا سے انداز میں دائیں بائیں دیکھے جا رہے تھے۔

ان دونوں نے اپنا ایک ایک ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیبوں میں ڈال رکھا تھا جس کا صاف مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں موجود بھرے ہوئے پستولوں کو چھو رہے ہوں گے۔ صاف ظاہر تھا کہ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس عورت نے اپنی ''اجرتِ خالص'' قسم کی ٹپ کا حق ادا کر دیا تھا۔

یکلخت میری رگوں میں خون مثلِ پارہ کے گردش کرنے لگا۔ میں نے روڈلف کو ادھر رکنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ہم تھوڑی دیر تک رکے رہے تب ہی میں نے دیکھا کہ ان دونوں سوٹ پوش افراد نے کسی کی آمد کا بے حاصل انتظار کرنے کے بعد بیک وقت دو مخالف سمتوں میں حرکت کی۔

مجھے ان سے یہی توقع تھی۔ ایک شکار ہماری طرف آ رہا تھا..... میں تھوڑا پیچھے سرک گیا اور روڈلف کو ازحد محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے خود دیوار کے بالکل سرے کے ساتھ پشت لگا کر چپک گیا۔ میں نے گویا اپنی سانسیں تک روک لی تھیں اور اپنی چست نظریں سرے پر جمائے رکھیں۔

مجھے یقین تھا کہ اس طرف آنے والا وہ سوٹ پوش بہت محتاط ہو کے اس طرف کو گھومے گا، میں نے ایک داؤ کھیلنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ پہلے ہی سے بلند کر رکھا تھا۔ وہی ہوا، سوٹ پوش اپنے تئیں بڑی احتیاط کے ساتھ اس راہداری کی طرف گھوما۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک کوٹ کی جیب کے اندر تھا، شاید وقت سے پہلے وہ اس معروف پبلک مقام پر اسلحہ شو کرنے سے بھی احتیاط برتے ہوئے تھا، مگر اسے یہ توقع نہیں تھی میں یہاں اس طرح گھات لگائے اس کے بالکل قریب کھڑا ہوں گا..... وہ مڑتے ہی مجھے اپنے اتنے قریب پا کر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا یا تھا۔

صرف ایک لمحے کے لیے..... اس کے بعد اس نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے ہاتھ نکالنے کی

کوشش چاہی تھی، مگر میں تو اس سے پہلے ہی اپنا ''ہاتھ'' دکھا چکا تھا۔ اسے فوری طور پر چھاپنے کے لیے میرا ایک ہاتھ کا گھونسہ پہلے ہی فضا میں بلند تھا۔ جو اس سوٹ پوش کی جنبش سے پہلے ہی حرکت میں آچکا تھا۔ اس کے بال میری مٹھی میں تھے اور اگلا لمحہ میرا اس کی گردن کو بالوں سمیت زوردار جھٹکا دینے کا تھا، وہ لہرایا اور اسی دوران اس نے پستول بھی نکال لیا تھا جس پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ تب تک اس کی متوقع حرکت پر میرے دوسرے ہاتھ کا پنجہ بھی متحرک ہوا تھا۔ جو اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑا۔ تب ہی میں نے اسے زور سے گھما کے اپنے ساتھ والی دیوار پر مارا۔ رہی سہی کسر روڈلف نے اس کی ناف کے نیچے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب رسید کر کے پوری کر دی۔ تب تک اس کا پستول میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔

روڈلف کی ضرب پر وہ 'اوغ' کی آواز حلق سے خارج کر کے دوہرا ہوا۔ میرے دائیں ہاتھ کے شکنجے میں ہنوز اس کا سر دبا ہوا تھا یوں میں نے بھی ڈبل پریشر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی ٹانگ کا...گھٹنا اس کی ناک پر زور سے رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

اگلا.... اہم مرحلہ نہایت پھرتی کے ساتھ نمٹانے کا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس کے بے سدھ وجود کو کھینچ کر زینے اور کوریڈور کے درمیانی خلا میں گھسیڑ دیا۔

''اس طرف .....'' میں نے سرسراتی سرگوشی میں روڈلف کو پہلے والی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا دوسرا ساتھی دوسری سمت سے نمودار ہو گا، اسے تھوڑا وقت لگے گا۔ جلدی..... آؤ۔'' کہتے ہوئے میں نے اپنی سابقہ راہداری کا رخ کیا جہاں ہمارا مطلوبہ کمرا تھا۔

اس طرف کا میدان صاف پاتے ہی، دوسرے سوٹ پوش کو چھوڑ کر ہم نے تیزی سے حرکت کی تھی اور کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اسے ذرا اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ تاہم میری مشاق نظریں راہداری کی اس سمت کا بھی جائزہ لے رہی تھیں جدھر سے مجھے دوسرے سوٹ پوش کے نمودار ہونے کی پوری اُمید تھی۔ اس پر میں نے وقت ضائع کیے بغیر ہی دروازہ اندر سے کھلتا پا کر بہ سرعت حرکت کی تھی اور اگلے ہی لمحے میں اور روڈلف اندر تھے۔

اندر داخلے سے پہلے میں نے ایک ہلکی سی سرگوشی روڈلف کے کان میں کر دی تھی اور اس نے بھی اسی انداز میں اپنا سر اثبات میں ہلایا تھا۔

اندر گھستے ہی میں نے تیز متلاشی نظروں سے دو افراد کو حرکت پذیر ہوتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک بھاری مگر درمیانے قد و قامت اور دوسرا اکہرے بدن کا مالک شخص قدرے طویل قامت کا تھا۔ انہیں بالکل بھی توقع نہ تھی کہ...... ان کے دو مسلح اور چوکنا گرگوں کی موجودگی میں ہم اس قدر آناً فاناً ملک الموت بنے ان کے سر پر جا پہنچیں گے۔ شاید اسی سبب وہ اندر لاؤنج میں صوفوں پر دائیں بائیں بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی بس، ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے ہونق سے ہو گئے، پھر یقینی موت کی لہر ان کی آنکھوں میں خوف بن کر چمکی۔ میں چاہتا تو چشم زدن میں سائلنسر لگے پستول سے ان دونوں کو واصلِ جہنم کر ڈالتا مگر یوں بلا تصدیق کے اندھا دھند خوں ریزی سے میں اجتناب ہی کرتا تھا۔ اگرچہ میری رگوں میں اس وقت خون لاوے کی طرح اُبل رہا تھا۔ کیونکہ اسپیکٹرم کا ہر رکن، بالخصوص اعلیٰ قیادت سے متعلق افراد عابدہ کے مجرم تھے۔ ایسے مجرم جنہوں نے میری عابدہ کو یہودیوں کے حوالے کر ڈالا تھا۔ جنہوں نے میرے ملک کو انتشار کی زد میں لانے اور ملک دشمن عناصر ''را'' اور ''بلیو تلسی'' کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ بھلا میں یہ سب کیسے بھول سکتا تھا۔

''خبردار.... ! ذرا بھی جنبش کی تو پلک جھپکتے ہی موت کی وادیوں میں اُتر جاؤ گے۔''

میری آواز اور لہجے کی گھن گرج ہی ان کے لیے موت کا پیام تھی۔ وہ ایک لخت وہیں جامد ہو گئے۔ جانتے تھے کہ ان کا واحد دشمن شہزی انہیں نابود کرنے کے لیے اپنے سر سے کفن باندھے ہوئے۔

''یہی دونوں جوشوا اور استاربک ہیں۔'' روڈلف نے بلا تاخیر میری ہدایات پر عمل کیا تھا۔ جو میں نے دروازہ دھکیلنے سے پہلے ہلکی سرگوشی کی صورت، اس کے کان میں ڈالی تھی۔

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور چہرہ سفاکیت کی تصویر پیش کرنے لگا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب بس! ایک ثانیے کے لیے میرے چشمِ تصور میں عابدہ کا مظلوم چہرہ رقصاں ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے میرے سائلنسر لگے پستول سے ''خاموش'' شعلہ لپکا۔ 'چز' کی آواز اُبھری، اکہرے بدن والے کی دونوں آنکھوں کے درمیان سرخ نشان اُبھرا، وہ اسی طرح صوفے پر بیٹھے بیٹھے پشت گاہ سے ٹک گیا اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیل گئے۔ درمیانے قد و

قامت والے نے اپنے متوقع انجام کو بھانپتے ہی زندگی کی آخری کوشش چاہتے ہوئے، جنبش لی تھی اور میرے پستول کی دوسری گولی عین اس کے دل کے مقام پر سرخ روشندان بنا چکی تھی۔

ان دونوں کو ٹھکانے لگا کر میں جب روڈلف کی طرف پلٹا تو چونک گیا۔ اس کا منہ ہونقوں کی طرح کھلا پڑا تھا۔

''تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا؟ اب نکلنے کی کرو یہاں سے.....''

''ب..... بڈی! تت..... تم نے ان دونوں کو...... ی ی..... یعنی جج..... جوشوا اور استاربک کو ختم کر ڈالا! اوہو.....'' اس کے منہ سے عجیب طرح کی منمناتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔

''کیوں؟ تمہیں افسوس ہوا اس بات کا؟'' میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے احمقوں کی طرح سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ ''تم نہیں جانتے بڈی! یہ دونوں اسپیکٹرم کی اعلیٰ قیادت کے اہم ترین ممبرے تھے۔ شرقِ وسطیٰ اور لاطینی امریکا کی اہم ریاستوں میں یہ دونوں اسپیکٹرم کے ایک وسیع نیٹ ورک کو کنٹرول کیے ہوئے تھے۔ یہ تمہارا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے مائی ڈیئر بڈی شہزی خان!'' وہ ابھی تک متحیر تھا۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں پہلے ہی اس کی طرف سے چوکنا تھا، کیونکہ میں دوسرے ''سوٹ پوش'' کو نہیں بھولا تھا۔ تاہم کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی اور ہونے کی صورت میں دروازے پر دستک ہونا لازمی ہوتا۔ میں نے فوراً روڈلف کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے ایک دم دروازے کے دائیں جانب دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور میں نے سب سے پہلے لمبی نال کی جھلک دیکھی، اگلا لمحہ میرے حرکت کرنے کا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی کا وار میرا پستول والے ہاتھ پر پڑا۔ پستول گرا اور دوسری جانب سے روڈلف حرکت میں آ گیا۔ اس کا گھونسا نو وارد کے چہرے پر پڑا تھا۔ تب تک میں نے نمودار ہوتے ہی نو وارد کو جھپٹا اور اسے کھینچ کر اندر لے آیا، مگر وہ بجلی کی طرح تڑپا اور اس نے ایک لات روڈلف کے چلا دی جو اس کے پہلو پر لگی اور وہ ایک ہذیانی سی چیخ مار کے پرے جا گرا۔

یہ دوسرے سوٹ پوش کا ساتھی ہی تھا۔ ادھر میری بھی لات چلی جو اس کی پشت پر رسید ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک صوفے پر جا گرا، مگر اس نے اُٹھنے اور سنبھلنے میں بھی مطلق دیر نہ لگائی تھی، جیسے ہی پلٹا، میں اپنے خاموش پستول کی گولی اس کے پہلو میں اُتار چکا تھا۔ اس کے حلق سے اذیت ناک کراہ آمیز چیخ خارج ہوئی اور وہ وہیں تڑپتا ہوا قالین پر گرا۔

''نکل چلو.....'' میں نے روڈلف سے کہا۔ جو لات کھانے کے بعد سنبھل رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ہم دونوں کوریڈور میں تھے۔ پستول میں نے اپنی جیکٹ کے اندر رکھ لیا اور بظاہر عام سے انداز میں مگر قدرے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے دوسری جانب کے زینے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

وہاں سے ہم گراؤنڈ فلور پر آئے اور...... اسی راستے سے بیسمنٹ پارکنگ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہم...... نکاسی والے دروازے سے باہر تھے، جہاں ٹھٹھرا دینے والی ہواؤں کے ساتھ موجوں کی روانی کا شور سنائی دے رہا تھا۔

میں نے پستول سمندر میں پھینکا اور ڈونگا کشتی کی رسی کھولنے لگا۔ بڑی تیزی سے اس میں سوار ہونے کے بعد ہم دونوں کے ہاتھوں میں گویا موٹر فٹ ہو گئی۔ وہ تیزی سے چپو چلانے لگے۔

تاریک ساحل پر آتے ہی ہم اُترے تو میرے کہنے پر روڈلف نے کشتی کو باندھنے کے بجائے کھلا سمندر میں چھوڑ دیا۔ پھر ہم تیزی سے پلٹ کر پام کے جھنڈ کی جانب بڑھ گئے اور وہاں سے مین روڈ پر آ گئے۔

مین روڈ پر ایک معروف مارکیٹ چوراہے پر پہنچ کر روڈلف نے مجھے اچانک ٹھہرنے کا کہا۔

''وہ دیکھو بڈی! ہمارا کیا چٹھا میڈیا پر ظاہر ہو رہا ہے۔'' اس نے ایک جانب اشارہ کیا جہاں عام عوام کی دلچسپی کے لیے ایک بڑی سی دیو قامت اسکرین پر ٹی وی چل رہا تھا اور لوگ باگ اس کے گرد جمگھٹا لگائے، سر اُونچا کیے دیکھنے اور سننے میں محو تھے۔

ہم بھی ذرا قریب ہو کر دھڑکتے دل سے اسکرین کو تکنے لگے۔

ایک مقامی چینل پر بڑی دھواں دھار خبریں فوٹیج اور تبصرے دکھائے جا رہے تھے۔ فلپائنی اور انٹرپول پولیس کے اہلکار ایک طیارے کے پاس کھڑے تھے اور ایک چھوٹی کرین کے ذریعے گوتم بدھ کا مجسمہ اُتارا جا رہا تھا۔

لاشیں بھی نظر آرہی تھیں، قریب ایمبولینس اور پولیس گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ طیارہ وہی تھا جس پر ہم سوار تھے۔

ایک مرد اور خاتون اینکر پرسن بڑے دھنادھن انداز میں خبر دے رہے تھے...... ان کی زبان میرے لیے ہی نہیں بلکہ روڈلف کے لیے بھی اجنبی تھی مگر تصاویر اور فوٹیج اجنبی نہیں تھیں ہمارے لیے...... چونکے ہم تب تھے جب ہم نے ٹوپر کو بھی دیکھا۔ اس کی تصویر اسکرین پر ہائی لائٹ کرتے ہوئے اینکر اس کے بارے میں بھی کچھ بتا رہے تھے۔ اسپیکٹرم کا بھی کچا چٹھا کھولا جارہا تھا کہ کس طرح اس نے دنیا کو اپنی نیک نامی کی آڑ میں بے وقوف بنا کر ان سے پیسے بٹور رہا تھی۔ ایک ایشین مبصر نے تو کھل کر بے لاگ تبصرہ کرڈالا تھا کہ اسپیکٹرم کو درپردہ امریکا کی سرپرستی حاصل ہے اور وہ خود بھی اس کی بالادستی چاہتا ہے۔ نیز اسپیکٹرم سی آئی اے کے لیے بھی ایک ”ٹاؤٹ“ کا کام کرتی ہے۔ جس کا مقصد مختلف ملکوں کے خفیہ راز اڑانا ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

اس کے علاوہ ٹوپر نے اپنا وعدہ بھی نبھایا تھا۔ اس نے میرے اور روڈلف کے حلیے پولیس کو غلط بتا کر بھٹکا دیا تھا۔ بعد میں جو خاکے جاری ہوئے وہ بھی اسکرین میں دکھائے جارہے تھے جو ظاہر میرے اور روڈلف کے چہروں سے بالکل مختلف تھے۔

اس دوران ...امریکا کے ایک مبصر نے جانبدارانہ تبصرہ کرتے ہوئے دفاع کرنے کی لنگڑی لولی کوشش چاہی تھی کہ...... اسپیکٹرم اپنی پیشہ ورانہ کوششوں کے بل بوتے پر اس مجسمے کو بہت پہلے ہی بینکاک کے ایک بڑے گینگسٹر کاسپاکو براڈے کے غاصبانہ قبضے سے بازیاب کرا چکی تھی۔ تاکہ بعد میں وہ اسے تھائی حکومت کے حوالے کرسکے جبکہ کاسپاکو براڈے کو اسپیکٹرم کی ہی کوششوں سے تھائی پولیس کے حوالے کیا جاچکا ہے۔“

اس امریکی تبصرہ نگار اینکر کے اس جھوٹے تجزیے اور خبر پر مجھے ہی نہیں روڈلف کو بھی سخت غصہ آیا۔ ابھی ہم یہ سب دیکھ ہی رہے تھے کہ اسی کا ڈب امریکی اینکر پرسن نے کہا۔

”معزز ناظرین! اب ہم آپ کو اسپیکٹرم جیسی عالمی معتبر تنظیم کے نائب سربراہ مسٹر کالاہان سے بات کرواتے ہیں۔“

میری یک ٹک نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ تب ہی ایک شخص کا چہرہ اسکرین پر ابھرا۔ یہ ایک چوڑے کاندھوں اور مضبوط تن و توش کا مالک شخص تھا۔ مگر اس کی گردن اس قدر مختصر تھی کہ سر جیسے کاندھوں پر رکھا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے وہی جھوٹی بکواس کی جو اس سے پہلے وہ امریکی اینکر پرسن کر چکا تھا اور اسپیکٹرم کی تعریفوں میں رطب اللسان بھی رہا تھا۔

اسپیکٹرم کے نائب کالاہان نے پہلے تو اپنی گھرگھراتی آواز میں اپنی گفتگو کا آغاز حسب توقع تنظیم اور اس کے ”عظیم“ مقاصد پر تعریفوں کے پُل باندھ کر نیا پھر اس کے بعد اس نے وہی کچھ کہا کہ ایک سازش کے تحت اسپیکٹرم کے خلاف پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ اور اس سازش کا اصل کردار......“

یہاں پر میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ اگر یہ میرا نام لے ڈالتا تو میرے لیے کافی مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ میں جیسے اب سرتاپا سماعت بن گیا۔ اگر یہ بدبخت میرا نام لے دیتا تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ میرا امریکی ویزا کینسل یا رد بھی ہوسکتا تھا۔ نہ بھی ہوتا تو شبہے کی زد میں آجانا بھی میرے لیے ایک وبال بن جاتا۔ اس وقت ایکا ایکی میں خود کو جیسے اسپیکٹرم کے رحم و کرم پر محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگا۔ کالاہان یقینا لولوڈش کی اجازت اور اسی کے ایما پر ہی ٹی وی اسکرین پر آیا تھا یا لایا گیا تھا۔

اسی وقت روڈلف نے میرے پہلو میں ہلکی سی چٹکی لی۔ اور سرگوشی میں مجھے اپنا چہرہ مفلر میں ڈھانپنے کا مشورہ دیا اور میں نے فوراً ایسا ہی کیا۔

میرا سینہ جیسے دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

کالاہان کا بیان جاری تھا۔ اس نے میرا نام نہیں لیا تھا۔ مجھے یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔

مجھے یوں لگا جیسے اسپیکٹرم نے مجھ پر یہ ایک ”احسان عظیم“ کیا ہے لیکن اس بدبخت کالاہان نے میرا نام تو نہیں لیا البتہ میرا تعلق غلط طریقے سے عابدہ کے ساتھ جوڑتے ہوئے اسپیکٹرم کے مکروہ کرتوت پر پردہ ڈھانپنے کے لیے زہر اگلنا شروع کردیا اور اسکرین پر عابدہ کی تصویر دکھا دی۔ عابدہ کی تصویر دیکھ کر میں بے حال سا ہونے لگا۔ میری سانسیں رکنے لگی تھیں۔ دل جیسے یکلخت دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اس تخم خنزیر شخص کالاہان نے اپنی غلیظ زبان سے معصوم عابدہ پر یہی الزام لگایا کہ وہ ایک عالمی دہشت گردوں کی ایجنٹ ہے جسے عالمی دہشت گردی کی عدالت

میں مجرم ثابت کیا جاچکا ہے اور اسپیکٹرم کے خلاف سازش میں مصروف ہے (یعنی میں) اس کا ساتھی اور بوائے فرینڈ ہے۔ جو خود بھی ایک دہشت گرد ہے اور اسی نے ہی اسپیکٹرم کے خلاف یہ ساری سازش تیار کی ہے۔ اس کے خلاف خفیہ ادارے حرکت میں آچکے ہیں۔ وہ جلد ہی گرفت میں ہوگا۔ وغیرہ......“

جب کچھ غیر جانبدار رپورٹرز نے کالاہان کو میرا نام پوچھنے اور اسے عالمی میڈیا پر ظاہر کرنے کا کہا تو اس نے کسی مصلحت کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ ایک اور رپورٹر نے جب کالاہان سے یہ سوال کیا کہ...... وقوعے کی جگہ پر اسپیکٹرم کے کارکنوں کی لاشوں کے ساتھ مجسمہ چوروں کی بھی لاشیں برآمد ہوئی ہیں جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ ان دونوں مذکورہ پارٹیوں کے درمیان کوئی ڈیل ہورہی تھی تو اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟“

کالاہان کے پاس اس رپورٹر کے سوال کا جواب وہی تھا، یعنی آئیں بائیں شائیں...... ظاہر یہی ہوتا تھا کہ کوئی بھی اس کی بات پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”کھسک چلو یہاں سے بڈی! اب کچھ ویسا ہی ہورہا ہے، جیسا کہ ہم چاہتے تھے۔“ روڈلف نے میرے کان میں اچانک سرگوشی کی اور میں نے سرہلا دیا۔

ہم انسانوں کے جم غفیر سے نکل کر دور چلے آئے۔

ان خبروں کے بعد اب میرے دل سے ہی نہیں بلکہ ذہن سے بھی یہ خوش گمانی فرو ہوچکی تھی کہ اسپیکٹرم یا لولوڈش...... میری راہ کھوٹی کرنا چاہتے تھے۔ صاف عیاں تھا کہ وہ خود بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ان کے سامنے آؤں۔ گویا وہ اپنے شکار کو اپنی کچھار میں آنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ انہیں اپنی طاقت کا کچھ ایسا ہی غرور اور زعم تھا۔ لیکن میں نے تصویر کا دوسرا رخ بھی جانچنے کی کوشش چاہی۔ کیا خبر ان کے نزدیک کچھ اور مقصد یا مصلحت ہو......؟ مجھے یوں ظاہر کرکے ان کے اپنے کسی مفاد پر ضرب آتی ہو۔ یا اس کی پشت میں کسی کی ”ڈکٹیٹ“ شاملِ حال رہی ہو۔ یوں بھی بھلا ان کے پاس میرے بارے میں کوئی ایسی منفی سرگرمیوں کا کون سا ثبوت تھا؟ پھر عابدہ کے حوالے سے میرا منفی تعلق جوڑنے پر انہیں...... میرے بارے میں ثبوت دینا یوں بھی لازمی ہوجاتا کہ کیا میں واقعی عالمی دہشت گردوں سے تعلق رکھتا تھا؟ جس کا جواب نفی میں ہی ہوتا یوں عابدہ کے سلسلے میں دفاع کی راہ ہموار ہوجاتی، اسی بات کا انہیں ڈر رہا ہوگا۔ جبکہ کاسپاکو کے بارے میں یہ سن کر کہ وہ اس بار بُری طرح پولیس کے نرغے میں آچکا ہے اور طویل مقدمے بازی میں مصروف ہے۔

”کیا سوچنے لگے بڈی؟ جلدی کرو...... اس جزیرے سے ہمیں فی الفور نکلنا ہوگا۔“ میں نے جیسے خود کلامیہ بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”اس سے پہلے کہ پام ریزورٹ کی خبر بھی پھیل جائے۔

”میرا خیال ہے ٹوپر اپنے وعدے پر قائم رہا ہے۔ اس نے پولیس کو سارا کچھ ویسا ہی اور وہی بتایا ہے جیسا کہ اسے ہم نے کہا تھا۔ اس نے ہم پر بہت بھروسا کیا ہے۔“ روڈلف میری بات پر دھیان دیے بغیر بولا۔ وہ کافی خوش نظر آرہا تھا۔ مطمئن تو کافی حد تک میں بھی تھا۔ روڈلف مجھ .... پر اب زیادہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ میرے ہاتھوں اسپیکٹرم کے دو ”بڑوں“ کی ہلاکت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے بھی اب لگتا ہے اسپیکٹرم کے خلاف میرے ہاتھ مضبوط کرنے کے لے ہمت اور کمر دونوں ہی کس لی تھیں۔

”بھروسا تو اسے کرنا ہی تھا۔ کیونکہ اس قدر بیش قیمت اور مذہبی اہمیت کے حامل گوتم بدھ کے مجسمے کو عالمی چوروں کے ہاتھوں میں جانے سے ہم نے بچایا جو تھا۔ اس نے اپنے ذمے دار شہری ہونے کا فرض ادا کیا ہے۔ اب نکلنے کی بات کرو۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ ممکن تھا کہ پام ریزورٹ کے دوسرے تازہ کار واقعے کے بعد پولیس پورے ڈیواؤ میں حرکت میں آسکتی ہے۔“

”بے فکر رہو، بڈی! یہ گوبورا کی طرح چھوٹا شہر یا جزیرہ نہیں ہے بلکہ پورا شہر ہے، ایک جزیرہ نما بڑا شہر۔ یہاں ڈومیسٹک پروازیں بھی چلتی ہیں اور سڑک کا راستہ بھی ہے۔“ اس نے قدرے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”ہمیں اب جانا کہاں ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”منیلا......“ اس نے جواب دیا۔ ”فلپائن کا کیپٹل ہے، وہاں انٹرنیشنل ائرپورٹ ہے۔ جو ”نینوئے اکینو انٹرنیشنل ائرپورٹ“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ Davao (ڈیواؤ) سے تینوں راستے منیلا کی طرف جاتے ہیں۔ بائی روڈ، بائی ائر اور سی پورٹ...... تاہم بائی روڈ دس سے بارہ گھنٹے لگ جائیں گے ہمیں، سمندری راستے سے ایک دو گھنٹے بڑھالو، البتہ ڈومیسٹک پرواز کے ذریعے اگر ہمیں ائربس مل جاتی ہے تو ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم منیلا پہنچ جائیں گے، عام پرواز میں تین گھنٹے کم از کم لگ جائیں گے۔ وہاں سے ہم امریکا کی طرف کسی بھی فلائٹ سے پرواز کرسکتے ہیں۔ جیسے تم کہو۔“

تب ہی میں چونکا۔ وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مجبوراً ذرا آگے ہو کے دیکھ رہا تھا اور جب ہم دونوں کی نظریں آپس میں ملیں تو اس نے فشکوک ڈائل کرنے کے لیے دوبارہ ایک دم پیچھے ہٹنے کے بجائے اسی طرح گردن موڑ کے سامنے دیکھنے لگا۔ پھر پیچھے ہو گیا۔ میں نے نظریں ہٹا لیں اور میری نبضیں دوڑ پڑیں۔ میرا تیس فیصد شبہ نوے فیصد ہو چکا تھا۔

میں نے چاہا تھا کہ اپنے ساتھ بیٹھے روڈلف کے کان میں ایک ہلکی سرگوشی انڈیل دوں تاکہ وہ بھی محتاط ہو جائے، لیکن وہ کم بخت ہنوز اپنے معدے میں اسکاچ انڈیلنے میں مصروف تھا۔ کیا خبر وہ میری بات اور نشے کی پینک میں کوئی اونگی بونگی مار دیتا۔ اس لیے میں نے روڈلف کو مطلع کرنے کا ارادہ بدل دیا۔

اب میں اس مشکوک شخص کی طرف بہت احتیاط سے دیکھنا چاہتا تھا جیسی احتیاط وہ میرے سلسلے میں برتتے ہوئے تھا۔ یوں اب میں ترچھی نظروں سے کام لے رہا تھا۔

اچانک میں نے اسے اپنی سیٹ سے اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے کوئی جنبش نہ کی۔ دل کی رفتار البتہ تھوڑی مجھے اپنی تیز ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ نشستوں کے درمیان سے ہوتا ہوا پیچھے جا رہا تھا اور ناچار مجھے اپنی گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھنا پڑا تھا۔ اس کا رخ کیبن کے دروازے کی طرف تھا۔ وہ شاید ٹوائلٹ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے اسے لابی والے دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رکتے اور عقب میں گردن موڑتے دیکھا تو اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ میں نے اپنا چہرہ اس کی جانب سے گھما کر سیدھا کر لیا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی خالی نشست کے دائیں بائیں بیٹھے افراد کو بغور دیکھا کہ کہیں اس کا کوئی اور ساتھی بھی تو نہیں بیٹھا تھا۔ ایسا کچھ محسوس نہ ہوا تھا مجھے جس سے اس کے ساتھی کا گمان ہوتا۔ اس رو میں باقی تین مسافروں میں ایک جوان عورت بیٹھی کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی، دوسرا ایک چربیلے جسم کا مالک بھاری بھرکم عمر رسیدہ آدمی تھا۔ تیسرا ایک ٹین ایجر لڑکا تھا۔ جو گاہے بگاہے اپنے ساتھ بیٹھی خاتون سے ہنس کر بات کر لیتا تھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ وہ شاید اسی کا ہی بچہ تھا۔ یہ میرا خیال تھا۔ میں نے گردن گھما کر پھر کیبن کے دروازے کی طرف دیکھا، وہ مشکوک آدمی جا چکا تھا۔

میں اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں چل دیے......؟'' روڈلف بوجھل سی آواز میں بولا۔

''ٹوائلٹ......'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

میں نشستوں کے درمیان والی جگہ پر چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا اور اسے کھول کر دوسری طرف آیا۔ یہاں میں نے ایک نوجوان جوڑے کو اٹکھیلیاں کرتے دیکھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے کو ہی نہیں بلکہ اوروں کو بھی یہ جتانے میں محو تھے کہ وہ دونوں کس قدر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کی طرف سے نظر ہٹا کر میں ٹوائلٹ کے حصے میں آیا۔

میری متلاشی نظریں اسی مشکوک شخص کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ ایک جینٹس ٹوائلٹ میں ''آکوپائیڈ'' کے ساتھ مرد کا تصویری اشارہ روشن تھا۔ میں اس کے برابر والے ٹوائلٹ میں گھس گیا۔ مگر اس کا دروازہ ٹائٹ بند کرنے کے بجائے تھوڑا کھلا رکھا۔ اسی وقت مجھے برابر والے ٹوائلٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور میں نے اسی شخص کو وہاں سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ گیا نہیں تھا، کھڑا رہا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگائی تھی اور وہیں کھڑے ہو کے گہرے گہرے کش لینے لگا۔ میں دروازے کی باریک جھری سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک تھا اور چال ڈھال اور بشرے سے ایک خاص قسم کی چابک دستی مترشح ہوتی تھی۔

اسی وقت ایک اور شخص اس سے آن ملا۔ وہ دراز قامت اور مضبوط تن و توش کا مالک تھا۔ دونوں ہی ایشیائی نظر آتے تھے۔ دراز قامت کا چہرہ قدرے لمبوترا اور آنکھیں کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جو میں نہ سمجھ سکا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ دونوں نے مختلف سمتوں کی راہ لی۔ یعنی جہاں سے وہ دراز قامت آیا تھا اس کی راہ پر وہ درمیانی قامت والا مشکوک شخص لوٹ گیا جبکہ اول الذکر نے اس کی جگہ لے لی اور وہ کیبن کی طرف بڑھا۔

دونوں نے نشستیں بدل ڈالی تھیں...... کیوں......؟ میرے ذہن میں سوالیہ نشان اُبھرا۔

میرا خیال درست ثابت ہوا۔ ان دونوں نے اپنی اپنی نشستیں بدل ڈالی تھیں۔ اب وہ دراز قامت آدمی پہلے والے شخص کی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں نے پیچھے سے اسے ایک نظر دیکھا تھا اور پھر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو چونک پڑا...... روڈلف اپنی جگہ سے غائب تھا۔

☆☆☆

تھوڑا چونکنے کے بعد میں نے اس کے اچانک غیاب پر یہی محمول کیا کہ...... شاید اُسے بھی ٹوائلٹ کی ضرورت پڑی ہو۔ میں اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔ میرا دھیان اسی دراز قامت کی طرف تھا۔ میں اب اس کی طرف دیکھنے سے اعراض ہی برتتے ہوئے تھا۔ لیکن ایک موقع پر میں نے بہانے سے کہیں اور دیکھنے کے اُس کی جانب بھی چھچھلتی سی نظر ڈالی تھی۔ وہ میری طرف بالکل بھی متوجہ نہ تھا۔

''ہے بڈی!'' اچانک میرے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا روڈلف اپنی نشست پر براجمان ہوا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے سرسری سے انداز میں اُس سے پوچھا۔

''جہاں تم گئے تھے۔''

''مجھے تو تم وہاں نظر نہیں آئے؟''

''تم اندر ہو گے۔'' اس نے جواب دیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر ہلکی سی سرگوشی میں بولا۔

''اب میری بات دھیان سے سنو! اور ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر مت دیکھنے لگ جانا۔ طیارے میں دو مشکوک افراد موجود ہیں۔''

''اوہو......!'' اس کے منہ سے برآمد ہوا۔ ''میں پہلے ہی تمہارے اس طرح اچانک اُٹھ جانے پر ٹھٹک گیا تھا جو خالی از علت نہ تھا۔'' وہ بولا۔ ''تمہیں کیسے ان پر شبہ ہوا؟'' اس نے آخر میں پوچھا۔

''شراب اور عورت سے ہٹ کر تم اپنے گرد و پیش سے بھی چوکنا رہو تو تمہیں بھی خطرے کا احساس ہو سکتا ہے۔'' میں نے ترشی سے کہا۔

''تت...... تو کیا تم نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا تھا؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ خجل سا نظر آنے لگا۔

''کیا مطلب؟ تم نے جہاز میں بھی کسی کو پھانس لیا تھا؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ قدرے گڑبڑا کر بولا۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ...... کون دو لوگ ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں؟''

''تمہاری یہ بے راہ رو عادتیں کہیں ہمیں کسی بڑی مصیبت میں نہ ڈال دیں...... روڈلف۔'' میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بدستور تلخ لہجے میں کہا۔

''او کے باس! سوری، اب بتا بھی چکو۔'' وہ بدستور خجل ہو کے بولا۔

''ہمارے بائیں ہاتھ والی درمیانی رو کی دوسری سیٹ پر بیٹھا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے سب بتا ڈالا۔

''یہ دونوں اسپیکٹرم کے ایجنٹوں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''میرا اس بارے میں پچاس فیصد خیال بھی نہیں۔'' میں بولا۔

قارئین متوجہ ہوں

چند عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی تھیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

''کیا......؟'' روڈلف کا منہ کھل گیا۔ ''تو پھر یہ کون ہوسکتے ہیں؟''

''کہوتو ان سے جاکر پوچھ لوں کہ آپ ہمارے کس دشمن سے تعلق رکھتے ہیں؟''

''خوشی ہوئی تمہاری زندہ دلی پر بڈی! لیکن بتاؤ تمہاری زیرک دماغی کیا کہتی ہے ان کے بارے میں......؟'' وہ ہولے سے ہنس کر بولا۔

''اس کا ابھی مجھے اندازہ نہیں ہوسکا ہے۔ بس! تم محتاط رہنا۔ اس کا دوسرا ساتھی کچھ زیادہ ہی ہوشیار بن رہا ہے۔ ہماری طرف ایک بار بھی اس نے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا، شاید اس کے ساتھی نے اسے بتادیا کہ ہمیں بھی اس پر شبہ ہوگیا ہے، اسی لیے اس نے سیٹیں ایکسچینج کرلی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہوم......'' اس نے ہنکارا بھرا۔

ٹھیک پچاس منٹ بعد اعلان ہوا کہ کچھ دیر بعد ہم منیلا کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ ہم نے سیٹ بیلٹس باندھ لیے۔

منیلا کا ائرپورٹ ماڈرن، خوبصورت اور نہایت دیدہ زیب تھا۔ روڈلف نے مجھے بتایا کہ یہاں غیرملکی پروازیں آتی رہتی ہیں۔ جن میں اکثریت یورپین اور امریکی مسافروں کی ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر صحیح معنوں میں کسی نیم مغربی ائرپورٹ کا گمان ہوتا تھا۔ میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ یہاں کے لوگوں نے مغربی لباس پہنے ہوئے تھے۔ کام کرنے والوں میں اکثریت خواتین کی تھی۔ جو اسمارٹ اور میک اپ سے آراستہ بالکل مغربی رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاصی گہما گہمی تھی مگر ایک پُرسکون سی خوشگواریت کا احساس ہوتا تھا۔

کسٹم کا عملہ بہت چاق چوبند اور تازہ دم نظر آرہا تھا۔ کسٹم سے جلدی چھٹکارا پانے کے بعد ہم... ایک اور کاؤنٹر ٹیبل کی جانب بڑھ گئے۔ میری گردشی نظریں سریع الحرکت کے ساتھ ان دونوں مشکوک افراد کی متلاشی رہی تھیں، مگر وہ دونوں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے، تاہم میں نے اپنی ''کوشش'' جاری رکھی تھی۔

اس کاؤنٹر ٹیبل پر کافی مسافر کھڑے تھے۔ جن میں فلپائنیوں کی اکثریت تھی۔ ہمارے پاس کوئی خاص سامان نہ تھا ماسوائے دو عدد شولڈر بیگ کے۔ وہ کاؤنٹر پر رکھ کر کھولا اور چیک وغیرہ کیا گیا اس کے بعد...... ہمارے سفری کاغذات چیک ہوئے۔ میرا دل نامعلوم اندیشناک خیالات سے بُری طرح دھڑکنے لگا تھا کہ کیا خبر کاساپوکو نے کوئی گل کھلا دیا ہو، اگرچہ یہ اس قدر فوری ممکن تو نہیں نظر آتا تھا لیکن جب حالات غیریقینی ہوں تو ایسی سوچیں تشویش زدہ تو رکھتی ہی ہیں۔

بہرکیف...... ایسا کچھ نہ ہوا اور کسٹم کا مرحلہ بہ خیر و خوبی طے ہوگیا۔ یوں ہم بھی دیگر مسافروں کی طرح، جو سامانوں سے بھری ہوئی ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے مسافر لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے، ان میں شامل ہوگئے۔

میرا خیال تھا کہ حسب سابق ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی ایشیائی ملکوں کی طرح ٹیکسی والوں کی یلغار ہوجائے گی۔ کوئی ہمارا بیگ چھینے گا تو کوئی بازو دبوچے گا اور لپٹ ہی جائے گا۔ اس دھینگا مشتی سے نجات کے بعد بھاؤ تاؤ کا مرحلہ آئے گا۔ مگر باہر آکر مجھے حیرت ہوئی، ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ بہت سی ٹیکسیاں ایک لمبی قطار میں کھڑی تھیں اور باری باری آکر مسافروں کو لے جارہی تھیں۔ کوئی دھکم پیل یا زبردستی نہیں، نہ شور نہ غل غپاڑا۔ بڑی خاموشی سے ایک ٹیکسی رکتی، مسافر اس میں سوار ہوتے اور پھر اس کی جگہ دوسری ٹیکسی لے لیتی۔ یہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ... فلپائن بلاشبہ ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہوچکا ہے۔

میری متلاشی نظریں کچھ لمحوں کے لیے بھٹکی تھیں مگر ایک بار پھر وہ گردش کرنے لگیں۔ وہ دونوں ہنوز غائب تھے۔ میں اسی میں ہی اُلجھا ہوا تھا کہ روڈلف نے ٹھوکا دیا۔

''لگتا ہے بڈی! تم منیلا آکر اس کے حُسن میں کھو گئے ہو؟''

''یار! تمہیں حُسن کی رنگینیوں کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا؟'' میں نے اسے گھورا۔ ''میں ان دونوں کو تلاشنے کی کوشش کررہا ہوں، تم بھی اپنی نظریں رعنائیوں سے ہٹا کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرو۔ مت بھولو کہ اس وقت اسپیکٹرم نے تمہارے ایک طرح سے ڈیتھ وارنٹ جاری کررکھے ہیں۔'' میری اس طرف توجہ مبذول کروانے پر روڈلف کی آنکھوں سے واقعی خوف جھلکنے لگا۔ اس کا چہرہ ست کررہ گیا۔ لیکن پھر جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور نہایت سنجیدگی سے بولا۔

''اوکے بڈی!......''

''چلو اب آگے بڑھو اور اپنے گرد و پیش سے از حد محتاط رہو۔ ہم سیر کرنے نہیں آئے ہیں۔'' میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے لباساتھ ہی ایک تپا ہوا مختصراً تبصرہ بھی کر ڈالا۔

ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' یہ درمیانے قد کا گنجا آدمی تھا جو طیارے میں سب سے پہلے مجھے مشکوک دکھائی دیا تھا۔ دوسرا اس کا دراز قامت ساتھی روڈلف کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اس سے ہاتھ ملاچکا تھا۔

اس کے منہ سے کاساپوکو کا نام سنتے ہی مجھے اپنے وجود میں ایک سنسنی کا احساس ہوا۔ تب ہی کچھ سوچ کر میں نے ایک گہری سانس خارج کرکے اس کا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ تاہم مجھے یہ سن کر ایک ناخوشگوار حیرت بھی ہوئی تھی کہ کاساپوکو پولیس کی گرفت میں تھا۔ ممکن تھا، وہ ضمانت یا پیرول پر رہا کردیا گیا ہو۔ کوئی معمولی آدمی تو وہ بھی نہیں تھا۔

''کیا باس یہاں آئے ہوئے ہیں......؟''

یہ تسلی ہوتے ہی کہ ان کا تعلق اسپیکٹرم سے نہیں تھا، جواباً میں نے بھی دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ چلو، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔'' اس نے گہری متانت سے کہا۔ ہلکی مسکراہٹ اب اس کے پتلے پتلے ہونٹوں سے یکسر غائب ہوچکی تھی۔ روڈلف میری طرف ہی دیکھ رہا تھا جیسے منتظر ہو کہ میں کیا کرتا ہوں۔

میں بلاتردد ان کی کار میں جا بیٹھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور براجمان تھا۔ وہ بھی ان کا ساتھی لگتا تھا۔ دراز قامت اگلی سیٹ پر اور ہم تینوں عقبی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

''ہاں سے میں خود بھی بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر افسوس مجھے کوئی موقع ہی نہ مل پایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اور...... اس میں ہمارا نہیں، حالات کا قصور تھا۔'' جانے کیا سوچ کر روڈلف نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا تھا۔

کاساپوکو سے متعلق پیش آمدہ حالات میں مجھے بغیر کسی ''گڑبڑ'' کے کیا کرنا تھا، اس کی ''کھچڑی'' میں پہلے ہی سے بناچکا تھا۔ کیونکہ ابھی میں ان سے لڑائی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

ہمارے ساتھ بیٹھے درمیانی جسامت والے نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ جانتا تھا کہ ان کے کوٹ کی جیبوں میں بھرے ہوئے پستول موجود ہوسکتے تھے۔ میرا یہ خیال مغالطے پر ہرگز مبنی نہ تھا کہ جب تک میں کسی بھی ایشین کنٹری میں ہوں، کاساپوکو سے نہیں بچ سکوں گا۔ تاہم ایک خوف ضرور تھا کہ کہیں کاساپوکو مجھے میرے سفری کاغذات سے نہ محروم کردے جو میرے لیے امریکا کے لیے پروانہ

''تمہارے اس حریص پن پر مجھے کبھی کبھی بے حد حیرت ہوتی ہے۔ تم خود اس سے زیادہ ایک آزاد معاشرت والے ترقی یافتہ ملک سے تعلق رکھتے ہو جہاں ان ساری خرافات کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ پھر بھی تم......؟'' میرا جملہ ادھورا ہوتے ہوئے بھی مکمل تھا، جس مطلب سمجھتے ہوئے روڈلف مسکرا کے بولا۔

''ایک بات کا جواب دو بڈی! انسان کا کبھی دولت سے پیٹ بھرا ہے......؟ خواہ وہ کتنا ہی امیر کبیر ہو مگر تب بھی اس کی حرص بڑھی ہوئی ہی ہوتی ہے۔ بس! یہ بھی وہی چکر ہے۔ اب یہ بتاؤ چلنا کہاں ہے؟''

''کسی قریبی ائرپورٹ ہوٹل......'' میں نے کہا۔

''بہت مہنگا پڑ جائے گا یہ...... پانچ کونوں والے ہوٹلوں سے کم نہیں ہوتے یہ......''

''تو پھر تم بتادو کوئی درمیانے درجے کا ہوٹل......''

''چھوڑو...... آگے کہاں جائیں۔ ہم نے اِدھر سے ہی دوبارہ امریکا پرواز کرجانا ہے۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''کاساپوکو کا پیسا زندہ باد......'' کہتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ میں بھی ہنستے ہوئے سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ ٹیکسی والے سے بھاؤ تاؤ میں مصروف ہوگیا۔ حالانکہ ائرپورٹ ہوٹل کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اچانک ایک کار کے ٹائر چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ میں ہی نہیں ٹیکسی ڈرائیور سے جھک کے بات کرتا ہوا روڈلف بھی چونک کر سیدھا ہوا۔

وہ ایک لمبی سی سیاہ کار تھی جو ٹیکسی کے بالکل عقب میں رکی تھی۔ کسی فوری ممکنہ خطرے کو بھانپتے ہی میرے جنگجوانہ اعصاب یکلخت تن گئے۔ میری تیز نظروں نے کار سے دو افراد کو اُترتے دیکھا۔ دونوں غیرمسلح تھے اسی لیے میں نے بھی خود کو ذرا جام رکھا۔ ورنہ تو میں ان پر اُچھل پڑنے کا ارادہ کرہی چکا تھا۔ یہ دونوں وہی مشکوک افراد تھے جنہیں میں طیارے میں دیکھ چکا تھا۔

وہ دونوں قریب آگئے اور دوستانہ مسکراہٹ سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔ ٹیکسی والے نے جانے کیا سمجھا کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اپنی ٹیکسی آگے بڑھا لے گیا۔

''آپ کی تعریف......؟'' میں نے ابھی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی جانب نہیں بڑھایا تھا اور میرا دل کسی ممکنہ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''ہمیں دوست سمجھو...... کاساپوکو نے تم سے کچھ

راہداری کا وجود رکھتے تھے۔

جواب نہ ملنے پر میں بھی سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ بہ ظاہر کار کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک مقصد راستوں سے شناسائی بھی حاصل کرنا تھا۔

ہماری کار ائرپورٹ سے روانہ ہو کر مختلف کھلی وطویل شاہراہوں اور سبزہ زاروں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ شہری آبادی کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس دل فریب مگر شہرِ خرابہ کے خدوخال میری نظروں میں واضح ہونے لگے جس کی ابتدا میں تو...... غریب اور متوسط طبقے کے لوگ روزمرہ کے کاموں میں مصروف دکھائی دیے۔ تاہم ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ یہاں انتہائی غریب یا مفلوک الحال شخص کوئی بھی نہیں نظر آتا تھا۔ یا پھر اس کی وجہ ان کے چہرے اور جسمانی ساخت تھی اور ایک حد تک ان کا لباس بھی۔ کیونکہ صورت وشکلوں سے یہ سبھی صحت مند اور ہشاش بشاش دکھتے تھے۔ جبکہ مدقوق ومریل خال خال ہی تھے۔ عجیب بات ایک یہ بھی مجھے دیکھنے میں آئی کہ یہ سب قد و قامت اور جسامت میں بھی قریب قریب ایک ہی جیسے تھے۔ یعنی متوسط گھٹے ہوئے مضبوط جسم، پستہ قد، گندمی یا پھر زردی مائل سپید رنگت۔ بال سیاہ آنکھیں کالی۔ مرد حضرات قمیص پتلون اور بش شرٹ، کیکس لگی پینٹ پہنے ہوتے اور خواتین نے عموی طور پر اسکرٹ، جینز اور بلاؤز پہنے ہوئے تھے۔ یا پھر مردانہ حلیے میں ہوتیں۔ لمبے بالوں والی کم ہی تھیں۔ البتہ تراشیدہ زلفوں کا یہاں عام رواج نظر آتا تھا۔ شنید تھی کہ یہاں کے مرد وزن بہت محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ایسا نظر بھی آرہا تھا بلکہ مردوں کے مقابلے میں یہاں عورتیں ہی زیادہ کام کرتی ہیں۔

شہری حدود میں پہنچے تو خوش حال منیلا کے آثار مزید نمودار ہوئے۔ سربفلک عمارتیں، کمرشل علاقے، آراستہ و کشادہ سڑکیں، ٹریفک اور زندگی کی چہل پہل گویا... علی الصباح ہی شروع ہو گئی تھیں۔ تھائی لینڈ کی طرح، ان کے شانہ بشانہ جھونپڑیاں اور کچے ٹوٹے بوسیدہ مکانات کا سلسلہ بھی نظر آیا۔ یوں جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہو۔ رہی سہی کسر ان چند "ٹاٹ زدہ" مکانوں کی چمنیوں سے اُٹھنے والی دھوئیں کی لکیروں نے پوری کر دی تھی۔ منیلا کا آسمان صاف اور چمک دار تھا۔ خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ایسا شاید گنجلک آبادی اور بلند عمارتوں کی وجہ سے تھا۔

بقول روڈلف کے...... منیلا چار شہروں کا مجموعہ تھا جبکہ سینٹرل سٹی کو "میٹرو منیلا" کہا جاتا ہے۔

میں اپنے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن کے ساتھ یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے کاسپاکو کو کس طرح مطمئن کرنا ہوگا؟ اس نے مجھ پر بھروسا کر کے دو اہم ذمے داریاں بلکہ اپنی دو متاعِ کل داؤ پر لگا رکھی تھیں۔ ایک تو وہ روپیہ جس کے بل بوتے پر اس نے مجھے ملٹی پل ویزا دلوا کر پلک جھپکتے ہی عالمی آوارہ گرد بنا ڈالا تھا۔ دوسرے یہ کہ گوتم بدھ کا مجسمہ ہاتھ سے نکلا چلا گیا تھا۔ لہٰذا اب مجھے کاسپاکو کو نئے انداز میں چکر دینا تھا جس کے لیے میں سمجھتا تھا کہ حالات غیر موافق نہیں تھے۔ اسی سبب میں بغیر کسی حجر مجر کے...... ان کے ساتھ چل دیا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد گاڑی ایک سفید رنگ اور نیلی چھتوں والے مکان کے گیٹ کے سامنے جا رکی۔ گیٹ کو ریموٹ سسٹم کے ذریعے کار میں بیٹھے بیٹھے ہی ڈرائیور نے کھولا تھا اور پھر کار اندر لا کر وسیع پورچ میں روک دی۔

ہم نیچے اتر آئے۔ وہاں ایک عورت نظر آئی، اندرونی داخلے کا دروازہ اسی نے ہی کھولا تھا۔ اس نے اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ شکل وصورت عام سی تھی۔ ہم اندر آ کر صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ یہ نیچی چھت والا خاصا کشادہ کمرا تھا۔ وہ تینوں ہمارے ساتھ ہی اندر آ گئے تھے۔ روڈلف کا چہرہ کچھ ستا ہوا تھا۔ وہ شاید کاسپاکو اور اس کے ہرکاروں سے خوف زدہ سا تھا۔ پریشان اور تشویش زدہ تو میں بھی تھا۔ تاہم میری حکمت عملی ایسی تھی کہ مجھے ابھی ان سے بگاڑ پیدا کرنا مناسب نظر نہیں آرہا تھا، جب تک کہ کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

اسی وقت درمیانی قامت والے گنجے نے فون ملا کر میری طرف بڑھا دیا۔

"باس سے بات کرو..." مجھے فون تھماتے ہوئے اس نے کہا۔

میں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے فون لے کر اپنے کان سے لگایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ "ہیلو باس!" کہا تو دوسری جانب سے پہلے تو مجھے سانپ جیسی پھنکاریں سنائی دیتی رہیں، جیسے کاسپاکو مجھ سے مخاطب ہونے کے لیے اپنے طیش پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے بعد اسی سے مشابہ اس کی غراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

"میں نے زندگی میں آج تک اپنے سوا کسی پر بھی بھروسا نہیں کیا شہزی! لیکن تم وہ واحد آدمی تھے جس پر میں

نے اس قدر اعتماد کیا اور اس کا اتنا ساتھ بھی دیا۔ خدا کرے کہ یہ کوئی دھوکا نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا تم نے میرے ساتھ کرنے کا سوچا بھی ہے تو تم نے اپنی زندگی کی بہت بڑی اور آخری غلطی کی ہے۔"

اس کی بات مکمل ہوئی اور مجھے اس کے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سنسناتی ہوئی سفاک دھمکی نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی۔ میں نے وجود میں دوڑتی ہلکے ہلکے خوف کی لہروں پر قابو پاتے ہوئے پورے اعتماد اور اطمینان سے اسے جواب دیا۔

"یس باس! آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک بات میں بھی بتائے دیتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی کے زیرِ تسلط کام نہیں کیا۔ نہ ہی کسی کا احسان لینا چاہا ہے۔ آپ ہی وہ واحد آدمی ہیں جسے باس کہتے ہوئے مجھے ماتحتی کا ہی نہیں بلکہ ایک دوستی کا بھی خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر اگر آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی یا غلط فہمی پیدا ہونے لگی ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے۔" یہاں میں نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا اور پھر آگے بولا۔

"میں خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ اس کا مجھے موقع نہ مل سکا۔"

"مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو گیا اور کیسے ہوا......؟" دوسری جانب سے اس کی ہنکاتی ہوئی آواز ابھری۔ "لیکن یاد رکھنا شہزی! تمہاری بات سے میری تسلی ہو گئی تو ٹھیک، ورنہ اپنے عبرت ناک انجام کے لیے تیار رہنا۔" اس نے ایک بار پھر دھمکی سے کام لیا تو میں نے بھی تحمل اور مفاہمت کا دامن نہ چھوڑا۔

"صفائی کا موقع دینے کا شکریہ باس! لیکن ایک درخواست آپ سے ضرور کروں گا کہ آپ کو بھی سچائی کھلے دل سے تسلیم کرنا ہوگی تا کہ بگڑے ہوئے کام کو سنوارنے کا موقع مل سکے۔" میں نے دانستہ آخر میں "لولی پاپ" دینا ضروری سمجھا تھا۔

"سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ بگاڑ کی ابتدا یہاں سے نہیں بلکہ بینکاک سے روانگی کے وقت ہی ہو گئی تھی۔ آپ کے کسی باغی ساتھی یا دشمن نے بینکاک کی پولیس کو ایک گمنام فون کر کے چوری شدہ مجسمے کے بارے میں مطلع کر دیا گیا تھا۔ ڈین اور جیڈ نے آپ کو بھی اس کی اطلاع دی تھی۔"

"لیکن...... تب تک تم لوگ نہ صرف تھائی لینڈ بلکہ کو مانگو کے جزیرے سے نکل جانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔" کاسپاکو نے میری بات کاٹ کر درمیان میں کہا۔

"اور...... گومبورا بھی پہنچ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ڈین کی آخری اطلاعات کے مطابق ڈیل آخری مرحلے میں تھی کہ...... پھر ایک دم اتھاہ خاموشی چھا گئی۔ اب ٹی وی پر خبریں آرہی ہیں...... جس کے مطابق ہمارا سارا منصوبہ پانی بن کر بہہ چکا ہے۔ کیا تم نے لالچ میں آ کر مخالف پارٹی سے ساز باز کر لی تھی؟ روڈلف کو تم اسی لیے مجھ سے سفارش کر کے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے؟ جواب دو...... مگر تسلی بخش......" کاسپاکو کا غصہ اور جہنم زدہ سا طیش رفتہ رفتہ آسمان کو چھونے لگا۔

اس بار میں نے طمانیت کی سانس لی تھی۔ کیونکہ اس کی ساری باتوں کا جواب میرے پاس تھا۔ "باس! میرا سر آپ کے لیے حاضر ہے۔ کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ میں آپ کو مطمئن کر لوں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ...... اگر میں نے مخالف پارٹی سے کوئی ساز باز کر لی ہوتی تو آج میں یہاں منیلا میں بے سروسامانی کی حالت میں آپ کے آدمیوں کے پاس نہیں ہوتا۔ آپ نے ٹی وی پر خبروں میں یہ تو دیکھ لیا کہ مجسمہ فلپائنی اور انٹرپول پولیس کے قبضے میں جا چکا ہے، لیکن شاید ابھی تک آپ کی نظروں سے یہ خبر نہیں گزری کہ جن لوگوں نے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی، وہ سب اپنی اعلیٰ قیادت کے ساتھ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتارے جا چکے ہیں۔ ڈیواؤ کے پام ریزورٹ میں جوشوا اور اسٹاربک کی لاشوں کو سمیٹا جا رہا ہوگا اور یہی نہیں گومبورا میں بھی ان کے ساتھیوں کے قاتلوں کی پولیس کو تلاش ہے۔"

"ہاں! یہ میں سب سن اور دیکھ چکا ہوں......" دوسری جانب سے کاسپاکو کی پہلی بار کچھ ٹھہری ہوئی آواز اُبھری تھی۔ درحقیقت قسمت نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ دیا تھا۔ اس طرح کہ جو کچھ ہوا وہ سب میرے مفاد میں ہوتے ہوئے اس طرح وقوع پذیر ہوا تھا کہ میری پوزیشن ازخود صاف ہوتی چلی گئی تھی۔ کاسپاکو کو بھی اس کا احساس ہوگا کہ معاملہ میری طرف سے نہیں بلکہ دوسری طرف سے بگڑا ہے لیکن وہ...... مجھے پرکھنے کے لیے اندھیرے میں تیر چھوڑ رہا تھا۔

"سارا بگاڑ آپ کے اُس باغی ساتھی موتو کی مخبری کی وجہ سے ہی ہوا تھا باس!" میں نے دل ہی دل میں اُبھرنے والی مسرت کی لہروں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "جس سے

مخالف پارٹی نے فائدہ اُٹھانا چاہا تھا لیکن میں نے ان کا منصوبہ تو ناکام بنا ڈالا، مجسمہ نہیں بچا سکا۔ حالانکہ بڑی مشکلوں سے اپنی جانوں پر کھیل کر ہم کوماگو جزیرے سے اس طیارے میں وہ مجسمہ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور یہاں گومبورا کے جزیرے تک بھی ہم بہ خیر و عافیت پہنچ گئے تھے مگر جیسے ہی ان کی اعلیٰ قیادت جوشوا اور اسٹاربک کو تمہاری گرفتاری کا علم ہوا ان کی نیت میں پھر فتور جاگا اور انہوں نے ہمارے سامنے ڈین اور جیڈ وغیرہ کو گولی مار کر ہلاک کر ڈالا مگر روڈلف اور میں ان کے مقابلے پر اتر آئے اور انہیں ہلاک کر ڈالا۔"

"تمہیں پھر اسی طیارے میں فلائی کر جانا چاہیے تھا جس میں مجسمہ لوڈ تھا، ایسا کیوں نہیں کیا تم نے.....؟" کاساپاکو نے درشتی سے کہا۔

"یہی ایک راستہ تھا ہمارے پاس باس!" میں نے فوراً کہا۔ "لیکن..... تب تک بینکاک کی پولیس انٹرپول اور فلپائنی پولیس سے رابطہ کر کے ہمارے بارے میں انہیں مطلع کر چکی تھی۔ اور پھر طیارے میں فیول کا بھی مسئلہ تھا۔ پولیس کے ہیلی کاپٹر گومبورا کے آسمان پر پرواز کرتے نظر آئے تو ہم نے وہاں سے فرار کی راہ لی تھی۔"

"پولیس کو کیسے پتا چلا کہ یہ ڈیل گومبورا کے جزیرے میں ہو رہی ہے؟" اس نے اگلا سوال ٹھونکا۔ میں بھی اسے بلا تامل جواب دیتا جا رہا تھا۔ وجہ ظاہر تھی کہ میں جانتا تھا وہ مجھ سے اس قسم کی بازپرس کر سکتا تھا جس کے جوابات میں نے بھی پہلے سے ہی اپنے ذہن میں سوچ رکھے تھے۔ معاملہ اب اُسے مطمئن کرنے کا تھا۔ لہٰذا یہ ترنت بولا۔

"اس کی وجہ وہی ہے جو میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں، یعنی آپ کے ایک باغی ساتھی کی مخبری "

"وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم ..." میں نے جھوٹ بولا۔ سچ بولتا تو ساپچی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے محبوب موتو کے حوالے سے تب تک خطرے میں ہی تھی جب تک کہ وہ کاساپاکو کی رکھیل بنی ہوئی تھی۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی جس کی وہ اب تک سزا بھگتتے ہوئے تھی اور میں مزید اس کا کوئی دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے "غدار" کے نام والی گیند کاساپاکو کی کورٹ میں پھینک دی تھی۔

"ہوں ں ..! خبروں میں ٹوپر نامی ایک شخص کے بیان کے مطابق..... آخری ہنگامہ اور قتل و غارت اس کے مکان میں ہوئی تھی۔ جس نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ..... اسپیکٹرم نامی کسی عالمی معتبر تنظیم کے کارکنوں سے تمہاری جنگ ہوئی تھی اور اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مجسمے کو عالمی چوروں کے قبضے میں جانے سے بچانے والے جو آدمی اس نے اپنے بیان میں بتائے تھے، وہ تم دونوں کے علاوہ کون ہو سکتے ہیں۔ یقیناً اس میں تمہاری ہی ہدایت کارفرما ہوگی کہ اس نے پولیس کو تم دونوں کے غلط حلیے بتائے۔ جواب دو۔"

"ہمارے پاس اپنی گلوخلاصی میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا باس!" میں نے پورے اعتماد سے اور تھوڑا سچ کا تڑکا لگا کر جواب دیا۔ "کیونکہ پولیس ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ اسی لیے مجھے اس مقامی آدمی ٹوپر کی ہمدردی لینے کے لیے یہ جھوٹ بولنا پڑا تھا کہ ہم نے مجسمے کو چوروں کے قبضے میں جانے سے بچایا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ میری یہ چال کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ ٹوپر نے پولیس کو ہمارے غلط حلیے بتائے تھے۔"

دوسری جانب سے چند ثانیوں کے لیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی، یوں لگا جیسے کاساپاکو میرے بارے میں کسی شش و پنج کا شکار ہو گیا ہو۔

اس کے بعد اس کی ایک گہرا ہنکارا لیتی آواز اُبھری۔

"اچھا ٹھیک ہے! تم ایسا کرو۔ سب سے پہلے اپنے سفری کاغذات میرے ان آدمیوں کے حوالے کرو اور ان کے ساتھ پہلی فلائٹ میں بینکاک پہنچو۔" اس نے نیا حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔ "میرے آدمی کو فون دو....."

"لل ... لیکن ... باس!" میں نے کچھ کہنا چاہا تو دوسری جانب سے..... کاساپاکو کی پھنکارتی ہوئی آواز اُبھری

"میں کہتا ہوں میرے آدمی کو فون دو..."

میرے وجود میں ایکا ایکی سنسنی کی لہر دوڑتی چلی گئی کیونکہ میں اس کا یہ حکم ماننے سے یکسر قاصر تھا۔ آنے والے لمحات ایک بار پھر کسی خوں ریزی کا پتا دینے لگے تھے۔ کیونکہ ہماری گفتگو کے آخری الفاظ سے ..... وہاں موجود کاساپاکو کے تینوں ہرکاروں نے پسٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیے تھے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

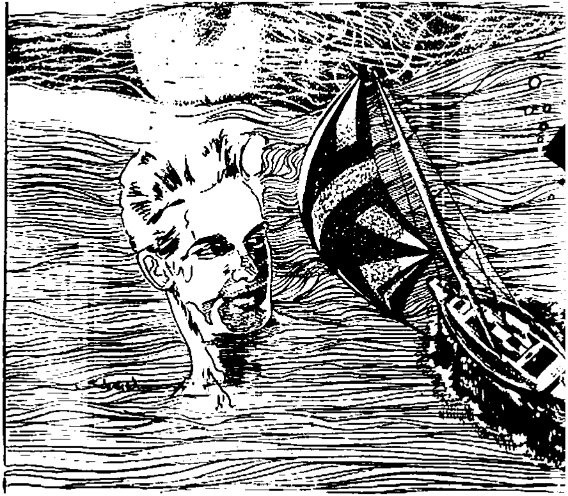

منہ زور

محمد ذوالقرنین خان

شکم کی آگ بڑی جان لیوا ہوتی ہے...اس کا احساس وہی کر سکتا ہے جس نے بھوک کی تپش جھیلی ہو...بھوک و افلاس کے ہاتھوں اپنے لختِ جگر کا سودا کرنے والوں کی دردناک داستان... صحراؤں میں بگولوں کی طرح بھٹکتے کرداروں کی بغاوت... عداوت اور وحشتیں...

قانون شکن اور قانون کے محافظوں کے درمیان ہونے والی جنگ......

جوائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم جس میں ملک کے خفیہ اداروں کے صفِ اول کے تفتیش کار موجود تھے۔ اس وقت ایک کمرے میں جمع تھے۔ اس وقت زیرِ بحث وہ تازہ واردات تھی جو ایک دوست ملک کے سامنے شرمندگی کا موجب تھی۔ شکار کی غرض سے صحرا میں ڈیرے ڈالے دوست ملک کے ایک بہت اہم شخص پر حملہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ موجود دس محافظوں میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔

جس علاقے میں شکار کھیلا جا رہا تھا، یہ کافی پرامن علاقہ تھا۔ برسوں سے دوست ممالک سے مہمان وہاں آ رہے تھے۔ انہیں کبھی کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ ڈاکوؤں کی کارستانی یقیناً نہیں تھی کیونکہ وہ جانتے تھے ایسا کرنے کی صورت میں انہیں حکومت کے عتاب کا شکار ہونا پڑے گا پھر تمام قیمتی سامان جوں کا توں موجود تھا۔ یہ بات بہت تشویش ناک تھی، سیاح پہلے ہی غیر یقینی حالات کی بنا پر یہاں کا رخ نہیں کر رہے تھے۔ اس واقعے کے بعد دوست ممالک سے آئے ہوئے مہمان بھی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ حکومتی یقین دہانی کے باوجود جلد از جلد واپس جانا چاہتے تھے۔ اس سانحے کے بعد عالمی سطح پر ملکی ساکھ داؤ پر لگ گئی تھی۔ تفتیش کار تمام تر رسوخ اور جدید تفتیشی سہولیات کے بعد صرف اتنا جان پائے تھے کہ یہ کام سلطان کے کسی بندے کا ہے۔ سلطان زیرِ زمین دنیا کا ایک بہت تجربہ کار کھلاڑی تھا۔ چہار سو جس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ اس نے پرانا اسلحہ بیچنے سے کام کا آغاز کیا تھا اور آج ایک سیاسی پارٹی اس کے فنڈز پر چلتی تھی۔

☆☆☆

مجم خان سرکاری ریسٹ ہاؤس کے سامنے موجود تھا۔ برف کی سفید تہ نے حدِ نگاہ ہر چیز کو ڈھانپ رکھا تھا۔ شہر سے کچھ سرکاری لوگ آ رہے تھے۔ جن کے استقبال کی ذمے داری اسے سونپی گئی تھی۔ سیاحتی مقام ہونے کی وجہ سے سیاحوں کا بہت رش تھا۔ برف دیکھنے کا شوق لوگوں کو کشاں کشاں اس طرف کھینچ لایا تھا۔ وہ حیران ہوتا کہ اس برف میں ایسا کیا تھا؟ گرم میدانی علاقے چھوڑ کر لوگ ان پہاڑوں میں کیا لینے آتے تھے۔ پیسہ خرچ کر کے ہڈیوں میں سرایت کر جانے والی ٹھنڈ کا سامنا کرنا اور اسے تفریح کا نام دینا اسے یہ منطق کبھی سمجھ نہیں آئی۔ اس وقت بھی وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑا نیچے برف سے اٹی بل کھاتی سڑک کو دیکھ رہا تھا جس پر گاڑیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ برف نے آگے جانے کا راستہ مسدود کر دیا تھا اور اناڑی ڈرائیورز نے پیچھے جانے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ سرکاری مہمان بھی یقیناً وہیں کہیں پھنس کر رہ گئے تھے۔

وہاں کھڑے کھڑے دانت بجانے اور ہاتھوں میں ہوا بھرنے سے بہتر تھا کہ وہ ایک چکر سڑک کا لگا آئے۔ یہ سوچ کر وہ چل دیا۔ وہ حلیے سے تو ان کو نہیں جانتا تھا مگر گاڑی کا نمبر اس کے پاس تھا ویسے بھی اکثر ایسے مہمان لینڈ کروزر میں سفر کرتے تھے۔ وہ ان کو آرام سے تلا[illegible] لیتا۔ یوں وہ اپنے بارے میں اچھا تاثر پیدا کر سکتا تھا۔ دیر چلنے کے بعد اسے ایسی ایک گاڑی دکھائی دے گئی تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ اس سے پہلے وہ اس قریب پہنچتا، گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے اسے حواس با[illegible] دیا۔ وہ جلدی سے ایک گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا فائرنگ تھمی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ میلی سی چادر اوڑ[illegible] گداگروں جیسے حلیے والا ایک شخص اس گاڑی کو گھور رہا ان گولیوں کا نشانہ بنی تھی اور جس کی جانب مجم جا رہا قریب پہنچ کر ایک نظر میں وہ جان گیا تھا کہ آڑھے تر[illegible] خون میں لت پت جسم سرکاری مہمانوں کے تھے۔ اس پہلی دفعہ لاشیں دیکھی تھیں۔ یہ منظر اتنا بھیانک بھی نہیں جتنا وہ سوچا کرتا تھا یا وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک وہ فیصلہ نہیں کر پایا۔

اچانک اسے وہ شخص یاد آیا جو گاڑی کے اردگر[illegible] رہا تھا۔ اب وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ[illegible] سے اس کی جانب لپکا۔ ایک موڑ مڑ کر وہ اسے نظر آ گیا۔ نے بھی اپنے تعاقب میں اٹھتے قدموں کو بھانپ[illegible] تھا۔ گردن موڑ کر ایک قہر آلود نگاہ مجم پر ڈالی اور یکدم[illegible] سے بھاگنے لگا۔ برف میں یوں پستی کی طرف بھاگنا[illegible] وارد کا کام ہی ہو سکتا تھا۔ نپے تلے قدموں کے ساتھ بھاگتے مجم نے اندازہ کر لیا تھا کہ آگے بھاگنے والے قدم بے لگام ہو چکے ہیں۔ وہ ان پر قابو کھو چکا ہے۔ کس[illegible] لیے وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا نیچے کھائی میں جا گرے گا۔ کے قیاس کے مطابق وہ کھائی میں تو نہ گرا بس سڑک پر آ[illegible] کر کنکریٹ کے حفاظتی بلاک سے جا ٹکرایا۔ مجم اس کے[illegible] پہنچ چکا تھا۔

”ہیرو بننے کا بہت شوق ہے؟“ چیتھڑوں میں م[illegible] اس شخص نے ڈپٹ کر پوچھا۔

مجم اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ سیاہ چہرے انتہائی سفید دانتوں والے اس دھان پان سے شخص[illegible] آنکھوں میں ناچتی درندگی نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تو[illegible] میں صرف اس کے پیچھے بھاگے جا رہا تھا۔ یہ تو اس نے[illegible] ہی نہیں تھا کہ وہ خالی ہاتھ ہے اور جس کے پیچھے بھاگ[illegible] ہے وہ ایک خطرناک قاتل ہے، اس نے اتنے تربیت[illegible] لوگوں کو دوسرا سانس لینے کی مہلت نہیں دی تھی، اس اوقات تھی۔

مجم حال ہی میں پولیس فورس میں بطور اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی ہوا تھا۔ کچھ کر دکھانے کی چاہت نے اسے موت کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ کالا بھجنگ شخص لمحوں میں اس کا کام تمام کر سکتا تھا۔ آج اگر وہ زندہ بچ جاتا تو معجزہ ہی ہوتا۔

کوئی چارہ نہ پا کر گندی رنگ کی شلوار قمیص اور ادنیٰ چادر اوڑھے تہی دست مجم نے آواز کو بارعب بناتے ہوئے کہا۔

”تم خود کو میرے حوالے کر دو۔ ہاتھ کمر کے پیچھے کر کے زمین پر لیٹ جاؤ۔“ یہ سن کر اس شخص کا چہرہ مزید سیاہ ہو گیا۔ وہ غرا کر بولا۔

”مگر میرا جرم کیا ہے؟ اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے تمہاری شناخت کیا ہے؟ ایک تو خواہ مخواہ میرے پیچھے بھاگ رہے ہو اور پھر حکم یوں دے رہے ہو جیسے تم پولیس والے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ خواہ مخواہ فقیروں کو تنگ نہ کرو۔“ اس کے ہاتھ جو چادر کے نیچے تھے، وہ حرکت میں آئے تھے۔

یہ دیکھ کر مجم کو شدید سردی میں بھی پسینہ آ گیا۔ سامنے والے کی آنکھیں اس کا خود پر یقین متزلزل کر رہی تھیں۔ چھٹی حس بار بار اسے وہاں سے بھاگنے کے لیے اکسا رہی تھی۔ اب اس کی نگاہیں بوسیدہ چادر میں نہاں اس کے ہاتھوں کی جانب تھیں جن میں یقیناً آتشی اسلحہ تھا۔

اسی وقت اوپر پہاڑی کی طرف جاتی پولیس وین غیبی مدد ثابت ہوئی۔ جو مجم کو دیکھ کر رک گئی تھی۔ اس نے جلدی سے اس کی اوٹ لی تو گاڑی میں موجود سپاہی چوکنا ہو گئے۔ سڑک پر گرے شخص پر انہوں نے اسلحہ تان لیا۔ جس نے بازو چادر سے نکال لیے تھے اور ان میں کشکول موجود تھا۔ وہ فائرنگ کی اطلاع پر اوپر جا رہے تھے۔ مجم اور اس مبینہ قاتل کو بھی انہوں نے بٹھا لیا تھا۔ سپاہیوں میں سے کسی کے تاثرات سے نہیں لگتا تھا کہ انہیں اپنے افسر کی بات کا یقین ہو کہ وہ دبلا پتلا فقیر جو پولیس کو دیکھ کر ہی گھگیانے لگا تھا، وہ دارالحکومت سے آئے پانچ افراد کا قاتل تھا اور وہ اتنی آسانی سے قابو میں بھی آ گیا تھا۔ یہ خیال ہی مضحکہ خیز لگتا تھا۔

اس ڈر سے کہیں اُس کا کوئی افسر اس کارنامے کا سہرا اپنے سر نہ سجا لے، مجم نے اپنے صحافی دوست کو اس بات کی اطلاع دے دی۔ جو جائے وقوعہ پر موجود تھا۔ اب سارے کیمروں کا رخ اس شخص کی طرف ہو چکا تھا۔ جس کے بارے میں مجم کا کہنا تھا وہ قاتل ہے اور جو ہر سوال کے جواب میں ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنے لگتا۔ پولیس والوں نے اسے دو چار ہاتھ بھی دکھائے مگر اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔

مجم میڈیا والوں کو بتا رہا تھا، اس نے اپنی آنکھوں سے اسے گاڑی پر فائر کرتے دیکھا تھا۔ چونکہ اس وقت اس کے پاس اسلحہ نہیں تھا اس لیے وہ اسے اس وحشیانہ حرکت سے نہ روک سکا۔ وہ خاموشی سے اس کے تعاقب میں چل دیا مگر قاتل کو خبر ہو گئی اس نے اس پر گولیاں چلائیں مگر اسے اپنے پیچھا کرنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ جب پسٹل میں سے گولیاں ختم ہو گئیں تو اس نے دو بدو مقابلے کے بعد بڑی مشکل سے اس پر قابو پایا۔ اس دوران اس کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔

ملک بھر کے نیوز چینلز اس خبر کو دکھا رہے تھے۔ مجم ہیرو بن گیا تھا۔ ہر کوئی اسے سراہا رہا تھا۔ ہر طرف سے انعامات ..... کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر کوئی اس دوڑ میں شامل ہو چکا تھا۔ اسے پروموشن دینے کے وعدے کیے جا رہے تھے۔ سوشل میڈیا پر اس کی بہادری کے چرچے تھے۔

شرجیل اعظم ارسلان کا نائب تھا اور وفاقی تفتیشی ادارے کا ایک مایۂ ناز افسر تھا۔ ارسلان اور اس کی ٹیم کو... قاتل سے تفتیش کرنے کی ذمے داری اسے سونپی گئی تھی۔ وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ مجم اس انتظار میں تھا کہ کب وہ اسے بلائے اور اس سے اس کے کارنامے کی تفصیل پوچھے مگر شرجیل سیدھا مجرم کے پاس گیا تھا جسے اس سب میں نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد مجم کی طلبی ہوئی تھی۔

”تم یہ کیسے پکڑ لائے ہو؟“ چائے کا سپ لیتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا گیا۔

مجم کو ایسے لہجے میں اس سوال کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ کافی جزبز ہوا پھر وہی داستان سنانے لگا جو وہ بیسیوں مرتبہ بیان کر چکا تھا۔

”سر میں اس دن سڑک پر ارسلان صاحب اور ان کی ٹیم کی تلاش میں گیا تھا جب......“

”یہ سب میں نیوز میں سن چکا ہوں مسٹر مجم۔“ شرجیل نے درشت لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے وہ بات بتاؤ جو سچ ہے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اسی بندے نے فائر کیا؟ یا تم نے اسے وہاں سے بھاگتے دیکھا تھا؟“

”سر حقیقت وہی ہے جو بیان کر چکا ہوں۔“ مجم نے

تلخی سے کہا۔

''شہرت دیکھ کر تمہارے دماغ میں خناس سما گیا ہے۔'' شرجیل کو اس کا انداز ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ ''کوئی ثبوت بھی ہے تمہارے پاس ؟'' شرجیل نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا پکڑا ہوا آدمی ''جو دے اس کا بھی بھلا'' کا آلاپ گا رہا ہے۔ تشدد کر کر کے تم لوگوں نے اسے موت کے قریب پہنچا دیا ہے مگر تم اس سے اپنی مرضی کا بیان تک نہیں لے سکے۔ بقول تمہارے اس نے پستل کھائی میں پھینک دیا جس کا چپا چپا چھان مارا، مگر وہاں سے کچھ نہیں ملا۔ بیٹھ جاؤ، مجھے سب سچ سچ بتاؤ؟'' شرجیل نے اپنی کنپٹی کو سہلاتے ہوئے نرمی سے کہا۔

نجم اپنی بات پر اڑا رہا۔ شرجیل نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

اگلا دن نجم کے لیے بہت بھیانک ثابت ہوا۔ ایک وڈیو سوشل میڈیا پر تیزی سے وائرل ہو رہی تھی جس میں صاف .... دیکھا جا سکتا تھا کہ دو آدمی سڑک پر آگے پیچھے جا رہے ہیں ان میں سے آگے والا پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور تیزی سے بھاگنے لگتا ہے اور اس دوران پھسل کر گر جاتا ہے

اس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی یوں وڈیو بھی بنا سکتا ہے۔ اب اسے ہر نیوز چینل پر جھوٹا فریبی اور نجانے کیا کیا کہا جا رہا تھا۔ اس وڈیو کو بار بار چلایا جا رہا تھا۔

ایک خاتون اینکر چلا چلا کر دہائیاں دے رہی تھی۔

''ناظرین آپ وڈیو میں دیکھ سکتے ہیں۔ نجم خان پر کوئی فائر نہیں ہوا۔ پستل کھائی میں پھینکنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ کوئی دو بدو مقابلہ نہیں ہوا۔ یہ سب من گھڑت کہانی تھی جسے سنا کر نجم خان ہیرو بن گیا ہے۔ اس نے لاکھوں بٹور لیے ہیں۔ پروموشن دی جا رہی ہے۔ ناظرین میں آپ کو بتاتی چلوں کہ حمید نامی معصوم شخص کو مجرم ٹھہرا کر پولیس نے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ اس سے یہ منوانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہی قاتل ہے۔ نجم خان جانتا تھا اس شخص کی مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ اس ملک کو اندھیر نگری سمجھ لیا گیا ہے جس کا جو جی چاہے وہ کر سکتا ہے۔ سچائی سامنے نہ آتی تو اسے پولیس مقابلے میں مار ڈالا جاتا اور اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جاتا۔''

نجم کو معطل کر دیا گیا تھا۔ اس کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا سوشل میڈیا پر الگ اودھم مچا ہوا تھا۔

شرجیل البتہ اس کی کہانی کو ایک مرتبہ اپنے طریقے سے جانچنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ نجم سے دوبارہ ملا تھا۔ نجم نے بلاکم وکاست اسے سب کچھ بتا دیا۔

اب اس نے اس ہوٹل کا رخ کیا تھا جہاں اس گداگر کے اعزاز میں ظہرانہ دیا جا رہا تھا۔ اسے باعزت بری کروا لیا گیا تھا۔ وہاں ہر کوئی اپنی دکان چمکانے کے چکر میں تھا۔ معمول کے مطابق اپنی تقاریر میں پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کو تضحیک کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ بظاہر تو ایسا لگ رہا تھا کہ شرجیل مقررین کو سن رہا ہے مگر اس کا دھیان حمید کی طرف تھا۔ جو ہونق بنا وہاں بیٹھا تھا۔ اس کا بدن ایک ٹارگٹ کلر کی تمام خوبیاں لیے ہوئے تھا۔ حلیہ بھی اس کام کے لیے بہت اعلیٰ تھا۔ کسی کو ہلکا سا شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک بھیک مانگنے والا یوں بھی کر سکتا ہے ارسلان اور اس کے آدمی اسی لیے بے خبری میں مارے گئے ہوں گے مگر اس کے چہرے پر عجیب سی مسکینیت شرجیل کو تذبذب میں ڈال رہی تھی جو ایک قاتل کے چہرے پر اسے کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ اسے یہ بات جاننے میں دلچسپی تھی وہ وہاں سے بھاگا کیوں تھا۔ وہ اس تک رسائی کے لیے درست وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کے ہمدردوں میں سے کوئی اسے گھر لے جانے سے تو رہا۔ ان کی ساری ہمدردی کیمروں کی موجودگی تک تھی۔

شام ہونے کو تھی۔ حمید اڈے پر کھڑا تھا۔ وہ اپنے آبائی علاقے کی طرف جانا چاہتا تھا۔ جب شرجیل گاڑی لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا پروگرام ہے اُستاد؟'' گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے اس نے بےتکلفی سے پوچھا۔

''صاحب گھر جا رہا ہوں۔'' حمید نے بوکھلا کر ٹکٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ میں تمہیں دارالحکومت تک چھوڑ دوں گا۔'' شرجیل نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''صاحب آپ پولیس میں ہو؟'' حمید نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''نہیں یار میں تو ایک صحافی ہوں۔'' شرجیل نے صاف جھوٹ بولا۔ ''آج دعوت میں بھی میں شامل تھا۔''

یہ سن کر حمید کو کسی قدر اطمینان ہوا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''صاحب یہ پولیس والے بہت ظالم ہوتے ہیں۔ اللہ سب کو ان سے بچائے۔ مجھے تو مروا دیا تھا بس کوئی نیکی

کام آ گئی۔'' حمید کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''مگر تمہیں گاڑی کے قریب جانے کی کیا ضرورت تھی۔ خوامخواہ تم نے انہیں شک میں مبتلا کر دیا؟'' شرجیل نے پتا پھینکا۔

حمید کے جواب نے مگر اسے چکرا کر رکھ دیا۔

''صاحب آپ ان پولیس والوں کی بات کا یقین کرتے ہیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ چھ مہینے کی کمائی کو گننے بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ خبیث اوپر کھڑا دیکھ رہا ہے اور پیسے دیکھ کر میرے پیچھے پڑ جائے گا۔ اس دن تو میں اسے چکمادے کر بھاگ نکلا لیکن مجھے کیا معلوم تھا وہ پیسے بھی چھین لے گا اور مجھے پانچ بندوں کا قاتل بھی بنا دے گا۔'' حمید نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''دنیا کیسے کیسے ظالم لوگوں سے بھری ہے؟'' ایک مرتبہ پھر اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

اس نے ایک نگاہ شرجیل پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں دیکھ کر جلدی سے بولا۔

''صاحب میرے پاس کوئی پانچ دس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے تھے۔ در بدر پھر کر کمائے تھے۔ وہ سب لے گیا۔''

شرجیل یہ سُن کر دماغی طور پر الجھ گیا۔ نجم یا تو کوئی بہت بیوقوف شخص تھا یا مسئلہ کچھ اور تھا۔ اتنا بڑا رسک وہ کیسے لے سکتا تھا۔ مرنے والے کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ سب سے بڑی سول ایجنسی کے قابل ترین لوگ تھے۔ وہ حمید کو پولی گراف ٹیسٹ کے لیے لے جا رہا تھا۔ ملک کے مایہ ناز ماہر نفسیات سے اس نے وقت لے رکھا تھا جو ان کی ایجنسی کے لیے بھی کام کرتا تھا۔ اگر حمید کی بات سچ تھی تو نجم کے ساتھ وہ بہت برے طریقے سے پیش آتا جس نے اسے بھٹکا دیا تھا۔

اچانک ایک خوفناک خیال بجلی کے لپکے کے مانند اس کے دماغ میں کوندا۔ وہ جو سوچ رہا تھا ایسا ہونے کی قوی اُمید تھی۔ جو شخص پیسے کے لیے اس حد تک جا سکتا تھا، وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی۔

''حمید تمہیں انصاف ملے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل نکال لیا۔

''صاحب مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ پولیس والے ہو۔ مجھے انصاف نہیں چاہیے۔ میں کبھی ثابت نہیں کر سکوں گا کہ انہوں نے مجھ سے دو لاکھ چھین لیے۔ یہ جو پچاس ہزار مجھے لوگوں نے دیے ہیں، میں ان سے بھی محروم نہ ہو جاؤں۔'' شرجیل کو موبائل پر تیزی سے میسج لکھتے دیکھ کر حمید نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

شرجیل نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے نجم کو فون ملا دیا۔ اسے فوراً اس پیٹرول پمپ پر پہنچنے کی ہدایت کی جہاں وہ اس وقت موجود تھا۔

''میں نے اسے بُلایا ہے۔ ایک ایک پائی تم کو واپس لے کر دوں گا۔ تم بےفکر رہو۔'' ساتھ ہی اس نے حمید کے چہرے پر نگاہ ڈالی وہاں ہلکا سا تفکر دکھائی دے رہا تھا۔

شرجیل نے قریب سے گزرتے شخص کو اشارہ کر کے بُلایا اور اسے دو چائے لانے کا کہا۔

چائے پینے کے بعد حمید کو غنودگی محسوس ہونے لگی۔

''تم کچھ دیر آرام کرو۔'' یہ کہہ کر شرجیل نے اسے سیٹ پیچھے کر کے دے دی۔ اس نے بھی کوئی پس و پیش نہیں کیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

نجم تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ حمید کو گاڑی میں پا کر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ شرجیل اسے کچھ بدلا بدلا دکھائی دیا۔ اس نے بہت روکھے انداز میں اس سے علیک سلیک کی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر بھی تناؤ محسوس کر سکتا تھا۔ بہرحال وہ افسر تھا، نجم سوال نہیں کر سکتا تھا۔ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

شرجیل کے گارڈز پچھلی گاڑی میں فاصلہ رکھ کر ساتھ چل رہے تھے۔ بہت خاص مواقع پر ہی وہ انہیں ساتھ رکھتا تھا اس لیے وہ بہت چوکنے تھے۔ وہ اپنی صاحب کی طبیعت سے واقف تھے، وہ ایک لمحے کی کوتاہی برداشت کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ دارالحکومت سے کچھ فاصلے پر تھے جب اچانک شرجیل کی گاڑی سڑک پر لہرائی اور پلٹیاں کھاتی ہوئی کھیت میں جا گری۔

شرجیل اعظم کو جب گاڑی سے نکالا گیا تو اس کا نرخرا کٹا ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بھی اس کے مرنے کی یہی وجہ سامنے آئی تھی۔ اس کے جسم پر اور کوئی ایسا مہلک زخم نہیں تھا جسے اس کی موت کی وجہ قرار دیا جا سکے۔ حمید اور نجم دونوں زندہ تھے۔ نجم کو نسبتاً کم چوٹیں آئی تھیں۔ وہاں ایسی کسی چیز کا سراغ نہیں ملا تھا جو ایسی تیز دھار ہو کہ تین انچ تک انسانی گلے کو کاٹ سکے۔ تفتیش کا رخ ان دونوں کی جانب موڑ دیا گیا تھا۔ تفتیش کار اب دوسرے خطوط پر سوچ رہے تھے۔

ایک ہفتے میں نجم اس قابل ہو گیا تھا کہ ڈاکٹرز نے اسے تفتیش کاروں کے حوالے کر دیا۔ اس وقت وہ اپنا بیان ریکارڈ کروا رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا، اس دن مجھے شرجیل صاحب نے کیوں بُلایا تھا میں جب وہاں پہنچا تو انہوں نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ حمید ان کے ساتھ والی سیٹ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ شرجیل صاحب نے مجھے بتایا، وہ حمید کو پولی گراف ٹیسٹ سے گزارنے دارالحکومت لے جا رہے ہیں۔ انہیں وہاں میری ضرورت پڑے گی۔ اس کے بعد ہمارے درمیان ... مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب ہم دارالحکومت کے قریب پہنچے تو میں باہر کے مناظر میں کھویا ہوا تھا۔ جب حمید نے شرجیل صاحب پر اچانک حملہ کر دیا۔ شرجیل صاحب نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھ خون سے رنگ گئے تھے۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا، حمید نے ایک دم اسٹیئرنگ گھما دیا۔ گاڑی الٹ گئی۔ اس کے بعد مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔''

یہ سن کر ایک تفتیش کار کو حیرت کا جھٹکا لگا جسے وہ اپنی سخت تربیت کی وجہ سے سہہ گیا۔

مجم کو اس بارے میں نہیں بتایا گیا تھا کہ شرجیل کا گلا کٹا ہوا تھا۔ لہجے میں سختی شامل کر کے وہ تفتیش کار گویا ہوا۔

''مجم صاحب! میں آپ کو بتاتا چلوں کہ حمید کو شرجیل صاحب کے کہنے پر چائے میں ڈی۔ 58 کا ڈوز دیا گیا تھا۔ بارہ گھنٹے سے پہلے وہ خود سے ہوش میں نہیں آ سکتا تھا۔ اسے جب ہاسپٹل منتقل کیا گیا تب بھی وہ مکمل طور پر بے ہوش تھا۔'' اس نے چبا چبا کر کہا۔

یہ سُن کر کچھ دیر کے لیے مجم سکتے میں آ گیا۔

بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا اور بولا۔

''آپ کہیں مجھ پر تو شک نہیں کر رہے۔ مجھے شرجیل صاحب کے ساتھ ایسا کر کے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ میں خود ان کے ساتھ نہیں گیا تھا انہوں نے مجھے خود بلایا تھا۔ آپ ان کا فون دیکھ لیں۔''

''ہم ان کا فون دیکھ چکے ہیں۔ آپ کو بتاتا چلوں آپ کو کال کرنے سے پہلے انہوں نے وہاں موجود اپنے ماتحتوں کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ آپ کو کال کر کے بلا رہے ہیں اگر آپ نہ آئے تو آپ کو زبردستی اٹھا کر دارالحکومت پہنچا دیں۔ میرا اندازہ ہے انہیں آپ کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہوگئی تھی جو وہ اس حد تک چلے گئے تھے۔''

یہ سن کر وہ بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ ہر چیز اس کے خلاف جا رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم انہیں ایسا خیال کیوں آیا مگر میں ان کے پاس اس لیے گیا تھا کہ جب سب نے مجھے دھتکار دیا، وہ میرے گھر آئے اور انہوں نے میری باتوں پر یقین کیا۔ وہ میرے محسن تھے۔'' مجم نے افسردہ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

اب ان کا رخ حمید کی طرف تھا۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حمید نے وہی کیا ہو جو مجم بتا رہا تھا۔

ہوش میں آتے ہی حمید نے سب سے پہلے اپنے پچاس ہزار کا پوچھا تھا۔ جب تک وہ اسے مل نہ گئے اسے چین نہیں آیا۔ اس وقت وہ ہاسپٹل کے بیڈ پر چوکڑی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے دو افسر موجود تھے۔

''میں تو جی سو گیا تھا۔ کافی دنوں سے ڈھنگ سے سو نہیں سکا تھا۔ صاحب نے سیٹ کو پتا نہیں کیسے گھمایا وہ بستر بن گئی۔ پولیس والوں نے تو جی سارے پیسے بھی چھین لیے اور کہتے تھے تُو پانچ بندوں کا قاتل ہے مان جا، تو تجھے سونے کو بستر دیں۔ میں جی کیسے مان لیتا۔ جانتا تھا مان گیا تو بستر کی جگہ پھانسی ملے گی۔'' باآواز چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ تفتیش کاروں کو بتا رہا تھا۔

اب وہ ان سے سوال کر رہا تھا وہ یہاں کیوں ہے؟ اسے چوٹیں کیسے لگیں؟ شرجیل صاحب اور وہ دوسرا بندہ کہاں گئے؟ ایک تفتیش کار کے اشارے پر نرس آگے بڑھی اور پٹی تبدیل کروانے کے بہانے حمید کو لٹا دیا۔

حد درجے تضاد کے باوجود پولی گراف ٹیسٹ میں بھی دونوں پاس ہو گئے تھے۔ تفتیش کاروں کے ہاتھ کوئی سرا ہی نہیں آ رہا تھا۔ مجم اپنی بات پر اڑا ہوا تھا کہ حمید نے شرجیل اعظم کا گلا کاٹا تھا۔ اب تھرڈ ڈگری والا راستہ ہی باقی بچا تھا۔

یعقوب کرائم برانچ کا انچارج تھا۔ جسے یہ کیس سونپا گیا تھا اس نے یہ طریقۂ تفتیش رد کر دیا۔ اس نے حمید کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے کولیگ اس بات پر بہت چیں بہ جبیں ہوئے مگر جب اس نے ان سے پوچھا کہ اس شخص کے ساتھ کیسے پیش آیا جائے جس کے خلاف ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں؟ تشدد سے وہ اگر تسلیم کر بھی لے گا عدالت میں جا کر مکر جائے گا۔ میڈیا نے پہلے ہی اس کے حق میں لوگوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا کر دی ہے۔ اس کا حلیہ دیکھو! کون مانے گا یہ قاتل ہے اور مجم کی بات پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے جسے سارا ملک جھوٹا قرار دے چکا ہے۔ جس پر شرجیل کو یہ شک تھا کہ ارسلان کی پوری ٹیم کو اس نے قتل کیا ہے۔ یا کم از کم مخبری اس نے کی ہے یا اصل قاتلوں سے توجہ ہٹانے کے لیے اس نے یہ چال چلی ہے۔ ہر کوئی یہ

کہہ رہا ہے کہ ہم سارا ملبا ایک گداگر پر ڈال کر بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر باقاعدہ مہم چلائی جا رہی ہے۔ ہم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالیں۔ مجھے تو اس سب میں مجم ملوث لگتا ہے۔ اس اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

اس نے اپنے ایک جونیئر کو مجم کے بارے میں حتی الوسع تمام معلومات حاصل کرنے کو کہا تب تک اسے چھ بائی چھ کے ایک تاریک سیل میں ڈال دیا گیا۔ جہاں اچھے اچھوں کے اعصاب دنوں میں چیخ جاتے تھے۔

وہ جو اپنی نوکری بچانے آیا تھا، وہ تنگ و تاریک قفس کا اسیر ہو چکا تھا۔

عاصم فرخ جو ارسلان کا گہرا دوست تھا اور کرائم برانچ کا ایک قابل افسر تھا یوں حمید کو جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اس کے پیچھے اپنے چار بندے لگا دیے۔ اگلے چند ماہ جو اس پر مسلسل نظر رکھتے۔

حمید ایک شہر سے دوسرے شہر گھومتا صحرا کے قریب موجود ایک چھوٹے شہر میں جا کر ٹھہر گیا۔ دانش اور اس کی ٹیم اس کے تعاقب میں تھی۔ ایک لمحے کو بھی انہوں نے اسے آنکھوں سے اوجھل ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے کام کے بہت ماہر تھے۔ اس کی نگرانی کرتے ہوئے دوسرا مہینہ ختم ہونے والا تھا۔

رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ حسبِ معمول حمید اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا۔ اس کا معمول تھا اس ٹائم وہ چرس خریدنے اور کھانا کھانے بلو ہوٹل جاتا تھا۔ بلو ہوٹل وہیں نالے کے اندر قائم کیا گیا تھا جو شہر بھر کے نشئیوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ وہاں انتہائی کم قیمت پر بہت شاندار کھانا ملتا تھا۔ دانش اور اس کے ساتھی اکثر وہاں کھانا کھانے جاتے تھے۔ حمید چرس کا دیوانہ تھا۔ دانش اکثر سوچتا کہ وہ خبیث مر کیوں نہیں جاتا۔ دیکھنے میں تو یوں لگتا کہ آتا جاتا سانس ہے مگر وہ سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا۔ ڈٹ کر کھانا کھاتا۔ 12، 12 گھنٹے سویا رہتا۔ دانش جب سوچتا کہ نجانے کب تک یوں ہی رہنا پڑے گا تو اس کا سانس رکنے لگتا۔ اس نے بہت خطرناک مشن سرانجام دیے تھے مگر اس طرح کی بیزار کن ڈیوٹی سے پہلی دفعہ سابقہ پڑا تھا۔ ایک بھیک منگے کے لیے اس کی پوری ٹیم کو بھکاری بنا دیا گیا تھا۔ وہ اکتا ضرور گیا تھا مگر اس کیفیت کی بھنک بھی اس نے اپنے کسی ساتھی کو لگنے نہیں دی تھی۔ اس کے ایک ساتھی نے اسے مشورہ بھی دیا کہ حمید کا کام تمام کر کے نکل جاتے ہیں۔ یہ سن کر دانش نے مصنوعی قہقہہ لگایا اور بولا۔

''بیٹا! ہو سکتا ہے وہ ہم میں سے ہی ایک ہو اور ہمیں یہاں اس کی حفاظت کے لیے تعینات کیا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے یہ کوئی امتحان ہو۔ اپنے کام سے ہماری وابستگی اور لگاؤ جانچا جا رہا ہو۔ کسی اہم مشن میں ایجنٹس کو استعمال کرنے سے پہلے اس طرح کے آزمائشی مراحل سے اکثر گزارا جاتا ہے۔ اس کام میں صبر اور برداشت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ عام آدمی یہاں تک ہی نہیں سکتا۔ تم چند ہفتوں میں گھبرا گئے یہاں تو بیس بیس سال کے لیے اسائنمنٹ دے دی جاتی ہیں۔ تمہاری بات مان کر میں اسے ٹھکانے لگانے کی اجازت دوں اور ہم اپنا سب کچھ گنوا بیٹھیں۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے ہم پر بھی نظر رکھی جا رہی ہوگی۔ پل پل کی خبر اوپر والوں تک پہنچ رہی ہو گی۔ اتنا عرصہ گزار لیا ہے کچھ وقت اور سہی۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ گیا کہ کہیں اس کا اپنا ارادہ تبدیل نہ ہو جائے۔

اس کی باتیں سن کر وہ سب سہم گئے اور نئے جوش سے اپنے کام میں لگ گئے اب انہیں یہ سب فضول نہیں لگ رہا تھا۔

دانش نے انہیں وہ بات نہیں بتائی تھی جس سے وہ بہت خوفزدہ تھا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ قربانی کے بکرے ہوں۔ جنہیں بھیڑ کو اس کی بھٹ سے نکالنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہو۔ وہ جانتا وہ جتنے بھی ماہر ہوں، لمبے عرصے تک خود کو چھپا کر نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایک جاسوس کی طاقت اس کا بہروپ ہوتا ہے۔ اسے ڈر تھا حمید اگر ویسا ہی ہوا جیسا انہیں شک ہے تو ان سب کی زندگیاں داؤ پر لگ جائیں گی۔ اس صورت میں حمید کا تعلق یقیناً کسی عام جرائم پیشہ گروہ سے نہیں ہوگا۔ اس نے انٹیلی جنس کے... بہترین افسر قتل کر دیے تھے۔ وہ اب تک جان گیا ہوگا کہ اس پر نظر رکھی جا رہی ہے وہ اس کا سدباب کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ حمید کے ساتھی کسی وقت بھی ان پر شب خون مار سکتے تھے۔ وہ اور اس کے ساتھی بہت احتیاط برت رہے تھے۔ ویسے بھی وہ سب تربیت یافتہ کمانڈو تھے احتیاط اور شک ان کے خون میں شامل ہو چکا تھا۔ مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ بہرحال اس نے یہ ادارہ ان وہموں کو پالنے کے لیے نہیں چُنا تھا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی کہ حمید بلو ہوٹل گیا ہے۔ وہ اس کا دھیان رکھیں تب تک وہ کمر سیدھی کر لے۔ ایک گھنٹا ہی گزرا ہوگا جب اسے وہاں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ صورتِ حال جاننے کے لیے اس نے اپنے ساتھی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف کسی اجنبی نے کال اٹھائی۔

''بھائی صاحب! آپ کے دوست کو گولی لگی ہے۔'' نشے میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ یہ سن کر دانش اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر وہ تیزی سے بلو ہوٹل کی جانب بھاگا۔ گلاک سیون ایمن پسٹل اس کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھی نے بھی اس کی تقلید کی۔

☆☆☆

بنگال کی تباہ حال بستیاں، جہاں سیلاب نے انسانوں کو ان کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ گھر بار مال مویشی سب بہہ گئے تھے۔ انسانی لاشیں یوں بکھری ہوئی تھیں جیسے پولی تھین کے لفافے کسی گندے نالے کے آس پاس پڑے ہوتے ہیں۔ زمین دلدلی تھی۔ اور بچ جانے والے خشک زمین کی تلاش میں میلوں سفر کرنے پر مجبور تھے۔ جیسے ہی کوئی زمین کا خشک ٹکڑا دکھائی دیتا وہاں انسانوں کا جمِ غفیر لگ جاتا۔

کئی ہفتوں سے انہوں نے اناج کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ گھاس پھوس کھا کر زندہ رہنے کا سامان کیا جا رہا تھا۔

تب ساحل پر بڑے بڑے جہاز لنگر انداز ہوئے۔ اناج سے بھرے ہوئے جہاز دیکھ کر بنگالیوں کی زرد آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ لاغر بدن توانائی محسوس کرنے لگے تھے۔

چاول اور مچھلی کی باس انہیں پاگل کیے دے رہی تھی۔ ان کا واسطہ تاجروں سے پڑا تھا۔ جو کچھ لو کچھ دو کے اُصول پر کاربند تھے۔

اناج کے بدلے، وہ ان سے ان کے بچے خریدتے اور انہی جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس کر نامعلوم منزلوں کا رخ کرتے۔

پانچ چھ سال کی عمر کا وہ بچہ اس وقت ایک بحری جہاز کے طبق میں موجود تھا۔ ایک کونے میں سب سے الگ تھلگ خاموش بیٹھا اپنی کالی کالی بڑی آنکھوں سے کسی غیر مرئی شے کو گھورتے ہوئے، اپنی ماں سے دور، کسی انجان راستے پر محوِ سفر تھا۔ اس کی ماں نے اسے ایک خریدار کے حوالے کیا تھا مگر بدلے میں اناج لینے سے انکار کر دیا تھا۔ شدید بھوک میں بھی اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے حلق سے نہیں اترے گا۔ وہ ایک ہی جملے کی تکرار کیے جا رہی تھی۔ ''میں چاہتی ہوں یہ بھوک سے نہ مرے۔''

جہاز میں وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ اور بھی بچے موجود تھے مگر گھپ اندھیرے میں قبر سا سناٹا تھا۔ ننگ دھڑنگ بچے جن کی کھال اور ہڈیوں کے درمیان سے گوشت کئی ہفتوں کی بھوک کی وجہ سے غائب ہو چکا تھا، ایک دوسرے میں سر دیے بیٹھے تھے۔ وہ متحرک تب ہوتے جب انہیں کھانا دیا جاتا۔

دن میں ایک بار ابلی ہوئی ادھ پکی مچھلی جس میں گوشت کم اور کانٹے زیادہ ہوتے، چھت میں موجود سوراخ سے نیچے پھینکی جاتی۔ جسے وہ سب ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ کر حاصل کرتے۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح چھینا جھپٹی نہیں کرتا تھا۔ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہتا۔

رفعِ حاجت کے لیے وہیں ایک کونہ مختص تھا۔ تعفن اور بیماری کے باعث روزانہ دو تین بچے اس قید سے نجات پا لیتے جنہیں منہ پر رومال لپیٹے گھٹنوں تک بوٹ چڑھائے ایک شخص گھسیٹ کر باہر لے جاتا۔ کچھ دنوں میں اتنا ہوا کہ پاؤں پسارنے کو جگہ میسر آگئی۔ نقاہت اتنی تھی کہ وہ حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا۔ بھوک مر گئی تھی۔ وہ زندہ تھا تو صرف اپنے تخیل کے سہارے جو اس کا پیٹ بھی بھر رہا تھا اور اس کو اس کی ماں اور بہنوں سے ملاقات کا اہتمام بھی کر رہا تھا۔

وہ منہ ہی منہ بڑبڑا تا رہتا اور کبھی کبھار مسکرا بھی دیتا۔ کبھی منہ کھول دیتا اور پھر اسے یوں چلانے لگتا جیسے کچھ چبا رہا ہو۔ اپنی بنائی گئی دنیا میں یادوں کے سہارے اس نے اپنے وہی مشاغل برقرار رکھے تھے جنہیں وہ روزمرہ زندگی میں سرانجام دیتا تھا۔ وہ اپنی بہنوں پر پانی پھینکتا۔ اونچے درختوں پر کسی بندر کی سی پھرتی لیے چڑھ جاتا اور ان کے لیے ناریل توڑ لاتا۔ گھر کے قریب ندی میں وہ اچھل کود کر نے نکل جاتے۔ اپنی بنائی ہوئی تخیلاتی دنیا میں اس میں یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ اس نے کھانے پینے میں نخرہ کرنا ترک کر دیا۔ اسے ماں کی یہ بات سمجھ آگئی کہ بے جا ضد اچھے بچے نہیں کرتے۔ ماں اسے کھانا کھلاتی، لقمے بنا کر اس کے منہ میں ڈالتی تو وہ فوراً منہ کھول دیتا۔

اس وقت وہ جہاز کے عرشے پر پانی میں تربتر پڑا ہوا تھا۔ اپنی لیفٹنسی سے باہر، سورج کی شعاعوں کی براہِ راست زد میں تھا۔ اندھیرے میں رہ رہ کے اس کی آنکھیں سورج کی تیز روشنی کو برداشت نہیں کر سکیں اور اس نے آنکھیں زور سے بھینچ کر ان پر بازو رکھ لیا۔ نقاب پوش اسے مردہ سمجھ کر باہر گھسیٹ لایا تھا مگر سانس چلتی دیکھ کر اس پر پانی انڈیل کر ایک کونے میں پھینک دیا تھا۔ سورج کی تمازت اس کے جسم کی توانائی لوٹا رہی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ قدموں کی دھمک کبھی تیز اور کبھی آہستہ ہو جاتی مگر ایک لمحے کو

بھی موقوف نہیں ہوئی تھی۔ اس سے کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ کافی دیر سے وہیں پڑا ہوا تھا جب ایک شخص نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ چاولوں کی خوشبو نے ابنِ مریم کے الفاظ کا کام کیا اور اس کی مری ہوئی بھوک میں جان ڈال دی۔ اس شفیق شخص نے تھوڑے تھوڑے کر کے چاول اس کے منہ میں ڈالے اور ساتھ گھونٹ گھونٹ پانی اسے پلانے لگا۔ شروع میں اسے چاول نگلنے میں مشکل ہوئی مگر جلد ہی وہ ٹھیک ہو گیا۔ اس شخص کے ہاتھ پر بنے ٹیٹو میں اسے اپنے گھر میں موجود پام کے درخت کی یاد آتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں وہ بھی ویسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے ساتھ اس کی ماں نے اسے بھیجا تھا۔

وہ شخص اسے جہاز میں ایک طرف موجود بوسیدہ کیبن میں لے گیا۔ جہاں کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ آنے والے دنوں میں اس کا یہی ٹھکانا تھا۔

وہ اس کیبن سے باہر تو نہیں نکلا مگر تانک جھانک شروع کر دی تھی۔ پہلی دفعہ اس نے اس نقاب پوش کی شکل دیکھی تھی جو مر جانے والے بچوں کو گھسیٹ کر باہر لے جاتا تھا۔ تب ہی اس کے علم میں یہ بات آئی کہ مرنے والے بچوں کے ساتھ بھاری بھرکم پتھر باندھ کر انہیں سمندر برد کر دیا جاتا تھا۔

سمندر میں ڈوبتے سورج کے ساتھ اس کی اپنی ماں سے ملنے کی امید بھی ڈوب جاتی، اس پر اضمحلال طاری ہو جاتا۔ اس کا جی دھاڑے مار کر رونے کو چاہتا۔ اسے یوں لگتا اب کبھی وہ اپنی ماں کو دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ اب ہمیشہ رات ہی رہے گی وہ یوں ہی سفر کرتا رہے گا۔

پیٹ بھر کھانے کو ملنے لگا تو تخیل میں بھی جان آگئی۔ وہ خود کو دیو قامت بنا کر سمندر میں یوں دوڑتا جیسے گھر کے قریب وہ دریائے پدما کو جاتی ساشونی ندی کو جب پار کر لیتا تھا جب ساون کو بیتے کئی ماہ ہو جاتے اور اس میں دیسا دم خم نہ رہتا۔

کچھ دنوں بعد اسے سمندر میں ایک کالی سی لکیر نظر آئی۔ جو قریب آتے آتے ایک وسیع ریگستان میں تبدیل ہو گئی تھی۔

گرم ہوا کے بگولے ریت کے دہکتے ذرات لیے یہاں وہاں چکر لگا رہے تھے۔ جو ان کے پسینے میں تربتر بدن سے چپٹ جاتے اور ان کی تکلیف میں اضافہ کر دیتے۔ اس نے سورج کو اتنا غضب ناک اور بے رحم کبھی نہیں پایا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑنے لگے تھے۔ زبان کھردری اور سخت ہو گئی تھی۔ انہیں ایک پرانے سے ٹرک میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

پیاس اور سانس گھٹنے کے سبب اس کی روح بدن کا ساتھ چھوڑنے کو پرتول ہی رہی تھی۔ اسے اس چھوٹے سے قفسِ عنصری کا دروازہ ٹوٹتا دکھائی دے رہا تھا جب ٹھنڈک کی دبیز چادر نے اسے کچھ دیر کے لیے ڈھانپ لیا۔ کچھ دیر تو اس اچانک کہیں سے ٹھنڈے میٹھے پانی کی صورت میں نازل ہونے والی آسودگی اور راحت نے اسے کوئی تحریک نہیں دی۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ہی اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا مگر جب دوسری مرتبہ پانی پوری قوت سے اس کے جسم سے ٹکرایا تو اس نے بے اختیار سانس اندر کھینچا۔ پانی سانس کی نالی میں جا گھسا اور وہ اچھل کر بیٹھ گیا اور زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس کا جسم گرم سرد ہونے کی وجہ سے جلنے لگا تھا۔ حدِ نگاہ پھیلا ریگستان اس کے سامنے موجود تھا۔ اس منظر نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔

اس بھدے سے بڑے بڑے ہونٹوں اور لمبی گردن والے جانور کو ان میں سے بیشتر نے نہیں دیکھا تھا۔ جسے وہاں اٹل کہا جاتا تھا۔ کچھ لڑکے اس سے واقف تھے جنہوں نے اسکول میں کچھ وقت گزارا تھا۔ سب کی طرح اس عجیب و غریب جانور کے سامنے اس کی بھی ٹانگیں کانپی تھیں مگر جب اس عجیب و غریب شے پر اسے سوار کروایا گیا تو دوسروں کی طرح اس اونچائی کی وجہ سے ڈر نہیں لگا تھا۔ مگر جب وہ عجیب الخلقت شے چلنے لگی تو وہ رسی کی مدد سے کوہان سے چپک کر بیٹھ گیا تھا مبادا جھٹکوں کی وجہ سے وہ نیچے نہ جا گرے۔ تیز ہوا میں پام کے جھولتے درختوں پر چڑھنے کی مشق یہاں کام آئی تھی۔ یہ اس کا ریگستان کے جہاز سے پہلا تعارف تھا۔

کھانے کو پھیکے بسکٹ ملتے اور پینے کو گرم پانی۔ کبھی کبھار انہیں قہوہ بھی دیا جاتا مگر اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ اس میں میٹھا بالکل نہ ہو تاکہ بچوں کا وزن ایک حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ اونٹ دوڑ میں جوکی کا وزن بہت اہمیت رکھتا تھا۔ گرمیوں میں وہ کھلے آسمان تلے ریت پر ہی سو جاتے۔ سردیوں میں البتہ کچھ کپڑے اور بستر کے نام پر چند چیتھڑے ان کے حوالے کر دیے جاتے۔ منہ اندھیرے انہیں اٹھا دیا جاتا اور سورج سر پر آنے تک وہ اونٹوں کی سواری کرتے۔ وہ جس کا اونٹ کو دیکھ کر رنگ فق ہو جاتا تھا، تیز دھوپ میں وہ اس کی اگلی ٹانگوں کے درمیان لیٹ جاتا اور لمبی گردن کے سائے میں کچھ دیر سو جاتا۔

شروع میں اسے بہت رونا آتا مگر ماں کی یاد بہنوں کی شرارتیں پام کے درختوں سے ہوا کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی آواز، ساشولی کا ٹھنڈا میٹھا پانی جسے وہ نہاتے ہوئے جی بھر کر پیتا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتی۔ صحرا کی یہ دکھ بھری زندگی کہیں پیچھے رہ جاتی۔ جہاں چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی سزا بہت بھیانک تھی۔ کھانے کے نام پر جو دن میں چند بسکٹ ملتے بات بے بات ان پر پابندی لگ جاتی۔ سایہ اور پانی دونوں چھین لیے جاتے اور بے رحم صحرا کے حوالے کر دیا جاتا۔ اسے جب بھی کوئی ایسی سزا ملتی، وہ پلک جھپکتے ہی ماں کے پاس پہنچ جاتا۔ اس کا نگران جو بھینگا تھا اور اس وجہ سے سب اسے احول پکارتے تھے، ایک خرانٹ اور دبلا پتلا شخص تھا۔ وہ وہیں پلا بڑھا تھا اور ان سب کو بہانے بہانے سے خوب پیٹتا تھا۔ وہ روز رات کو سونے سے پہلے آنکھیں موند لیتا اور احول سے بدلہ لینے نکل کھڑا ہوتا۔ اسے خوب پیٹتا۔ صحرا میں گھسیٹتا۔ یوں جب صبح اٹھتا تو خوش خرم ہوتا۔

لمبی دوڑ میں اونٹنی کا استعمال کیا جاتا۔ اونٹ 60 میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھاگ سکتا تھا مگر اپنی یہ رفتار وہ چند منٹ ہی برقرار رکھ پاتا جبکہ اونٹنی 40 میل فی گھنٹا سے زیادہ رفتار کو کئی میل تک دوڑ سکتی تھی۔ وہ اونٹ کی سواری سے لطف اندوز ہونے لگا تھا سواری کرتے وقت وہ ہمیشہ یہ تصور باندھ لیتا کہ وہ اپنی ماں کے پاس جا رہا ہے۔ یہ خیال اس میں جوش بھر دیتا اور وہ پوری قوت سے چیختا۔ اونٹ پر لاٹھیاں برساتا۔ اسی وجہ سے وہ ایک دن اپنے مالک کی نگاہوں میں آگیا۔ مالک اس دن اپنے کیمپ کا دورہ کر رہا تھا۔ اس کی نظر دبلے پتلے سیاہ بچے پر پڑی جس نے بھاگ کر ایک پاؤں اونٹ کے پچھلی ٹانگ کے الٹے گھٹنے پر جمایا اور اچھل کر کوہان کے پاس موجود رسی تھام لی۔ اگلے ہی لمحے وہ اونٹ پر سوار ہو چکا تھا۔ اونٹ تیزی سے بھاگ رہا تھا اور وہ بچہ اس پر یوں جم کر بیٹھا تھا جیسے اسے وہاں چپکا دیا گیا ہو۔ مالک کے متوجہ ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ اسے مار پیٹ سے اور اس طرح دوسری سزاؤں سے نجات مل گئی۔ صفائی ستھرائی کا کام بھی پہلے کی طرح نہیں لیا جاتا تھا۔

کچھ دنوں بعد عالمی سطح پر اونٹ دوڑ کا انعقاد ہونے والا تھا۔ دنیا بھر سے ایک مشکل مقابلے کے بعد 40 کے قریب اونٹ پہنچنے جانے تھے۔ اس کا مالک ہر حال میں اس مقابلے میں حصہ لینا چاہتا تھا اور اس مقابلے میں بڑے بڑے امراء کے اونٹ حصہ لے رہے تھے۔ اس کے پاس سرمئی رنگ کی ایک کوہان والی، قدآور اونٹنی تھی جو انتہائی برق رفتار تھی مگر لگاتار مقابلے ہار رہی تھی۔ وجہ اس کے جوکیوں کا اس پر سنبھل نہ سکنا تھا۔ ابھی تک کئی منجھے ہوئے سوار اس پر سے گر کر زخمی ہوئے تھے جن میں سے دو مر گئے تھے۔ مگر وہ جانتا تھا اس اونٹنی کے بنا وہ آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ریس نہیں جیت سکتا۔ وہ دبلا پتلا سیاہ بچہ اس کی آخری امید تھا۔

بھوک کے ہاتھوں بنگال کی سحر آگیں سرزمین سے اس تپتے اجاڑ صحرا تک پہنچنے والا وہ بچہ ایک خطرناک سرمئی اونٹنی پر سوار تھا۔ جس کا نام الموت پڑ گیا تھا۔ اس ریس میں اول آنے والا ہی ان چالیس اونٹوں میں منتخب ہو پاتا جو ملک کی سب سے بڑی ریس میں حصہ لیتے۔ ریس شروع ہوئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا نام الموت کیوں ہے۔ وہ تیزی سے بھاگتے ہوئے خود پر بیٹھے سوار کو گرانے کی تابڑتوڑ کوشش کرتی تھی۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا اس پر مسلسل چھڑی برسانی پڑتی تھی تب ہی وہ اپنی رفتار کو قائم رکھتی تھی۔ یوں ایک ہاتھ سے توازن برقرار رکھنا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس نے دونوں پاؤں رسی میں پھنسا کر گرنے کے امکان کو کم کیا اور جب اس سے بھی کام بنتا نظر نہ آیا تو دانتوں سے رسی کو پکڑ لیا۔ منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کی پنڈلیوں سے کھال اتر چکی تھی اور سامنے کے دانت ٹوٹ گئے تھے۔ بہرحال وہ ریس جیت گیا تھا۔ عالمی سطح پر مقابلے میں شرکت کا اہل قرار پایا تھا۔

مالک نے بہترین ڈاکٹرز سے اس کا علاج کروایا تھا اس کے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ اس بات کی خبر جلال تک پہنچ گئی تھی کہ سرمئی اونٹنی کو ایک جوکی میسر آگیا ہے۔ وہ اونٹنی اس نے ہی فروخت کی تھی، وہ بہت اچھی طرح اس کے خصائل سے آگاہ تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اگر وہ دوڑے گی تو مقابلے میں موجود دوسری اونٹنیاں اس کی گرد بھی نہیں پا سکیں گی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک منصوبہ بنایا۔

ایک رات اس چھوٹے بچے کے پاس اس کا نگران احول آیا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اسے بتایا کہ مالک نے بلایا ہے۔ مگر وہاں کوئی اور موجود تھا جو بنگالی ڈرائیور کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے اسے کھانے کے لیے چاول اور مچھلی پیش کی اور بنگالی میں بولا گھبراؤ نہیں یہ کھاؤ۔ جلال اس بڑی بڑی پُراسرار آنکھوں والے کالے رنگ کے دبلے پتلے بچے کو غور سے دیکھ رہا تھا جو پچاس ملین ڈالر کا انعام اور اس کا غرور اس سے چھین لیتا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس کو زمین میں گاڑ دے۔ وہ

بچہ کبھی کھانے کو گھورتا اور کبھی ان دونوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ ایک مرتبہ پھر ڈرائیور نے اسے کھانے کو کہا اس نے جھجکتے ہوئے چاول منہ میں ڈالے۔ دو سال سے اوپر ہونے کو آئے تھے اس نے بسکٹوں کے سوا کچھ نہیں کھایا تھا۔ بہت کوشش کر کے بھی وہ تھوڑے سے چاول ہی کھا سکا۔

وہ بچہ گاڑی سے نکلا تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے جلد اس کی ماں کے پاس بھیج دیں گے۔ بنگالی ڈرائیور جو مترجم کا کام کر رہا تھا، اس نے بھی اسے خوب تسلیاں دی تھیں۔ خاص کر ساشولی ندی کے حوالے سے جب اس نے ڈرائیور کو بتایا تو... اس نے گاؤں کا نام لے کر اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

وہ دن آپہنچا جب صحرا میں دنیا کی مہنگی ترین اونٹ دوڑ کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔ الموت کا مقابلہ سفید رنگ کی ایک نسبتاً چھوٹے قد والی اونٹنی سے تھا جس کا نام اسرح تھا۔ جس کا مالک جلال تھا۔ سفید رنگ کی لمبی پلکوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی اس خوبصورت اور پھرتیلی اونٹنی کا شجرہ بھی اس کے پاس موجود تھا۔

دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ ننھے سوار زور زور سے چلا کر اور پوری قوت سے اپنے اونٹوں پر لاٹھیاں برسا کر آگے نکلنے کی تگ و دو میں تھے۔ خلافِ معمول الموت آج سبک رفتاری سے بنا جھٹکے دیے آگے بڑھ رہی تھی چند لمحوں میں ہی وہ سب سے آگے نکل گئی۔ ان کے ساتھ چلنے والی گاڑیوں میں اس کا مالک دوربین آنکھوں سے لگائے جوش سے اسے مزید تیز بھاگنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ جلال کی اونٹنی دوسرے نمبر پر تھی مگر کافی پیچھے تھی۔ اس ننھے جوکی کو آج پہلی دفعہ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ تیزی سے اپنی ماں سے دور جا رہا ہے۔ جلال کے ڈرائیور نے اسے بتایا تھا کہ اگر وہ یہ ریس ہار جائے تو اسے نہ صرف خرید کر آزاد کر دیا جائے گا بلکہ اسے اس کی ماں تک پہنچانے کا انتظام بھی کر لیا جائے گا۔

منزل قریب آرہی تھی اور ماں کی شبیہ دھندلاتی جا رہی تھی۔ اچانک اس نے رسی چھوڑ دی۔ زمین پر گرتے وقت اسے سفید روئی کے گالوں جیسی بھاری بھرکم اسرح دکھائی دی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے نرم ریت پر گرا۔ اس کے منہ اور سینے پر اسرح کے پاؤں پڑے، وہ اڑ کر حفاظتی باڑ سے جا ٹکرایا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور اس کا سانس رک گیا تھا۔ پوری کوشش کر کے بھی وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر بے اختیار مکے برسائے۔ اس کی یہ تدبیر کارآمد ثابت ہوئی اور اس کا سانس بحال ہو گیا۔ چند گہرے سانس لینے کے بعد وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے خود کو کچے کمرے میں پایا۔ ایک آنکھ کو چھوڑ کر پورے منہ پر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ نتھنوں کے پاس کپڑے میں چھوٹا سا سوراخ تھا جس میں سے وہ بہت دقت سے آکسیجن کھینچ کر پھیپھڑوں تک پہنچا رہا تھا۔ یہی دشواری اس کے ہوش میں آنے کا سبب تھی۔ اس نے بے اختیار منہ پر بندھے کپڑے کو ہٹانا چاہا۔ درد کی ایک لہر نے اسے دہرا کر دیا مگر حلق سے کوئی آواز برآمد نہیں ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو چکا تھا۔

مالک اتنے غصے میں تھا کہ اس نے تو اسے زندہ ہی دفنانے کا حکم دے دیا تھا مگر جلال سے رقم ملنے کی امید میں احول نے اسے بچانے کی سعی کی تھی۔ اس کے منہ پر گندا سا کپڑا باندھ دیا تھا اور ایک بچے کی ڈیوٹی تھی کہ وقفے وقفے سے ہونٹوں کے پاس اس کپڑے پر پانی کے قطرے ٹپکا دیتا جسے وہ خون کی آمیزش کے ساتھ حلق سے نیچے اتار لیتا۔

احول کا خیال تھا، وہ دو تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔ پہلے تو یہ زخم ہی اس کی روح کو اس کے جسم سے باہر نکالنے کا سبب بن جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھوک کی وجہ سے مر جائے گا۔ وہ کچھ کھا تو سکتا نہیں تھا۔ وہ ان تکلیف دہ دنوں میں اپنی ماں کے ساتھ تھا۔ غنودگی جتنی گہری ہوتی، ماں سے ملاقات کا لطف بھی اتنا زیادہ ہوتا۔ موت نے اسے قابلِ اعتنا نہ سمجھا کہ اس کے پیشِ نظر یہی خیال رہا ہوگا کہ وہ کسی وقت بھی اسے اچک سکتی ہے اور یوں زندگی کو موقع مل گیا اور وہ اسے اپنی طرف لانے میں کامیاب رہی۔ اس کے زخم بھرنے لگے۔ پانی کے ساتھ بسکٹ نگلنا گو کہ بہت تکلیف دہ کام تھا مگر وہ اسے بہت بہادری کے ساتھ سرانجام دے رہا تھا۔

جلال تو اسے اس کی ماں کے پاس پہنچانے کا وعدہ کر کے بھول گیا مگر قسمت نے اس کی یاوری کی اور نئے حکمران نے یہ قانون بنا دیا کہ بیرونی ممالک سے آنے والے وہ لوگ جن کے پاس شناختی کاغذات نہیں، انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ ان افراد کی فہرست میں اس کا بھی نام درج کر لیا گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ پوری دنیا سے اکٹھے کیے گئے ان جوکیوں کو بھیجا کہاں جائے۔ تب اسلامی جمہوریہ ملک کا نام سامنے آیا جہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کوئی کان نہیں

دھرتا۔ ان سب کو جہاز میں بھر کر ساحلی شہر پہنچا دیا گیا۔

اسے وہاں وہ شفیق انسان ملا جس نے اس کی زندگی بدل دی۔ اسے بہترین کھانا کھلایا اعلیٰ کپڑا پہنایا۔ اس کے لیے رہائش کا انتظام کیا۔ اسے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا۔ ایسی محبت اور خلوص سے پہلے کہاں اس کا واسطہ پڑا تھا۔ وہ اس کا بے دام غلام بن گیا۔ وہ شہر میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ صحرا میں اس نے ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ شہر کی زندگی اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اس نے اپنے استاد اپنے مربی سے اس بابت بات کی تو اس نے خوش دلی سے اسے اجازت دے دی۔ اسے اونٹوں سے بہت انسیت تھی تو اس نے اسے اونٹ خرید کر دے دیے۔

صحرا میں پانی کی بہت قلت تھی۔ اس نے اپنے استاد سے کہہ کر وہاں پانی کے لیے بورنگ کروا لی۔ صحرائی باشندے وہاں جمع ہوئے تو وہاں ایک بستی بن گئی۔ اس نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا بس ایک بات ان کو سمجھا دی کہ اسے تشدد سے نفرت ہے۔ اگر کسی نے بستی کے امن کے لیے خطرہ بننے کی کوشش کی تو وہ اسے باہر نکال پھینکے گا۔ اپنے استاد کے تعلقات استعمال کروا کے اس نے ان کے لیے سڑک بنوا دی تھی۔ ان صحرائی لوگوں سے اس کی محبت دیکھ کر استاد نے بھی دریا دلی دکھائی۔ اب ہر ماہ دو ٹرک آٹا لے کر ان کے لیے آتے تھے۔ ان کے بچوں کے لیے وہاں اسکول قائم کیا گیا۔ مفت کتابیں کاپیاں تقسیم ہوتیں۔ وہ شاذ و نادر ہی بستی کا رخ کرتا ورنہ تو صحرا میں یہاں وہاں بھٹکتا رہتا۔

☆☆☆

شرجیل کی موت کے بعد حملہ کیس عاصم فرخ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں وہ سلطان پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ دوست ملک کا سفارت کار ہر روز فون کر کے حملہ آور کے بارے میں پوچھتا تھا۔ وہ انہیں کوئی نہ کوئی کہانی سنا کر ٹال دیتا تھا کیونکہ جب اس نے سلطان پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت چاہی تو کہا گیا ثبوت لاؤ۔ وہ اب ثبوت تلاش کر رہا تھا۔ سلطان نے اپنی نقل و حرکت بہت خفیہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے تمام غیر قانونی کاموں سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ وہ جان گیا تھا عاصم کے لوگ پوری جانفشانی سے اس کے خلاف ... ثبوت اکٹھے کر رہے ہیں۔ وہ ملک چھوڑنے کے لیے اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ عاصم اس کے کام میں مسلسل روڑے اٹکا رہا تھا۔ وہ اس پر براہِ راست ہاتھ اگرچہ نہیں ڈال سکتا تھا لیکن اس کے ہوتے ہوئے سلطان ملک سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ بالآخر ایک دن اس نے سلطان کی مالی بے ضابطگیوں، ٹیکس چوری، زمینوں پر ناجائز قبضہ، جیسے کاموں کو بنیاد بنا کر عدالت کے ذریعے اس کا نام ای سی ایل میں ڈلوا دیا اور اس کے گرفتاری کے وارنٹ حاصل کر لیے۔

اس دن عاصم کو ایک پرانے کلاس فیلو کی کال موصول ہوئی جس نے اسے اچنبھے میں مبتلا کر دیا۔

کمال الدین جس کا تعلق ایک طاقتور سیاسی خانوادے سے تھا۔ عاصم کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ اس نے عاصم کو اپنے گھر کھانے پر بُلایا تھا۔ عاصم اتنے عرصے بعد اچانک اس مہربانی پر کافی حیران ہوا۔ وہ کمال کو بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا۔ وہ اس خانوادے سے تعلق رکھتا تھا جن کا ہر قدم ان کے کسی مفاد کے تابع ہوتا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کمال کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ اس کے تو بڑے صاحب کا ان کے گھر آنا جانا تھا۔ اس کا سالہ یعقوب اسی کے محکمے میں ایک اہم عہدے پر موجود تھا تو پھر اسے اس کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔

جیسے ہی وہ کمال کے ہاں پہنچا تو سامنے بیٹھے شخص کی موجودگی نے اس کے دماغ میں اتھل پتھل مچا دی۔ اس نے چہرے سے مگر ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کمال اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اسکول کے دنوں کو یاد کرتا رہا۔

جب کافی دیر وہ اصل بات کی طرف نہیں آیا تو عاصم کو کوفت ہونے لگی۔ اس دوران نوکر نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ کھانا بہت خاموشی کے ساتھ تناول کیا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد کمال ان کو اوپر اپنی اسٹڈی میں لے گیا۔ چائے کا انتظام وہیں کیا گیا تھا۔

”فرخ تم ان سے تو واقف ہو گے، سلطان صاحب ہمارے بڑے اچھے دوست ہیں۔“ کمال نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ وہ عاصم کا ہمیشہ دوسرا نام ہی استعمال کرتا تھا۔

عاصم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”مگر میں ان سے پہلی دفعہ مل رہا ہوں۔“ اس نے سلطان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ اپنی بے بسی کا لطف لے رہا تھا۔ اس کے ساتھی سلطان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مار رہے تھے اور وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ جیب میں اس کی گرفتاری کے وارنٹ ہونے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”انہی سے ملانے کے لیے میں نے تمہیں بُلایا تھا۔“ کمال نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عاصم یہ سن کر حیران نہیں ہوا۔ وہ سلطان کو وہاں دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔

”دراصل سلطان میرے پاس آیا تھا کہ میں تمہارا ٹرانسفر کروا دوں۔ تم تو جانتے ہو تمہارے بڑے صاحب، آغا جی کے دوست ہیں۔ کل بھی انہوں نے ڈنر آغا جی کے ساتھ ہی کیا ہے۔ بتا رہے تھے تمہارے چار بہترین بندے گندے نالے میں بہنے والے نشہ بازوں کے ہاتھوں مارے گئے .... لیکن وہ ان کی بہت تعریف کر رہے تھے کہ وہ بہت جوانمردی سے لڑے اور پچاس ساٹھ نشئی مار کر مرے۔“ اس نے سلطان کو دیکھتے ہوئے... استہزائیہ لہجے میں کہا۔ سلطان مسکرا دیا۔

یہ سن کر عاصم کا خون اس کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ ”گھر آئے مہمانوں کا مذاق اڑانے کا رواج تمہارے ہاں پہلے تو نہیں تھا۔“ عاصم نے ہاتھ میں پکڑا بسکٹ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم جیسے تہذیب آشنا میزبان نے مجھے اس لیے بلایا بھی نہیں ہوگا۔ تو کیوں نا کام کی بات کی جائے۔ تم مجھے ٹرانسفر کر دینے کی بات کر رہے تھے۔“ عاصم کے روکھے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

کمال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اب جو اس نے بات شروع کی تو اس کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا۔

”سلطان ملک سے باہر جانا چاہتا ہے اور تم ایسا ہونے نہیں دے رہے۔ تم کو وہ بندہ چاہیے نان... جس نے صحرا میں حملہ کیا تھا۔ سلطان سے لے کر میں اسے تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم وہ بندہ لو اور سلطان کو جانے دو۔ دوسری صورت میں تمہاری جگہ دوسرا آدمی لانا ہمارے لیے مشکل نہیں۔ بس وقت یہ ہے اس میں پندرہ بیس دن لگ جائیں گے۔ ایک ہفتے بعد فرانس میں میٹنگ ہے سلطان کا اس میں شامل ہونا بہت ضروری ہے۔ تم تعاون کرو گے تو ہم بڑے نقصان سے بچ جائیں گے۔ حملہ آور کو پکڑ کر تمہارا کھویا ہوا مقام بھی مل جائے گا ...... اس میں سب کا فائدہ ہے۔“

اسے سوچنے کے لیے ایک دن کی مہلت دی گئی تھی۔

اس رات وہ کافی دیر تک جاگتا رہا۔ دانش اور اس کی ٹیم کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کا ذمے دار وہ تھا۔ یہ بہت بڑی ناکامی تھی کوئی اور ہوتا تو اب تک اسے برخاست کر دیا گیا ہوتا۔ وہ اب بھی اسی پوزیشن پر بیٹھا ہوا تھا تو اس کی وجہ صرف اور صرف اس کی وہ ساکھ تھی جو اس نے برسوں کی محنت کے بعد بنائی تھی۔ آج بھی کچھ لوگ تھے جو اس پر بھروسا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کمال کے والد کے ایک فون پر اسے کسی ایسی جگہ بھیج دیا جائے گا جہاں وہ عضوِ معطل بن کر رہ جائے گا۔ چند عرصے بعد اس کی ساری خدمات کو فراموش کر دیا جائے گا۔ اس محکمے میں رہ کر اس نے اپنے بہت دشمن بنا لیے تھے ایسے حالات میں کوئی بھی موقع پا کر اس کا کام تمام کر دیتا۔ کمال کی بات نہ ماننا سراسر خسارے کا سودا ہوتا۔ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا تھا مگر سمجھوتا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنی بیوی اور دو پریوں جیسی بیٹیوں پر ڈالی مگر ان کی محبت بھی اسے جھکنے پر مجبور نہیں کر سکی۔ ساری عمر وہ دوسروں کو لعنت ملامت کرتا آیا تھا اب خود ایسا کیسے کر سکتا تھا۔

اس نے کمال کو فون کر کے آگاہ کر دیا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

ایک ہفتے بعد ہی اسے اپنی سیٹ چھوڑنی پڑی۔ اسے فی الحال آرام کرنے کو کہا گیا تھا۔ اس کی جگہ یعقوب نے سنبھال لی جو کمال کا سالا تھا۔

رات کے اس پچھلے پہر عاصم کا فون بجا، وہ اس وقت

علاج

سردار جی کو زندگی کے ہر مرحلے پر اپنی بیوی سے سرد مہری کی شکایت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ بیوی ان کی ہر ہدایت اور خواہش پر ایک روبوٹ کی طرح سپاٹ انداز میں عمل کرتی ہے۔ تنگ آ کر وہ ایک نفسیاتی معالج کے پاس گئے۔ اس نے سردار جی سے ان کی بیوی کو تخلیے میں لے جانے کی اجازت چاہی جو بلا تامل دے دی گئی۔ معالج کافی دیر بعد ان کی بیوی کے ساتھ برآمد ہوا۔ اس نے سردار جی سے کہا کہ ان کی بیوی کو ہفتے میں کم از کم تین بار بے تکلفانہ رفاقت میسر ہو تو وہ ایک مہینے میں نارمل ہو جائے گی۔

”ٹھیک ہے۔“ سردار جی بے نیازی سے بولے۔ ”ہفتے میں پانچ دن تو میں اپنے کاروبار میں مصروف رہتا ہوں۔ ہفتے اور اتوار کو کام مندا ہوتا ہے۔ جاتے ہوئے اسے تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا... واپسی پر لے لوں گا۔ تمہاری فیس کتنی ہوگی؟“

معالج کی باچھیں کھل گئیں۔ ”دو دن بھی ٹھیک ہیں... ہر وزٹ کے بارہ سو روپے ہوں گے۔“

زاہد صادق۔ لاہور

جاگ رہا تھا۔ ان دنوں کرنے کو تھا کچھ نہیں تو دن بھر گھر میں پڑا وہ سوتا رہتا تھا رات کو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے موبائل اسکرین پر جگمگاتا نمبر دیکھا تو ایکدم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے نکلا اور ایک طرف کونے میں بنی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گیا۔ حبیب کی کال تھی جو اس کا بہت خاص بندہ تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ عاصم اسے خاص مواقع پر ہی استعمال کرتا تھا۔ محکمے کے لوگ اس سے واقف نہیں تھے۔ دانش کی ٹیم پر نظر رکھنے کے لیے اس نے حبیب کو بھیجا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ ارسلان اور شرجیل کو قتل کرنے والے لوگ عام نہیں۔ اگر حمید قاتل ہے تو اپنے تعاقب سے آگاہ ہو جائے گا۔ وہ ان سے پیچھا چھڑانے کی اپنی سی کوشش کرے گا۔ وہ اس کے ذریعے اس نیٹ ورک تک پہنچنا چاہتا تھا جس کا وہ مہرہ تھا۔

حبیب جب بھی کال کرتا تھا، کوئی دھماکے دار اطلاع ہی دیتا تھا۔ دانش اور اس کے ساتھیوں پر حملے کی اطلاع بھی اسی نے دی تھی۔ اس دن اس نے حمید کا پیچھا بھی کیا تھا۔ جو فائرنگ کے بعد وہاں سے نکل بھاگا تھا۔ وہ کافی دیر سنسان گلیوں میں چلتا رہا تھا اچانک کہیں سے سیاہ نسان نمودار ہوئی اور وہ اسے لے کر نکل گئے۔ حبیب نے نگران دو اشخاص کو بغور دیکھا تھا... جو اسے لینے آئے تھے۔ رات کے اس پہر ان میں سے ایک اسے وہاں کسی مقامی ہوٹل میں دکھائی دے گیا تھا۔ اس نے مشورے کے لیے فون کیا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

بہت سوچ بچار کے بعد عاصم نے فیصلہ کیا کہ اب اسے اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ حمید کو ارسلان صدیقی کے محکمے والے بہت شد و مد سے تلاش کر رہے تھے۔ انہیں مطلع کر دیا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اسی وقت بابر لودھی کو کال ملائی۔

بابر کسی زمانے میں اس کا اُستاد رہا تھا۔ بہت دلچسپ انسان تھا۔ اس نے چھ ماہ میں اس کی نگرانی میں انٹیلی جنس کا سب سے مشکل کورس پاس کیا تھا۔ ارسلان اور شرجیل بھی اسی کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہیں اس کی ارسلان سے دوستی ہوئی تھی۔

پہلی ہی بیل پر بابر لودھی نے کال اٹھائی تھی۔

''کوئی خاص کام ہوگا جناب محترم کو۔ ورنہ سالوں گزر گئے استاد کی یاد کبھی نہیں آئی۔'' رات کے اس پہر بھی وہ پوری طرح چاق و چوبند تھا۔

اس اندازِ گفتگو نے اس کے دماغ سے بوجھ ہٹا دیا۔

''سر کبھی رات کو آرام بھی کر لیا کریں۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

''ویسے رات کے اس پہر کر کیا رہے ہیں؟'' اس نے تکلفاً پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، وہ اس وقت بیٹھا کوئی دوائی بنا رہا ہوگا۔

بابر لودھی کا جواب سُن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔'' بابر لودھی نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''آپ نے کیسے جان لیا کہ میں کال کروں گا۔'' عاصم نے حیرت سے کہا۔

''کیونکہ تم ناہنجار شاگرد ہو۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''سر میری اُردو بہت کمزور ہے۔'' عاصم نے بے بسی سے کہا۔

''تو اسے مطالعے کی ڈرپ لگاؤ۔'' بابر لودھی نے اسے مشورہ دیا۔

''سر آپ کہہ رہے تھے آپ میری کال کا انتظار کر رہے تھے۔'' عاصم نے اسے ٹریک پر لانے کے لیے کہا۔

''دراصل تم جیسے ناہنجار شاگرد سالوں تو سوئے رہتے ہیں اور اچانک رات کے اس پہر کال ملانے کے لیے جاگ اٹھتے ہیں۔''

یہ سن کر عاصم شرمندہ ہو کر ہنس دیا۔

''کیوں کال کی؟'' بابر لودھی کی ٹون اب تبدیل ہو گئی تھی۔

''سر حمید کے بارے میں تو آپ جانتے ہوں گے۔ اس کے بارے میں ایک ٹپ ملی ہے۔ سوچا آپ کو دے دوں۔'' عاصم نے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

بابر لودھی نے ہنکارا بھرا۔

''تمہیں کہا بھی تھا میرے پاس آجاؤ ان لوگوں کو تمہاری قدر نہیں مگر تم کو وردی پہننے کا شوق بہت ہے۔'' بابر لودھی نے برسوں پہلے کی گئی اپنی پیش کش اسے یاد دلائی۔

یہ اس کی عادت تھی سوال چنا ہوتا جواب گندم ملتا تھا۔

''سر آپ کو بتایا تھا میں کمزور آدمی ہوں۔ آپ لوگوں جیسی قربانی دینے کی سکت مجھ میں نہیں۔ گھر والوں کو بھی معلوم نہ ہو کہ بندہ کرتا کیا ہے تو فائدہ کیا ہے انسان اپنا تعارف بھی نہ کروا سکے تو مزہ کیا ہے۔''

''اب ایسا بھی نہیں، میں نے ہومیو پیتھک کا باقاعدہ کورس کر کے کلینک کھولا ہوا ہے۔ نئے ڈاکٹرز کو ٹریننگ دیتا

ہوں گھر والوں کو معلوم ہے۔'' بابر لودھی نے سادگی سے کہا۔

اس کا جی چاہا کہے کہ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے تو یہ ملک قائم ہے مگر بابر لودھی نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

''سنا ہے ان دنوں تم او ایس ڈی ہو۔ گھر بیٹھ کر مکھیاں مارنے سے بہتر ہے تم اس کام کو خود سنبھالو۔ میں تمہیں ہر سہولت فراہم کروں گا۔ میں کل ہی ایک لیٹر وزارتِ داخلہ کو بھجوا کر تمہیں طلب کر لیتا ہوں۔'' بابر لودھی نے اس کا جواب سنے بنا ہی فون بند کر دیا۔

عاصم مختصر سی تیاری کے بعد رات کے اسی پہر نکل کھڑا ہوا۔ جب کام سنبھالنا تھا تو صبح تک کا انتظار کیوں کرتا۔ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

جب یعقوب جیسے لوگ اتنے حساس عہدوں پر موجود ہوں تو کوئی چیز خفیہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے اپنا ذاتی گارڈ اور ڈرائیور ساتھ لیے اور صحرائی شہر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت وہ ایک ہوٹل میں ناشتا کرنے کے لیے رکا تھا۔ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے موبائل نکال کر ایک نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے کال نجم نے اٹھائی تھی۔

''کیا حال ہے جوان!'' اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''عاصم فرخ بات کر رہا ہوں۔ ہمیں بھول تو نہیں گئے؟''

''آپ کو سر کیسے بھول سکتا ہوں۔ جب بھی دھوپ میں نکلتا ہوں آپ لوگ یاد آتے ہیں۔ آج بھی میں لائٹ جلا کر سوتا ہوں اندھیرے میں یوں لگتا ہے چھ بائی چھ کے اسی سیل میں ہوں۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ میں نے جان داؤ پر لگا کر اسے پکڑا تھا۔ آپ نے اسے تو جانے دیا اور مجھے اٹھا کر تعفن بھری کوٹھری میں ڈال دیا۔'' نجم نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

عاصم مسکرایا۔ وہ جانتا تھا اسے یہی باتیں سننے کو ملیں گی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ کرخت کرتے ہوئے کہا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں جوان مگر وہ ہمارے کام کا حصہ تھا۔ ویسے میں نے نجم خان اے ایس آئی کو فون کیا تھا۔ ایسی بزدلانہ باتوں کی مجھے توقع نہیں تھی۔ تمہاری تو ہوا ہی اکھڑی ہوئی ہے۔ قید تو تم نے بہت بہادری سے کاٹی تھی۔ اسی بات نے مجھے اکسایا کہ تم سے بات کی جائے مگر تم تو ابھی تک سوگ منا رہے ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے کال کاٹ دی۔ وہ جانتا تھا یہ سن کر نجم کے کان کھڑے ہو جائیں گے۔ وہ خود کال کرے گا تو شکایتوں کی پٹاری نہیں کھولے گا۔ وہی ہوا نجم کی کال آگئی۔

''اگر تم میں پہلے والی کوئی بھی بات باقی ہے تو سیدھا ائرپورٹ پہنچو۔ میں تمہارا ٹکٹ بک کروا رہا ہوں۔ یہ سوچ کے آنا کہ جو کام میں لوں گا وہ کم ہمت اور بزدل لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ اس میں جان کا خطرہ ہے اور ماضی کے حوالے سے میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔'' عاصم نے یہ کہہ کر ایک بار پھر کال کاٹ دی۔

اسے امید تو نہیں تھی وہ آئے گا مگر وہ آگیا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ جسم بھی کچھ فربہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جس سے عاصم متاثر ہوا تھا۔

اس وقت وہ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نجم کی الجھن کو دیکھتے ہوئے عاصم بولا۔ ''ہم تمہارے دوست کا شکار کھیلنے جا رہے ہیں مگر اس کا ٹھکانا جاننے کے لیے پہلے اس کے ایک دوست کو اپنا مہمان بنانا ہوگا۔''

''میرے کس دوست کی بات کر رہے ہیں؟'' نجم نے حیران ہو کر کہا۔

''جس کی وجہ سے تمہیں ہدایت ملی۔'' اس نے نجم کی داڑھی دیکھتے ہوئے کہا۔

نجم ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔ ''آپ حمید کی بات کر رہے ہیں؟''

عاصم جواب میں مسکرا دیا۔

حبیب اور نجم اس سیاہ نسان والے سے ڈرگ ڈیلر بن کے ملے تھے جس کے ساتھ حمید گیا تھا۔ وہ اس وقت ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ حبیب کی چرب زبانی اور نجم کے حلیے نے کام آسان کر دیا۔ حبیب نے اسے بتایا تھا کہ نجم افغانستان سے آیا ہے۔ وہ اپنا مال بیچنا چاہتا ہے۔ گنفور بھائی نے بھیجا ہے۔ حوالہ ایسا استعمال کیا گیا تھا کہ وہ ان کی باتوں میں آگیا اور مال دیکھنے اپنے ایک ساتھی سمیت ان کی گاڑی میں آبیٹھا۔ ویسے بھی ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے ساتھی آس پاس موجود تھے۔ مال کے بجائے ان دونوں نے اسٹن گنز نکال لیں جن کے زوردار برقی جھٹکوں نے لمحوں میں دونوں کو بے حس و حرکت کر دیا۔ عاصم نے گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ اس کے ساتھی کھڑے تو ایسے تھے جیسے وہ اس کے لیے جان کی بازی لگا دیں گے مگر وہ اوئے اوئے کرتے رہ گئے۔ اتنا بوکھلائے کہ ایک فائر بھی نہیں کر سکے۔ جب کچھ ہوش آیا تو وہ اپنی گاڑی

کی جانب بھاگے مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ نجم کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جس کام کو ناممکن سمجھ رہا تھا، اس میں انہیں معمولی سی بھی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

وہ اسے بابر لودھی کے دیے گئے ایک سیف ہاؤس میں لے آئے تھے۔ ایک انتہائی تیز ٹارچ کے سامنے اسے بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ جو بہت بڑا پھنے خان بنا ہوا تھا۔ اب ڈرپوک لومڑی کی طرح کسمسا رہا تھا۔ تفتیش کرنے سے پہلے عاصم کو اسے تسلی دینا پڑی۔ نجم کا خیال تھا اس سے معلومات لینے میں بہت وقت لگے گا مگر جب عاصم نے اسے بتایا، وہ کن لوگوں کی تحویل میں ہے تو وہ کسی طوطے کی طرح فرفر بولتا چلا گیا۔ نجم حیران ہو رہا تھا ''ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ'' کے مصداق وہ اندر سے کھوکھلے تھے۔ اب اسے سمجھ آئی تھی، عاصم کو اس کی کس بات نے متاثر کیا تھا۔

وہ مسلسل اصرار کر رہا تھا کہ وہ حمید کو نہیں امد پوپلے کو لے کر صحرا کی طرف گیا تھا۔

عاصم نے اسے حمید کا حلیہ بتایا تو اس نے تصدیق کی مگر نام پر وہ مصر رہا کہ وہ امد پوپلے ہے۔

یہ سنتے ہی عاصم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''تم بھی سلطان کے لیے کام کرتے ہو۔'' عاصم نے جواب معلوم ہونے کے باوجود پوچھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دیا۔

امد...... حمید...... امد...... حمید کی گردان کرتے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اب سلطان کو وہ کسی صورت نکلنے نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں تیزی سے ایک منصوبہ پنپ رہا تھا۔

''تم امد پوپلے سے ہماری ملاقات کا بندوبست کرو گے۔ وہ تم پر بھروسا کرتا ہے۔'' عاصم نے اس شخص سے کہا تو وہ فوراً مان گیا۔

دو دن بعد حمید، عاصم کے سامنے بیٹھا تھا۔ حبیب اور نجم نے دکھاوے کے طور پر خود کو بطور ضمانت اس کے خاص بندے کے حوالے کیا تھا۔ جو دراصل ان کی تحویل میں تھا۔

عاصم نے اس کے سراپا پر نگاہ ڈالی اور بولا۔

''سلطان نے تمہارا سودا کر دیا ہے۔ کسی بھی وقت وہ تم کو بلائے گا اور ان کے حوالے کر دے گا۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے تاکہ تم سلطان کے لیے کسی پریشانی کا سبب نہ بن سکو۔''

حمید نے ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی اور سرد لہجے میں بولا... ''اس نے ایسا کیا تو میں اس سے نمٹ لوں گا مگر تمہیں مجھ سے کیوں ہمدردی ہو رہی ہے؟''

وہ بالکل بدلا ہوا تھا کسی طور وہ والا حمید تو لگ ہی نہیں رہا تھا جس سے وہ دورانِ تفتیش ملا تھا۔

''مجھے تم سے ہمدردی نہیں ہو رہی۔'' عاصم نے درشتی سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم قربانی کا بکرا بن کر سلطان کو نہ بچاؤ۔ سارا کیا دھرا اس کا ہے وہ ملک سے فرار ہو جائے گا اور تم مارے جاؤ گے۔ یہ میں نہیں چاہتا۔ تم جب تک زندہ ہو وہ کم از کم ملک سے باہر نہیں جا سکے گا۔''

''تم اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے؟'' حمید نے طنزاً کہا۔

عاصم نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ''مجھے سلطان کے کہنے پر اس نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔ اس نے میری جگہ اپنا بندہ لگوا لیا ہے۔ اتنا آسان ہوتا تو میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں کیوں ڈالتا۔ تمہارے ساتھ یہاں کیوں بیٹھا ہوتا۔ بس اتنا کرو کہ اگر وہ بلائے تو منہ اٹھا کر پہنچ نہیں جانا۔''

حمید کی پیشانی پر تفکر کی پرچھائیں تیرنے لگی تھی۔

''تم مجھ سے بس اتنا ہی چاہتے ہو۔'' اب کے وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔

یہ سن کر عاصم مسکرا دیا۔

''تم سلطان کو نکلنے نہ دو۔ وہ نکل گیا تو تم نہیں بچ سکو گے۔ یہ میں تم کو بتا رہا ہوں۔'' عاصم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں تمہارا بندہ میری تحویل میں ہے۔ وہ تمہاری پل پل کی خبر سلطان تک پہنچاتا تھا۔ بتا اس لیے رہا ہوں کہ تم ہم پر اعتبار کرو۔''

یہ سن کر حمید ہنسا۔ ''مجھے تم خوفزدہ نہیں کر سکتے۔''

''مجھے ایسا کر کے کچھ نہیں ملے گا۔'' عاصم نے کہا اور چل دیا۔

نجم اور حبیب کا خیال تھا کہ اس نے حمید کو پکڑنے کے لیے جال بچھایا ہے مگر جب اس نے اسے آسانی سے جانے دیا تو وہ دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ ''یہ اب ہم سے بچ نہیں سکتا مگر اس سے...... کچھ کام لینا ہے، وہ ہو جائے تو اس کے بارے میں سوچیں گے۔'' اس نے انہیں مطمئن کیا۔

☆☆☆

دوست ملک سے آئے مہمان پر... ہونے والے حملے کو بہت سنجیدگی سے لیا گیا تھا۔ محکمہ داخلہ نے ارسلان صدیقی کو خصوصی طور پر طلب کیا تھا۔ سلطان کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد اس کی نظر میں اب یہ کوئی ایسا

مشکل کیس نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ اسے اور اس کے محکمے کو خواہ مخواہ اس کام پر لگا دیا گیا تھا۔ اس کے پاس اس سے کہیں زیادہ اہم کام کرنے کو تھے جن کا براہِ راست تعلق ملکی سالمیت کے ساتھ تھا۔ پولیس کی نااہلی کی وجہ سے سلطان کو پر پُرزے نکالنے کی آزادی میسر آ گئی تھی۔ وہ ایک معمولی اسلحہ ڈیلر تھا۔ مہینے کے چند لاکھ کما لیتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے دوسرے کاموں میں ہاتھ ڈالنا شروع کیا اور مخالفین کا صفایا کرتا چلا گیا۔ ساحلی شہر میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ میں اس کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مقتدر حلقوں میں سلطان کو بہت رسوخ حاصل تھا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں میں ایسی کالی بھیڑیں موجود تھیں جو اسے تحفظ دے رہی تھیں۔ ارسلان ذرا بھی حیران نہیں تھا کہ اتنا کچھ معلوم ہونے کے باوجود اس کے خلاف کبھی کوئی کیس درج کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا پولیس کارروائی کرنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ سیاسی بھرتیوں نے اس محکمے کا ستیاناس کر دیا تھا۔ سفارش کلچر کے تحت آنے والے افسر سلطان کی غلامی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کے لیے صورتِ حال بہت مضحکہ خیز تھی۔ جس کیس کو حل کرنے کے لیے ایک ڈی ایس پی لیول کا افسر ہی کافی تھا۔ اس کے لیے اعلیٰ کی سربراہی میں ہونے والی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ملک کے بہترین تفتیش کاروں پر مشتمل ٹیم اس سارے معاملے کو جانچے گی اور اعلیٰ افسران کو براہِ راست رپورٹ کرے گی۔ جیسے ہی اس کو معلوم ہوا اس حملے میں سلطان کا بندہ ملوث ہے اسی وقت اس نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا کہ کیس حل ہو چکا ہے۔

اس وقت ارسلان صدیقی کو اس کا ایک جونیئر اس شخص کے حوالے سے بریفنگ دے رہا تھا جس نے حملہ کیا تھا۔

''سر! ہماری اطلاعات کے مطابق حملہ آور ایک منجھا ہوا قاتل ہے۔ جرم کی دنیا میں جو امد پوپلے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ سلطان کا خاص آدمی ہے۔ آج تک اپنے کسی مشن میں ناکام نہیں ہوا۔ کبھی اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا۔ کسی کو نہیں معلوم وہ کیسا دکھتا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ وہ ایک چھلاوہ ہے۔ صرف اپنے شکار کو زندگی سے آزاد کرنے کے لیے ظاہر ہوتا ہے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے قصے کہانیاں مشہور ہیں۔ جن میں سچ اور جھوٹ کو علیحدہ کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا جس نے بھی اسے دیکھا، ملک الموت کے مانند اپنے مرنے سے چند لمحے پہلے ہی دیکھا۔''

یہ سب سُن کر ارسلان کا موڈ خراب ہو گیا۔

''کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔ یہ کوئی ڈراما چل رہا ہے یا تم مجھے اس سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' اس نے چڑ کر کہا۔ وہ افسر بغلیں جھانک کر رہ گیا۔

ارسلان اس سلسلے میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنے والا تھا۔ اس کا ارادہ تھا وہ براہِ راست سلطان پر ہاتھ ڈالے گا اور اس قاتل کو اس کے بل سے نکال باہر لائے گا۔

لیکن بہت غور و خوض کے بعد بھی وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر اس بھیانک واردات کے پسِ پشت محرک کیا ہے؟ سلطان کا اس میں کیا فائدہ تھا؟ کسی ہمسایہ ملک کے کہنے پر تو اس نے ایسا نہیں کیا؟ ان سب سوالات کے جوابات سلطان سے حاصل کرنے کے لیے اس نے کارروائی کا آغاز کر دیا۔ سب سے بڑا مسئلہ وہ سیاسی جماعت تھی جس کی مکمل پشت پناہی سلطان کو حاصل تھی۔ سلطان اپنے تحفظ کے لیے جماعت کو بھاری بھرکم فنڈ دیتا تھا ارسلان صدیقی اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔

سلطان کو جب یہ معلوم ہوا کہ امد پوپلے نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس نے فوراً اس سے رابطہ کیا تھا۔

''وہ جلال کا بیٹا تھا۔ سوچا تھوڑا سا جی بہلا لوں۔'' امد نے سرد لہجے میں کہا جو اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ مزید کوئی بات نہیں سنے گا۔

سلطان نے اسے تو کچھ نہیں کہا مگر اس کے دماغ میں خطرے کے سائرن بج رہے تھے۔ وہ دور اندیش تھا جانتا تھا کہ اس حرکت کا ردِعمل کتنا خوفناک ہو گا۔ اقتدار کے ایوانوں میں ہونے والے ارتعاش کی خبریں اس تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کے خیر خواہوں نے اس کے اندازے کے عین مطابق اس تک یہ اطلاع پہنچائی تھی کہ اس سلسلے میں اس کا نام لیا جا رہا تھا۔ حملہ آور کی تلاش کے لیے ماہرین کی ایک ٹیم تشکیل پا چکی تھی جو یقیناً پہلے اس تک پہنچتی۔ ارسلان صدیقی کیا کرنے جا رہا تھا اسے معلوم ہو چکا تھا۔

سلطان کو اس کے دوستوں نے کہا تھا کہ وہ وارنٹ، تھانے، کچہری کے چکر میں پڑے بنا ہی اسے اٹھا لے جائے گا۔ اسی کے ذریعے اس کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت اکٹھے کرے گا اور تب عدالت میں لے جا کر پھینک دے گا۔ ارسلان کے ہاتھ لگنے کا مطلب اس کی تباہی تھا۔ اسے مشورہ دیا جا رہا تھا وہ فوراً ملک سے باہر چلا جائے۔ سلطان جانتا تھا وہ چند منٹ بھی ان کی تفتیش کے سامنے نہیں ٹک سکے

گا۔ وہ ملک سے بھاگنے کا سوچ رہا تھا جب اس کے پارٹنر کمال الدین، جو ایک بڑے سیاسی خاندان کا چشم و چراغ تھا، نے اسے کہا کہ حوصلہ رکھے۔ اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ملک سے بھاگنے کے بجائے پوپلے کو صدیقی کے خلاف استعمال کرے۔ اس طرح کے افسر ''اؤ'' نیگیٹو بلڈ کی طرح نایاب ہیں۔ اس کے بعد جو بھی آئے گا، سودا بازی کے لیے تیار ہو جائے گا۔

اب تک سلطان کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے براہِ راست بھڑنے سے احتراز برتتا رہا تھا۔ جب بھی وہ اس کے سامنے آتے وہ کنی کترا کر نکل جاتا۔ ان کاموں میں وہ براہِ راست ہاتھ نہیں ڈالتا تھا جن میں ان کی نظروں میں آنے کا خدشہ ہوتا۔ اس نے کبھی اپنی طاقت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کمال مگر مسلسل اسے اکسا رہا تھا۔

''وہ تمہیں ملک سے باہر جانے نہیں دے گا۔ تم کسی بھول میں نہ رہنا۔'' کمال نے اسے ڈرایا۔

''ارسلان صدیقی تمہیں عام سا مجرم سمجھ رہا ہے۔ تم اس بات کا فائدہ اٹھاؤ۔ وہ بہت بااختیار افسر ہے مگر کام کی نوعیت ایسی ہے کہ اسے زیادہ تر سفر میں رہنا پڑتا ہے اس لیے وہ زیادہ بندے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ خفیہ نقل و حرکت ہی اس کی اصل طاقت ہے۔ اگر درست معلومات مل جائیں تو اس کو پوپلے بہت آرام سے ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ یہ درست معلومات میں تمہیں دوں گا۔'' یہ پیشکش کر کے اس نے سلطان کو راضی کر لیا۔

اگلے ایک ہفتے تک وہ کہاں کہاں پایا جائے گا، کمال نے اپنے تعلقات استعمال کر کے بہت عرق ریزی سے جمع کی گئی معلومات اسے فراہم کر دی تھیں۔ جو اس نے پوپلے تک پہنچا دی۔

جب سے سلطان کو پوپلا ملا تھا، اس کی چاندی ہو گئی تھی۔ وہ کسی غلام کے مانند اس کے حکم کی تعمیل کرتا۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس نے بلامبالغہ سیکڑوں لوگ اس کے کہنے پر قتل کیے تھے۔ وہ شہر سے دور ریگستان میں بستا تھا۔ اس نے چند اونٹ پال رکھے تھے ان میں مگن رہتا۔ سلطان کے کہنے پر حرکت میں آتا۔ کام پورا ہوتے ہی دوبارہ صحرا کی وسعتوں میں غائب ہو جاتا۔

پوپلا اسے بندرگاہ سے ملا تھا۔ قہر برساتی دھوپ سے بے نیاز شدید گرمی میں منہ کھولے سویا ہوا وہ لڑکا جس کے اگلے تمام دانت غائب تھے، نے سلطان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا لی تھی۔ سلطان کو اس کے لبوں پر جمی پراسرار مسکراہٹ ورطۂ حیرت میں ڈال رہی تھی۔ سانس باہر نکالتے ہوئے اس لاغر لڑکے کی پسلیوں تلے پڑنے والا گڑھا اس کے زندہ ہونے کا ثبوت تھا ورنہ زندوں والی کوئی بات اس میں نہ تھی۔ وہ ایک ہی نظر میں پہچان گیا تھا وہ کہاں سے آیا ہو گا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے سر پر کھڑا اسے جگا کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس لڑکے نے اپنا نام احد بتایا تھا۔ سلطان سمجھ گیا تھا کہ وہ حمید کہہ رہا ہے مگر وہ اسے احد ہی کہتا تھا۔ سلطان کو وہ کام کا بندہ لگا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کے کرنے کے بیسیوں کام سلطان کے دماغ میں موجود تھے مگر وہ ایک دن ملک کا سب سے بڑا ٹارگٹ کلر بنے گا اور اسے زیرِ زمین دنیا کا حقیقی سلطان بنا دے گا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔

دنیائے ادب میں شاعر کے لیے جیسے تخلص ضروری ہے۔ جرم کی دنیا میں بالکل ویسے مجرم کے لیے عرفیت لازم ہے۔ ہر چند کہ سلطان نے اس کے منہ میں بڑھیا دانت لگوائے تھے مگر کہلا اسے پوپلے ہی جاتا تھا۔ یہ عرفیت جرم کی دنیا میں اس کی پہچان تھی۔

برف میں پھنسی سیاہ لینڈ کروزر میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ارسلان صدیقی اور اس کے ساتھیوں کا اس نے بطخوں کی طرح شکار کھیلا تھا۔ بریٹا نائن تھری آر کا وہ پہلے سے معترف تھا۔ ٹریگر پر انگوٹھا رکھتے ہی چشم زدن میں میگزین خالی ہو جاتا تھا۔ آج اس پسٹل نے ایک مرتبہ پھر اپنے انتخاب کو بالکل درست ثابت کیا تھا۔ طے شدہ وقت سے پہلے اس نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ اس لیے گاڑی کے گرد گھوم کر تسلی کی اور وہاں سے چل دیا۔ راستے میں اس نے پسٹل اپنے ایک مقامی ساتھی کو تھما دیا۔

کچھ دور جانے کے بعد اسے تعاقب کا احساس ہوا۔ ایک نظر میں اس جوان کو اس نے تول لیا تھا۔ وہ اس کے سامنے دو منٹ بھی نہیں ٹک سکتا تھا۔ اس کا منصوبہ اسے سڑک سے نیچے درختوں تک لے جانے کا تھا مگر بندۂ صحرائی برف میں چلنے کا انداز کیا جانے رپٹ کر گرا اور خود کو زخمی کروا بیٹھا۔

کچھ دیر بعد وہ تھانے میں الٹا لٹکا ہوا تھا۔

احد پوپلے خود پر ہونے والے تشدد کے باوجود مطمئن تھا۔ پولیس والے لاکھ سر پٹختے اس کے خلاف عدالت میں ثبوت پیش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس کی سوچ کے برخلاف کھیل نے کوئی اور رخ اختیار کر لیا۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں نے اسے رہا کروا لیا۔ اس کے اعزاز میں شاندار ظہرانے کا انتظام کیا گیا جسے میڈیا نے بھرپور کوریج دی۔ وہ

حیران ہو رہا تھا، یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہاں شرجیل اعظم کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک آگئی تھی۔ سلطان کے بندوں نے اسے اس شخص سے بچ کر رہنے کو کہا تھا۔ جو مسلسل اس سے رابطے میں تھے۔ وہ ارسلان صدیقی کا نائب تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اسی کے لیے وہاں آیا ہے وہ اتنی آسانی سے اسے جانے دیتے، ایسا سوچنا بھی حماقت تھی۔

شرجیل نے جب اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی تو اس نے ایک نظر اس کے خوبصورت اور بارعب چہرے پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت چمک رہی تھی پھر بھی وہ موت کو اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا رہا تھا۔ ارسلان صدیقی کی طرح وہ بھی کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار تھا۔ پوپلے نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔ چائے کے سپ لیتے ہوئے اس نے پورا منصوبہ بنا لیا تھا۔ مگر چائے ختم ہوتے ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ جب شرجیل نے اسے سیٹ پیچھے کھسکا کر دی تو وہ سمجھ گیا کہ اسے بے ہوشی کی کوئی طاقتور دوا دی گئی ہے۔ عام ادویہ تو برسوں پہلے اپنی تاثیر کھو چکی تھیں۔ وہ اسے جتنا احمق اور لاپروا سمجھ رہا تھا وہ اتنا ہی شاطر نکلا تھا مگر شومیٔ قسمت یہ دوا بھی اسے دو گھنٹے تک ہی سلا سکی تھی۔ گاڑی اس وقت پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ شرجیل کے حلقوم پر چھری پھیرنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے گاڑی کا اسٹیئرنگ پوری قوت سے گھما دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ننھا سا چاقو کھڑکی سے باہر اچھال چکا تھا۔

اس کی قسمت اچھی تھی، وہ ان کو ملا نہیں۔ اسپتال سے وہ بھاگنے کے منصوبے بنا رہا تھا مگر اچانک ایک دن اسے وہاں سے خود جانے کا کہہ دیا گیا۔ اسے معلوم تھا اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔ یعقوب نے سلطان کو بتا دیا تھا کہ وہ عاصم کے خاص بندے تھے۔ سلطان نے پوپلے کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا تھا مگر جب یہ تعاقب طول پکڑ گیا تو.. وہ انہیں گندے نالے تک لے آیا جہاں اس کے دوست بستے تھے جو ہیروئن کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ پوپلے جب بھی وہاں آتا ہیروئن اور چرس کا ریٹ وہاں کے رہنے والوں کے لیے خود بخود گر جاتا۔ پوپلے کی خواہش پر سلطان اپنے بندوں کو کہہ کر ایسا کرواتا تھا۔ وہ پوپلے کو کوئی روحانی شخصیت تسلیم کرتے تھے۔ وہ ان کا مرشد تھا۔ سارا سال وہ اس کا انتظار کرتے تھے۔ اب وقت آگیا تھا وہ اپنے مرشد کے لیے کچھ کریں۔

اس دن وہ بلو ہوٹل جانے کے لیے نالے میں اترا تو وہ دونوں بھی اسے آتے دکھائی دیے۔ اس کے ایک اشارے پر پچاس ساٹھ ہیروئنچی ان پر پل پڑے۔ وہ بہت تربیت یافتہ تھے مگر ان سے لڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کے مکے ان کی ہڈیوں سے ٹکراتے تو ان کی اپنی چیخیں نکل جاتیں۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ دونوں ادھ موئے ہو چکے تھے۔ انہیں بے دردی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اتنی دیر میں پوپلے کھانا کھا چکا تھا اور اب انعام کے طور پر سب میں ہزار ہزار روپیہ بانٹ رہا تھا۔ رسیوں سے بندھے دونوں آدمیوں کے موبائل اس کے سامنے موجود تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک موبائل کی اسکرین پر ڈی لکھا ہوا نظر آیا۔ تو اس نے ایک جھومتے ہوئے نشئی کو فون دے کر کہا وہ بات کرے۔ اس کے اندازے کے عین مطابق دو بندے تیزی سے نالے میں اتر رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو آگے تھا اس کے ہاتھ میں گلاک سیونٹین پسٹل دیکھ کر پوپلے ایک پلر کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کا سارا منصوبہ غارت ہونے جا رہا تھا۔ وہ ان کو اپنے ساتھ زندہ لے جانا چاہتا تھا۔ سنگین صورتِ حال پا کر ان دونوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ان کے ایک فائر سے وہاں تین چار ہیروئنچی گر جاتے تھے۔ ان کے سوکھے جسموں سے گولیاں آر پار ہو جاتی تھیں۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے روئے زمین کی سب سے خطرناک مخلوق سے ان کا واسطہ پڑا تھا۔ وہ بے دریغ ان کی جانب بڑھتے تھے۔ ان دونوں کو اپنی حماقت کا احساس ہو چلا تھا مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ وہ اب وہاں سے بھاگنا چاہتے تھے مگر ایسا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہاں سب ان پر پل پڑے تھے۔ جس کے ہاتھ میں جو آ رہا تھا، وہ اس سے ان کو مار رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ان کے لہولہان جسموں پر ڈالی اور وہاں سے نکل آیا۔ کچھ دیر میں پولیس وہاں آ پہنچی۔ وہاں رہنا اب خطرناک تھا۔ اس کا منصوبہ ان کو اغوا کر کے لے جانے کا تھا۔ وہ ان کے ذریعے عاصم تک پہنچنا چاہتا تھا۔

رات کے اندھیرے میں ایک سنسان گلی میں چلتے چلتے اس نے ایک نمبر ملایا۔ کچھ دیر میں وہ مرکزی شاہراہ پر ایک لگژری کار میں سفر کر رہا تھا۔ وہ صحرا کی جانب جا رہا تھا جہاں اس کا گھر تھا۔ ایک بستی سے کچھ دور اس نے گاڑی رکوا دی۔ گاڑی میں سے دو آدمی نکلے اور بھاری بھرکم تھیلے نکال کر نیچے رکھ دیے اور بنا کوئی بات کیے وہاں سے چل دیے۔ سامان وہیں چھوڑ کر وہ بستی کی جانب چل دیا۔ وہاں کے مکین پہلے تو یوں اس کی آمد سے حیران ہوئے پھر ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ اس کے کہنے پر دو تین جوان وہ سامان اٹھا لائے۔ جو اس نے بستی والوں میں

تقسیم کر دیا۔ جیب سے سارے پیسے نکال کر ان کو دے دیے۔ اس نے وہاں کھانا کھایا۔ ایک شخص کو آواز دی کہ وہ اس کے اونٹ لے آئے۔ پانچ خوبصورت اونٹ ایک قطار میں موجود تھے۔ سب سے آگے بندھے ہوئے اونٹ نے تھوتھنی اس کی گردن پر رکھ دی جیسے وہ اس کی آمد سے بہت خوش ہو۔ اس نے اس کی گردن کو تھپتھپایا۔ اونٹ تو وہاں سب کے پاس تھے مگر پوپلے کے اونٹوں کی بات ہی الگ تھی۔ ایسی محبت اپنے مالک کے لیے انھوں نے کبھی اونٹوں میں نہیں دیکھی تھی۔ چاندنی رات میں وہ نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا تھا۔ ساری بستی والے اسے الوداع کہنے آئے تھے۔

☆☆☆

عاصم کی جگہ لینے والا کمال کا سالا یعقوب اپنے بندوں کو لے کر سرحدی شہر میں امد پوپلے کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ یعقوب نے اپنے بندوں سے کہا تھا کہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں صرف یہ دھیان رکھیں اس کا چہرہ سلامت رہے تاکہ پہچان کرائی جاسکے۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے مگر ابھی تک وہ انھیں نظر نہیں آیا تھا۔ سلطان، یعقوب سے مسلسل رابطے میں تھا۔

"تمھیں خود ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ تم اسے پہچانتے ہو۔ تمہارے ساتھی کام بگاڑ ہی نہ دیں۔" سلطان نے غصے سے کہا۔ اسے جب معلوم ہوا وہ ایک ہوٹل میں رنگ رلیاں منا رہا ہے تو اس کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔

یعقوب نے جواب میں قہقہہ لگایا۔

"تم کو اتنی فکر ہے تو تم خود آجاتے۔ تم مجھے میرا کام کرنے دو، وہ اگر آیا تو بچ کر نہیں جائے گا۔" اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' سلطان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ امد پوپلے کو جانتا تھا وہ مار خور جیسی حس رکھتا تھا اسے ذرا بھی شک ہو جاتا تو وہ وہاں سے غائب ہو جاتا۔ اسے سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ اسے پھنسانے کی سازش سلطان کی ہے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ سلطان کے دیے گئے سبق اس نے ہمیشہ یاد رکھے تھے۔ جن میں سے ایک سبق یہ بھی تھا، دھوکے باز کی سزا موت ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں اس کے بعد زیر زمین دنیا میں اس پر کوئی اعتبار نہ کرتا۔ اس کے جاننے والے اس پر تھو تھو کرتے۔ اس کے اپنے آدمی اس کے دشمن ہو جاتے۔ اس نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا بہرصورت پوپلے کو مار ڈالا جائے۔

مستقبل کے خدشات سنپولیے بن کر اس کے دماغ میں رینگ رہے تھے۔ اچانک یعقوب کی کال موصول ہوئی۔ اس کے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ اس کے آدمیوں نے پوپلے کا کام تمام کر دیا تھا۔ وہ اس بات پر پھولا نہیں سما رہا تھا کہ جس کام کو ملک بھر کی ایجنسیوں کے بہترین لوگ سرانجام نہیں دے سکے تھے، وہ کام اپنی تعیناتی کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے کر دیا تھا۔ اس کو وزیراعظم نے خود فون کر کے مبارک باد دی تھی۔ پوپلے کی لاش تصدیق کے لیے دارالحکومت بھجوائی جا رہی تھی۔ یہ سن کر سلطان نے سکھ کا سانس لیا تھا مگر کچھ دیر بعد پوپلے کے انجام پر اسے دکھ ہو رہا تھا۔ جسے منانے کے لیے اس نے وہسکی کی بوتل نکال لی تھی۔ اس نے دو پیگ بھی نہیں پیے تھے کہ یعقوب کی کال پھر آگئی۔ وہ انتہائی غصے میں تھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے یہ امد پوپلے تمھیں بندرگاہ سے ملا تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ یہ تمہاری ...... کے یار کہاں سے آگئے۔ پچاس سے اوپر اس کے وارث اکٹھے ہو گئے ہیں۔ میڈیا والے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اگر تم نے کوئی دھوکا کیا ہے تو میں تمہاری ......" ایک موٹی گالی دی اس نے۔

سلطان اس وقت ویسے بھی نشے میں تھا۔ اس سے یوں کبھی کسی نے بات نہیں کی تھی۔ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان بہہ نکلا تھا۔ یعقوب بھی برابر گالیاں بک رہا تھا۔

اچانک ایک خیال سے اس کا نشہ ہرن ہونے لگا۔ ان لوگوں نے پوپلے کے دھوکے میں کسی اور کو تو نہیں مار ڈالا تھا۔ وہ باتھ روم گیا ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ جب حواس بحال ہوئے تو یعقوب کو کال ملائی۔

دوسری طرف سے اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

وہ شدید خطرے میں گھر چکا تھا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو کال ملائی اور اسے ساری صورتِ حال بتا کر کہا کہ تصدیق کر کے بتائے کہ وہاں پوپلے ہی مارا گیا ہے یا یعقوب کے بندوں نے کسی اور کو مار ڈالا ہے۔

اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔ یعقوب جیسے اناڑی سے اور توقع بھی کیا کی جاسکتی تھی۔ اس نے فوراً کمال کو کال کی اور اسے ساری صورتِ حال بتا کر دہاڑا۔

"مجھے اب جلد سے جلد یہاں سے نکالو۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

کمال اس کے یوں بات کرنے پر ہنسا اور بولا۔ "بس بھاگنے کو تیار رہتے ہو۔ میں تو حیران ہوں اتنا دھندا کیسے پھیلا لیا۔ اتنا خوفزدہ ہونے کی بھی بھلا کیا ضرورت ہے۔ میں تمھیں آج کل میں ملک سے نکال دوں گا مگر تم کو اپنے حصے سے محروم

ہونا پڑے گا۔"

یہ سن کر سلطان کو جھٹکا لگا۔ "تم ہوش میں ہو۔ تم اب مجھ سے قیمت طلب کرو گے۔" سلطان نے ایسے لہجے میں کہا کہ اگر وہ سامنے ہوتا تو وہ اس کا خون پی جاتا۔

"تمہارا ٹائم خراب چل رہا ہے سلطان۔ اتنی قیمت ادا کر کے ہی تم یہاں سے نکل سکتے ہو۔ عاصم بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔ وہ کسی بھی وقت تمھیں دبوچ لے گا اگر پوپلے تم تک نہ بھی پہنچ سکا۔" کمال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

سلطان بری طرح پھنس گیا تھا۔ اس کے پاس ملک سے بھاگنے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ مگر کمال جس حصے کی بات کر رہا تھا، وہ دو بلین ڈالرز کی ڈیل تھی۔ اتنی بڑی قیمت دیتے ہوئے اس کا کلیجا منہ کو آ رہا تھا۔

"زیادہ مت سوچو! زندہ رہو گے تو پیسہ بنانے کے بہت مواقع ملیں گے۔" کمال نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"تم آج رات تک اپنی تیاری پوری کر لو۔ میں انتظام کر دیتا ہوں۔ قیمت ایڈوانس میں ادا کرنی ہوگی۔" کمال نے کھاگ سودخور کی طرح کہا۔

"تم مجھے یہاں سے نکالنے کا انتظام کرو، میں تمھیں فائل دے دوں گا۔ لاکر نمبر اور پاسورڈ بتا دوں گا۔" کوئی راہ نہ پا کر سلطان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

کمال بہت عرصے سے اس کو اس ڈیل سے علیحدہ کرنے کے چکر میں تھا مگر اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج وہ خوشی سے مخمور تھا۔ بیٹھے بٹھائے خزانہ ہاتھ آگیا تھا۔ سلطان ملک سے باہر چلا جاتا تو وہ اس کے نیٹ ورک پر بھی قبضہ کر لیتا۔ وہ اس وقت ساحل سمندر پر بنے اپنے بنگلے میں موجود تھا۔ آج اس کا موج مستی کرنے کا ارادہ تھا مگر اس کے خاص نمبر پر آنے والی کال نے اس کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔

"میں حمید بات کر رہا ہوں۔" ایک پھنکارتی ہوئی آواز آئی تھی۔

"کون حمید؟" کمال نے حیرت سے پوچھا۔

"ارسلان صدیقی اور شرجیل کا نام سنا ہے بلکہ انھیں چھوڑو اصغر شاہ کو تو جانتے ہو گے تمہارا سب سے بڑا کاروباری حریف تھا جسے تمہارے کہنے پر دن دہاڑے قتل کر دیا گیا تھا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

کمال یہ سن کر اچھل پڑا۔ "ت...... تت...... تم امد پوپلے ہو؟ تم کو میرا نمبر کس نے دیا۔" اس نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں حمید بات کر رہا ہوں۔" جس لہجے میں کہا گیا تھا، کمال کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

"مجھے کیوں کال کی؟" کمال نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تمھیں یہ بتانے کے لیے کال کی کہ تم جس کرسی پر بیٹھے ہو اس پر سے ہلنا نہیں۔ ایم 82 کی دوربین میں مجھے تمہاری کھوپڑی بہت اچھے سے دکھائی دے رہی ہے۔ میرے نشانے کی سچائی سے تم واقف ہو۔ تمہارا چہرہ بھی پہچانا نہیں جائے گا۔ ہاں گولی کے ساتھ دوڑ لگانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے پاجامے کا رنگ پوچھنا چاہو تو بھی مجھے اعتراض نہیں۔"

دوسری طرف کمال کی بے ترتیب سانسوں کی آواز آ رہی تھی۔

"ویسے مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ سلطان کو بلاؤ۔ اسے ابھی فون کرو۔ جب آئے تو بالکل اپنے سامنے بیٹھنے کا کہو۔ دوسری کسی بھی صورت میں تم نہیں بچ پاؤ گے۔"

کمال چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"ویسے میں تمہارے دس بارہ غیر تربیت یافتہ گارڈز کو مار کر اندر بھی گھس سکتا تھا مگر مجھے تم نہیں سلطان چاہیے۔ بلاؤ اسے۔ اسپیکر اونچا کر کے بات کرو۔" تحکمانہ لہجے میں اس نے کہا۔

کمال نے سامنے موجود گلاس ونڈو کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً سامنے کسی بلڈنگ پر تھا۔ ایسی صورتِ حال سے اس کا سابقہ پہلی مرتبہ پڑا تھا۔ ساری ذہانت، اعتماد دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دوسرا فون نکالا۔

"خود پر قابو رکھو۔ اسے شک نہیں ہونا چاہیے۔ وہ آئے گا تو تمہاری جان بچے گی۔ اسے مجبور کرو وہ آئے۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ میرا ہاتھ تھک گیا تو میں تمھیں گولی مار کر نکل جاؤں گا۔" حمید نے ایسے کہا جیسے یہ کوئی بڑی بات ہی نہیں۔

کمال نے سلطان کو فون ملایا اور اسے ساحل والے بنگلے پر پہنچنے کو کہا۔

"میں فائل بھی ساتھ لا رہا ہوں۔" سلطان نے اس فون کو کمال کے لالچ پر محمول کرتے ہوئے کہا۔ "تم بس میرا کام کر دو۔"

اس سے پہلے وہ کوئی اور بات کرتا، کمال نے اسے جلد پہنچنے کا کہہ کر کال منقطع کر دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا حمید کو اس کی

ڈیل کے بارے میں معلوم ہو۔ مگر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"کس کام کا کہہ رہا ہے کہیں وہ ملک سے بھاگنے کا تو نہیں سوچ رہا۔ اس کام کے بدلے کیا وصول کر رہے ہو؟" اعد۔۔۔۔۔ کسی ماہر تفتیش کار کی طرح سوال کر کے کمال کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ کمال نہیں چاہتا تھا اسے کسی صورت اس رقم کا علم ہو۔

"یہ کاروباری باتیں ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم نے جیسا کہا میں نے ویسا کیا۔ سلطان آ رہا ہے۔" کمال نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

حمید نے بھی اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔

ایک گھنٹے تک کمال اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ وہ گردن بھی ہلاتا تھا تو حمید فوراً اس بات کا نوٹس لیتا۔ خدا خدا کر کے سلطان وہاں پہنچا۔

"وہیں اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاؤ۔" پوپلے نے کمال کو حکم دیا۔ ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو تم جان سے جاؤ گے۔ کمال نے بلا چون چرا اس کی بات مان لی تھی۔

"تمہارے سالے نے سارا کام بگاڑ دیا۔" پہنچتے ہی سلطان نے گلہ کیا۔ "اعد کے دھوکے میں کسی فقیر کو گولیاں مار دیں۔ اس کا سارا خاندان سڑک بند کر کے بیٹھا ہے۔ اعد کو تم جانتے ہو اگر اسے معلوم ہو جائے تو وہ میرا کیا حال کرے گا۔ وہ میرے بارے میں ضرورت سے زیادہ جانتا ہے۔ میرے ہر ٹھکانے سے واقف ہے۔ فی الحال تو میں نے اسے مطمئن کر دیا ہے کہ فون کسی ایجنسی نے ٹیپ کر لیا تھا مگر وہ جلد یا بدیر سمجھ جائے گا۔ تم بتاؤ تم نے میرا کام ...." بولتے بولتے سلطان اچانک رک گیا۔

"تم کیوں بت بنے ہوئے ہو۔" کمال کو کسی روبوٹ کی طرح بیٹھے دیکھ کر وہ کچھ مشکوک ہوا۔

اس وقت تپائی پر دھرے موبائل سے حمید کی بھرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

"تم نے مجھے دھوکا دیا سلطان بابا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں مارنا میرے لیے بہت مشکل ہو گا۔ میں بے سہارا تھا تم نے مجھے سہارا دیا۔ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ ننگا تھا لباس پہنایا۔ کمزور تھا طاقت ور بنایا۔ بدلے میں، میں نے تمہارے لیے چھ دفعہ گولی کھائی۔ پچھلے دس سالوں میں کتنے لوگ قتل کیے، مجھے یاد نہیں۔ تم نے جب کہا جسے کہا، میں نے مار ڈالا۔ تم سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور تمہاری ایک ہر بات کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھا۔ تم ہی تو کہا کرتے تھے۔ دھوکے بازی ہمارے دھندے میں کوئی جگہ نہیں۔ اس جرم کی سزا موت ہے پھر تم نے ایسا کیوں کیا بابا......؟"

سلطان کا رنگ ایک لمحے کو پیلا پڑ گیا۔ اس نے کمال پر ایک غضب ناک نگاہ ڈالی جو سکتے کی سی حالت میں بیٹھا تھا۔

سلطان نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ "میرے بچے! میرے پاس تم نے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ میں اپنا سب کچھ لٹا کر اس ملک سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ جو سامنے بیٹھا ہے۔" اس نے ایک حقارت آمیز نگاہ کمال پر ڈالی۔ "کبھی میرے ٹکڑوں پر پلتا تھا۔ آج مجھ سے اس معمولی کام کے بلین ڈالرز مانگ رہا ہے۔ میرے لیے تو خسارہ ہی خسارہ ہے۔ تمہاری ایک غلطی نے میرا سب کچھ برباد کر دیا۔" سلطان نے آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر حمید کو طیش آ گیا۔

"مجھے دوش مت دو بابا! جلال کے بیٹے پر حملہ میں نے ذاتی حیثیت میں کیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے تھے اس میں تمہارا ہاتھ ہے پھر بھی کوئی مسئلہ ہوتا، تم حکم کرتے میں پیش ہو جاتا۔ تم نے بلا ضرورت انٹیلی جنس والوں کو مروا ڈالا۔ وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ تمہیں اسے اتنی بڑی رقم دینے کی کیا ضرورت تھی۔ تم مجھے کہتے میں تمہیں اس سے اتنی ہی رقم نکلوا کر بھی دیتا اور یہ تمہیں ملک سے باہر بھیجنے کا انتظام بھی کرتا۔" حمید نے غضب ناک ہو کر کہا۔

اس کی بات سن کر کسی خیال سے سلطان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں اور مرنے کے لیے تیار ہوں مگر میری ایک آخری خواہش ہے تم پہلے کمال کو قتل کر دو گے پھر میری طرف آؤ گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم جہاں کہو گے میں آ جاؤں گا۔" سلطان نے فاتحانہ نظروں سے سامنے بیٹھے کمال کو دیکھا۔

کمال یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار دروازے کی جانب دوڑا۔ سلطان اسے یوں بھاگتا دیکھ کر حیران رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے سامنے دیوار پر بھیجا ملے گاڑھے خون کے چھینٹے پڑتے دیکھ کر اس کا جسم سن ہو گیا۔ کمال ایک جانب خون کے تالاب میں پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کے سر کا اوپری حصہ غائب ہو گیا تھا۔ سلطان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ وہ اس کے نشانے پر تھے۔ اس نے یہ بات کمال کو پھنسانے کے لیے کہی تھی۔

اس نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ٹھک ونڈو گلاس میں ایک اور سوراخ ہوا اور سلطان ایک جھٹکے سے

زمین پر گرا۔

سلطان اور کمال کو قتل کر کے حمید غائب ہو گیا تھا۔ عاصم کا خیال تھا، وہ اسے بہت آسانی سے اسے تلاش کر لے گا۔ تمام وسائل اس کی تلاش میں جھونکنے کے بعد بھی وہ اسے نہیں ملا۔ یہ بہت بڑی ناکامی تھی۔ اس کی تلاش میں کچھ اور محکمے بھی تھے مگر وہ کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔ اس دن وہ اخبار پڑھ رہا تھا جب نجم کی کال موصول ہوئی۔

"سر، آپ کو حمید کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔" نجم نے تکلفات میں پڑے بنا کہا۔

"کیا معلوم ہوا ہے اس بارے میں جوان! جلدی بتاؤ؟" عاصم تیز آواز میں بولا۔

"سر! وہ آج کل پڑوسی ملک کی کسی جیل میں ہے۔" نجم نے جوش سے کہا۔

"وہاں کیسے پہنچ گیا اور یہ تم نے کیسے پتا چلا لیا؟" عاصم کی آواز خودبخود دبی ہو گئی تھی۔

"سر! میں نیوز دیکھ رہا تھا۔ ایک ماہ پہلے جو مچھیرے بھٹک کر پڑوسی ملک کی سمندری حدود میں داخل ہو گئے تھے، ان میں حمید بھی تھا۔ میں نے خود اس کو ٹی وی پر دیکھا ہے۔"

نجم کے اس انکشاف نے عاصم کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔ اس نے اسے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا تھا اور وہ کہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ بہت خطرناک بات تھی۔ پڑوسی ملک کی انٹیلی جنس کو اگر ذرا سی بھنک بھی لگ جاتی کہ وہ کون ہے؟ تو وہ اسے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کرتے۔ حمید کے زیر زمین دنیا میں تعلقات کے بل بوتے پر وہ مملکت ...... میں بہت تباہی پھیلا سکتے تھے۔ بابر لودھی بھی یہ سن کر پریشان ہو گیا تھا۔

اس نے اس سلسلے میں اوپر والوں سے بات کی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد حمید کو وہاں سے نکالنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اس سارے آپریشن کے لیے ایک مہینے کا وقت رکھا گیا تھا۔

عاصم کا خیال تھا کہ وہ سرحد پار کوئی تگڑا سا آپریشن کریں گے۔ اسے جیل سے نکال لائیں گے۔ یہاں وہیں قتل کر دیں گے۔ اسے فلموں کی حد تک تو یہ بات ٹھیک لگتی تھی مگر حقیقت میں یہ سب اس کے نزدیک ممکن نہیں تھا۔ وہ اس سب میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کو قریب سے دیکھ رہا تھا جو اس ملک کی آنکھیں اور کان تھے۔ جو ہر وقت حالت جنگ میں رہتے تھے۔ جب آپریشن کا آغاز ہوا تو وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔

غیر محسوس طریقے سے ایک غیر ملکی این جی او کو پڑوسی ملک کے پکڑے گئے مچھیروں تک رسائی دی گئی۔ جس نے ان پر ایک ڈاکومینٹری بنا ڈالی۔ جس کے سامنے آتے ہی حسب توقع سول سوسائٹی نے احتجاج شروع کر دیا۔ ان کو رہا کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ انسانی حقوق پر کام کرنے والی ایک عالمی تنظیم کے مقامی مبصر نے اس حوالے سے ایک مہم کا آغاز کر دیا۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا بھی اس جنگ میں کود پڑے۔ کالم نویسوں نے اس حوالے سے لکھ لکھ کر اخبارات کے صفحے بھر دیے۔ اس دوران کچھ محب وطن صحافیوں نے اپنے پکڑے گئے مچھیروں کے لیے بھی آواز بلند کی۔ ایک بحث کا آغاز ہو چکا تھا کہ ان غریبوں کو اپنی دشمنی کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔ ان کے لیے قوانین نرم کیے جائیں۔

پلان کے مطابق اچانک صدر مملکت نے ایک دن خیر سگالی کے پیغام کے طور پر پڑوسی ملک کے مچھیروں کو رہا کر دیا۔ سرحد کی دوسری طرف اس غیر متوقع اقدام نے کھلبلی مچا دی۔ مجبوراً ان کو بھی وہ مچھیرے رہا کرنے پڑے۔

عاصم اور اس کی ٹیم حمید کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھی ... جلد ہی وہ انہیں دکھائی دے گیا۔ اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ جیسے ہی اس کی عاصم پر نظر پڑی، وہ دوڑ کر اس کے پاس آیا۔ "صاحب سگریٹ ہے سگریٹ پلاؤ۔ جلدی سے پلاؤ۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

حبیب نے اسے جیب سے سگریٹ نکال کر دیا تو جلدی سے اس نے کپکپاتے ہونٹوں میں داب لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ اب ایک بے پایاں سکون اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک اور سگریٹ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ حبیب نے اسے پوری ڈبی تھما دی۔ کسی نادیدہ بچے کے مانند جسے اس نے تھام لیا۔ سارا راستہ وہ سگریٹ پیتا رہا انہوں نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

عاصم نے اسے اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ حمید ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار تھا۔ اس کے انکشافات کے بعد اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے لوگوں کو کچھ ہوش آیا اور انہوں نے ایسے عناصر کے خلاف کارروائی کا عندیہ دیا جو ملک کے امن کے لیے خطرہ تھے۔ اس حوالے سے پلان بن رہے تھے۔ سوچ بچار کی جا رہی تھی۔ اس دوران میں بے وطن بچوں سے بھرا ایک اور بحری جہاز اسلامی جمہوریہ کی طرف رواں دواں تھا۔ اعد پوپلے جیسے سیکڑوں بچے ساحلی شہر پہنچنے والے تھے۔

بلیک میلر

انجم فاروق ساحلی

نوجوانی کی بالی عمریہ کو خطرناک سمجھا جاتا ہے... جوشِ جوانی میں یہ ادراک نہیں ہوتا کہ یہ راستہ کتنا خطرناک اور سانپ کی طرح بل دار ہے... مدہوشی و سرمستی کی کیفیات ہوش و خرد کے ہر احساس کو دور کھڑا کر دیتی ہیں... محبت... نفرت اور دھوکے دہی کی سنسنی خیز مثلث... دونوں کھلاڑیوں میں ٹکر کی بازی تھی...

شاطر ذہین کی شاندار منصوبہ بندی کا دلچسپ احوال......

رات کا وقت تھا۔ مارگریٹ نے دستی گھڑی دیکھی۔ نو بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ اسے اپنے شوہر رینالڈ کو قتل کرنے میں پورے دس منٹ لگے تھے اور اب وہ خود کو حیرت انگیز طور پر پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔ وقت کم تھا۔ اب لائبریری میں وہ ایک منٹ بھی نہیں رک سکتی تھی۔ اس نے پیچھے دیکھے بغیر لائبریری کا دروازہ کھولا۔ ہال خالی تھا۔ اس کی نوجوان اور خوب صورت ملازمہ ڈرائنگ روم میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ملازمہ کا نام کلارا تھا۔

مارگریٹ مطمئن انداز میں ہال عبور کر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، کلارا دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور یاقوتی ہونٹ تھوڑے سے کھلے ہوئے تھے۔ جذبات کی وجہ سے اس کی سانسیں بہت تیز چل رہی تھیں۔ اس نے مارگریٹ سے پوچھا۔

''کام ہو گیا؟''

''ہاں۔'' مارگریٹ نے سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ جواب دیا۔

''کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں، ہر کام اندازے کے مطابق نہایت آسانی سے ہو گیا۔'' مارگریٹ نے گلاس میں برانڈی انڈیلی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ اسے شدت سے شراب کی طلب ہو رہی تھی۔ تیز شراب کی۔ اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی، ملازمہ نے معنی خیز نظروں سے اپنی حسین اور نوجوان مالکہ کی طرف دیکھا۔ مارگریٹ نے برانڈی کی چسکی لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کلارا دروازہ کھولنے چلی گئی۔ چند لمحوں بعد مارگریٹ کو ہال سے گفتگو کی آواز سنائی دی۔ کلارا کی کسی مرد سے گفتگو۔ مارگریٹ نے جلدی سے برانڈی ختم کر کے گلاس میز پر رکھ دیا۔ برانڈی نے اس کی رگوں میں آگ بھر دی تھی۔ اس کے بدن میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ بند ہو گئی اور اس کی خود اعتمادی تیزی سے لوٹ آئی۔ کلارا کے ساتھ ایک دراز قد اور وجیہہ نوجوان ڈھیلے ڈھالے دتیالوجی سوٹ میں ملبوس تھا پھر بھی اس کا مضبوط کسرتی جسم نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اس کی کمر پتلی تھی۔ کولھے بھی پتلے تھے...... اس کی نیلی آنکھیں گستاخ اور شرارت آمیز معلوم ہو رہی تھیں۔

مارگریٹ اس یونانی دیوتا کے خدوخال آنکھیں بند کر کے بھی دیکھ سکتی تھی کیونکہ اس کے ساتھ اس نے متعدد رنگین اور پُرکیف شامیں گزاری تھیں۔ ''کیسی ہو جان؟'' مارٹن نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس طرح مخاطب نہ کرو۔'' مارگریٹ کا لہجہ سرد تھا۔

''اوہ، معاف کرنا میں بھول گیا تھا کہ اب ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل چکی ہے۔ کیا میں تمہیں تمہارے نام سے مخاطب کروں؟''

''نہیں، میں مسز رینالڈ کہلانا زیادہ پسند کرتی ہوں۔''

''اچھا۔'' مارٹن نے تمسخر سے کہا۔ ''کیا اب تم اپنے بوڑھے بر فیلے شوہر سے محبت کرنے لگی ہو؟'' وہ چند لمحوں تک شرارت سے اسے دیکھتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''خوب یاد دلایا۔ ہماری یہ ملاقات کاروباری نوعیت رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وعدے کے مطابق تم نے پچاس ہزار ڈالر تیار رکھے ہوں گے۔''

مارگریٹ اپنی نشست سے اٹھ کے قالین پر ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اچانک رکی اور مڑ کے اپنے سابق محبوب کو گھورنے لگی۔ ''نہیں، میرے پاس رقم نہیں ہے۔''

''یہ تو سراسر وعدہ خلافی ہے۔'' مارٹن کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ''تم نے ٹیلی فون پر خود مجھ سے یہاں آنے کی درخواست کی تھی۔ تاریخ اور وقت کا تعین بھی تم ہی نے کیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ رقم تیار ہو گی۔ کیا میں غلط تاریخ یا غلط وقت پر آ گیا ہوں؟''

''نہیں، تاریخ اور وقت دونوں صحیح ہیں۔''

''پھر مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تمہارے پاس وعدہ خلافی کا کوئی جواز نہیں۔ شاید تم مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو؟ مجھے بھی احساس ہے کہ ان معاملات کے لیے گھر میں ملاقات نہیں کرنی چاہیے۔ ویسے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تم نے مجھے اپنے گھر بلا کے خواہ مخواہ خطرات کو دعوت دی ہے۔ میں تم سے کسی بھی جگہ ملنے کے لیے تیار تھا۔ کسی سے کدے کے مختصر سے کیبن میں یا کسی جھاڑی کی اوٹ میں یا کسی سنسان باغیچے کی آخری بینچ پر۔''

''کسی مے کدے، جھاڑی یا باغیچے میں ملاقات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں رقم نہیں دوں گی۔ نہ یہاں نہ کہیں اور۔''

''کیا؟'' مارٹن حیرت زدہ رہ گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو مارگریٹ؟''

''میں یہ کہہ رہی ہوں مارٹن کہ میں تمہیں رقم نہیں دوں گی۔ رقم میرے پاس ہے ہی نہیں اور میں کہیں سے اس کا انتظام بھی کرنا نہیں چاہتی اور اگر میرے پاس اتنی رقم ہوتی یا اس کا بندوبست کرنا میرے بس میں ہوتا تب بھی میں رقم تمہیں نہ دیتی۔''

مارٹن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک خاموشی سے مارگریٹ کو دیکھتا رہا پھر اس کی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ ''کیا تم مذاق کر رہی ہو؟''

''نہیں، میں بے حد سنجیدہ ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' مارٹن خشونت سے بولا۔ ''کیا تم اپنے فیصلے کا نتیجہ جانتی ہو؟''

''پوری طرح جانتی ہوں۔''

''نہیں، شاید تمہیں احساس نہیں کہ صورتِ حال کس قدر سنگین ہے۔'' مارٹن نے کہا۔ 'میں تمہیں نتیجے سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر تم اپنے اس غلط فیصلے پر جمی رہیں تو میں تمہارے شوہر کو اپنے اور تمہارے رنگین تعلقات کی ناگوار تفصیلات بتانے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

''تمہارے شوہر بوڑھے ہونے کے علاوہ بے حد قدامت پسند بھی ہیں۔ وہ بہت دولت مند بھی ہیں اور ملک کے ایک معزز ترین شہری ہیں۔ اگر انہوں نے تقاضا کیا تو میں تمہارے لکھے ہوئے گرما گرم خطوط، محبت نامے اور چند خوب صورت تصویریں بھی ادب سے انہیں پیش کروں گا۔ ان تصویروں میں ہماری محبت کے یادگار لمحات محفوظ ہیں۔ وہ تصویریں میں نے تمہاری بے خبری میں ایک حساس اور خودکار کیمرے سے کھینچی تھیں۔ میں تمہارے بزرگ شوہر مسٹر رینالڈ کو یہ بھی بتاؤں گا کہ تمہارے عاشقوں میں میرا نمبر گیارھواں یا بارھواں تھا۔ تم جانتی ہو کہ ان ٹھوس ثبوتوں کی وجہ سے مسٹر رینالڈ چپ چاپ میری خاموشی کی قیمت ادا کر دیں گے۔ وہ ایک شریف آدمی ہیں اور بدنامی سے بہت ڈرتے ہیں لیکن میری جان، میری شعلہ بدن محبوبہ! یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوگا۔ تم اپنے شوہر کو اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ تم جیسی آوارہ عورت کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کریں گے اور تمہیں انہی دو کپڑوں میں کھڑے کھڑے اس گھر سے نکال دیں گے۔ وہ تمہارے خطوط اور تصاویر کی مدد سے تمہیں اس طرح طلاق دے دیں گے جس طرح کسی کو ملازمت سے برخاست کیا جاتا ہے پھر تم ان کے لاکھوں ڈالرز سے محروم ہو جاؤ گی۔'' مارٹن سانس لینے کے لیے رکا پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چند ہفتے پہلے ہم دونوں انتہائی گہرے دوست تھے۔ خلوتوں میں ہمارے درمیان کوئی فاصلہ کوئی حجاب نہیں رہتا تھا۔ ایک دوسرے کے بغیر ہماری نیندیں حرام تھیں لہٰذا میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ جذباتی فیصلے ہمیشہ نقصان دہ ہوتے ہیں۔ پچاس ہزار ڈالرز کی وقعت ہی کیا ہے۔ تم یہ معمولی رقم دے کے اپنی نیک نامی اور مستقبل محفوظ کر لو۔ تم مسٹر رینالڈ کی بیوی ہو اور ان کے لاکھوں ڈالرز کی جائداد کی واحد وارث ہو مگر یہ ذرا سی ضد اور کم عقلی تمہیں تباہ کر دے گی۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں اس نتیجے سے نہیں ڈرتی۔''

''اچھا تو مسٹر رینالڈ سے جلد از جلد گفتگو کرنی پڑے گی۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے بے حد افسوس ہوگا لیکن میں مجبور ہوں، میرا ذریعۂ معاش یہی ہے۔ تمہیں میں اب بھی دل و جان سے چاہتا ہوں مگر کاروبار میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی جا سکتی۔''

''جو تمہارا دل چاہے کرو، مجھے تم سے شدید نفرت ہو گئی ہے، میں تو تمہاری صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ حسین عورتوں کو محبت کا فریب دینا، عیاشی میں مبتلا کرنا پھر انہیں بلیک میل کرنا تمہارا پیشہ ہے تو میں کبھی تمہیں اپنے قریب بھی نہ آنے دیتی۔''

مارٹن بے حیائی سے ہنسنے لگا۔ ''مارگریٹ شاید تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں صرف تمہیں دھمکا رہا ہوں اور تمہارے شوہر کے پاس جانے کی ہمت نہیں کروں گا؟''

''نہیں، میں یہ نہیں سمجھ رہی ہوں۔ یہ غلط فہمی صرف اسے ہو سکتی ہے جو تمہاری خصلت سے واقف نہ ہو۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھ گئے۔ میرا خیال ہے اب میرے لیے یہاں ٹھہرنا فضول ہوگا۔ بہت ممکن ہے کل ہی تمہارے شوہر سے ملاقات کروں۔''

''کل کیوں؟ دیر کرنے سے کیا فائدہ؟ تم رینالڈ سے ابھی مل سکتے ہو۔''

''ابھی.....!'' مارٹن نے تعجب سے کہا۔

''ہاں، ہاں ابھی مل لو، دوبارہ آنے کی زحمت سے بچ جاؤ گے۔ رینالڈ لائبریری میں موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی بیوی کی آوارگیوں کا ڈراما نہایت دلچسپی سے سنیں گے۔''

مارٹن چند لمحوں تک مارگریٹ کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی پتلیاں سکڑ گئی تھیں۔ ''تم آخر کس چکر میں ہو؟''

''کسی چکر میں نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں یہاں بُلا کے یہ قضیہ حل کرنے کی دعوت دی تھی کیونکہ اب میں اس معاملے سے تنگ آگئی ہوں۔ جو کچھ ہونا ہے جلد ہو جائے، کسی طرح سکون تو ملے۔''

''پچھتاؤ گی۔''

''اوہو۔ تم میرے ہمدرد کب سے بن گئے؟ اب شاید تم یہ بھی کہو گے کہ میرے مستقبل کی فکر تمہیں ساری رات نہیں سونے دیتی؟ کہو، کہو، میں منتظر ہوں۔''

''میرا خیال ہے مجھے مسٹر رینالڈ سے مل ہی لینا چاہیے۔'' مارٹن نے جھنجلا کر کہا۔ ''تمہارا کہنا درست ہے۔ دیر کرنے سے کیا فائدہ، جو کام کل کرنا ہے وہ آج کیوں نا کر لیا جائے۔ لائبریری کس طرف ہے جانِ من؟''

''آؤ۔'' مارگریٹ نے کہا۔ ''میں بھی تمہاری زبانی اپنی بدکرداری کی داستان سنوں گی۔ یہ میرے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ ہوگا۔''

مارگریٹ ڈرائنگ روم سے نکل کے ہال عبور کرتے ہوئے لائبریری کی طرف بڑھی، اسے اپنے پیچھے مارٹن کی چاپ سنائی دیے رہی تھی۔ وہ لائبریری کا دروازہ کھولنے میں بالکل نہیں جھجکی۔ اندر داخل ہو کے وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ مارٹن بھی اندر داخل ہوا لیکن وہ دو قدم چل کے ساکت ہو گیا۔ مارگریٹ نے خاموشی سے لائبریری کا دروازہ بند کر دیا۔ ''یہ ہیں میرے شوہر مسٹر رینالڈ!'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ پھر لاش کو مخاطب کیا۔ ''رینالڈ! ان سے ملو، یہ ہیں میرے بارھویں عاشقِ زار مسٹر مارٹن۔ یہ تمہیں میری آوارگیوں کا رنگین اور باتصویر قصہ سنانا چاہتے ہیں۔''

مارٹن کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ تیزی سے مارگریٹ کی طرف پلٹا۔ اس کی کمر اس طرح جھکی ہوئی تھی جیسے وہ چھلانگ لگا کے مارگریٹ پر حملہ کرنا چاہتا ہو۔ اس کا ہر پٹھا کھنچا ہوا اور آنکھوں میں خوف کے سائے لرز رہے تھے۔

''تم... تم مجھے کس چکر میں پھنسانا چاہتی ہو؟'' اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''میں تمہیں کسی چکر میں پھنسانا نہیں چاہتی۔ میں نے تو تمہیں صرف اپنے شوہر کی لاش دکھائی ہے۔ کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔ اب تم یہ حقیقت آسانی سے سمجھ سکتے ہو کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ ایک مردہ آدمی نہ کسی کو طلاق دے سکتا ہے، نہ اپنی وصیت تبدیل کر سکتا ہے۔ اب میں ایک آزاد اور دولت مند عورت ہوں۔ مجھے اپنی نیک نامی کی قطعی پروا نہیں۔ میں بے حد حقیقت پسند ہوں اور صرف اتنا جانتی ہوں کہ زندگی کسی کو لامحدود مہلت نہیں دیتی۔ خصوصاً جوانی تو انتہائی مختصر ہوتی ہے۔ میں جوان ہوں، حسین ہوں اور اب آزاد بھی ہوں اور دولت مند بھی۔ اب میں زندگی کی ہر لذت چکھنے کی خواہش رکھتی ہوں۔ مجھے نیک نامی یا بدنامی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ تم چاہو تو میری بدکاریوں کی روداد تصویروں کے ساتھ اخبارات میں شائع کروا سکتے ہو۔ تم جو چاہو کر سکتے ہو، تمہیں کھلی چھوٹ ہے۔''

مارٹن سیدھا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ ''میری جان! ذرا ایک منٹ توقف کرو۔'' اس نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا شوہر مر چکا ہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے اور تمام شواہد اس کا قاتل تمہیں ثابت کر رہے ہیں۔''

مارگریٹ بے پروائی سے بولی۔ ''کسی کی سوچ پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ تم جو چاہو تصور کر سکتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنے شوہر کی موت کا بہت قلق ہے۔ اگر میں قتل جیسا جرم کرنا چاہتی تو رینالڈ کے بجائے تمہیں قتل کر کے مجھے بہت مسرت ہوتی۔''

''مجھے قتل کر کے تمہیں واقعی بڑی مسرت ہوتی لیکن تم نے مجھے نہیں اپنے شوہر کو قتل کیا ہے اور یہ کام انتہائی بھونڈے انداز میں انجام دیا ہے۔ تم نے اس بے چارے کو گولی ماری ہے۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ کافی یا برانڈی میں بھی کوئی چیز ملائی جا سکتی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ تمہارے شوہر کا دل کمزور تھا۔ لوگ یہی سمجھتے کہ اس کا انتقال دل کی حرکت بند ہونے سے ہوا ہے۔''

''تم خود کو بہت ذہین سمجھتے ہو لیکن کیا پولیس بالکل بے وقوف ہوتی ہے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب کوئی بوڑھا دولت مند مرتا ہے اور اس کی بیوی جوان ہوتی ہے تو پولیس بوڑھے دولت مند کی موت کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ایسی لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے اور پوسٹ مارٹم ہر قسم کا زہر فوراً ظاہر کر دیتا ہے لیکن جہاں تک اس واردات کا تعلق ہے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حرکت کسی چور کی یا کسی ملاقاتی کی ہے۔ ذرا غور سے جائزہ لو، آنکھیں کھول کے دیکھو کہ فرش پر ایک ریوالور پڑا ہوا ہے۔ یہ میرے شوہر کا ریوالور ہے۔ یہ میز کی سب سے اوپر والی دراز میں ہمیشہ بھرا ہوا موجود رہتا ہے۔ کمرے کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے شوہر اور قاتل کے درمیان جدوجہد ہوئی، اس جدوجہد میں گولی چل گئی اور قاتل کھڑکی سے فرار ہو گیا۔ اگر تم کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھو تو وہ کھلی ہوئی نظر آئے گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے قاتل نے کھولا تھا ورنہ اتنے سرد موسم میں کوئی شخص کھڑکیاں کھلی نہیں رکھتا۔''

''منصوبہ عمدہ ہے لیکن جامع نہیں ہے۔'' مارٹن نے کہا۔ ''اگر پولیس دولت مند بوڑھوں کی جوان بیویوں کو شک سے دیکھ سکتی ہے تو وہ نامعلوم چوروں اور پُراسرار ملاقاتیوں کا معاملہ بھی شک سے دیکھے گی۔ خاص طور پر ایسے

ملاقاتی جنہیں کسی نے آتے اور واپس جاتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔‘‘ مارٹن زور سے ہنسا۔ ’’نہیں، نہیں میری خوب صورت معصوم گڑیا، یہ منصوبہ نہیں چلے گا۔ تم نے اپنے شوہر کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ اگر تم بے گناہ ہوتیں تو سب سے پہلے پولیس کو اطلاع دیتیں۔ بہرحال تم جانو، میں تو صرف ایک بات پر حیران ہوں کہ تم نے میرے بجائے اپنے شوہر کو کیوں قتل کیا؟‘‘

’’میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں مارٹن۔‘‘ مارگریٹ نے پھنکار کے کہا۔ ’’مجھے یقین ہے، تم نے ضرور کوئی ایسا انتظام کرلیا ہوگا کہ تمہاری موت کی صورت میں پولیس مجھے گرفتار کرلے۔‘‘

’’بے شک میں نے یہ انتظام کرلیا ہے لیکن میں یہ بات سمجھنے سے اب بھی قاصر ہوں کہ اس بھیانک راز میں مجھے شریک کرکے تمہیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ میں اگر قانون پسند شہری بننے کا فیصلہ کرلوں تو تمہیں بہت آسانی سے موت کی سزا دلوا سکتا ہوں۔‘‘

’’تم نے اگر ایسا کیا تو بلیک میلنگ کے جرم میں تمہیں بھی چند سال جیل میں کاٹنے پڑیں گے۔‘‘

’’بہت اچھا نکتہ ہے۔ میں تمہاری پوری زندگی کے عوض اپنے چند سال جیل کی بھینٹ چڑھانا پسند نہیں کروں گا۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا کیونکہ اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا مگر یہ حرکت کرکے اب تم نے میری خاموشی کی قیمت بڑھا دی ہے میری جان، اگر چند عریاں تصویروں کی قیمت پچاس ہزار ڈالر ہوسکتی ہے تو اتنے بڑے راز کی قیمت کیا ہوگی؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں، ایک کوڑی بھی نہیں۔‘‘ مارگریٹ نے سخت لہجے میں کہا۔

’’زبان ہلانے سے پہلے سوچ لیا کرو ڈیئر، میں پولیس کا سامنا کیے بغیر بھی اس کی توجہ تمہاری طرف مبذول کروا سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ پولیس گڑھے مردے اکھاڑنے میں کتنی مہارت رکھتی ہے، میرے علاوہ تمہارے گیارہ سابق عاشقوں کا سراغ لگا سکتی ہے۔ جب انہیں تمہاری رنگین مزاجی کا علم ہوگا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہاری گرفتاری نہیں رکوا سکے گی۔ پولیس یہی سمجھے گی کہ تمہارا بوڑھے شوہر کو تمہارے کرتوت معلوم ہوگئے تھے اس لیے وہ تمہیں طلاق دینا چاہتا تھا لیکن تم طلاق لے کر اس کی دولت سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ یقین کرو بارہ عاشقوں کی موجودگی میں دنیا کی ہر عدالت یہ مفروضہ آنکھ بند کرکے تسلیم کرلے گی۔‘‘

مارگریٹ کے سرخ سرخ ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم ابھرا۔ ’’مجھے یقین تھا کہ تم یہی کہو گے اور میرے انکار کی صورت میں تم ایک قانون پسند شہری بننے کی کوشش کرو گے۔ لیکن مارٹن! یہ حقیقت مان لو کہ نہ تو میں تمہیں کچھ دوں گی اور نہ تم قانون پسند شہری بن سکو گے۔ تم مجبوراً اپنی زبان ہمیشہ بند رکھو گے۔‘‘

’’بڑے یقین سے کہہ رہی ہو۔‘‘ مارٹن نے طنز کیا۔ ’’کیا تم اس کی کوئی معقول وجہ بیان کرسکتی ہو؟‘‘

’’اس لیے کہ اپنے شوہر کو میں نے قتل نہیں کیا ہے۔‘‘

’’پھر کس نے کیا ہے ڈارلنگ؟‘‘

مارگریٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کان لگا کے کچھ سنتی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور اپنی ملازمہ کو آواز دی۔ ’’کلارا کیا تم باہر ہو؟ اندر آجاؤ پلیز۔‘‘

لائبریری کا دروازہ کھلا۔ نوجوان اور خوب صورت ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کردیا اور بند دروازے کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ ’’حاضر ہوں مسز رینالڈ۔‘‘

’’ذرا مسٹر مارٹن کو بتاؤ کہ آج رات یہاں کیا واقعہ پیش آیا ہے؟‘‘

’’جو حکم مسز رینالڈ!‘‘ ملازمہ نے تابعداری سے مارٹن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت اور کینہ پروری ظاہر ہو رہی تھی۔ ’’کہاں سے شروع کروں مسز رینالڈ؟‘‘

’’ڈنر کے بعد سے۔‘‘

’’کھانے کے بعد مسٹر رینالڈ معمول کے مطابق لائبریری میں آگئے۔ میں نے انہیں کافی اور برانڈی دی۔ آپ کے سر میں شدید درد تھا اس لیے آپ کھانے کے فوراً بعد اوپر خواب گاہ میں چلی گئی تھیں۔ مسٹر رینالڈ کو کافی اور برانڈی دے کے میں آپ کے پاس پہنچی۔ آپ کو میں نے سر درد کی دو گولیاں دیں۔ گولیاں کھا کے آپ لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر دراز ہوگئیں۔‘‘

’’کیا میں اس کے بعد نیچے آئی تھی؟‘‘ مارگریٹ نے ملازمہ سے پوچھا۔

’’نہیں، آپ نیچے نہیں آئیں۔ میں ہال میں سیڑھیوں کے پاس موجود تھی تاکہ آپ یا مسٹر رینالڈ مجھے

آواز دیں تو میں احکام کی تعمیل فوراً کرسکوں۔ اگر آپ نیچے آتیں یا اپنے کمرے سے نکلتیں تو میں دیکھ لیتی۔‘‘

’’پھر کیا ہوا؟‘‘

’’پھر ٹھیک نو بجے مسٹر رینالڈ کا ملاقاتی آگیا۔ مسٹر رینالڈ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک شخص نے فون پر ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ نو بجے آئے گا۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اسے ان کے پاس لائبریری لے آؤں۔‘‘

مارٹن کی رنگت بدلنے لگی۔

’’پھر کیا ہوا کلارا؟‘‘ مارگریٹ کی نظریں مارٹن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

’’مسٹر رینالڈ کی ہدایت کے مطابق میں اس ملاقاتی کو لائبریری میں لے گئی۔‘‘

’’کیا اس وقت مسٹر رینالڈ زندہ تھے؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو انہوں نے بلند آواز سے اندر آنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو مسٹر رینالڈ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک موٹا سا ناول تھا۔ میں ملاقاتی کو چھوڑ کر باہر آگئی لیکن ہال میں موجود رہی تاکہ اگر ملاقاتی کی تواضع کے لیے مسٹر رینالڈ کوئی حکم دیں تو اس کی فوراً تعمیل کی جاسکے۔‘‘

’’کیا تم لائبریری سے اتنی نزدیک تھیں کہ اندر کی گفتگو سن سکو؟‘‘

’’جی نہیں مسز رینالڈ! مجھے اندر کی گفتگو سنائی نہیں دی۔ لیکن جب مسٹر رینالڈ کی آواز بلند ہوئی تو اس وقت مجھے چند الفاظ سنائی دیے تھے۔ وہ ملاقاتی پر غصے میں برس رہے تھے۔ ان کے الفاظ بے ربط تھے اس لیے میں ان کا مفہوم تو نہیں سمجھ سکی البتہ میں نے بلیک میل کا لفظ کئی بار سنا تھا۔‘‘

’’کیا تمہیں پورا یقین ہے کلارا؟‘‘

’’جی ہاں مسز رینالڈ! میں عدالت میں حلف اٹھا کے یہ بات دہرا سکتی ہوں۔‘‘

’’پھر کیا ہوا؟‘‘

’’اس کے فوراً بعد مجھے کچھ ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے دو افراد ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوں۔ چند لمحوں کے بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں ڈر گئی اس لیے لائبریری میں جانے کے بجائے اوپر آپ کے پاس پہنچی۔ اس کے بعد آپ خود جانتی ہیں کہ کیا ہوا۔ ہم دونوں ایک ساتھ لائبریری میں داخل ہوئے۔ لائبریری کی حالت یہی تھی جو اس وقت ہے۔ ملاقاتی فرار ہوچکا تھا۔ وہ کھڑکی سے بھاگا تھا۔ کیونکہ مکان کا داخلی دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ شاید دستانے پہنے ہوئے تھا اس لیے کمرے یا کھڑکی کی چوکھٹ پر انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکیں گے۔‘‘

’’تم بہت ذہین ہو کلارا! اس واردات کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟‘‘

’’یہ تو بہت آسان سوال ہے مسز رینالڈ! ملاقاتی ایک پیشہ ور بلیک میلر تھا۔ وہ مسٹر رینالڈ کو بلیک میل کرنے آیا تھا۔ اس نے ان سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ مسٹر رینالڈ نے دوٹوک الفاظ میں اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کردیا۔ انہوں نے میز کی دراز سے اپنا ریوالور نکالا۔ وہ ریوالور کے ذریعے بلیک میلر کو روکنا چاہتے تھے تاکہ اسے پولیس کے حوالے کردیں۔ وہ پولیس کو فون کر رہے تھے۔ بلیک میلر نے انہیں غافل پاکر ان پر حملہ کردیا۔ دونوں کے درمیان ریوالور کے لیے جدوجہد ہوئی۔ اس جدوجہد میں گولی چل گئی۔ بدقسمتی سے مسٹر رینالڈ گولی کا نشانہ بن گئے۔‘‘

’’بہت خوب کلارا! اب میں تم سے ایک بے حد اہم سوال کرتی ہوں۔ جواب دینے سے پہلے اچھی طرح غور کرلینا۔ کیا تم اس ملاقاتی کو دوبارہ دیکھنے پر پہچان سکتی ہو؟‘‘ مارگریٹ نے سوال کیا۔

’’جی ہاں مسز رینالڈ! میرا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ میں اگر کسی کو قریب سے دیکھ لوں تو اسے دوبارہ کسی غلطی کے بغیر پہچان لیتی ہوں۔‘‘

’’کیا تم ملاقاتی کا حلیہ بیان کرسکتی ہو؟‘‘

’’جی ہاں، اس کا قد چھ فٹ سے کچھ بلند تھا، بال سنہرے، آنکھیں ہلکی نیلی تھیں، سینہ چوڑا اور کمر پتلی تھی، کولہے بھی پتلے تھے۔ اس کا جسم کسرتی تھا۔ وہ پرانی طرز کا ایک ڈھیلا ڈھالا بھورے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ٹائی گہری سبز تھی اور جوتے کالے تھے۔‘‘ ملازمہ نے مارٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ وہ شخص مارٹن کا ہم شکل تھا اور انہی جیسا لباس پہنے ہوئے تھا۔‘‘

’’خوب لطیفہ ہے۔‘‘ مارٹن زور سے ہنسا لیکن اس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ ’’اگر تم نے یہ بیان دہرایا تو کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔‘‘ اس نے کہا۔

"تم ایک پیشہ ور بلیک میلر ہو۔" مارگریٹ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم نے ابھی کہا تھا کہ پولیس گڑے مردے اکھاڑنے میں بہت ماہر ہوتی ہے جب وہ تمہارے ذریعۂ معاش کا سراغ لگانے کی کوشش کرے گی تو اسے تمہارے پیشے کا علم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس میں ایک مقتول کی سوگوار بیوہ ہوں اور یہ بے چاری ایک سیدھی سادی ملازمہ ہے۔ اسے بھلا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر وقت پڑا تو میں اپنے اور تمہارے خفیہ تعلقات بھی پولیس کو بتا دوں گی تاکہ اسے یہ علم ہو جائے کہ تم میرے شوہر کو کس بات پر بلیک میل کر رہے تھے۔"

"کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو، مجھے تمہارے منصوبے کا علم ہو گیا ہے، میں اس کا کوئی توڑ بھی تو کر سکتا ہوں۔"

"ضرور، کوشش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

مارٹن چند لمحوں تک کسی خیال میں ڈوبا رہا پھر سر ہلا کے بولا۔ "نہیں، یہ کھیل اس قابل نہیں کہ اسے کھیلا جائے۔ ممکن ہے میں تمہیں شکست دینے میں کامیاب ہو جاؤں لیکن ناکامی کا ناگوار امکان بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اور ناکامی کی صورت میں مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اس کے علاوہ اگر میں نے تمہیں شکست دے بھی دی تو مجھے اپنے بہت سے پیشہ ورانہ راز پولیس کو بتانے پڑیں گے اور ان کا انکشاف دونوں صورتوں میں نقصان دہ ہوگا۔"

"اگر تم کھیل شروع ہونے سے قبل ہی اپنی شکست تسلیم کرنے پر آمادہ ہو تو میں کلارا کو اس امر پر راضی کر سکتی ہوں کہ وہ پولیس کے سامنے قاتل کا کچھ حلیہ بھول جائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر بعد میں ضرورت پڑ گئی تو کلارا کو بھولی ہوئی باتیں یاد نہیں آئیں گی یا یہ کہ میں اپنی نیک نامی کی دھجیاں اڑانے سے ہچکچاؤں گی۔ تمہیں پھانسی کے تختے پر دیکھنے کے لیے تو میں سڑکوں پر برہنہ چہل قدمی بھی کر سکتی ہوں۔"

"مجھے پورا یقین ہے کہ تم اتنی ہی بے حیا اور کمینی ہو۔ اچھا میں چلا، مجھے امید ہے کہ آئندہ ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوگی۔" وہ غیر فطری انداز میں چلتا ہوا لائبریری سے نکل گیا۔ چند لمحوں بعد داخلی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی پھر مکان پر سکوت طاری ہو گیا۔

مارگریٹ نے اپنی خوب صورت ملازمہ سے کہا۔ "پولیس کو فون کرنے میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔ پولیس سرجن موت کے وقت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا لیکن زیادہ تاخیر ہمارے لیے مہلک ہو سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے رینالڈ نے اس کمرے میں درجۂ حرارت کچھ زیادہ ہی رکھا تھا۔ تمہیں اپنا بیان پوری طرح یاد ہے نا کلارا؟"

"آپ میری فکر نہ کیجیے مسز رینالڈ! میں جھوٹ بولنے میں ماہر ہوں۔ مجھے تو بس آپ کی فکر ہے، اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو مجھے بہت افسوس ہوگا مسز رینالڈ!"

"تم نے پھر مجھے مسز رینالڈ کہا۔" مارگریٹ کی پیشانی پر ناگوار شکنیں ابھر آئیں۔ "ہم یہاں تنہا ہیں اس لیے تکلفات کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں اپنی ملازمہ نہیں سمجھتی۔ تم میری دوست ہو، عزیز ترین دوست، مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میری خاطر اتنا کچھ کر سکتی ہو، سچ سچ بتاؤ تم نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی کیوں دی؟"

"اس لیے کہ آپ نے مجھ سے اس کا مطالبہ کیا تھا۔"

"لیکن تم انکار بھی تو کر سکتی تھیں۔ مجھے یہ مطالبہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا تھا، تمہیں معلوم ہے اس قربانی سے تم میرے جرم میں برابر کی شریک ہو گئی ہو۔"

"لیکن میں آپ کی بات کس طرح رد کرتی؟"

"کیا تم واقعی مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہو؟"

"یہ سوال آپ نے پہلے بھی کیا تھا۔ میں نے جواب دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر میں آپ کے لیے اس سے بھی زیادہ ایثار و قربانی دے سکتی ہوں۔"

"کیا کیا کر سکتی ہو؟" مارگریٹ نے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیا تم میرے لیے جان بھی دے سکتی ہو؟"

"جان دینے کے لیے بہت زیادہ حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مجھ میں اتنا حوصلہ ہوا تو یقین کیجیے میں آپ پر جان بھی قربان کر دوں گی۔"

"او کلارا! تم میرے لیے بہت کچھ کر چکی ہو۔ اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ایک انمول موتی ہو، میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟"

کلارا مسکرائی۔ "نہیں مارگریٹ!" اس نے بے تکلفی سے کہا۔ "شکریہ ادا کرنے کا ایک عمدہ طریقہ موجود ہے۔ پولیس کو فون کر کے تم خواب گاہ کی خفیہ مجوری سے مجھے پچاس ہزار ڈالر دے سکتی ہو، میں اس کے لیے تمہاری ممنون ہوں گی۔ آخر میں بھی تو تمہاری طرح خوب صورت اور جوان ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک دل دھڑک رہا ہے۔"

ایک ہی نشست میں رونما ہونے والی ڈرامائی انداز کی واردات......

کسی بھی لکھاری کو سچائی تک پہنچنے کے لیے تمام تر وسیلے اختیار کرنے چاہئیں... اسے دیکھنا چاہیے... سننا بھی چاہیے... پڑھ کر بھی سچائی و حقیقت کا پتا لگانا چاہیے اور اپنے تجربے سے بھی تحریر میں دم بھر دے... قلم و کاغذ سے تعلق رکھنے والے چند ایسے ہی مصنفین کی ملاقات کا دلچسپ ماجرا...

عذرشناس

مظہر سلیم ہاشمی

بجلی چمکی موسلا دھار بارش نے لمحوں میں گوشہ گوشہ جل تھل کر دیا تھا۔ اسموگ اور دھند میں لپٹی ہوئی فضا اس بارش کے باعث صاف ہو گئی تھی۔ نئے سال کے آغاز میں یہ باران رحمت شہریوں کے لیے خوشی کا پیغام لے کر آئی تھی۔

روڈ پر گاڑیوں کا بے پناہ رش تھا وہاں پیدل چلنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ بارش سے بچنے کے لیے سب لوگ اِدھر اُدھر پناہ ڈھونڈنے لگے۔ وہ سر پر ایک اخبار رکھے، بھیگنے سے بچنے کے لیے...... دوڑنے کے انداز میں چل رہا تھا۔ اپنی کوشش میں ناکامی کا اندازہ لگاتے ہی اس نے نگاہ دوڑائی تو اپنی منزل کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ سامنے موجود ایک مشہور کافی شاپ کا سائن بورڈ اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو اس کے نرم گرم ماحول سے سرشار ہو گیا۔

بھیگے کوٹ کو جھاڑ کر اس نے قریبی خالی میز پر اخبار کے ساتھ رکھ دیا۔ فضا میں رچی کافی کی مہک ایک خوشگوار سا تاثر قائم کر رہی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر وہ خود کو اتنا پُرسکون محسوس کرنے لگا جیسے اپنے گھر کے کسی آرام دہ گوشے میں بیٹھا ہو۔ کونے میں موجود کشن والی سیٹ کافی آرام دہ تھی۔ اپنا بھیگا اخبار ایک طرف کرتے ہوئے وہ کافی ہاؤس کے ماحول سے لطف اندوز ہونے لگا۔

فوراً ہی ایک دلکش نقوش والی ویٹرس اس کے پاس آ گئی۔ خوبصورت ہونے کے علاوہ وہ کم عمر بھی لگ رہی تھی۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" وہ مینیو کارڈ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"لوہ...... اس کی ضرورت نہیں۔" وہ مینیو کارڈ کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ اردو بولنے کے باوجود اس کے لہجے میں ایک اجنبی تاثر تھا۔

ویٹرس کی نگاہوں میں اس کی بات سن کر سوال امنڈ آئے۔

"مجھے بس سادہ کافی لا دیں مس زاہرا۔" اس کی شرٹ پر لگے نیم ٹیگ کو پڑھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"ابھی لائی جناب۔" وہ بال پوائنٹ کو یونیفارم کی جیب میں

اتر تے ہوئے مسکرائی اور مڑ کر چلی گئی۔
نووارد اس کی دل آویز چال سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کسی ہوئی یونیفارم میں اس کا سراپا چھلک رہا تھا اور ہر قدم پر لہراتے ہوئے لمبے بال دیکھنے والوں کا دل موہ لیتے تھے۔
کافی کے انتظار میں اس نے کافی ہاؤس کا طائرانہ جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سہ پہر کے اس وقت اس کے علاوہ صرف چند ہی گاہک موجود تھے جو نیم تاریک ماحول میں کافی سے محظوظ ہو رہے تھے۔
ایک گول میز کے گرد بظاہر... میاں بیوی نظر آنے والے مرد اور عورت دبی دبی آواز میں کسی گرما گرم بحث میں مصروف تھے۔ خاتون نے جدید تراش کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ مرد بھی خوبرو تھا اور نیلے رنگ کا سویٹر اس پر جچ رہا تھا۔
ان سے ذرا ہی فاصلے پر بچے قدرے بلند اسٹول پر ایک معقول صورت شخص براؤن کوٹ پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری تھی جس پر وہ نہایت مشاقی سے کچھ لکھنے میں محو تھا۔ اس کے تاثرات سے لگتا تھا کہ دبی دبی ہی سہی لیکن بحث کی آواز اس کے ارتکاز میں مخل ہو رہی تھی۔ ماتھے پر آئے بالوں کو جب اس نے ہاتھ سے پیچھے کیا تو نووارد کو اندازہ ہوا کہ اس نے ایک نفیس چشمہ بھی لگایا ہوا تھا۔
زارا واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کافی ہاؤس کے مونوگرام والا خوبصورت سا مگ تھا۔
"آپ ادھر کے نہیں لگتے۔" وہ مگ اس کی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔
"صحیح پہچانا... میں طویل عرصے بعد ملک واپس آیا ہوں۔ سردیوں کی چھٹیاں چل رہی ہیں اس لیے پیرس سے لاہور گھومنے چلا آیا۔ میرا نام طلال ہے۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔
"خوش آمدید پھر تو... امید ہے آپ یہاں انجوائے کریں گے۔" اس نے پروفیشنل مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"میرا ایک دوست مجھ سے ملنے آرہا ہے... اس کو غالباً آپ کے ہاں کی کافی پسند ہے اس لیے مجھے یہاں انتظار کرنے کو کہا۔" طلال نے بات آگے بڑھائی۔
"آپ کے دوست کی پسند واقعی اعلیٰ ہے جناب..." زارا نے مسکرا کر کہا۔ "اور کافی کے ساتھ انتظار کرنے کے لیے آپ کو مزید کچھ بھی درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔"
وہ وہاں سے چلی گئی تو طلال اپنی کافی کے سپ لیتے ہوئے پھر سے دیگر لوگوں کو دیکھنے میں مگن ہو گیا۔
زارا نامی ویٹرس اس بحث کرتے جوڑے تک پہنچی اور ان سے اتنی بلند آواز سے مخاطب ہوئی کہ طلال کو سننے کے لیے کان لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔
"میری بات سنو تم دونوں... اب اس بحث کو چھوڑو کہ کون سا رائٹر زیادہ اچھی قسط وار لکھتا ہے... آن لائن تم لوگوں کا مباحثہ کیا کم سر درد پیدا کرتا ہے جو آج کی اس چھوٹی سی ملاقات کو اس بحث کی نذر کر دیا۔" زارا کا رویہ ان دونوں کے ساتھ بالکل بھی گاہکوں والا نہیں تھا بلکہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ان کی قریبی دوست ہو۔
زارا کے ٹوکنے پر وہ دونوں یک لخت ہی خاموش ہو گئے۔
"سوری احمد، میں شاید زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔" فیشن ایبل لڑکی نے فوراً معذرت کی۔
"ویسے لگتا نہیں کہ یہ تم دونوں کی پہلی ملاقات ہے؟" زارا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
فیشن ایبل لڑکی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی۔
"تمہاری شک کرنے کی عادت نہیں جائے گی۔ گروپ میں بھی سب پر شک کرتی رہتی ہو۔" وہ تیزی سے بولی جیسے کچھ چھپانا چاہتی ہو۔
زہرا اس کی بات پر بس آنکھیں گھما کر رہ گئی۔ اس سے کہیں زیادہ یہ کام اس پر الزام دھرنے والی خود کرتی تھی۔
"ارے صبا معذرت کی کیا ضرورت ہے... میں بھی بس اپنے پسندیدہ لکھاری سے اوپر کسی کو نہیں دیکھ سکتا اس لیے بے مقصد بحث میں الجھ گیا۔ یہ سیلبریٹیز تو جانتے ہی نہیں ہوں گے کہ ان کے فینز ان کے نام پر کتنی ناراضگیاں پال لیتے ہیں؟" احمد نے خوش دلی سے معذرت قبول کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں صبا کے چہرے پر جیسے ثبت ہو چکی تھیں۔
"یہ ہوئی نا بات۔" زہرا تالی بجا کر بولی تو دونوں ہی جو ایک دوسرے کی نگاہوں میں دیکھ رہے تھے، جھینپ کر رہ گئے۔
"تم لوگ باتیں کرو میں ذرا اس نئے عظیم لکھاری جاسم غزال کی خبر لے لوں۔" احمد نے اپنی خفت مٹانے کے لیے وہاں سے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا اور بات کو بدلتے ہوئے بولا۔ "جہاں اس کو آئیڈیا آتا کہانی لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ ابھی کل ہی شمشیر نے اس کی پوسٹ پر گروپ میں کوئی کمنٹ کیا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر کہانی مکمل کرنے بیٹھ گیا ہے۔"
"مجھے تو اس کا تخلص ہی بڑا پسند ہے۔ غزال... کیا شاعرانہ مزاج والا نام ہے۔" زہرا شوخی سے بولی۔
احمد اس کی باتوں کو ان سنا کر کے جاسم کی جانب بڑھ گیا جو کہ بڑے انہماک سے اپنی ڈائری میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔
اس کی چال میں خفیف سی لنگڑاہٹ تھی۔ طلال کو اس بات کا اندازہ بالکل بھی نہ ہو پاتا لیکن جب احمد اپنا کافی کا مگ واپس رکھنے کے لیے آیا تو یہ بات عیاں ہو گئی۔ گزرتے ہوئے اس نے طلال کو ایک عدد تبصرہ کرنے والی نگاہ سے بھی نوازا تھا۔
جب وہ جاسم کے پاس جا کر بیٹھا تھا تو خوش شکل لکھاری نے اپنا قلم بند کر دیا اور بڑی دلچسپی کے ساتھ اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ

باتوں کے دوران میں اپنا مگ چھوڑ کر جب جاسم کے مگ سے کھیلنے لگا تو اس نے اتنے غیر محسوس انداز میں واپس لیا کہ احمد کو اس بات کا احساس تک نہ ہو سکا اور وہ اپنی باتیں خوش دلی سے کرتا رہا۔
نسبتاً اندھیرے کونے میں بیٹھا ایک کرخت نقوش والا شخص فون پر بات ختم کرنے کے بعد اب اپنے موبائل فون پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ فون کی منعکس ہوتی ناکافی روشنی میں چہرے کا جائزہ لینا آسان نہیں تھا لیکن نجانے کیوں طلال کو اس کے نقوش پھر بھی کرخت سے ہی لگے تھے۔ موبائل چھوڑ کر اس نے اپنے سامنے رکھے نسبتاً چھوٹے کپ کو قریب کر لیا۔ اب وہ چینی کے پیکٹ کو ہاتھ میں پکڑ کر کھیلنے میں مگن تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ اتنا میٹھا کافی ہے یا مزید کی ضرورت پڑے گی...
"چرررر..." کرسی گھسیٹے جانے کی آواز اتنی بھیانک تھی کہ طلال اچھل کر رہ گیا۔
مڑ کر دیکھنے پر پتا چلا کہ صبا نے کرسی گھسیٹ کر احمد اور جاسم کی میز پر لانے کی کوشش کی تھی جس پر یہ خوفناک چرچراہٹ ہوئی تھی۔
"ان تینوں کا کیا ہے؟" طلال نے زارا سے پوچھا جو اس کے پاس مزید کسی چیز کا پتا کرنے آئی تھی۔ طویل عرصہ بیرون ملک رہنے سے وہ قومی زبان بولنے سے خاصا دور ہو گیا تھا اس لیے لہجے اور الفاظ میں اجنبیت در آئی تھی۔
"دراصل... یہ ان تینوں کی بلکہ کہنا چاہیے کہ ہم پانچوں کی پہلی ملاقات ہے۔" زارا نے ہچکچاتے ہوئے آغاز کیا۔ "صبا نرس ہے اور یہاں لاہور کے ہی ایک نجی اسپتال میں کام کرتی ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھا احمد فیصل آباد میں گاڑیوں کے شوروم پر کام کرتا ہے۔ جاسم کا تعلق چترال کے ایک چھوٹے سے کسان گھرانے سے ہے جبکہ وہ کونے میں بیٹھا ہوا شمشیر کمپیوٹر گرافکس کا کام کرتا ہے۔ میں دن میں سینٹرل لائبریری میں ڈیوٹی کرتی ہوں اور شام کو یہاں کافی ہاؤس میں پارٹ ٹائم۔"
"توبہ... کتنا بولتی ہے یہ..." طلال صرف سوچ کر رہ گیا لیکن جب بولا تو الفاظ کچھ اور ہی تھے۔
"اتنے مختلف مزاج کے لوگ ہونے کے باوجود تم سب یہاں اکٹھے ہو کر کیا کر رہے ہو...؟"
طلال یہ سوال نہ بھی پوچھتا تو زارا جواب دینے کے لیے منہ کھول چکی تھی۔
"اوہ... ہم سب نوآموز لکھاری ہیں۔ ہم سب کا کام کہیں نہ کہیں شائع ہو چکا ہے۔ میرا ایک جاسوسی ناول حال ہی میں مارکیٹ میں آیا ہے۔ ہم لوگوں نے ایک گروپ بنایا ہوا ہے انٹرنیٹ پر جہاں ہم لوگ بیٹھ کر پرانے مصنفین کے شاہکاروں پر بات چیت کرتے ہیں اور اپنی کاوشیں بھی ایک دوسرے کو دکھاتے ہیں۔ ہم سب کی دوستی اس قدر مثالی ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اپنی غیر مطبوعہ کہانیوں کے پلاٹ بھی شیئر کر لیتے ہیں۔" وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولی لیکن طلال دلچسپی کھو چکا تھا، اس کو یہ لکھنے لکھانے والے لوگ بڑے ہی بیزار کن لگتے تھے۔
وہ جاسم کے سامنے رکھے کافی کے مگ کو دیکھ رہا تھا جس پر اس کی شبیہ ابھری ہوئی تھی۔ صبا بھی مارے تجسس کے وہ مگ اٹھا کر دیکھنے لگی جس پر جاسم کا مسکراتا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔
'عجیب شخص ہے یہ۔ کافی پینے کے لیے ریسٹورنٹ میں بھی اپنا ذاتی مگ لے کر آیا ہے۔' طلال نے سوچا۔
زارا ابھی بھی بول رہی تھی اس لیے اس نے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ "ہم سب یہاں پر شبیر قاسمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ ہم میں سب سے کامیاب لکھاری ہے اب تک... باقی لوگوں کی نسبت اس کا کام نہ صرف زیادہ شائع ہوا ہے بلکہ اس کے فینز کی تعداد بھی خاطر خواہ ہے۔"
طلال کے چہرے پر یہ سن کر شش و پنج کے تاثرات ابھر آئے۔
"کیا تم اسی شبیر قاسمی کی بات کر رہی ہو جو کہ کرائم برانچ میں کام کرتا ہے؟" وہ کافی کا مگ ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ چھوٹے چھوٹے سپ لینے کے باوجود کافی ختم ہو چکی تھی۔ شاندار ذائقے کے باعث ایک اور کی خواہش دل میں جاگ اٹھی تھی۔
"ہاں... تم کیسے جانتے ہو؟" وہ حیرت سے بولی۔ "اس کے اصل پیشے سے تو بہت کم لوگ واقف ہیں... حتیٰ کہ یہاں موجود سب لوگ بھی واقف نہیں ہوں گے۔"
"میرا بہت پرانا دوست ہے... میں اس کے لکھنے لکھانے کے مشغلے سے بالکل بھی واقف نہیں ہوں..." طلال بولا۔ "میں اسے حیران کرنے آیا تھا لیکن شاید مجھے سرپرائز دینے کے لیے اس نے مجھے کافی ہاؤس بلایا ہے۔"
"ہاں..." زہرا کچھ مزید نہ بول سکی۔
"کیا ایک اور کپ مل جائے گا؟" طلال کے استفسار پر وہ اٹھ کر کافی لینے چلی گئی اور وہ اپنی سابقہ مصروفیت کو جاری رکھتے ہوئے پھر سے وہاں موجود لوگوں کا بغور مشاہدہ کرنے لگا۔
جاسم نے شاید کوئی فرمائش کی تھی اس لیے صبا کاؤنٹر کے پاس رکھے ایک خوبصورت شوکیس تک آ گئی جس میں خوبصورت اور لذیذ دکھائی دینے والے کپ کیکس رکھے ہوئے تھے۔ جاسم نے ایک گھونٹ پینے کے بعد شمشیر کو اشارہ کیا تو اس نے چینی کا پیکٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ پیکٹ کھول کر چینی کافی میں گھول ہی رہا تھا جب احمد اس کے پاس سے اٹھ کر صبا کی جانب بڑھ گیا۔ شاید اتنے سارے کیک دیکھ کر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کون سا بہتر رہے گا۔ وہ دونوں ادھر ہی رک کر بحث کرنے لگے۔
دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو سب کی نگاہیں اس جانب مرکوز ہو

گئیں۔ ایک دراز قد، چوڑے شانوں والا، گورا چٹا شخص وہاں رکا تھا۔ پُرکشش شخصیت والے اس شخص کے کن پٹیوں سے سفید ہوتے بال اس کی جاذبیت میں اضافے کا سبب بن رہے تھے۔ قدرے کھردرے نقوش کے ساتھ اس کے چہرے پر ہلکی داڑھی جچ رہی تھی۔

”توتم آہی گئے شبیر......“ صبا نے پُرمسرت انداز میں اعلان کیا۔

لڑکھڑاہٹ اور اس کے بعد اسٹول کے گرنے کی آواز نے سب کو جاسم کی جانب متوجہ کر دیا۔ وہ فرش پر گر کر تڑپ رہا تھا۔ اس کے بدن نے دو تین جھٹکے لیے اور پھر ساکت ہوگیا۔ شبیر دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔

”کوئی ایمبولینس بلاؤ......“ وہ چلایا۔

اس نے جاسم کے بے جان جسم کو سنبھالا اور کوشش کی کہ اسے زندگی کی جانب واپس لے آئے لیکن تمام کوششیں بے سود ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔

”صبا...... ادھر آؤ...... اس کو چیک کرو اور ضروری طبی امداد دو......“ وہ صبا کو مخاطب ہو کر اونچی آواز میں بولا تو وہ جیسے صدمے سے باہر آگئی۔

فوراً ہی دوڑتے ہوئے جاسم کے پاس پہنچی اور اس کے سینے پر مخصوص انداز میں مالش کرنے لگی۔ ہر دو منٹ کے وقفے سے وہ اس کی نبض بھی محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے تئیں پوری کوشش کرنے کے باوجود اس کے چہرے پر مایوسی کا رنگ غالب تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی تمام ناکام کوشش سے رک گئی اور شبیر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جاسم اب ہم میں نہیں رہا......“

زاہرا کے منہ سے یہ سن کر ایک سسکاری نکل گئی۔

☆☆☆

دو پولیس والے جب کافی ہاؤس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں موجود ہر شخص صدمے سے دوچار تھا۔ شبیر البتہ مرنے والے کی ڈائری، قلم اور مشروب کا جائزہ لے رہا تھا۔

اس نے فوراً ہی صورتِ حال کو قابو کر لیا اور پولیس والوں کو ہدایات دینے لگا۔

”یہاں موجود ہر کوئی زیرِ تفتیش ہے...... تو سب پر نظر رکھنی ہوگی۔ کوئی بھی مشکوک حرکت کرے فوراً مجھے خبر کرنی ہے۔“ اس نے سب سے کہا۔

”یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو شبیر......“ صبا ہکلائی۔

”میں ایک قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔“ اس نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔

”ق...... قتل...... جاسم کو قتل کیا گیا ہے؟“ زاہرا خوف سے چیخ اٹھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسو چھلکنے کو بے تاب دکھائی دینے لگے۔

”ہاں...... جاسم کو قتل کیا گیا ہے...... اور قاتل اس وقت ہم سب کے بیچ ہی موجود ہے۔“

سب رائٹرز کلب کے ممبران نے یک لخت طلال کی جانب دیکھا جس پر وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

”سب سے پہلے میں تم سے بات کرنا پسند کروں گا صبا...... میرے پیچھے آؤ...... اور تم بھی......“ آخری جملہ اس نے طلال سے مخاطب ہو کر کہا جو سر جھکائے خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑا۔

صبا بھی ان کے ساتھ تھی اور قدرے پُرسکون کونے میں پہنچ کر وہ بیٹھ گئے۔

”صبا۔“ شبیر آہستہ آواز میں بولا۔ ”کیا تم مجھے بتانا پسند کروگی کہ آج یہاں پر کیا ہوا؟“

”میں تو تمہیں محض ایک کہانی کار ہی سمجھتی تھی۔“ وہ اسے تکتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”ہاں میں کہانیاں بھی لکھ لیتا ہوں، لیکن میرا اصل کام یہی ہے جو ابھی میں کر رہا ہوں یعنی مجرموں کی کھوج......“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں متانت سے بولا۔

”اسی لیے تمہاری کہانیوں میں جرم و سزا کے واقعات حقیقت سے اتنے قریب لگتے ہیں۔“ صبا اب بھی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھی۔

”اس تعریف کا شکریہ۔“ وہ مسکرایا۔ ”لیکن میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ تمہارے خیال میں کون جاسم کا قتل کر سکتا ہے؟“

”ہم......“ وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”احمد کافی عرصے سے اس سے ناراض تھا۔ اس کی وجہ سے اس کو میگزین میں لکھنے کا کام بھی نہیں مل رہا کیونکہ جاسم تقریباً ہر ماہ ہی کہانی بھیج دیتا ہے۔ کتابیں بھی جاسم کی زیادہ بک رہی ہیں۔ قومی ادارے کے زیرِ اہتمام ہونے والا مقابلہ بھی وہی جیت گیا۔ احمد یقینی طور پر حسد کا شکار ہے۔“

”اتنا زیادہ حسد کہ وہ کسی کی جان لے لے؟“

”تم کیا کہتے ہو...... ؟ سوشل میڈیا پر کی گئی اس کی باتوں پر تو تم خود اس کی سرزنش کر چکے ہو۔“

”ہاں یہ تو ہے......“ وہ ہاتھ میں پکڑے پین کو ہونٹوں پر رکھتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ”لیکن سرزنش صرف اس کی نہیں کی تھی۔ تمہارے اوچھے افکار پر بھی کی تھی...... خیر یہ بتاؤ کہ زاہرا کے بارے میں کیا کہوگی؟“

”او تم نہیں جانتے کیا؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”زاہرا کی کتاب کی کمپوزنگ اور آرٹ ورک کے لیے اس نے اتنا معاوضہ لیا ہے کہ بے چاری کو اپنی لائبریری کی نوکری کے علاوہ یہاں پر ویٹرس بن کر بھی کام کرنا پڑ رہا ہے......“

”واقعی؟ اس بات سے تم کیسے واقف ہو؟“

”زاہرا نے مجھے خود بتایا تھا۔ پچھلے ہفتے جب ہم اس ملاقات کو طے کرنے کے لیے بات چیت کر رہے تھے تب کی بات ہے۔“

”اور شمشیر کے بارے میں کیا کہوگی؟“

اس نے مڑ کر شمشیر کو دیکھا اور پھر واپس شبیر کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ وہ کافی عرصے سے رائٹرز کلب میں بھی بھرپور انداز میں حصہ نہیں لے رہا...... پر مجھے لگتا کہ وہ زرینہ کی بیماری کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔“ وہ شمشیر کی بیگم کا نام لیتے ہوئے بتانے لگی۔

”شکریہ صبا...... اب ایسا کرو کہ تم زاہرا کو میرے پاس بھیج دو۔“ شبیر سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

وہ طلال پر ایک خشمگیں نگاہ ڈالتے ہوئے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی جہاں رائٹرز کلب کے تمام لکھاری ممبران براجمان تھے۔

☆☆☆

زاہرا نروس سی شبیر کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ بار بار اپنی یونیفارم کے اوپر پہنے ایپرن سے نادیدہ سلوٹیں دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے طلال کو دیکھا جو کہ اب دیوار سے ٹیک لگائے اس تمام صورتِ حال کا ادھ کھلی آنکھوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ بیزاریت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی کہ کب موقع ملے اور وہ یہاں سے فرار ہو جائے۔

زاہرا آبدیدہ نگاہوں سے سب دیکھ رہی تھی۔ کچھ چھلکتے آنسو اس کے گداز رخساروں پر نشان چھوڑ گئے تھے۔

”پلیز زاہرا...... خود کو سنبھالو اور مجھے بتاؤ کہ تم کیا جانتی ہو؟“

”کیا مطلب...... میں کیا جانتی ہوں؟“

”آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ صبا، جاسم کو قتل کرنے کے لیے مجبور ہو جائے؟“

”صبا؟ ہم لوگوں کی گپ شپ تو چلتی رہتی ہے...... خاص طور پر جب سے ہم نے اس ملاقات کا اہتمام کرنا شروع کیا تھا...... بظاہر تو کوئی خاص بات نہیں لیکن وہ جاسم سے اس بات پر ناراض تھی کہ وہ اس کی کہانیوں پر سخت تنقیدی تبصرے کرتا ہے۔“

”ہاہاہا...... اور اس بات پر وہ اسے قتل کر سکتی ہے؟“ شبیر استہزائیہ انداز میں بولا۔

”نہیں...... نہیں ایسی بات نہیں...... لیکن صبا کو لگتا کہ اس کا کوئی بھی دوست رائٹرز کلب میں آنے کے بعد جب جاسم سے پینگیں بڑھاتا ہے تو اس کے کچھ ہی عرصے بعد وہ اس کے کام پر تند و تیز تنقید کرنے لگتا ہے۔ اور ہاں...... اس کو یہ جعلی آئی ڈیز سے ہمیشہ بڑی شدت سے نفرت رہی ہے اور اسے لگتا ہے کہ نبیلہ کے نام سے جاسم نے ہی فیک اکاؤنٹ بنا رکھا تاکہ جیسے دل چاہے اس کے کام میں کیڑے نکالے۔ ایسے میں تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ وہ کس قدر غصے میں ہوگی......“ زاہرا ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی جس میں کسی اور کا حصہ صرف سننے تک ہی محدود ہو جاتا تھا۔

”صحیح کہا...... اور احمد کے بارے میں کیا رائے ہے تمہاری؟“

شبیر نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی...... عموماً ان دونوں کی آپس میں گاڑھی چھنتی ہے اور سوشل میڈیا پر بھی خوش گپیاں لگاتے رہتے ہیں...... پر آج ان کی ہلکی پھلکی بحث ہوگئی تھی...... وہ بھی......“ زاہرا کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ جملہ مکمل نہ کر سکی۔ آنسو پھر اس کی آنکھوں سے رواں ہو چکے تھے۔

”بس زاہرا آخری سوال...... پھر تم جاسم کی موت کا غم سکون سے بیٹھ کر منانا...... مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم کوئی ایسی بات بتا سکتی ہو شمشیر کے بارے میں جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ قاتل ہو سکتا ہے؟“ شبیر زاہرا کو پچکارتے ہوئے بولا۔

”نہیں...... بالکل بھی نہیں......“ وہ تیزی سے بولی۔ ”میں یہ تو جانتی ہوں کہ کتابوں کی کمپوزنگ اور سرورق ڈیزائن کرنے کے حوالے سے ان میں مسابقت چل رہی ہے لیکن کبھی ایک دوسرے کو انہوں نے برا بھلا نہیں کہا......“

”تمہارا شکریہ...... یہ معلومات بہت قیمتی ہیں...... اب ذرا احمد کو میرے پاس بھیج دو......“ شبیر نے مسکراتے ہوئے زاہرا کو رخصت کیا۔

احمد تھوڑی ہی دیر میں لنگڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کی چال کی خفیف لنگڑاہٹ اب نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ دوسری سے معمولی سی چھوٹی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک پیر میں بڑے سول والا جوتا پہنتا تھا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم مجھے قاتل سمجھ رہے ہو......“ وہ براجمان ہوتے ہی بولا۔ ”لیکن یہ اچھی طرح جان لو کہ میں نے یہ سب نہیں کیا...... میرا کبھی بھی جاسم سے کوئی اختلاف نہیں رہا ہے بلکہ میں تو اس کو پسند کرتا تھا اور اس کی کامیابی کو سب سے زیادہ سراہتا تھا۔“

”پھر کس نے قتل کیا ہے اگر تم قاتل نہیں ہو تو؟“ شبیر نے اس کی بے مقصد باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کام کی بات کی۔

”میں نہیں سمجھتا کہ یہاں موجود ہم میں سے کوئی شخص اس چیز کا ذمے دار ہے۔ اگرچہ زاہرا کو اس کی مہنگی ڈیزائننگ کی وجہ سے دو دو نوکریاں کرنی پڑ رہی ہیں لیکن یہ اس کی خود کی غلطی ہے۔ اسے جاسم جیسے مہنگے ڈیزائنر کے بجائے اپنی کتاب کا سرورق شمشیر سے بنوانا چاہیے تھا۔“ احمد بولا۔

”شمشیر سے کیوں؟“ شبیر یہ بات اپنی فائل میں نوٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بھی سرورق بناتا ہے...... یا ایسا کہہ سکتے ہیں کہ بناتا تھا۔ جاسم کے منفرد انداز نے اس کا بیشتر کام سمیٹ دیا تھا۔ تم بھول گئے کیا کہ شمشیر نے چند ماہ قبل ہر ادبی گروپ میں پوسٹ لگائی تھی کہ وہ ویب ڈیزائننگ اور گرافکس کے کام کے لیے مناسب نرخوں پر دستیاب ہے؟“ تفصیل بتاتے بتاتے احمد کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔

"نہیں مجھے یہ سب یاد نہیں...... اور میں اپنا سارا وقت فیس بک اور گروپس میں نہیں گزارتا ہوں......" شبیر قدرے ناگواری سے بولا۔ "لیکن زارا اپنی کتاب کی ڈیزائننگ شمشیر ہی سے کیوں کراتی؟ اس بات کی تم نے وضاحت نہیں کی......"

"پہلی بات وہ سستا پڑ جاتا ...... دوسری بات یہ کہ وہ جاسم کی طرح ہی بہترین سرورق بناتا ہے۔ میرے خیال میں تو ان دونوں نے کافی سارے پراجیکٹس پر اکٹھے کام کیا ہے......" احمد کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"ہم......" شبیر نے ہنکارا بھرا۔ "معلومات کا شکریہ...... تم باقیوں کے ساتھ جا کر بیٹھ سکتے ہو۔"

"کیا میں شمشیر کو بھیجوں تمہارے پاس؟" احمد نے اٹھتے ہی پوچھا۔

"نہیں...... ابھی رک جاؤ...... میں ذرا اب تک کی معلومات کا جائزہ لے لوں......" شبیر نے جواب دیا۔

احمد کے جانے کے بعد وہ طلال سے معلومات لینے لگا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

"کیا تمہارے خیال میں ہمیں قاتل کو گرفتار کر لینا چاہیے؟" وہ مسکراتے ہوئے طلال سے مخاطب ہوا۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں......"

متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او بھی اتنی دیر میں موقعِ واردات پر پہنچ چکا تھا۔ شبیر کو تفتیش کرتے دیکھ کر وہ مسکرایا اور اطمینان کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ وہ تینوں رائٹرز کلب کے ممبران کے پاس پہنچے جو سرگوشیوں میں محوِ گفتگو تھے۔

"شمشیر تمہیں جاسم کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے؟" شبیر نے جیسے کوئی بم گرا دیا تھا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ پولیس والوں نے شمشیر کو ہتھکڑی لگائی اور باہر لے گئے جبکہ باقی سب کو جانے کی اجازت مل گئی۔

☆☆☆

"تم نے یہ کیس اتنی جلدی کیسے حل کر لیا؟" ایس ایچ او کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ مدح سرائی کی آمیزش بھی تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ ہر کوئی بہانے بنا رہا تھا ایک دوسرے کو الزام دینے کے لیے لیکن کوئی بھی شمشیر کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دوسری بات طلال کی شہادت کے مطابق یہاں صرف ایک شخص ایسا تھا جو کہ کافی میں زہر بلیم کسی شک کے شامل کروا سکتا تھا۔ تیسری بات صرف شمشیر نے اس کافی مگ کو نہیں چھوا تھا...... باقی سب کی انگلیوں کے نشان اس پر موجود ہوں گے۔" شبیر نے تمام تفصیل بتائی۔

"سب کی عذر تراشیاں تم نے خوب پکڑیں...... لیکن یہ سب کچھ ایک اتفاق بھی تو ہو سکتا تھا۔" ایس ایچ او نے اعتراض اٹھایا۔

"ہاں ہو سکتا تھا...... لیکن یہ حقیقت ہے کہ جاسم، شمشیر کے ڈیزائن چوری کر رہا تھا۔ اس کو اپنی کہانیاں لکھنے کے دوران آج کل اتنی فرصت نہیں مل رہی تھی کہ وہ اپنے اس کام پر بھی توجہ دیتا سو شمشیر کا بنا بنایا کام اٹھا کر وہ اپنے گاہکوں کو مطمئن کر رہا تھا۔ لیکن سب سے بڑی بات...... میری نظروں سے کل شمشیر کا...... گروپ میں کیا گیا ایک کمنٹ گزرا تھا، جو کہ اگرچہ اس نے بعد میں ڈیلیٹ کر دیا تھا لیکن وہی اسے پھنسوانے کا سبب بنا......" شبیر زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ کیا کمنٹ تھا؟" ایس ایچ او نے بے ساختہ پوچھا۔

"جاسم اپنی ایک جاسوسی کہانی میں الجھا ہوا تھا...... ایک کافی ہاؤس میں اسے طریقۂ واردات نہیں مل رہا تھا اور شمشیر نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ چینی کے پیکٹ کے ذریعے زہر دے دیا جائے......" شبیر بولا۔

"اوہ...... لیکن اس قتل کا محرک کیا ہوگا؟" اب کی بار سوال طلال نے کیا تھا جو کہ بڑی دیر سے خاموش تھا۔

"پیسہ...... اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟" شبیر تاسف سے بولا۔ "شمشیر کی بیگم شدید بیمار ہے اور اس کے علاج پر بہت خرچ آ رہا ہے۔ جاسم نے نہ صرف اس کے ذریعۂ آمدنی کو متاثر کیا تھا بلکہ گاہک چھیننے کے بعد اب اس کے ڈیزائن بھی چوری کر رہا تھا۔ مجھے پوری امید ہے کہ شمشیر، جاسم کے کلائنٹس سے رابطے میں ہوگا کہ اگر وہ کام مکمل نہ کر پائے تو اس کی خدمات حاصل کر لی جائیں......"

"مجھے افسوس ہے کہ تم نے ایک دوست کھو دیا لیکن بہرحال اس بات کی خوشی ہے کہ قاتل پکڑا گیا۔" ایس ایچ او وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے بولا اور سپاہیوں کو ضروری ہدایات دینے لگا۔

"مجھے بھی افسوس ہے کہ تم نے ایک دوست کھو دیا......" طلال نے شبیر سے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ان سماجی رابطوں پر آپ کسی سے کتنے ہی قریب کیوں نہ ہو جائیں...... وہ آپ کے دوست نہیں بنتے......" شبیر کے لہجے میں گہرا دکھ پنہاں تھا۔ "جاسم اگر دھوکے بازی نہ کرتا تو شاید شمشیر بھی ایسا انتہائی قدم نہ اٹھاتا......"

"چلو...... اب صبر کرو...... میں تو تمہیں جنم دن کی مبارک دینا چاہتا تھا لیکن تم نے تو سال کی ابتدا ہی خون خرابے سے کر دی۔" طلال نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"تمہیں یاد تھا...... اتنے برسوں کے باوجود...... تمہیں میری سالگرہ یاد تھی؟" شبیر کے لہجے میں حقیقی حیرت تھی۔

"یاد تھی تو آج کے دن ملنے کا خصوصی منصوبہ بنایا...... سالگرہ مبارک ہو...... اور پلیز اب مجھے اس وحشت زدہ ماحول سے لے چلو......" طلال تیزی سے بولا۔

دونوں کافی ہاؤس سے نکل آئے جہاں سرد ہوا نے ان کا استقبال کیا...... ایمبولینس میں رکھی جانے والی لاش بھی حضرتِ انسان کے سرد پڑتے رویے پر نوحہ کناں تھی۔

حصار

سید شکیل کاظمی

خواہشات کا تعاقب کرتے ہوئے انسان کبھی کبھی اتنی دور نکل جاتا ہے کہ واپسی کی کوئی صورت نہیں ملتی... یہاں تک کہ انسان اپنی موت بھی بھول جاتا ہے... پھر بھی خواہشات انسان کو منہ کے بل گراتی ہیں تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے... چند آسائشوں کی خاطر اپنا نفس گروی رکھنے والے ضمیر فروشوں کا گھناؤنا منصوبہ... جس نے نوجوان نسل کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا...

معصوم چہروں کے پیچھے چھپے سفاک درندے کی عکس در عکس پھیلی داستانِ عبرت......

جنگل میں ہُو کا عالم تھا۔ اس نیم تاریک شب میں کبھی کبھار کسی جانور یا حشرات الارض کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ چاند بھی تکمیل کے نصف مرحلے میں تھا۔ یہ جنگل اسلام آباد سے ایبٹ آباد جاتے ہوئے راستے میں ایک چھوٹی سی وادی کے دامن میں تھا۔ یہ وادی پہاڑی اور میدانی علاقے کا امتزاج تھی۔ اکثر سیاحت کے شوقین لوگ اس وادی میں آتے یا جاتے ہوئے ضرور قیام کرتے تھے۔ مقامی یونیورسٹی کی منی بس

یہاں موجود تھی۔ وہ ایک معلوماتی ریسرچ اور تفریحی ٹرپ کے سلسلے میں یہاں موجود تھے۔ یہاں اکثر و بیشتر لوگ کیمپنگ اور سیر و تفریح کے لیے آتے رہتے تھے۔ اس لیے سب کی باہمی رضامندی کے بعد ہی یہاں پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔ یونیورسٹی کے چند طلبا و طالبات جن کی کل تعداد چھ تھی، یہاں موجود تھے۔ ان میں دو عدد لڑکیاں جبکہ باقی چار لڑکے تھے۔ باقی افراد میں ایک عدد ڈرائیور اور دو پروفیسر شامل تھے۔ جبکہ ڈرائیور کی مدد اور کھانے پکانے کا انتظام کرنے کے لیے یونیورسٹی کی کینٹین کے ایک باورچی کو بھی خصوصی طور پر ساتھ لایا گیا تھا۔ لڑکیوں کی تعداد پہلے اس کلاس میں چار ہوا کرتی تھی...... لیکن چند ماہ پہلے اس کلاس کی باقی دو لڑکیاں سائرہ اور شائستہ اپنے ہاسٹل کے کمرے میں مردہ حالت میں پائی گئی تھیں۔ پولیس کے مطابق یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس تھا کیونکہ ان کی اپنی ہینڈ رائٹنگ اور دستخط میں خودکشی کا اقرار نامہ موجود تھا۔ اس لیے اس کیس میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کی گئی اور نہ ہی ان عوامل پر غور کیا گیا کہ ان لڑکیوں نے خودکشی کیوں کی۔ ایک عام سی رائے صرف یہی قائم ہوئی تھی کہ ان کی تعلیمی کارکردگی کا گراف کافی نیچے تھا اسی لیے دل برداشتہ ہو کر دونوں نے خودکشی کر لی...... اور غالباً خودکشی کے اقرار نامہ میں یہی بات درج تھی۔ لیکن اب یہ بات قصۂ پارینہ ہو چکی تھی۔

یہاں بیس کیمپ کے پاس ہی ایک خوبصورت چشمہ بہہ رہا تھا۔ پانی اس معتدل موسم میں بھی یخ بستہ اور حیران کن حد تک میٹھا تھا۔ خیموں کی تقسیم اس طرح کی گئی تھی کہ لڑکیوں کے لیے ایک خیمہ لگایا گیا جبکہ ڈرائیور اور باورچی کو بھی ایک عدد مشترکہ خیمہ ملا۔ اسی طرح پروفیسرز کو بھی ایک ہی خیمہ شیئر کرنا پڑا۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت لڑکوں کی تھی۔ ان کی تعداد چار تھی اور خیمہ ایک تھا۔ حالانکہ خیمے میں تین افراد انتہائی آسانی سے رات گزار سکتے تھے۔ چوتھا لڑکا بھی آرام سے ایڈجسٹ کر سکتا تھا لیکن مسئلہ یہی تھا کہ ان تینوں لڑکوں کا مزاج اس چوتھے لڑکے سے بہت ہٹ کر تھا۔ وہ اسے اپنے خیمے میں برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن فی الحال مجبوری تھی۔

رات آہستہ آہستہ آگے سرکنے لگ گئی۔ سفر کی تکان کی وجہ سے سب پر نیند کا غلبہ ہو رہا تھا سوائے لڑکوں کے خیمے میں موجود تین لڑکوں کے۔ وہ چوتھے لڑکے کو کروٹ کے بل سوتا دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی منصوبہ ترتیب دینے لگے۔ پھر وہ کسی ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ گویا وہ اپنے منصوبے سے پوری طرح مطمئن ہو چکے تھے۔

☆☆☆

شور کی آواز سن کر سب سے پہلے رجب کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اُسے دبے دبے لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے جلدی سے پاس لیٹے ہوئے عاصم اور سجاد کو جگایا۔ وہ ابھی باہر جا کر کچھ خبر لینے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ انہوں نے غور کیا کہ خیمے میں ان کے ساتھ لیٹا ہوا وقاص اس وقت خیمے میں موجود نہیں تھا۔ وہ تینوں برق رفتاری سے باہر آئے، لڑکیوں کے خیمے سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ رجب نے خیمے کے قریب جا کر آواز دی۔

”یہاں سب ٹھیک ہے مریم؟ کیا سدرہ بھی اندر ہے؟“

اندر سے مریم کی آواز آئی۔ ”آپ لوگ اندر آ جائیں۔“ خیمے کے اندر سر ندیم اور سرمد صاحب سدرہ اور مریم کے پاس موجود تھے۔ جبکہ سدرہ بہت خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ ”میں نے ابھی آپ سب کے بولنے کی آواز سنی تھی اور کچھ شور سا بھی...... کیا تم لوگوں پر کسی جانور نے تو حملہ نہیں کیا؟“ رجب نے دونوں کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس پر کسی جانور نے نہیں بلکہ انسان نما جانور نے حملہ کیا تھا۔“ مریم نے سدرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں نفرت بھری ہوئی تھی۔

”او نو، یہ کیسے ممکن ہے اور کس نے ایسی گھٹیا حرکت کی ہے کیونکہ ہمارے سوا تو یہاں کوئی اور ہے بھی نہیں۔“ عاصم نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

سرمد صاحب نے کہا ”اس کا جواب پتا ہوتا تو اس وقت اس انسان کا گریبان ہاتھ میں نہ ہوتا...... لیکن بچی اس وقت بہت خوف زدہ ہے۔ بہتر ہے ہم اس دو دن کے ٹرپ کو سمیٹ کر کل صبح ہوتے ہی واپسی کا قصد کر لیں۔ ہمیں تم سب کے والدین نے ایک بھاری ذمے داری سونپی ہے اور آج پہلی ہی رات یہ حرکت ہو گئی ہے اس لیے مجھے یہی لگتا ہے صبح ہوتے ہی ہم واپس چلے جائیں۔“

وہ سب سر جھکا کر شرمندگی سے کھڑے تھے جب اچانک سر ندیم نے کہا۔ ”وقاص کہاں ہے؟ وہ تم لوگوں کے

ساتھ نظر نہیں آ رہا؟“

”سر وہ خیمے میں نہیں تھا، ہم تو جلدی میں پتا کرنے اس طرف آ گئے سو وقاص کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔“ سجاد نے مختصراً بتاتے ہوئے کہا۔

سرمد صاحب نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا پھر سب کو ساتھ لیا اور لڑکوں کے خیمے کی طرف آ گئے۔ سر ندیم نے اندر جھانک کر دیکھا تو وقاص خیمے میں موجود آرام سے سو رہا تھا۔ البتہ اس کے بال بکھرے ہوئے اور لباس مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ جو شاید کافی کوشش اور صفائی کے بعد بھی ہلکے کریم کلر کی شرٹ پر صاف نظر آ رہی تھی۔

سر ندیم کے اشارے پر عاصم نے آگے بڑھ کر وقاص کو جگایا۔ وقاص بدمزگی کے تاثرات لیے اٹھا تو اپنے سامنے اس وقت تمام لوگوں کو دیکھ کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔

”تم تھوڑی دیر پہلے کہاں گئے تھے اور یہاں کب واپس آئے؟“ عاصم نے جارحانہ لہجے میں وقاص سے استفسار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سدرہ کو ذاتی طور پر پسند کرتا تھا اس لیے وہ کافی غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا میں تم لوگوں کو بتا کر آیا جایا کروں...... مسئلہ کیا ہے۔ یہاں سب کیوں جمع ہوئے ہو میرے سر پر؟“ وقاص نے نہایت روکھے لہجے میں جواب دیا۔

وہ کافی تند مزاج اور تیز خو تھا اس لیے باقی تین لڑکے اسے اپنے پاس خیمے میں جگہ دینے پر راضی نہیں تھے۔

سرمد صاحب نے ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لیے وقاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”بیٹا ابھی کسی نے سدرہ پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کامیاب تو نہیں ہو سکا مگر ہم سب پریشان ہیں اور سب ہی ایک طرح سے مشکوک بھی۔ اس لیے تم سے پوچھ رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے جب یہ تینوں لڑکیوں کے خیمے کی طرف آئے تو تم خیمے میں موجود نہیں تھے۔“

وقاص نے حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سدرہ کو دیکھا۔ جو اس وقت خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔

”میں ذرا رفع حاجت کے لیے ساتھ والے درختوں کی آڑ میں گیا تھا“ وقاص نے اپنی صفائی دی۔

”اچھا تو یہ تمہاری شرٹ پر اتنی شکنیں اور بال کیوں بکھرے ہوئے ہیں؟“ سجاد نے تیزی سے کہا۔

”میں درخت کی ایک ٹہنی سے الجھ کر جھاڑیوں میں گر گیا تھا۔“

وہ سب بے یقینی اور بے یقینی کے تاثرات کے ساتھ وقاص کے دیے گئے جواب پر غور کرنے لگے۔ اتنی دیر میں بس کا ڈرائیور اور باورچی بھی یہ ہنگامہ سن کر وہاں پہنچ گئے۔

”صاحب جی خیر ہے نا؟ سب لوگ یہاں... کیوں جمع ہیں۔“ ڈرائیور زاہد خان نے آتے ہی سوال کیا جبکہ باورچی خالد محمود کن انکھیوں سے سب کی جانب خاموشی سے دیکھتا رہا۔

سرمد صاحب نے مناسب سمجھا کہ ڈرائیور اور باورچی کو معاملے کی ہوا نہ ہی لگنے دی جائے۔ ورنہ ہو سکتا ہے یونیورسٹی واپس جا کر وہ دوسروں کے ساتھ اس بدمزہ واقعے کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔ لہٰذا انہوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”زاہد خان کوئی خاص بات نہیں...... بس صبح کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے کیونکہ مجھے ایسے محسوس ہوا یہاں اردگرد کوئی جنگلی جانور نہ ہو۔ اس لیے بہتر ہے ہم سب سونے کے بجائے دو دو گھنٹے کی پہرا داری کریں۔ تاکہ سب لوگ محفوظ رہیں اور چین سے سو سکیں۔“

یہ تجویز سب کے لیے قابلِ عمل تھی۔ باری باری ایک بندے کو نگرانی کرنی تھی۔

وقاص نے اپنے خیمہ نشینوں کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے جانے کے بعد اپنے بیگ سے ایک شرٹ نکال کر تبدیل کر لی۔ پہلے وہ نیند کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا تھا مگر اب نیند اُڑ چکی تھی۔ بیگ کھول کر وہ کسی الجھن کا شکار نظر آیا۔ آخر چند لمحوں بعد اس نے بیگ کی زپ بند کی اور دوبارہ لیٹ گیا۔

سب کو علم تھا کہ رات ختم ہونے کا مطلب طلوعِ آفتاب نہیں بلکہ باقی افراد کی نیند سے بیداری ہے۔ اور یہ رات صبح دن چڑھے تک طویل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

سب سے پہلے باری سجاد کی تھی۔ وہ دو گھنٹے تک پہرا دیتا اس کے بعد عاصم پھر رجب کی باری آتی۔ اسی طرح وقاص، زاہد خان اور سب سے آخر میں خالد کی باری تھی۔ تب تک دن خاصا نکل چکا ہوتا۔

☆☆☆

وقاص کو شک ہوا کہ رجب اور عاصم آپس میں کوئی سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت تاریک خیمے میں لیٹا ہوا تھا لیکن مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں مسلسل وقاص کو پریشان کر رہی تھیں۔ اس نے بستر سے اٹھ کر

اپنے موبائل کی ٹارچ جلائی اور خیمے کو روشن کیا تاکہ وہ ان دونوں کو ذرا چپ کروا سکے لیکن حیرت کے مارے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں، وہ دونوں اس وقت بستر پر موجود نہیں تھے۔ پھر یہ آوازیں؟ اس نے جلدی سے سوچا اور خیمے سے باہر نکلا۔

سامنے ہی سجاد ان دونوں کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف نظر آیا۔ وہ ان کے قریب آیا تو وہ اس کو دیکھ کر گھبرا گئے جیسے کسی نے ان کی چوری پکڑ لی ہو۔

رجب نے ہمت کرکے کہا ”تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

وہ سب وقاص سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ان سب سے... تنومند بھی تھا اور لڑائی بھڑائی کا ماہر بھی۔ دوسرا وہ غصے کا بہت تیز تھا۔ اس کی آئے دن کسی نہ کسی سے جھڑپ یا لڑائی ہو جاتی تھی۔ اس لیے یہ تینوں بھی وقاص سے دب کر رہتے تھے۔

وقاص نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جو یہ لینے آئے ہیں...... میں بھی وہی لینے آیا ہوں۔“

”وہ تو ہمیں نیند نہیں آ رہی تھی تو ہم نے سوچا کہ تمہیں تنگ کرنا مناسب نہیں اس لیے ہم باہر آ کر سجاد کے پاس بیٹھ گئے۔“ رجب نے جلدی سے اپنی موجودگی کا جواز پیش کیا۔

”واپس آجا...... اوئے میرے ساتھ ڈرامے نہ کیا کر۔“ وقاص نے تھوڑا جھک کر رجب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ یہ اس کا تکیہ کلام تھا ”واپس آجا“ اور اس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ ’باز آجا‘...... وہ پاکستانی پنجابی فلمیں شوق سے دیکھتا تھا اور یہ غالباً کسی پنجابی فلم کا ہی چرایا ہوا ڈائیلاگ تھا جو اسے کافی پسند آ گیا تھا۔

رجب کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

”اور ہاں اب اپنی چونچیں بند رکھنا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ اگر تمہاری آواز آئی تو منہ پر پکے تالے لگا دوں گا۔“ وقاص نے خیمے میں جاتے ہوئے ان تینوں کو دھمکایا۔

وہ بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

☆☆☆

سب کے لیے یہ خبر ایک سانحہ سے کم نہیں تھی۔ عاصم رات کو اپنی باری پر پہرا دینے گیا تھا لیکن ڈیوٹی ختم کرکے اس نے رجب کو بیدار نہیں کیا تھا کہ وہ اس کی جگہ جا کر پہرا دے، اسی لیے وہ مزے سے سب دن چڑھے سوتے رہے۔ صبح اٹھ کر رجب اور وقاص کو پہلا احساس یہی ہوا کہ کسی وجہ سے وہ پہرا دینے سے بچ گئے ہیں لیکن ساتھ ہی اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ کیسے؟

سجاد بھی بیدار ہو چکا تھا اور باقی سب کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ سب باہر نکلے تو ہر ایک کی زبان پر یہی سوال تھا کہ عاصم کہاں ہے۔ لیکن عاصم کا دور دور تک کوئی نشان نہیں مل رہا تھا۔ اس کا بیگ اور اس میں موجود لیپ ٹاپ اور کپڑوں کا ایک جوڑا وہیں موجود تھا۔ یہاں تک کہ جہاں فولڈنگ کرسی پر بیٹھ کر وہ پہرا دے رہا تھا، اس پر اس کا موبائل فون بھی پڑا ہوا تھا۔ سرمد صاحب اور سر ندیم تو سر پکڑ کے بیٹھ گئے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی ذمے داری میں تھا اور کسی پر انگلی بھی نہیں اٹھائی جا سکتی تھی کیونکہ اس وقت پہرا بھی خود عاصم ہی دے رہا تھا۔ اگر وہ ساتھ اپنی کوئی چیز نہیں لے کر گیا تو اس کا مطلب ہے وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں گیا تھا۔ سب لوگوں نے قیاس آرائیاں شروع کر دیں۔ مریم اور سدرہ بھی ان لوگوں کے ساتھ تھیں۔ سدرہ ابھی تک رات والے واقعے کے اثر میں تھی شاید اسی لیے اس کا چہرہ تاثرات سے بالکل عاری تھا پھر یہ طے ہوا کہ لڑکیاں اور سرمد صاحب یہیں رکتے ہیں۔ اور باقی سب لوگ دو دو کی ٹولی بنا کر تین مختلف اطراف میں نکل جاتے ہیں۔ سب کے پاس موبائل فون تھے۔ یہاں موبائل سروس بھی ٹھیک تھی اس لیے ہر دس سے پندرہ منٹ بعد ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنا ضروری تھا تاکہ اگر کوئی بھٹک جائے یا کوئی اور پریشانی پیدا ہو تو دوسرے اس کی مدد کے لیے پہنچ جائیں۔

سب کچھ طے ہونے کے بعد سب نے اپنی اپنی گھڑی اور موبائل کے وقت کو ایک ساتھ ملایا...... موبائل کی بیٹری اور کریڈٹ چیک کیا اور اپنے ساتھ اپنے بچاؤ کے سادہ سے ہتھیار جن میں لکڑی کی چھڑیاں اور چھتری جیسی چیزیں شامل تھیں، ساتھ لے لیں۔ یہ احتیاط خاص طور پر رینگنے والے جانوروں سے بچاؤ کے لیے تھی۔ ورنہ اس وادی میں بندروں کے سوا اور کوئی قابلِ ذکر جانور نہیں تھا۔

سرمد صاحب لڑکیوں کو ساتھ لے کر چاروں خیموں کے درمیان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تینوں پارٹیاں روانہ ہو چکی تھیں۔ سرمد صاحب بہت پُرامید تھے کہ یہ تینوں پارٹیاں عاصم کو جلد از جلد ڈھونڈ کر لے آئیں گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی نوکری اور مستقبل داؤ پر لگتا ہی لیکن ساتھ عمر بھر کی پشیمانی تھی کہ ان کی سرکردگی میں آئے ہوئے ٹرپ میں یہ حادثہ ہوا۔ وہ خود کو ابھی سے اس سب کا ذمے دار محسوس کرتے تھے۔

☆☆☆

یہاں پر دن کے وقت بھی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ معتدل موسم کے باوجود یہ جنگل کا بہت ٹھنڈا حصہ تھا اس لیے سامنے جلتی آگ سے راحت محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں درخت اتنے گھنے تھے کہ سورج کی روشنی بمشکل پہنچ رہی تھی۔ یہاں کُل تین افراد موجود تھے۔ سامنے بیٹھے شخص کے جسم پر گہرے کالے رنگ کا چوغہ تھا۔ اس کے بال لمبے اور بے ترتیب تھے لیکن اس کی آنکھیں آگ سے زیادہ روشن لگ رہی تھیں یا شاید آگ کا عکس اس کی آنکھوں میں نظر آ رہا تھا۔ وہ یہاں کا میزبان تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ساتھ ہی چند قدموں کے فاصلے پر اس کا گھر تھا جو ایک عدد جھونپڑی پر مشتمل تھا۔ سامنے بیٹھے دونوں آدمیوں میں سے ایک مقامی یعنی اطراف کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور اس کا نام ظہیر عرف جیرا تھا۔ دوسرا چوغہ پوش فی الحال اجنبی تھا کیونکہ وہ آج ہی مقدس حصار میں شامل ہوا تھا۔ جیرے نے اس کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ کیونکہ محترم جوشن نے ایسے سوال کرنے سے منع کیا تھا۔ جوشن اسی چوغہ پوش اور پُراسرار شخص کا نام تھا جو جنگل کے اس تاریک حصے کا مکین تھا۔ جیرا اور اس کی طرح چند اور لوگ ہر ماہ نصف چاند کی شب یہاں جنگل میں اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ یہاں محترم جوشن کے مقدس حصار میں شامل ہوتے تھے۔ وقتی طور پر وہ دنیا اور زمان و مکاں کو فراموش کرکے راحت اور بے خودی کی چند ساعتیں کشید کرتے تھے۔ وہ اس کو ذات کا عرفان کہتے تھے۔ باقی لوگ تو رات کو اپنا حصار مکمل کرکے واپس جا چکے تھے۔ مگر جیرے کو محترم جوشن نے بوجوہ روک لیا تھا۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ محترم جوشن کسی کو اپنے پاس رکنے کا کہتے تھے۔ عموماً ایسا تب ہی ہوتا تھا جب کوئی نیا رکن مقدس حصار میں شامل ہوتا تھا۔

”میرے لیے کیا اذن ہے اے محترم جوشن۔“ جیرے کو اب گھر واپسی کی جلدی تھی۔ یہ طرزِ تخاطب جیرے نے محترم جوشن کی معیت میں سیکھا تھا۔ محترم جوشن کے پاس وہ جب آیا تھا تو حصار کے رکن بھی مختلف تھے اور وہ آہستہ آہستہ تبدیل ہوتے گئے۔ ہر دو نصف چاند کے بعد سارے ارکان تبدیل ہو جاتے تھے جیرا شاید مقامی تھا اس لیے وہ مسلسل پندرہ دفعہ نصف چاند کی شب کو مقدس حصار میں شامل ہو چکا تھا۔ باقی ارکان اسے رشک سے دیکھتے تھے کیونکہ حسد حصار کے ارکان کے لیے کفر تھا اور حکم عدولی بھی اسی لیے وہ یہاں سے جانے کے بعد کبھی واپس نہیں آتے تھے...... محترم جوشن کا یہی حکم تھا۔ جیرے نے پرانے ارکان کو دیکھ کر ہی یہ سب کچھ کرنا اور بولنا سیکھا تھا۔ وہ آسن لگا کر جہاں دائرے کی شکل میں بیٹھتے تھے اسے مقدس حصار اور اس کے علاوہ ساری جگہ کو مجموعی طور کو مدار کہتے تھے جس کی حدود باہر والے لوگوں کے لیے ہمیشہ اَن دیکھی تھی۔

”صبر انسان کے لیے بہت بڑی نعمت ہے لیکن ہر انسان اس کا متحمل نہیں ہو سکتا......“ محترم جوشن نے اپنی گونج دار آواز میں کہا۔ وہ ہمیشہ ایسی نستعلیق، پُرمعنی اور محتاط گفتگو کرتے تھے۔

”جی بہتر۔ میں مدار میں موجود رہوں گا۔“ جیرا سمجھ چکا تھا کہ اسے مزید رکنا ہے۔

”ہم توقع کرتے ہیں کہ مزید ارکان جلد ہی مدار کے قریب دیکھے جائیں گے۔ انہیں مقدس حصار میں شامل کرنا ضروری ہے۔“ محترم جوشن نے جیرے کو مخاطب کیا

”اذن کی تکمیل ہوگی محترم جوشن۔“

”انسان مادہ پرستی میں مبتلا ہے۔ وہ فطرت کی لطافت سے دور ہو رہا ہے۔ ہم سب عرفان کے متلاشی ہیں۔ ہمیں دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنی ہے لیکن انسان کی بے چین فطرت اسے مجبور کرتی ہے وہ مادہ پرستی کی کثافت زمین پر پھیلا دے اس لیے اکثر وہ ہم خاک نشینوں کے مدار میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مقدس حصار کی توہین ہے کیونکہ وہ اس کی ماہیت اور اہمیت سے بے خبر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اگر کوئی مدار کی طرف آ نکلے تو اسے مقدس حصار کا رکن بنایا جائے۔ وہ کثافتوں سے پاک ہو کر اس مقدس عمل میں شامل ہو جائیں لیکن یہ اتنا آسان نہیں کیونکہ انسان ظاہر کو ترجیح دیتا ہے اور اسے ہی دیکھتا ہے۔ میں ان کے قدموں کی چاپ سن رہا ہوں، وہ جلد مدار میں داخل ہو جائیں گے اور اس مقدس فریضے کے لیے تم چن لیے گئے ہو۔ ان کی مزاحمت اصل میں ان کی کم علمی ہے کیونکہ وہ جانتے نہیں ...... اسے خاطر میں نہ لانا......“

محترم جوشن نے جیرے کو مخاطب کرکے مختصر سی تقریر کی۔ جیرے کو سمجھ آ گئی تھی کہ ہو سکتا ہے کچھ لوگ مدار کی طرف آ نکلیں اور اگر وہ آ گئے تو ان کو کسی بھی طرح حصار میں لے کر آنا ہے۔ جہاں وہ سب حصار کی شکل میں الاؤ کے گرد جمع ہو کر مقدس جام ”تھورس“ پیتے ہیں۔ پھر وہ تمام شب اسی حصار کے گرد مکمل کرتے ہیں۔

محترم جوشن نے نئے اجنبی رکن کو وہیں حصار میں رہنے دیا اور خود جھونپڑی کی طرف چلے گئے۔ جیرا اب نئے آنے والے ارکان کا منتظر تھا جو کہ ظاہر ہے اپنی مرضی سے

نہیں آ رہے تھے۔

☆☆☆

ان کو جنگل میں آئے تقریباً ایک گھنٹا ہونے ہی والا تھا۔ اس لیے اب وہ بے دلی سے آگے بڑھنے کے بجائے واپسی کا قصد کر رہے تھے۔ وقاص اور سجاد دونوں نے واپسی کی راہ لی۔ ان کو ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی سر ندیم اور زاہد خان سے بات کیے ہوئے۔ درمیان میں کبھی کبھی موبائل سروس معطل ہو جاتی تھی لیکن مجموعی طور پر وہ تعطل کا شکار نہیں رہی تھی اس لیے سب کے آپس میں رابطوں میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تھی۔ سجاد ابھی تک خود کو وقاص کے ساتھ آرام دہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کی پریشانی چہرے سے مترشح تھی۔ وقاص بھی پریشان تھا کیونکہ عاصم کا غیاب اس کے نزدیک بھی ایک قابلِ افسوس واقعہ تھا لیکن اس کے چہرے سے کسی قسم کے غم یا افسوس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ چلتے ہوئے جنگل کی ایک تنگ پگڈنڈی سے گزر رہے تھے کہ پیچھے چلتے ہوئے سجاد نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ''وقاص وہ دیکھو...... وہ کیا چیز ہے۔''

وقاص کی نظروں نے سجاد کے ہاتھ کا تعاقب کیا۔ پگڈنڈی سے تھوڑی ہی دور جھاڑیوں میں کوئی رنگ دار کپڑا اٹکا ہوا تھا۔ قریب جا کر دیکھنے پر ان کو پتا لگا یہ وہی چیک دار شرٹ تھی جو کہ رات کو عاصم نے پہنی ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً موبائل فون نکال کر سر ندیم اور زاہد خان کو مطلع کیا اور اسی جانب آنے کا کہا۔

وقاص اسی وقت آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن سجاد کے دبے دبے احتجاج اور لہجے نے اس بات پر زور دیا کہ باقی لوگوں کو بھی آلینے دو۔ خلافِ توقع اس دفعہ وقاص نے ضد نہیں کی اور درخت سے ٹیک لگا کر باقی چاروں کا انتظار کرنے لگا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ دونوں نے انتہائی بوریت کے عالم میں گزارے۔ وقاص تو ان سب کو غائبانہ صلواتیں بھی سنا تا جا رہا تھا۔

''پتا نہیں کہاں مر گئے ہیں سب......''

''وقاص! سر ندیم بھی ان میں شامل ہیں بھائی۔ تھوڑا تو خیال کیا کرو۔'' سجاد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''سر ندیم ہیں تو کیا سر پر بٹھا لوں......''

''نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے لیکن پھر بھی استاد کی تکریم اور عزت کرنی چاہیے......''

''واپس آجا...... زیادہ چمچہ نہ بن اب ..... کہیں ان کے آنے سے پہلے تو بھی گم نہ ہو جائے عاصم کی طرح۔ جانتا ہوں تیرے سر ندیم کو بہت اچھی طرح۔'' وقاص نے ڈانٹتے ہوئے سجاد کو کہا جو غصے اور ڈر سے ہونٹ بھینچ کر زمین کو گھورنے لگا تھا۔

آخر ان کا انتظار ختم ہوا۔ پہلے پہنچنے والوں میں زاہد خان اور باورچی خالد شامل تھے۔ انہوں نے بھی عاصم کی شرٹ کا معائنہ کیا جیسے وہ کوئی سراغ رساں قسم کی چیز ہوں۔ جبکہ خالد نے گھوم پھر کر تقریباً دس میٹر کے قطر میں اطراف کا جائزہ لیا۔ اسی دوران میں سر ندیم اور رجب بھی پہنچ گئے۔

''ہاں بھئی کیا دیکھا ہے تم نے؟ اور کہاں ہے عاصم کی شرٹ؟'' سر ندیم نے آتے ہی سوال کیا۔

جواب میں وقاص کے بجائے سجاد ان کو اس جھاڑی کے قریب لے گیا۔ انہوں نے ابھی تک شرٹ وہاں سے نہیں نکالی تھی۔ سر ندیم شرٹ کا معائنہ کر ہی رہے تھے کہ خالد کی آواز سنائی دی......

''صاحب جی، وہ اس طرف گئے ہیں۔''

وہ سب حیرت سے خالد کی جانب دیکھنے لگے۔

''وہ اس طرف گئے ہیں؟ عاصم اکیلا تھا تم کو بھی پتا ہے۔ اور تم کو کیسے اتنا یقین ہے کہ وہ اس طرف ہی گئے ہوں گے؟'' رجب نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ باقی سب کے دماغوں میں بھی یہی سوال تھا۔

''وہ جی مجھے نہیں پتا...... لیکن یہاں سے ایک نہیں دو بندے گئے ہیں۔ ہمارے پنڈ میں اکثر چوروں یا ڈاکوؤں کا جب کھرا نکالتے ہیں کھوجی تو وہ پیروں کے نشان دیکھ کر ہی سب بتا دیتے ہیں۔ یہاں تو جنگلی گھاس پر صاف صاف دو بندوں کے پیروں کے نشان ہیں۔'' خالد نے اپنی بات مکمل کی۔

اس نئی دریافت پر سب نے آگے بڑھ کر خالد کی کہی ہوئی بات کی تصدیق کی۔

''صرف دو بندوں کے پیروں کے نشان ہیں ادھر اور ایسے کوئی آثار نہیں لگ رہے کہ ان کی آپس میں کوئی ہاتھا پائی ہوئی یا عاصم کو زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہو۔ اگر ان میں سے ایک عاصم ہی تھا تو......'' سجاد بھی دور کی کوڑی لایا تھا۔ سب کا تجسس بڑھنے لگا لیکن ساتھ ہی کسی پُراسرار معاملے میں اُلجھتے دکھائی دے رہے تھے۔

☆☆☆

سرمد صاحب، سدرہ اور مریم کیمپ میں بیٹھے ان لوگوں کا انتظار کر رہے تھے۔ سرمد صاحب وقت گزاری کے

لیے اپنے ساتھ لائے ہوئے خشک میوے بھی کھا رہے تھے اور ساتھ ہی مطالعے میں غرق تھے۔ مریم اور سدرہ ان سے ذرا سا الگ ہو کر سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔ اچانک ہی مطالعے میں گم سرمد صاحب کو کچھ یاد آیا۔

''مریم، یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ہم ان لوگوں کے واپس آنے تک سامنے سامنے سے کچھ پودوں کے نمونے اور ان کے بیجوں کو اکٹھا کر لیں۔ آخر یونیورسٹی سے ہم معلوماتی ٹرپ کی اجازت لے کر آئے ہیں۔''

''جی سر...... ایسا کر لیتے ہیں۔ سدرہ بھی بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہے۔''

''چلو پھر تم پلاسٹک کے وہ لفافے لے آؤ جن میں ہم نے پتوں، بیجوں اور شاخوں کے نمونے رکھنے ہیں۔'' سرمد صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ یہاں جنگلات میں موجود دیگر نباتات کے ساتھ یہاں اُگنے والی ایک جڑی بوٹی کی مخصوص قسم کی تلاش میں آئے تھے۔ کیونکہ یہ جڑی بوٹی ان جنگلات میں کثرت سے پائی جاتی تھی۔ اس پر تجربات اور ریسرچ آج کل ان کے آنے والے امتحان کا حصہ تھا۔ وہ بوٹی حیرت انگیز خاصیت کی حامل تھی۔ جو نہ صرف انتہائی ناساعد حالات میں اپنا وجود برقرار رکھتی تھی بلکہ اپنے اردگرد موجود چھوٹے اور خوردہ پودوں کو بھی خوراک کا وافر حصہ فراہم کرتی تھی۔

مریم لفافے لے کر واپس آئی تو سرمد صاحب نے ان کو بوٹی کی مخصوص پہچان بتائی...... حالانکہ وہ دونوں خود بھی جانتی تھیں مگر ان کا مربیانہ انداز ان کو برا نہیں لگا۔

''ہیں کیمپ سے کسی بھی صورت دور نہ ہونا، بس سامنے سامنے ہی جو نظر آئے، اس کا نمونہ محفوظ کرتی جاؤ۔ ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے سامنے رہنا۔'' سرمد صاحب نے پھر سے انہیں تنبیہی انداز میں کہا۔

مریم اور سدرہ نے بیک وقت سر ہلا کر ''یس سر'' کہنے پر اکتفا کیا۔

وہ بڑی دل جمعی سے نمونوں کی کھوج میں لگ گئے۔ تقریباً تیس منٹ گزرے تھے کہ سدرہ کو اچانک جنگل میں کوئی آہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے تھوڑی دیر رک کر دوبارہ سن گن لینے کی کوشش کی مگر دوبارہ آہٹ نہ پا کر وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مگر ابھی تیس سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہی آواز اسے زیادہ تیزی کے ساتھ سنائی دی جیسے کوئی جنگل میں بھاگ رہا ہو۔ اس دفعہ مریم نے بھی وہ آواز سنی تھی۔

''لگتا ہے وہ لوگ واپس آ رہے ہیں۔'' سدرہ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن آواز تو مرکزی سڑک کی جانب سے آ رہی ہے اور وہ لوگ جنگل کے اندر گئے ہیں، باہر کی طرف نہیں۔'' مریم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

سرمد صاحب چونکہ دوسرے کونے پر مشغول تھے اس لیے وہ ان کی گفتگو اور وہ آواز واضح طور پر نہ سن سکے۔

''کہیں یہ کوئی جنگلی جانور نہ ہو'' سدرہ خوفزدہ دکھائی دینے لگی۔

''نہیں پاگل...... یہاں بندروں کے سوا کوئی خطرناک جانور نہیں اور بندروں کو بھی خوراک ملتی رہے تو وہ انسانوں کو کچھ نہیں کہتے نہ ہی ان پر حملہ کرتے ہیں۔''

یہ مریم کی قیاس آرائی تھی مگر وہ بھی اندر سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

انہوں نے سرمد صاحب کی طرف دیکھا جو انہماک سے اپنا کام کر رہے تھے۔ پہلے انہوں نے سوچا، وہ سرمد صاحب کے پاس چلی جاتی ہیں...... پھر وہ یہ سوچ کر رک گئیں کہ ہو سکتا ہے یہ صرف وہم ہی ہو اور وہاں کوئی چھوٹا موٹا رینگنے والا جانور ہو۔

وہ دونوں مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے کام میں لگ گئیں۔ اچانک ان کے قریب ہی ایک بڑی سی گول بھوری اور ٹھوس چیز جھاڑیوں میں آ کر عین ان کے سامنے گری۔

اتفاق سے وہاں جھاڑیاں بھی بھوری مائل زرد سی تھیں...... ان دونوں کی کورس میں چیخ نکلی اور سدرہ اپنے حواس سے بیگانہ ہونے سے پہلے یہ دیکھ چکی تھی کہ سرمد صاحب بھاگتے ہوئے ان دونوں کی جانب ...ہے تھے۔ اسے مریم کی حالت کی خبر نہیں تھی مگر وہ پوری طرح........ بے ہوش ہو چکی تھی کیونکہ وہ ایسی ہی نازک مزاج لڑکی تھی۔

☆☆☆

جیرا بیٹھے بیٹھے اب اُکتا رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ اس حصار سے اٹھ کر جانا چاہتا تھا یا اسے محترم جوشن کے حکم کا پاس نہیں تھا۔ وہ صرف آنے والے نئے ارکان کا انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تھا۔ جبکہ محترم جوشن ابھی تک اپنی جھونپڑی میں موجود تھے۔ نیا آنے والا رکن قیامت کی خاموشی کے ساتھ چہار سمت سے یکسر بے نیاز حصار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں ابھی تک زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ بس اس کے سانس لینے کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک زندہ آدمی کا وجود ہے۔ محترم جوشن کا ایسا کوئی حکم نہیں تھا کہ

حصار میں بیٹھنے والے ارکان کہیں اور نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن تھورس پینے کے کچھ دیر بعد ارتکاز کی ایک ایسی مشق ہوتی تھی جس میں تمام اراکین سامنے جلتی آگ کو مسلسل دیکھتے رہتے تھے یہاں تک کہ ان کی آنکھوں سے پانی کسی جھرنے کی طرح رواں ہو جاتا تھا۔ ان چند ساعتوں کے سوا ایسی کوئی پابندی نہیں تھی اسی لیے جیرا تھوڑا حیران و پریشان ہو کر نئے رکن کی جانب کبھی کبھی نظر مار لیتا تھا لیکن اس کا مکمل دھیان ابھی بھی مدار کے اطراف میں تھا۔

آخر اس کا انتظار رنگ لے آیا۔ اسے مدار سے کچھ دور گھنے جنگل میں کچھ لوگوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ چیتے کی پھرتی سے اٹھا اور مدار کی حدود کے قریب ایک مقام دیکھ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

''سر جی ان کے پیروں کے نشان اسی طرف جا رہے ہیں یہ دیکھیں۔'' جیرے کو یہ آواز کافی نزدیک سے سنائی دی تھی۔

اب اسے درختوں اور جھاڑیوں کے اندر ان کے لباس دکھائی دے رہے تھے۔ مزید کچھ لمحوں میں اس کے سامنے چھ افراد تھے۔ جن میں دو ادھیڑ عمر جبکہ باقی چار ابھی نوجوان ہی تھے۔ وہ جیرے کی موجودگی سے تاحال غافل تھے۔

اچانک جیرا درخت کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ ''میں مدار میں تمام احباب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے تو جیسے سب کے سروں پر بم پھٹ گیا۔ مگر جیرے کے معقول حلیے اور لہجے نے ان کا ڈر جلد ہی ختم کر دیا۔ وہ لوگ عاصم کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ گئے تھے۔

''کیا آپ اس جنگل کے آس پاس رہتے ہیں؟ ہمارا ایک دوست جنگل میں کہیں گم ہو گیا ہے، ہم اسی کو تلاش کرتے ہوئے اس طرف آئے ہیں۔ اگر آپ ہماری مدد کر سکیں تو ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔'' سر ندیم نے آگے آ کر جیرے کو مخاطب کیا۔

''جی میں اس جنگل کا ہی باسی ہوں۔ جنگل کا ایسا کوئی حصہ نہیں جو محترم جوشن کی نگاہ سے پوشیدہ ہو۔ وہ مدار میں رہتے ہوئے بھی تمام جنگل کو اپنی ہتھیلی کی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ وہ یقیناً آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ چونکہ آپ مدار کی حدود میں ہیں اس لیے آپ ہمارے مہمان بن گئے ہیں۔''

سر ندیم اور ان کے ساتھ باقی تمام لوگوں نے اُلجھی ہوئی نظروں سے جیرے کو دیکھا۔ وہ یقیناً کسی اور کی بات کر رہا تھا مگر یہ مدار اور اس کی حدود والی باتیں ان کی سمجھ میں ذرا بھی نہیں آئی تھیں۔

''ہم سمجھے نہیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا کوئی اور ہماری مدد کرے گا، آپ نہیں؟'' سر ندیم ہی بول رہے تھے جبکہ باقی خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

''آپ میرے ساتھ آئیں۔ مقدس حصار آپ کی رہنمائی کرے گا۔'' جیرے نے مدار کے اندر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مدار کی حدود کسی باڑ یا دیوار کی نہیں تھی۔ بلکہ مخصوص درختوں کی قطاروں کو مدار کی حدود بنایا گیا تھا۔ یہ ان دیکھی حدود صرف مدار کے مکین یا حصار میں شامل ارکان ہی جان سکتے تھے۔

سب لوگ اس الاؤ کی طرف چل دیے جہاں ایک چوغہ پوش خاموشی سے زمین میں نظریں گاڑے بیٹھا ہوا تھا... چوغے سے منسلک کپڑے کا کنٹوپ اس کے سر اور چہرے کو چھپا کر اور بھی پُراسرار بنا رہا تھا۔

''یار یہ کیسی جگہ ہے۔ یہاں تو دن میں بھی اندھیرا محسوس ہو رہا ہے۔'' سجاد نے ڈرے ہوئے لہجے میں رجب سے کہا۔

''کیا کھُسر پھُسر ہونے لگی تم دونوں میں۔ تمہاری زبان کو آرام نہیں آتا کہیں۔'' وقاص کے دبے مگر تند لہجے نے ان کے منہ پر دوبارہ تالے لگا دیے۔

جیرا ان کو الاؤ کے قریب لے آیا۔ ''آپ یہاں مقدس حصار میں بیٹھیں...... میں محترم جوشن کو اطلاع دیتا ہوں اور آپ حصار سے ہٹ کر نہیں بیٹھیں گے۔ یہ مقدس حصار کی تعظیم کے لیے انتہائی ضروری ہے۔'' جیرے نے وقاص کو حصار سے بالکل باہر ہو کر بیٹھتے دیکھ کر کہا۔ وہ سب وہاں واضح طور پر ایک کالے رنگ کا حصار نما دائرہ بنا ہوا دیکھ سکتے تھے۔

''اب یہ کونسی نئی قلم ہے؟ کون سا مقدس حصار اور کس کی تعظیم؟'' وقاص نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

سر ندیم نے اسے گھور کر دیکھا۔

''ہمیں ان کی مدد چاہیے۔ وہ جنگل کو ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم ان کی بات مانیں اور تہذیب سے پیش آئیں۔'' سر ندیم نے وقاص کی موجودگی کو ناپسندیدہ جانتے ہوئے کہا۔

''سر کیا بہتر نہیں ہوگا کہ ہم سرمد صاحب کو بھی اطلاع دے دیں۔'' سجاد نے ایک تجویز پیش کی۔

''یہ ایک اچھا مطالبہ ہے جس کے متعلق سنجیدگی سے سوچا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مجھے لگتا ہے اس کام کے لیے صرف دو افراد ہی کافی ہیں۔ باقی لوگ تب تک اس مقدس حصار میں ہماری میزبانی کا شرف حاصل کریں گے...... اب آپ لوگ خود ہی دو بندوں کو چن لیں، جو میری بتائی ہوئی سمت کی طرف نکل جائیں۔'' محترم جوشن نے سر ندیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں سب منظور ہے لیکن آپ کسی بھی طرح ہمارے ساتھی تک ہم کو پہنچا دیں۔''

جوشن نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ آخرکار سر ندیم نے باورچی خالد اور رجب کو پوری ٹیم میں سے چنا اور جوشن کے بتائے ہوئے راستے پر بھیج دیا۔ جوشن نے یہ باور کروا دیا تھا کہ پورے جنگل میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور وہ جلد ہی اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں آج ایک اجنبی دیکھا گیا ہے۔ وہ یقیناً آپ لوگوں کا ساتھی ہی ہوگا۔ کیونکہ جنگل کے اتنے گھنے حصے میں کم ہی کوئی جاتا ہے جب تک کہ وہ راستہ نہ بھٹک جائے۔

سب لوگ تقریباً مطمئن ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ آرام سے حصار میں بیٹھ کر ان دونوں کا انتظار کرنے لگے۔ جبکہ جیرا محترم جوشن کے اشارے پر سامنے رکھے مٹی کے گھڑے میں سے تھورس نکال کر مٹی کے پیالوں میں لے آیا۔

''یہ ہماری طرف سے آپ سب کے لیے ہے۔ یہ ایک مقدس جام ہے جو صرف حصار کے ارکان ہی پیتے ہیں مگر چونکہ آپ مہمان ہیں اور اس وقت حصار میں بھی موجود ہیں تو اس لیے اسے پینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ نے اس سے شیریں اور خوش ذائقہ مشروب آج تک نہیں پیا ہوگا۔'' جوشن نے پیالہ ندیم صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

سر ندیم نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد پیالہ قبول کر لیا۔ اسی طرح باقی سب لوگوں کو بھی مقدس جام ''تھورس'' دیا گیا۔

وہ واقعی ایک خوش ذائقہ مشروب تھا۔ ایسا مشروب کسی نے زندگی میں پہلے نہیں چکھا تھا۔ اتنا فرحت بخش اور لذت سے بھرپور تھا کہ ان کو یوں محسوس ہو رہا تھا، وہ کوئی مشروب نہیں بلکہ آبِ حیات پی رہے ہیں۔

سب سے آخر میں مشروب سجاد کے حصے میں آیا تھا اس لیے... جب سب لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کی پلکیں

''پہلے پتا تو لگ جائے اصل معاملہ ہے کیا اور یہ ہماری عاصم کو تلاش کرنے میں کیا مدد دیں گے۔'' رجب نے تیزی سے بات کاٹی۔

سجاد نے اُلجھن زدہ چہرے سے زاہد خان اور خالد کو دیکھا۔ وہ دونوں ابھی تک بالکل خاموش تھے اور یہاں آنے کے بعد ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے۔

مگر وہ بھی چپ چاپ نظریں جھکا کر بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی ان کو احساس ہوا کہ ان کے ساتھ حصار میں کوئی اور بھی بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اب ایک مکمل حصار کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے جس میں مزید چار یا پانچ لوگوں کی گنجائش باقی تھی۔ الاؤ کے سامنے اور حصار کے نقطۂ آغاز میں بڑا سا سرخ نشان تھا جہاں اس وقت کوئی نہیں بیٹھا ہوا تھا۔

چند لمحوں بعد انہوں نے جیرے کو ایک اور کالے چوغہ پوش کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا۔

''محترم جوشن آپ لوگوں کو خود خوش آمدید کہنے آئے ہیں۔ وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے۔'' جیرے نے آتے ہی سب کو مخاطب کیا۔

سبھی لوگ محترم جوشن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ ایک پُراسرار سا شخص لگ رہا تھا۔ سب لوگ اس کے ظاہری حلیے سے مرعوب ہو رہے تھے سوائے وقاص کے۔ اس کے دماغ میں چل رہا تھا کہ یہ کوئی ڈراما ہی ہے۔ محترم جوشن کی دہکتی ہوئی سرخ انگارہ آنکھیں وقاص پر جم گئیں۔ وقاص نے بے پروائی سے ان آنکھوں میں جھانکا اور پھر وہ پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ وہ اکھڑ، تند مزاج اور لڑاکا طبیعت رکھنے کے باوجود اپنے جسم کی کپکپاہٹ نہ روک سکا اور ڈر کے آنکھیں جھکا لیں۔

''ہم جس چیز کو سمجھ نہیں پاتے، اس کے متعلق شکوک و شبہات پال لیتے ہیں۔ انسان کی بصارت ہمیشہ اسے دھوکا دیتی آئی ہے کیونکہ جو ہو رہا ہوتا ہے، وہ ہم دیکھنا نہیں چاہتے اور جو دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ہوتا نہیں۔ جس سے مدد طلب کی جائے اس کے سامنے خود کو بہتر ظاہر نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی ذات پر قیاس کرتے ہیں۔''

محترم جوشن نے مسکراتے ہوئے بظاہر سب سے کہا مگر ان کا رخ وقاص کی جانب ہی تھا۔

سر ندیم فوراً آگے آ کر بولے۔ ''جی بالکل ہمیں آپ کی مدد چاہیے، ہمارا ایک ساتھی اسی جنگل میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ اگر کسی طرح آپ تلاش کر دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔''

بھاری ہو رہی ہیں اور دماغ پر کوئی دھندسی چھانے لگی ہے تو سجاد کسی حد تک اپنے حواس میں تھا۔ اس نے محسوس کیا وہ ارد گرد کے ماحول سے بیگانہ ہو رہا ہے اور جنگل کے سارے درخت اور حصار میں بیٹھے لوگ گھومنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے وقاص کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھیں بھی بمشکل کھلی ہوئی تھیں جبکہ زاہد خان کی گردن نیچے ڈھلک چکی تھی۔

وہ باری باری حصار کے تمام ارکان کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ندیم صاحب اسے قدرے بہتر نظر آئے کیونکہ وہ شاید جیرے یا محترم جوشن سے باتیں کر رہے تھے۔ آخر میں اس نے اپنے سامنے بیٹھے چوغہ پوش کو دیکھا جو تب سے ہی گردن جھکا کر بیٹھا تھا لیکن پہلی دفعہ اس کی گردن ہلتی ہوئی دکھائی دی اور اس نے اپنا چہرہ اوپر کی طرف کیا جس پر اس کا چہرہ پوری طرح ظاہر ہوا۔ سجاد پہلے ہی گھومتی ہوئی دنیا دیکھ رہا تھا مگر اس چوغہ پوش کو دیکھ کر اس کی ہمت واقعی جواب دے گئی تھی۔ اس کی آنکھیں سجاد پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ غیر انسانی آنکھیں تھیں جن میں انسانیت نام کی کوئی جھلک نہیں تھی اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ عاصم تھا۔ خود سے غافل ہونے سے پہلے سجاد کو یقین تھا کہ اسے کوئی بصری واہمہ نہیں ہوا۔ وہ صد فی صد عاصم ہی تھا لیکن وہ جس حالت میں تھا، وہ سجاد کے لیے ایک ڈراؤنا خواب ہی تھا۔

☆☆☆

''سدرہ آنکھیں کھولو...... یہاں سب ٹھیک ہے۔''

مریم نے سدرہ کا سر گود میں رکھا ہوا تھا اور سرمد صاحب ساتھ کھڑے تھے۔ جبکہ ان کے ساتھ ایک شادی شدہ جوڑا اور ان کا ایک پانچ سالہ بیٹا بھی تھا جس کے ہاتھ میں ایک براؤن رنگ زین سے بنا ہوا فٹ بال تھا۔ مرد مطمئن دکھائی دے رہا تھا جبکہ عورت اور بچے کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

سدرہ کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے سے وہ کسمسانا شروع ہو گئی۔ مریم نے اپنی چھوٹی سی منرل واٹر کی بوتل سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے تھے۔

''وہ کیا تھا مریم؟'' سدرہ نے ہوش میں آتے ہی سوال کیا۔

''کچھ نہیں وہ تو بس بچوں کا فٹ بال تھا...... تم ایسے ہی گھبرا گئیں۔''

''کیا واقعی......؟ لیکن میرے ساتھ تم بھی تو ڈر گئی تھیں۔''

''وہ تو میں تمہاری چیخ سے ڈر گئی تھی سو میری بھی چیخ نکل گئی۔'' مریم نے اپنی خفت کو مٹانے کے لیے جواز دیا۔

''تم اب کیسا محسوس کر رہی ہو سدرہ بیٹی......'' سرمد صاحب نے دونوں کے درمیان مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا محسوس کر رہی ہوں سر...... بس ایسے ہی ڈر گئی تھی۔''

''اچھا ان کی معذرت قبول کرو۔ یہ کیپٹن خان یعنی افضال خان اور ان کی اہلیہ عائزہ ہیں...... کیپٹن خان نے اپنے بیٹے حسن کے فٹ بال کو لات ماری تھی جو تمہارے قریب آ کر گرا تھا اور تم دونوں ڈر گئی تھیں اس لیے وہ تم سے معذرت خواہ ہیں۔''

سدرہ اب اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ کیپٹن خان ان کی اہلیہ اور پانچ سالہ بیٹے حسن کو دیکھا۔ حسن ہاتھ میں فٹ بال پکڑے کالی کالی خوبصورت آنکھوں سے سدرہ کو دیکھ رہا تھا۔ سدرہ کو اس پر بے اختیار پیار آیا۔

''ایسے تو معافی نہیں ملے گی جب تک حسن مجھے اپنے گال پر پیار نہیں کرنے دے گا۔'' سدرہ نے خوشدلی سے کہا۔

باقی سب کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی جبکہ حسن گھبرا کر کیپٹن خان کی طرف دیکھنے لگا جیسے یہ کوئی بہت معیوب بات ہو۔

کیپٹن نے مسکرا کر کہا۔ ''حسن بیٹا چلو، آپی سے سوری کرو اور ان کی بات مانو۔'' حسن شرماتا ہوا سر جھکا کر سدرہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''سوری آپی۔'' وہ صرف اتنا کہہ سکا تھا کہ سدرہ نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کا منہ چوم لیا۔

حسن شرم سے سرخ ہو کر بھاگتا ہوا اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''چلیے کیپٹن صاحب آپ کچھ دیر ہمارے ساتھ گزاریں اور ہمیں میزبانی کا موقع دیں۔'' سرمد صاحب نے کیپٹن خان کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی۔

''سرمد صاحب، مجھے ریٹائرڈ ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ اب میں ریٹائرڈ کیپٹن ہوں۔'' کیپٹن خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سدرہ کی بے ہوشی کے دوران اُن کا ہلکا سا تعارف ہو چکا تھا۔

''ہماری دعوت پھر بھی موجود رہے گی۔ بے شک آپ ریٹائرڈ ہیں اور ہاں ہم آپ کو کیپٹن ہی کہیں گے یا پھر خان صاحب کہہ لیں گے۔'' سرمد صاحب نے کیپٹن خان کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیپٹن کی جیکٹ کے دائیں ابھار سے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ ان کے بغلی ہولسٹر میں پستول موجود ہے۔ سرمد صاحب نے بھی یہ بات محسوس کی لیکن وہ اس لیے مطمئن تھے کہ آرمی کے حاضر سروس لوگ ہوں یا ریٹائرڈ وہ اپنی حفاظت یا شوق کی خاطر چھوٹا موٹا ہتھیار ضرور ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ ان کے لیے ایک عام سی بات ہوتی ہے۔

''ٹھیک ہے سرمد صاحب، جیسے آپ مناسب سمجھیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

وہ کیمپ کے بالکل سامنے ہی تھے اس لیے چند لمحوں میں وہ وہاں پہنچ گئے۔ سرمد صاحب نے کیپٹن خان اور ان کی اہلیہ کو کرسیاں پیش کیں جبکہ حسن کھلی جگہ دیکھ کر دوبارہ فٹ بال کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ مریم اور سدرہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کیپٹن خان کو اب چائے یا کم از کم کافی ضرور پلانی پڑے گی۔ اب ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہی کافی بنانی تھی کیونکہ باورچی خالد تو کھوجی پارٹی کے ساتھ عاصم کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔

وہ دونوں بس کی طرف چلی گئیں جہاں کھانے پینے کے سامان کے ساتھ گیس سلنڈر اور برتن موجود تھے۔ کل رات کے کھانے کے بعد خالد نے سارے برتن چشمے کے پانی سے دھو کر دوبارہ بس میں رکھ دیے تھے۔ کیونکہ خیموں میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ کھانے کا سامان اور برتن الگ سے رکھے جاتے۔ وہ ابھی کیتلی اور سلنڈر نکال کر باہر لائی ہی تھیں کہ ان کو سامنے سے خالد آتا ہوا دکھائی دیا۔ انہیں خوشگوار حیرت ہوئی...... کیونکہ کچن کے کام ان دونوں کے لیے کوئی معرکہ سر کرنے سے کم نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے فوراً خالد کو اپنی طرف بلایا۔ ورنہ وہ شاید پہلے سرمد صاحب کی طرف جاتا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم عاصم کی تلاش میں نہیں گئے تھے؟'' مریم نے خالد سے پوچھا۔

''جی میں یہی بتانے سرمد صاحب کے پاس جا رہا تھا۔''

''کیا وہ مل گیا؟'' سدرہ اچانک بولی۔

''جی نہیں، یہی تو مسئلہ ہے۔ اس لیے سرمد صاحب کو اطلاع دینی ہے۔'' خالد نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''اچھا پہلے یہ چار پانچ کپ چائے یا کافی بنا دو پلیز...... وہ سرمد صاحب نے کسی کیپٹن صاحب کو مہمان بنا لیا ہے۔'' مریم نے جلدی سے کہا

''ہیں جی...! کیپٹن؟ یہ کہاں سے آ گئے اور کون سے کیپٹن ہیں یہ؟'' خالد نے گھبرا کر پوچھا۔

''جو بھی ہیں اس کو چھوڑو...... بس تم کافی بنا دو...... اور زیادہ ڈرنے کی ضرورت نہیں وہ ریٹائرڈ ہیں۔ اس لیے جیسی بھی کافی بنے گی وہ پی لیں گے آرام سے۔'' مریم نے گویا اسے تسلی دی۔

''جی بہتر...... جیسا آپ کہیں۔'' خالد مطمئن دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ دونوں بھی خوش ہو گئی تھیں کہ کافی بنانے سے جان چھوٹی۔

بس چونکہ خیموں سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی اس لیے سرمد صاحب کو فوری طور پر یہ پتا نہ لگ سکا کہ خطرے کی واپسی ہو گئی ہے۔ خالد نے کافی تیار کی اور پانچ کپ بھر دیے۔ تین کپ سرمد صاحب، کیپٹن خان اور ان کی اہلیہ عائزہ کے لیے جبکہ دو کپ سدرہ اور مریم کے لیے بھی بنا دیے تھے۔

مریم خود ہی ایک ٹرے میں کپ لے کر مہمانوں کی طرف چلی گئی۔ سرمد صاحب نے اسے آتے دیکھ کر تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔

''پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے، کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' مریم نے آتے آتے سرمد صاحب کی اتنی سی بات سنی۔ وہ یقینی طور پر کیپٹن خان کو عاصم کے غیاب کا بتا رہے تھے۔

کیپٹن خان کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے جبکہ عائزہ نے فوراً حسن کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہیں یہ بھی نہ کھو جائے۔

''سر کافی۔'' مریم نے ان کے درمیان پہنچتے ہی کہا۔

''شکریہ سرمد صاحب...... آپ نے ایسے ہی بچوں کو تکلیف دی۔'' کیپٹن خان اور عائزہ نے کافی کے کپ لیتے ہوئے رواداری میں کہا۔

''نہیں خان صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمیں تو خوشی ہو گی آپ جیسے انسان کی خدمت کر کے جس نے ملک و قوم کی خدمت کو اپنا شعار اور پیشہ بنایا تھا......'' اس دفعہ سرمد صاحب نے کیپٹن نہیں کہا تھا۔

مریم اور سدرہ کے کپ سدرہ کے پاس ہی تھے جو بس کے قریب بیٹھی تھی۔ جبکہ خالد زمین پر بیٹھ کر جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر انہیں مریم واپس آتی دکھائی دی۔ آتے ہی دونوں نے کافی کے کپ اٹھائے اور پینے لگیں۔

''اچھا اب بتاؤ تم کیا کہہ رہے تھے؟ اور تم اکیلے یہاں کیسے آ گئے۔ تمہیں تو باقی لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔'' مریم نے خالد سے اس کی موجودگی پر استفسار کیا۔

''جی مجھے ان لوگوں نے ہی اِدھر بھیجا تھا کہ آپ لوگوں کو اطلاع دے دوں کہ عاصم کا ابھی کوئی پتا نہیں لگا۔''

''لیکن یہ بات تو تم لوگ موبائل پر بھی بتا سکتے تھے۔ اس کے لیے تمہیں یہاں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔'' سدرہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، اسے یہ بات کچھ ہضم نہیں ہوئی تھی۔

''ہاں جی لیکن ندیم صاحب کو لگا مجھے خود جانا چاہیے اور یہاں کی خیر خبر بھی لینی چاہیے۔'' خالد نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''فضول باتیں کر رہے ہو۔ چلو سرمد صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ ان کو ہی بتانا کہ یہاں کیا لینے آئے ہو۔'' مریم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

ان دونوں نے اسی دوران کافی کے کپ ختم کر دیے تھے۔ وہ تینوں اٹھ کر سرمد صاحب کی جانب چل دیے۔ خالد سر جھکائے چل رہا تھا۔ اور ساتھ ہی بار بار مڑ کر جنگل کی طرف دیکھنے لگتا۔ یہ بات سدرہ کو بہت ڈسٹرب کر رہی تھی مگر اس نے مریم کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

سرمد صاحب نے دور سے مریم اور سدرہ کے ساتھ ساتھ خالد کو آتے دیکھا تو اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو لگا جیسے وہ عاصم کے بارے میں کوئی خبر لے کر آیا ہے۔

سرمد صاحب کی تقلید میں کیپٹن خان اور ان کی اہلیہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''خالد، تم یہاں؟ کیا عاصم کا کوئی پتا چلا؟'' انہوں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ سرمد صاحب کو بہت زور سے چکر آیا تھا۔

کیپٹن خان نے ان کو سہارا دیتے ہوئے کہا ''آپ ٹھیک تو ہیں سرمد صاحب؟''

مگر ساتھ ہی مریم، سدرہ اور ان کی اہلیہ بھی اپنا سر پکڑے ہوئے نیچے بیٹھتی گئیں۔ کیپٹن خان نے مڑ کر دیکھا تو ان کو اپنا سر بھی گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کیپٹن کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ انہوں نے اپنے بغلی ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے کہ ان کا ہاتھ اپنے پستول تک پہنچتا، وہ خود بھی دھڑام سے نیچے گر گئے۔ اور ان کے ساتھ ہی سرمد صاحب زمین پر آ رہے۔

خالد نے مسکراتے ہوئے سب کو زمین پر پڑے ہوئے دیکھا پھر اس نے جنگل کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ ہلائے۔ چند ہی لمحوں میں گھنے جنگل سے رجب آتا دکھائی دیا۔

☆☆☆

سب سے پہلے زاہد خان کو ہوش آیا تھا۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے لیٹا چھت کو گھورتا رہا پھر جیسے اچانک خیال آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے گہری نظروں سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ کسی زیرِ زمین قید خانے میں بند تھا۔ یہ ایک مربع شکل کا کمرا تھا جس میں لوہے کا ایک مضبوط دروازہ نظر آ رہا تھا۔ پورے کمرے پر بیش قیمت اور آرام دہ قالین تھا۔ وہ کمرا چاروں طرف سے بند تھا جس میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا لیکن پھر بھی گھٹن یا اندھیرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ وہ ایک ہوادار اور روشن کمرے میں موجود تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں چار ضرب چار فٹ کا شیشے اور ایلومینیم کا کیبن بنا ہوا تھا۔ وہ باتھ روم تھا جس میں کموڈ لگا ہوا تھا۔ زاہد خان نے روشنی اور ہوا کے مخرج کو اپنے طور پر تلاش کرنے کی کوشش کی تاکہ فرار کی کوئی صورت نکل سکے مگر اسے صرف اتنی ہی کامیابی ملی کہ وہ یہ جان سکا کہ روشنی اور ہوا چھت کی طرف سے ہی کہیں آ رہی ہے اور اس کا ایک مخرج نہیں ہے۔ دوسرا انکشاف اس پر یہ ہوا کہ وہ اپنی طاقت اور ذہانت کے بل بوتے پر یہاں سے نہیں نکل سکتا اور نہ ہی باہر سے کسی کو مدد کے لیے بلا سکتا ہے کیونکہ اس کے لباس میں جو موبائل فون تھا۔ وہ ابھی موجود نہیں تھا بلکہ اس کا لباس بھی تبدیل ہوا تھا۔ یہ اس کے لیے بڑی شرم کی بات تھی کہ اس کی بے ہوشی کے دوران اسے بے لباس کر کے کسی اور نے لباس پہنایا تھا۔ یہ ساری صورتِ حال دیکھ کر زاہد خان کے اندر بقا کی شدید ترین خواہش ابھری اور اس نے غیر ارادی طور پر کہا۔

''کوئی ہے یہاں؟ یار ہم کو اِدھر سے نکالو بھائی جان۔ ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔''

اس کی آواز اسی کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ اس نے تھوڑی دیر مزید انتظار کیا کہ شاید وہاں کوئی سن گن لینے آئے لیکن وہاں خاموشی تھی۔ اس نے دوبارہ ارادہ کیا ہی تھا آواز دینے کا تو اسے چند آوازیں سنائی دیں۔ وہ کہیں قرب و جوار میں سے ہی آ رہی تھیں، وہ رک کر ان کا ماخذ تلاش کرنے لگا لیکن روشنی اور ہوا کی طرح وہ بھی اسے چھت سے ہی آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر اسے لگا وہ آوازیں اجنبی نہیں ہیں۔ یہ اس کے ساتھی تھے جو اس کے ساتھ ہی

بے ہوش ہوئے تھے۔ اب یقیناً ان کو ہوش آ گیا تھا اور وہ بھی زاہد خان کی طرح کسی اور ذی نفس کی موجودگی جاننے کے لیے شور کر رہے اور آوازیں دے رہے تھے۔ یہ اب تھوڑی حوصلہ افزا صورتِ حال تھی کہ وہ اکیلے نہیں سب ساتھ اور قریب ہیں۔

وقاص کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ اور اس نے بھی اپنے طور پر اس کمرے کا ہر طرح سے معائنہ کر لیا تھا لیکن اسے بھی کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ اسے اپنے کافی قریب سے سجاد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چلّا رہا تھا۔ ''سر ندیم...... کہاں ہیں آپ ..... کوئی ہے یہاں۔ کسی کو میری آواز آ رہی ہے۔'' اس کی آواز میں کرب تھا۔ وقاص کو لگا وہ شاید رو بھی رہا ہے۔ وہ چھوٹے دل کا مالک نہیں تھا لیکن اس عجیب و غریب صورتِ حال سے دل ہار بیٹھا تھا۔ اس نے بھی اپنے طور پر آزادی کے تمام راستے مسدود دیکھ کر ہی اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا۔ وقاص نے اپنی تمام تر بے پروائی اور اکھڑ مزاجی کے باوجود صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کیا اور خود کو ایک بندگلی میں پایا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اسے مسلسل سجاد کی آہ و بکا سنائی دے رہی تھی جو کبھی ندیم صاحب کو کبھی خود وقاص کو آوازیں دینے لگتا۔ اس نے ضروری سمجھا کہ سجاد کو تسلی دی جائے تاکہ وہ مایوسی میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے۔ اس نے چھت کی طرف منہ کیا اور اپنی تمام تر قوت کے ساتھ بولا۔ ''سجاد ہم اِدھر ہی ہیں سب...... تم پریشان نہ ہو...... بس کچھ دیر تک سب کو لے کر واپس کیمپ پر چلتے ہیں۔''

سجاد کو اس عجیب و غریب کمرے میں وقاص کی آواز سن کر کافی راحت محسوس ہوئی لیکن وہ پھر بھی غیر یقینی کا شکار تھا۔

''وقاص یہ ہمیں کس قسم کے کمرے میں رکھا گیا ہے..... اور ہمارے موبائل فون کدھر ہیں؟ اور یہ ہمارے کپڑے کس نے تبدیل کیے ہیں۔ یہ سب ہے کیا مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' سجاد نے ایک ہی سانس میں اتنے زیادہ سوال کر دیے۔

وقاص کو کچھ سمجھ آیا کچھ نہیں، لیکن یہ ضرور سمجھ آ گیا کہ سجاد وضاحتیں مانگ رہا ہے۔ وہ ابھی خود کچھ نہیں جانتا تھا اسے کیا وضاحت دیتا۔ اسے زاہد خان کی بھی ہلکی ہلکی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس کی آواز اس کے مخصوص لہجے کی بنا پر شناخت کر رہا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ کم کم ہی آ رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ زاہد خان کا کمرا ان دونوں کے کمروں سے ذرا فاصلے پر تھا۔ اس نے فی الحال یہی بہتر سمجھا کہ سجاد کو ہی سمجھا بجھا کر خاموش کرے اور یہاں سے نکلنے کے لیے کوئی نئی راہ یا موقع تلاش کرے۔

وقاص نے اسے تو تسلی دے دی تھی مگر خود ابھی تک پریشانی میں مبتلا تھا کہ وہ ظہیر احمد یعنی جیرا کون تھا، پُراسرار جوشن اور حصار میں بیٹھا ایک بندہ...... وہ سب کون تھے اور کہاں ہیں۔ اور ان کے کہنے پر جو مشروب پیا تھا، اس نے انہیں کتنی دیر بے ہوش رکھا۔ کیا سرمد صاحب کو ان کے غیاب کی خبر ہو گئی ہوگی؟ ندیم صاحب اس وقت کہاں ہوں گے، یہ سب سوال وقاص کے دماغ میں گردش کر رہے تھے اور وہ ابھی تک الجھن میں مبتلا تھا۔ اچانک اسے تیز چیخ سنائی دی۔ یہ صدفی صد سجاد کی چیخ تھی، وہ کچھ چلّا کر کہہ رہا تھا...... وقاص نے دھیان لگا کر سجاد کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔

''وقاص میں نے عاصم کو دیکھا تھا۔ وہ ..... وہ ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا..... حصار میں جہاں ہم سب بیٹھے تھے۔ وہ وہیں پر تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔'' سجاد بار بار یہی کہتا جا رہا تھا۔

یہ بات وقاص کے لیے قابلِ ہضم نہیں تھی لیکن سجاد کے لہجے کا یقین اسے شش و پنج میں مبتلا کر رہا تھا اس لیے یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن اگر عاصم ان لوگوں کے پاس ہی حصار میں موجود تھا تو جوشن نے رجب اور خالد کو جنگل کے گھنے حصے کی طرف کیوں بھیجا تھا عاصم کو تلاش کرنے......؟ یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی اس کے دماغ کی بہت سی الجھنیں ختم ہو گئیں۔ یعنی وہ یہاں پر جوشن اور اس کے ساتھی جیرے کی وجہ سے موجود تھے۔ اور یقیناً وہ لوگ پہلے عاصم کو تلاش کر چکے تھے اور اب یہ سب خود بھی ان کے قیدی تھے۔ یہ تمام تر خیالات وقاص کے دماغ میں بڑی تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سجاد کو ہی مخاطب کیا۔

''ہاں مجھے یقین ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن ابھی شور کرنا بند کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو ہمارے لیے کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جائے۔''

اچانک وقاص کو محسوس ہوا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہے۔ بے اختیار اس کے منہ سے ایک بلند چیخ نما چنگھاڑ برآمد ہوئی جو کہ اس کی حیرت اور غصے دونوں کا بیک وقت اظہار تھی۔ وہ ایک گہرے خلا میں گرتا ہوا ایک نرم اور آرام دہ گدے پر آ کر گرا۔ ہاتھ پیر سلامت دیکھ کر اس کو تسلی ہوئی لیکن اپنے سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی

ساری تسلی اور اطمینان ہوا میں اُڑ گیا تھا۔ اس کا خون کنپٹیوں میں ٹکریں مارنے لگا اور اس کی مٹھیاں غصے سے بھینچ گئی تھیں۔

☆☆☆

”چلو سب کو اٹھا کر بس میں لے چلو...... اور یہ خیمے اور باقی سامان بھی بس میں رکھو جلدی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور یہاں آجائے۔“ رجب نے آگے ہی خالد سے کہا۔

”رجب، یہ کوئی کیپٹن ہے آرمی کا۔ مریم بتارہی تھی یہ ریٹائرڈ ہے لیکن ہے تو کیپٹن ہی...... یہ یہاں کیسے آگیا؟“ خالد نے ڈرے ڈرے لہجے میں رجب کو بتایا۔

رجب کے ماتھے پر اُلجھن کے آثار نمودار ہوئے، اس نے موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملایا۔

”جناب ان لوگوں میں کچھ اور بھی مہمان شامل ہو گئے ہیں۔ کوئی ریٹائرڈ کیپٹن اور ان کی فیملی ہے۔ ان کے متعلق کیا حکم ہے؟“

”جی اچھا...... بے شک وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔“

”ایسا ہی ہوگا...... آپ بے فکر رہیں جناب......“

دوسری طرف سے آنے والی ہدایات کے جواب میں رجب کی بس یہی باتیں تھیں جو خالد نے سنی تھیں۔

”کیا بات ہے؟ کیا کہا انہوں نے؟“ خالد نے بے تابی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں، کیپٹن صاحب بن بلائے مہمان نہیں ہیں۔ بلکہ وہ متوقع مہمان تھے اس لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں...... یہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی مرکز جائیں گے۔“ رجب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا واقعی...... یقین نہیں ہوتا...... واقعی مرکز بہت باخبر ہے۔“ خالد نے عقیدت سے کہا۔

”اچھا مجھے یہ بتاؤ تم نے اتنی آسانی سے سب کو کیسے بے ہوش کر دیا۔ ہم تو بے ہوشی کے بے آواز انجکشن فائر کرنے والے تھے لیکن تم نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود جنگل سے باہر نکل گئے اکیلے...... یہ سب کیا ماجرا تھا؟“ رجب نے خالد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ اپنا کام بھی کرتے جارہے تھے۔ یعنی خیموں کو اکھاڑ کر پیک کر رہے تھے، اور ایک ایک کر کے تمام بے ہوش ہونے والوں کو بس میں لے کر جارہے تھے۔

”بس اپنا دماغ ہے نا ایک دم گھوڑے کی طرح دوڑتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کو دونوں لڑکیاں بس سے سلنڈر اور کیتلی نکال رہی ہیں تو اس کا مطلب تھا وہ کافی یا چائے بنانے والی ہیں۔ دوسرا ان کے چہروں سے لگ رہا تھا یہ ان کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں۔ اور اگر ہوتی بھی تو میں جا کر ان کو روک لیتا کہ میرے ہوتے ہوئے آپ کیوں چائے یا کافی بنائیں گی۔ کیونکہ میں تو پیشہ ور باورچی تھا۔ لیکن میری قسمت اچھی انہوں نے خود ہی مجھے کافی بنانے کا کہہ دیا۔ میرے لیے آسانی ہوگئی۔ اس لیے میرے پاس انجکشن کے علاوہ ہنگامی طور پر استعمال کرنے کے لیے بے ذائقہ اور بے رنگ گولیاں موجود تھیں جو مجھے پہلے ہی فراہم کر دی گئی تھیں کیونکہ باورچی ہونے کی وجہ سے میرے لیے یہ بہت آسان تھا کہ کھانے یا چائے میں ان کو ملا دیتا۔ پھر سب کے سب ہی پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر خود گر گئے۔“ خالد نے ہنستے ہوئے کہا۔

انہوں نے کیپٹن کو اٹھایا تو کیپٹن کا ہاتھ اپنے بغلی ہولسٹر کی طرف مڑا ہوا تھا...... انہوں نے کیپٹن کی جامہ تلاشی لی اور پستول کے ساتھ ان کی جیب میں موجود نقدی، والٹ اور دوسری اشیا بھی اپنے قبضے میں لے لیں...... وہ کیپٹن سے بے ہوشی کے باوجود خائف تھے۔ کیونکہ کیپٹن کے سوا یہاں کسی سے اتنی امید نہیں تھی کہ وہ کوئی مسئلہ کھڑا کر سکے گا، ان دونوں کے لیے۔ باتوں کے دوران ان کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ انہوں نے تنقیدی نظر سے جگہ کا جائزہ لیا۔ وہ وہاں کوئی ایسی چیز یا ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتے تھے کہ کوئی یہاں ہونے والی کارروائی کے متعلق جان سکے۔ باقی خیموں کے نشانات اور خشک پھلوں کے چھلکے وغیرہ یہ عام سی چیزیں تھیں کیونکہ یہاں اکثر و بیشتر آتے جاتے ہوئے لوگ رکتے تھے اور کیمپنگ بھی کرتے تھے۔ رجب نے بس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ جبکہ خالد پیچھے سوار ہو گیا۔ انہوں نے مرکزی شاہراہ کی طرف جانے کے بجائے گھنے جنگل کی طرف بس کو گھما دیا۔

رجب بس کو جس طرح چلا رہا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ وہ اس راستے کو بخوبی جانتا ہے اور اسے اپنی منزل کا علم ہے۔ وہ دونوں اطمینان سے باتیں کرتے ہوئے مرکز کی طرف جارہے تھے۔ کیونکہ انہیں آخری حکم یہی ملا تھا۔

☆☆☆

کیپٹن خان نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ وہ اس بے داغ سفید بستر کو دیکھنے لگے جس پر شکنوں کا جال ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کافی دیر اس بستر پر خود فراموشی کا وقت گزار چکے ہیں۔ ان کا دماغ فوری طور پر کام کرنے لگا تھا۔ انہیں ساری صورت حال سمجھ آچکی تھی۔ وہ

یقیناً اغوا کر لیے گئے تھے۔ کیونکہ بے ہوشی سے پہلے سرمد صاحب ان کو اپنے ایک طالب علم ساتھی کے اچانک غیاب کے متعلق بتا رہے تھے۔ لیکن اب وہ خود غائب شدہ لوگوں میں شامل ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر دیکھا جو کسی بھی قسم کی قید یا بندش میں نہیں تھے۔ یہ ایک اچھی اور خوش آئند بات تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا واقعی وہ اس کمرے میں آزاد ہیں یا اس کمرے کے باہر بھی۔ پھر انہیں اپنی بیوی عائزہ اور اپنے بیٹے حسن کا خیال آیا، یہ فطری بات تھی کہ ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے ان کو اپنی سلامتی کی فکر ہوئی۔ جب انہوں نے خود کو فی الحال محفوظ اور تندرست پایا تو فوراً خیال بیوی اور بیٹے کی طرف چلا گیا...... اس کے ساتھ ہی ان کے اندر کا فوجی اور باپ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ ان کے جسم پر ان کا اپنا لباس نہیں تھا۔ یقیناً ان کا پستول بھی ان لوگوں کے قبضے میں تھا۔ کیپٹن خان نے فوری طور پر بستر چھوڑا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا کسی اسپتال کا چھوٹا سا وارڈ لگ رہا تھا۔ دیواروں پر ہلکی ہلکی نمی اور سیلن بتا رہی تھی یہ زیرِ زمین کوئی جگہ ہے۔ سامنے کی طرف ایک دروازہ تھا جو مضبوط اسٹیل کا تھا اسے توڑ کر دوسری طرف جانا دیوانے کا خواب ہی تھا۔ کیپٹن کو قطعی امید نہیں تھی کہ دروازہ مقفل نہیں ہوگا لیکن پھر بھی انہوں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر گھمایا۔ دروازہ حسبِ توقع مقفل ہی تھا۔ کیپٹن نے اپنے بیڈ کا جائزہ لیا شاید پاس کوئی ایسی چیز یا بٹن ہو جس سے وہ کسی کو اپنی موجودگی کی خبر دے سکیں یا اپنے پاس بلا سکیں لیکن وہاں بستر کی سفید چادر ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ انہوں نے دروازے کو بجانا شروع کر دیا۔

دروازہ دھڑا دھڑ بجانے کی وجہ سے وہاں شورِ قیامت بپا ہو گیا تھا مگر وہاں جیسے کوئی ذی نفس موجود ہی نہیں تھا جو اُن کی آواز سنتا یا دروازے پر ہونے والی قوت آزمائی کو روکنے آجاتا۔ آخر کیپٹن تھک کر واپس بستر پر بیٹھ گئے اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگے۔

چند مزید لمحے اسی بے یقینی میں گزر گئے۔ پھر اچانک اسٹیل کے دروازے پر کوئی آہٹ ہوئی۔ کیپٹن نے آنے والے لمحات کے لیے خود کو اعصابی طور پر تیار کیا۔

دروازہ کھلا اور دو قوی الجثہ باڈی گارڈز اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں خودکار رائفلیں تھیں اور وہ کسی بھی وقت مرنے اور مارنے کے لیے تیار نظر آرہے تھے۔ کیپٹن نے ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں رحم نام کی کوئی شے نہیں تھی، وہ یقیناً سفاک قاتل تھے۔ کیپٹن انہیں نظروں میں تولنے کے بعد یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ خالی ہاتھ بھی انتہائی خطرناک فائٹر ہوں گے چہ جائیکہ ان کے ہاتھ میں خوفناک گنز تھما دی گئی تھیں۔ ان دونوں عفریتوں کے پیچھے نفیس تراش کے سفاری سوٹ میں ملبوس ایک رعب دار اور میانہ قد کا...... آدمی اندر داخل ہوا اور کیپٹن خان کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”کیپٹن خان، کیسے ہیں آپ؟ یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ کو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

”جی نہیں کوئی تکلیف نہیں، صرف ہوا خوری کرنے باہر جانا چاہتا ہوں اور اپنی بیوی اور بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں۔“ کیپٹن نے گہری چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ تاکہ اندازہ ہو سکے وہ یہاں کس حیثیت سے موجود تھا۔ قیدی، معزز قیدی یا کوئی خاص مہمان۔

”جی ضرور آپ کو ہوا خوری کے لیے باہر جانے سے کوئی نہیں روکے گا۔ ویسے بھی یہاں سب کمرے پہلے سے ہی ہوادار ہیں۔ یہ ہم نے اپنے مہمانوں کی سہولت کے لیے بنائے ہوئے ہیں۔ آپ کی اہلیہ اور بیٹا دونوں محفوظ اور اچھی دیکھ بھال میں ہیں۔ ان کی طرف سے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”یعنی میں مہمان ہوں آپ کا؟ ویسے میں جان سکتا ہوں میں اس وقت کس سے مخاطب ہوں اور کس سلسلے میں آپ کے اس ’عظیم الشان‘ مہمان خانے میں موجود ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں؟“

”میرا نام یامین ہے۔ میں اس عمارت یعنی مرکز کا منتظم ہوں۔ آپ کو جلد ہی یہاں لانے کا مقصد بتا دیا جائے گا۔ فی الحال میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کہیں پریشانی یا مایوسی میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لیں۔ آپ ہمارے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ اور ابھی آپ سے...... کافی کام ہیں جو ہمیں لینے ہیں اس لیے آپ اپنی طاقت اور ذہانت دونوں کو بچا کر رکھیں اور انہیں دروازے پر استعمال مت کریں۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کا انتظار جلد ختم ہو جائے گا، بے فکر رہیں۔“ یامین نے بظاہر مہذب لہجے میں کہا مگر اس میں بلا کی کاٹ تھی۔ وہ دبے لفظوں میں کیپٹن کو وارننگ دے گیا تھا کہ وہ کسی صورت یہاں محاذ آرائی سے باز رہے۔

کیپٹن اب کسی حد تک پُرسکون ہو گئے تھے۔ ایک تو

عائزہ اور حسن کی خیریت کا پتا لگ گیا۔ دوسرا یہ کہ کیپٹن خان کو غلط فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں لایا گیا تھا۔ اور جب تک مقصد سامنے نہ رکھا جاتا کیپٹن اور ان کی فیملی محفوظ تھی۔ کیپٹن کا الجھا ہوا دماغ پُرسکون ہو گیا اور وہ بہتر طور پر سوچنے لگے۔ اب اطمینان سے کوئی لائحہ عمل سوچا جا سکتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ کیپٹن فورس سے ریٹائرڈ ہو گئے تھے لیکن یہ ان کا کور تھا۔ ورنہ وہ ایک وفاقی ایجنسی کے انسانی اسمگلنگ اور اینٹی نارکوٹک شعبے کے سربراہ بنا دیے گئے تھے۔ وہ کاروبار کی آڑ میں ٹرانسپورٹرز کے بہت نزدیک آ گئے تھے۔ وہاں سے اچھی خبریں اور مفید معلومات کا حصول بہت آسان تھا۔ کیپٹن خان پچھلے ایک سال سے یہ کور بہت خوبصورتی سے جاری رکھے ہوئے تھے اور بہت سے منشیات فروشوں اور بردہ فروشوں کے خلاف کامیاب کارروائیاں کی تھیں...... اب وہ اس گروپ کے پیچھے بھی ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے جسے مرکز والے اپنے طور پر ہینڈل کر رہے تھے...... یونیورسٹی میں دو لڑکیوں کی خودکشی کو پولیس نے ایک عام کیس کے طور پر لیا تھا لیکن کیپٹن خان اور ان کی ایجنسی نے بہت دور تک اس کیس کی اسٹڈی کی تھی۔ اس لیے وہ کچھ لوگوں کے خلاف سرگرم ہو گئے تھے اور اپنے طور پر معلومات حاصل کر رہے تھے۔

☆☆☆

وقاص مارے حیرت کے گنگ ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے شیشے کے ایک کمرے میں سدرہ، مریم اور ان کے ساتھ ایک اجنبی عورت موجود تھی جو کہ کیپٹن خان کی اہلیہ عائزہ تھی مگر وقاص کے لیے وہ ہنوز اجنبی ہی تھی۔ عائزہ کے ساتھ ہی حسن بھی موجود تھا۔ وہ تینوں الگ الگ آرام دہ بستروں پر موجود تھیں۔ حسن اپنی ماں کے ساتھ ہی بیڈ پر موجود تھا اور وہ تینوں ہی نیند میں لگ رہی تھیں۔ لیکن وقاص جانتا تھا کہ وہ نیند میں نہیں بلکہ بے ہوشی کے عالم میں ہیں۔ ایک بات کافی حوصلہ افزا تھی کہ ان کے جسموں پر وہی لباس تھا جو وہ ہیں کیمپ سے نکلنے سے پہلے دیکھ چکا تھا۔ ہاں البتہ عائزہ کے لباس کے متعلق وہ کچھ نہ جانتا تھا نہ کہہ سکتا تھا۔ ایک عدد خاتون نرس بھی اسے کمرے میں دکھائی دی تھی۔ جس نے سفید رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور وہ باری باری تینوں کا چیک اپ کر رہی تھی۔

وقاص کا خون جوش مارنے لگا تھا۔ وہ ان دونوں لڑکیوں خصوصاً سدرہ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا... فی الحال تو وہ محفوظ لگ رہی تھیں۔ لیکن آگے کب تک محفوظ رہتیں یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ جس جگہ فرش پر گرا تھا وہاں موٹا اور نرم میٹریس موجود تھا۔ اس لیے اسے کوئی چوٹ نہیں پہنچی تھی۔ اس کے بالکل سامنے ہی چار پانچ فٹ کی دوری پر وہ شیشے کی دیوار موجود تھی جس کے دوسری طرف وہ موجود تھیں۔ وقاص نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے دیوار کی طرف رخ کیا۔ لیکن دو قدم اٹھاتے ہی اسے چونک کر رکنا پڑا...... اسے کمرے میں آواز سنائی دی۔

''اگر تم دیوار کی طرف گئے یا اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی تو دیوار کی دوسری طرف والی تمام خواتین کی زندگی اور عزت داؤ پر لگ جائے گی۔ حالانکہ تم چاہ کر بھی ان کو اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلا سکتے۔ وہ ہوش و حواس سے عاری ہیں۔ اور ہوش میں آنے کے بعد بھی دیوار کے اس طرف کچھ دیکھنے یا سننے کے قابل نہیں ہوں گی۔ مگر تمہاری کوشش ہی ان کے لیے کافی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔''

''کون ہو تم...... ہم سب کو یہاں کس مقصد کے لیے لائے ہو...... سامنے آ کر بات کرو مائے خاں۔'' وقاص نے غصے اور بے بسی سے کہا۔

''صبر کرو دوست، جلد ہی تمہارا انتظار ختم ہو جائے گا۔ یہ صرف تمہیں اس لیے دکھایا گیا ہے کہ تم اپنی حد میں رہو کیونکہ ہم جانتے ہیں یہاں آنے والوں میں تم کو ہی سب سے زیادہ کچھ کرنے کی کھجلی ہو رہی ہوگی یا ایک اُس کریک فوجی کو۔'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

وقاص فوجی کا سن کر اُلجھ گیا۔ یعنی کوئی اور بھی تھا جو اُن کے ساتھ یہاں تک لایا گیا ہے۔ اور غالباً یہ تیسری خاتون جو شیشے کی دوسری طرف تھی اس کا تعلق اسی فوجی سے تھا۔ وقاص نے اپنے طور پر اندازہ لگاتے ہوئے سوچا۔

''کیا میں اپنے باقی ساتھیوں کے پاس جا سکتا ہوں۔'' ایک فوری خیال کے تحت وقاص نے سوال کیا......

''نہیں، وہ بھی عنقریب تمہارے ساتھ یہیں اس کمرے میں موجود ہوں گے۔'' اس کی بات کو سختی سے رد کر دیا گیا۔

وقاص فی الحال منہ بسورنے اور انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لیے وہ خاموشی سے اسی نرم گدے پر بیٹھ گیا۔ مگر اس کا ذہن ابھی یہاں سے فرار اور ان لوگوں کے اصل مقاصد جاننے کے لیے بے چین تھا۔ دوسرا جب سے اس نے سدرہ کو دیکھا تھا اس کا دماغ ویسے ہی گھوم گیا تھا۔ شاید یہ صرف سدرہ جانتی تھی یا وقاص کہ وہ سدرہ کو بے

انتہا چاہتا ہے۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھا کہ شیشے کی دوسری طرف اس نے مریم اور سدرہ کو کسمساتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بے چینی سے شیشے کی طرف جانا چاہا لیکن پھر اسی دھمکی کی وجہ سے اس کے قدم پتھر کے ہو گئے۔ وہ دور کھڑا ہو کر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ مریم اور سدرہ نے حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ان کے پاس تیسرے بیڈ پر موجود عائزہ نے بھی آنکھیں کھولنا شروع کر دیں۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر یقیناً ختم ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سدرہ یا مریم کچھ کہتی یا کوئی اور کام کرتی، دروازہ کھلا اور وہی سفید کپڑوں میں ملبوس نرس اندر آتی دکھائی دی۔ اس کمرے کی طرح اس کمرے میں کیمروں کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وقاص بہت توجہ سے وہ سارے مناظر اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ شیشے کی دوسری طرف والوں کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اس طرف وقاص موجود ہے۔ اس لیے وہ آنے والی نرس سے سوال و جواب کرنے لگیں۔ وقاص صرف اندازے کی بنا پر ہی سوچ رہا تھا کہ وہاں کیا گفتگو چل رہی ہوگی۔ انہی باتوں میں حسن جو کہ عائزہ کے ساتھ ہی لیٹا ہوا تھا، جاگ گیا۔ اور خود کو اجنبی ماحول اور لوگوں میں دیکھ کر رونے لگا۔ عائزہ اسے چپ کرانے کے لیے آگے بڑھی۔ نرس نے صورتِ حال بھانپتے ہی داخلی دروازے کی طرف جست سی لگائی اور کمرا اس کے وجود سے خالی ہو گیا۔

☆☆☆

سب لوگ ایک کمرے میں جمع تھے۔ یہ کانفرنس ہال سے مشابہ ایک طویل کمرا تھا۔ جس کے درمیان ایک لمبی لکڑی کی میز تھی جس کے دونوں طرف کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کی دیوار پر پروجیکٹر کی مدد سے ایک لیپ ٹاپ کی اسکرین کو پروجیکٹ کر کے اسکرین پر دیکھا جا رہا تھا۔ یہ لیپ ٹاپ وائرلیس نیٹ ورک کے ذریعے سے پوری بلڈنگ کے نیٹ ورک سے جڑا ہوا تھا۔ اس لیے وہ اس کانفرنس روم میں بیٹھے ہوئے اس بلڈنگ میں موجود ہر کیمرے کا منظر اس اسکرین پر دیکھ سکتے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں یامین نے وقاص سے بات کی تھی جب وہ شیشے کی دیوار کے دوسری طرف لڑکیوں کو دیکھ کر اُدھر جانے ہی والا تھا کہ یامین نے اسے ٹوک دیا تھا۔ اسی طرح لڑکیوں کے کمرے کا منظر، کیپٹن خان کے کمرے کا منظر اور دوسرے ان کے ساتھ قید ساتھیوں کو وہ ہر وقت مانیٹر کر رہے تھے۔

''سر یہ ہے وہ لڑکا...... جس کے متعلق ہم...... بات کر رہے تھے۔'' یامین نے وقاص کے کمرے کو مرکزی اسکرین پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے یہ کسی دوسری پارٹی کے لیے کام کر رہا ہے یا کسی سرکاری ایجنسی کے لیے؟'' ان کے سربراہ نے سوال کیا۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں روشنی انتہائی کم تھی۔ اس کی پُراسرار شخصیت اور شکل سے یہاں کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ یہاں تک کہ یامین نے بھی باس کو نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ اسے باس کا دستِ راست سمجھا جاتا تھا۔

''سر اس کی سرگرمیاں انتہائی مشکوک ہیں اور یہ ہمیشہ ہمارے لوگوں کے ساتھ ہی اُلجھا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے یونیورسٹی میں موجود کوآرڈینیٹر سے بھی اُلجھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے متعلق ہماری آرگنائزیشن کے لوگ بھی ٹھیک سے نہیں جانتے لیکن یہ ان تک بھی پہنچ گیا اس لیے ہمیں تو یقین ہے کہ یہ کسی سرکاری ایجنسی سے وابستہ ہے اور ایک انڈر کور ایجنٹ ہے۔'' یامین ایک ثانیے کو رکا اور پھر گویا ہوا۔

''اسے سرکاری ایجنسی کے حصارِ شک میں لانے کی اصل وجہ یہی ہے کہ ابھی تک اسے کسی قسم کے مال کی ترسیل کرتے ہوئے یا بیچتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، نہ ہی خود وہ کسی ایسے گروپ کا ممبر ہے جو ''مال'' استعمال کرتے یا اس کی ترسیل کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ یہ انتہائی چالاک اور مکار لڑکا ہے...... اسی لیے ابھی تک ہم اس کے متعلق کوئی ٹھوس شواہد حاصل نہیں کر سکے لیکن حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو اس کی روشنی میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کوئی سرکاری جاسوس ہے۔''

یامین کے بات ختم کرنے پر وہاں ایک گمبھیر خاموشی چھا گئی تھی۔ سب منتظر تھے کہ ان کا سربراہ کوئی بات کہے یا نیا لائحہ عمل دے مگر وہ بالکل خاموش تھا۔

پھر جیسے اچانک برق کوندی۔ اس انتہائی کم درجۂ حرارت والے کمرے میں بھی سب نے اپنی ہتھیلیوں میں پسینہ محسوس کیا۔

اس کا مخاطب صرف یامین تھا۔ ''مجھے لگتا تھا میں نے ذہین لوگوں کو اپنے اس منصوبے کا حصہ بنایا ہے لیکن تم تو انتہائی چغد نکلے۔ تم ابھی تک یہ ہی طے نہیں کر سکے کہ یہ لڑکا کون ہے تو آگے کی کیا منصوبہ بندی کرتے۔ اگر یہ کسی سرکاری ایجنسی کا اہلکار ہے تو اس کا پتا کرنے میں ایک دن بھی نہیں لگتا۔''

یامین نے ڈرتے ہوئے کہا ''میں آج ہی اس کی

تصدیق کرواتا ہوں باس۔‘‘

’’اگر میں تم لوگوں پر ایسے معاملات چھوڑ دوں تو میں کل ہی اپنا سب کچھ سمیٹ کر یہاں سے چلتا پھرتا نظر آؤں، میں نے خود کر لی ہے تصدیق...... یہ کسی سرکاری ایجنسی کا بندہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی اور گروپ کا۔ تم نے بلاوجہ یہاں میلہ لگا لیا ہے۔ میرے کام کا صرف ایک ہی بندہ تھا کیپٹن خان۔‘‘ باس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

’’باس ہم کو اس لڑکے کی مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع ملی تھی۔ ان کو ہی اس پر شک تھا اس لیے ہم کو اسے بھی یہاں لانا پڑا۔‘‘

’’اچھا اس پر تو شک تھا...... اور وہ دو لڑکیاں اور باقی لوگ...... وہ کس کھاتے میں یہاں لے آئے ہو۔ تم کو لگتا ہے اب ان کو زندہ واپس بھیجنے کی غلطی ہم کر سکتے ہیں۔‘‘ باس نے رعونت بھرے لہجے میں یامین کو پھر ڈانٹ دیا۔

باقی لوگ وہاں ایسے بیٹھے تھے جیسے موجود ہی نہیں۔ ان کے وجود میں کھلبلی مچی ہوئی تھی اور ان کو یہی لگ رہا تھا کسی بھی وقت باس کے غضب کا نشانہ وہ لوگ بھی بن سکتے ہیں۔ کیونکہ ان لڑکیوں سمیت باقی لوگوں کو یہاں لانے میں یامین کے بجائے یہاں بیٹھے ہوئے دوسرے شخص کی رضامندی موجود تھی۔ اس لیے فی الحال وہ سب سے زیادہ نروس تھا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ یامین نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ’’باس باقی لوگوں کو یہاں لانے میں میرا نہیں بلکہ اس کا فیصلہ شامل تھا۔ اس لیے بہتر ہوگا اس بات کا جواب آپ اسی سے طلب کریں۔‘‘

’’کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟ تم لوگوں کو میں نے برابر کے اختیارات دیے تھے تاکہ تم آزادانہ کام کر سکو نہ کہ میرے ہی منصوبے کو داؤ پر لگا دو۔ ان لوگوں کو یہاں لانے کا مقصد بتاؤ۔‘‘

باس نے سب سے آخر والی کرسی پر موجود ایک نوجوان سے کہا جو کہ عاصم کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

’’باس میں آپ کو بتاتا ہوں ان کو یہاں لانے کی کیا وجہ تھی۔‘‘ عاصم نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

سدرہ اور مریم دونوں ہی بہت خوفزدہ تھیں۔ اُن کے ساتھ عائزہ کا بھی یہی حال تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ یہاں آئی نرس سے غصے میں سوال کر رہی تھیں کہ وہ کہاں ہیں اور انہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ لیکن نرس کمالِ مہارت سے صرف ایک ہی بات کہہ رہی تھی ’’میں آپ کی دیکھ بھال کے لیے یہاں موجود ہوں ۔ نہ کسی قسم کی کوئی معلومات مجھے دی گئی ہیں نہ ہی میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں ہوں۔ میں بھی تقریباً آپ جتنی ہی لاعلم ہوں۔‘‘

اسی دوران حسن کو ہوش آگیا تھا اور ہوش میں آتے ہی وہ رونے لگا تھا۔ وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں کہ اسی دوران نرس چپکے سے کمرے سے نکل گئی۔

حسن کو بمشکل دلاسا دے کر وہ اس پیدا ہونے والی صورتِ حال کو اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ حسن نے عائزہ کے ساتھ سدرہ اور مریم کی موجودگی کو ایک خوشگوار طریقے سے لیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ جلد ہی سنبھل چکا تھا لیکن کھوئی کھوئی نظروں سے سارے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

’’آپ کو کیا لگتا ہے ان لوگوں نے ہمیں یہاں کیوں قید کیا ہے؟‘‘ مریم نے پریشانی سے عائزہ کو مخاطب کیا۔ انہوں نے خود کو ذہنی طور پر سمجھا لیا تھا کہ وہ اغوا ہو چکی ہیں۔ مریم کو عاصم کا غیاب بھی اسی سلسلے کی کڑی محسوس ہو رہا تھا۔

عائزہ کو بھی عام بیویوں کی طرح گمان تھا کہ اس کا شوہر کسی ہیرو کی طرح اچانک کہیں سے نمودار ہو کر انہیں آرام سے آزاد کروا کے لے جائے گا۔ لیکن دل میں یہ ڈر بھی بہرحال موجود تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوگا۔ وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ تینوں بیک وقت دروازے کی جانب متوجہ ہوئیں جبکہ حسن بدستور ماں کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ دروازے کی اوٹ سے عائزہ کے لیے ایک اجنبی جبکہ مریم اور سدرہ کے لیے شناسا چہرہ ظاہر ہوا۔ حیرت اور بے یقینی کے تاثر سے اُن دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

☆☆☆

وقاص مسلسل سدرہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اس کی ایک ایک ادا کو شاید اپنی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے قید کر لینا چاہتا تھا پھر وقاص کو محسوس ہوا کہ سدرہ ملول اور افسردہ ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا ضبط جواب دینے لگا۔ وہ سدرہ کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ اور شادابی دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر اداسی اور خوف نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ کسی انتہائی قدم اٹھانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ دروازے کے پیچھے سے اُسے سجاد، زاہد خان، سرمد صاحب اور سرندیم کے چہرے دکھائی دیے۔ ان سب کو بے رحمانہ انداز میں کمرے کے اندر دھکیل دیا گیا تھا۔

وقاص انہیں دیکھتے ہی ڈھیلا پڑ گیا۔ اب سب لوگوں کی موجودگی میں وہ بہتر طور پر سوچ سکتے تھے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ انہیں یہاں لانے کی اصل وجہ کیا ہے۔ سب اپنے طور پر قیاس آرائی کرنے لگے۔

وہ سب اپنے طور پر حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب کے چہروں پر فکر کے سائے تھے۔ لیکن ایک چہرہ ان میں ایسا بھی تھا جس کے چہرے پر وہ سایہ قید کی نہیں بلکہ کسی اور چیز کی وجہ سے تھا اور وہ چہرہ کسی اور کا نہیں بلکہ وقاص کا چہرہ تھا۔

اچانک ان سب کو شیشے کے دوسری طرف والے کمرے کا دروازہ کھلتا دکھائی دیا۔ وہ سب اسی جانب متوجہ ہو گئے۔ دروازے کی اوٹ سے عاصم کا چہرہ نمودار ہوا تو سب نے حیرانی سے دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ اس کے پیچھے وہی...قوی الجثہ دو باڈی گارڈ بھی تھے۔ عاصم بہت مطمئن اور خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اعلیٰ تراش کے کپڑوں سے ظاہر ہو رہا تھا اس کا یہاں ... کافی گہرا تعلق ہے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ سدرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ مریم بے تابی سے عاصم ... کی طرف بھاگی لیکن سدرہ کو اپنی جگہ پر کھڑا دیکھ کر وہ تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ اس نے بھی عاصم کے حلیے پر غور کیا تو اسے بھی شاید سمجھ آگئی کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ عاصم نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ سدرہ کی طرف دیکھا اور اپنے پیچھے کھڑے دونوں باڈی گارڈز کو کچھ کہا۔ انہوں نے پلک جھپکتے ہی سدرہ کو دونوں طرف سے پکڑا اور اٹھا کر کمرے سے باہر لے گئے۔ مریم، عاصم کی طرف دیکھ کر چلا رہی تھی۔ لیکن عائزہ حسن کا سر اپنی گود میں چھپا کر چپ چاپ کھڑی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو اگر اس نے کچھ کہا یا بولی تو وہ حسن یا اس کے ساتھ کچھ غلط نہ کر دیں۔ مائیں اولاد کے معاملے میں اور عورتیں اپنی عزت کے معاملے میں ہمیشہ مجبور ہوتی ہیں۔ وہ ماں بھی تھی اور ایک عورت بھی۔

اس کمرے میں موجود سبھی لوگ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ سب کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتے تھے سدرہ کو یہاں سے کیوں لے جایا گیا لیکن عاصم کے ارادے ہرگز نیک نہیں لگ رہے تھے۔ سب سے بُری اور خطرناک حالت وقاص کی تھی۔ اسے سب سے زیادہ فکر سدرہ کی ہی تھی جس کی وجہ سے وہ یہاں پابند بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار میں موجود شیشے کو ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں...

ساتھ وہ گالیاں ... اور دھمکیاں بھی دے رہا تھا کہ اگر سدرہ کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو وہ یہاں قہر برپا کر دے گا۔

سب لوگ اسے پکڑ کر اور سمجھا بجھا کر دیوار سے ہٹانے لگے۔ سجاد نے ڈرتے ڈرتے کہا ’’وقاص تمہاری وجہ سے مریم اور سدرہ پر کہیں زیادہ بُرا وقت نہ آجائے۔ خدا کے لیے پاگل پن چھوڑ دو۔‘‘

اسی طرح سرندیم اور سرمد صاحب نے بھی اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

خدا خدا کر کے وقاص سب کے کہنے پر شیشے کے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا جس سے آنسو رواں تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کوئی اسے روتا ہوا دیکھے۔ وہ ایسا ہی تھا۔ باقی سب بھی افسردہ اور ملول تھے۔

اچانک کمرے میں وہی آواز گونجی۔ ’’ہیرو صاحب، کافی گرمی ہے آپ کے اندر حالانکہ ...آپ کو منع بھی کیا تھا لیکن شاید آپ کو شرافت کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ سدرہ کو عاصم صاحب کے کہنے پر ایک خوبصورت اور فرنشڈ کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ عاصم کی پسند ہے۔ اس لیے شاید عاصم اسے شادی کی پیشکش کرے گا۔ اس نے مان لیا تو اچھی بات ہے ورنہ اسے شادی کے بغیر ہی حقوقِ زوجیت ادا کرنے پڑیں گے اس لیے تم سب لوگ اپنے جامے میں رہو۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم لوگوں کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اپنی فکر کرو یہاں...... شاباش۔‘‘

سب کی نظریں وقاص کے چہرے کی طرف تھیں...... جو اس وقت غصے کی شدت سے سرخ تھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ اس وقت وہ مارنے اور مرجانے کی حالت میں تھا۔

☆☆☆

عاصم باس کو بتانے لگا کہ اس نے یہاں سب کو کیوں جمع کیا ہے۔

’’ان میں سے ایک لڑکی کو میں ذاتی طور پر بہت پسند کرتا ہوں باس۔ لیکن صرف ایک یہی وجہ نہیں ... بلکہ اس کا باپ ایک اعلیٰ کسٹم آفیسر ہے۔ جبکہ دوسری لڑکی بھی ایک سرکاری افسر کی بیٹی ہے۔ وقاص کو ہم نے یونیورسٹی کے کوآرڈینیٹر کے کہنے پر ہی اس منصوبے کا حصہ بنایا۔ اس کے علاوہ زاہد خان ڈرائیور ہے جو یہاں نوکری کرنے سے پہلے پاکستان اور افغانستان کے درمیان ٹرک چلاتا تھا۔ وہ یہاں کے راستوں سے ایسے واقف ہے جیسے کوئی انسان

اپنے ہاتھ کی لکیروں سے۔ باقی رجب اور خالد تو ہمارے ساتھی ہیں۔ یہ جو پروفیسر ہیں، ان کے متعلق آپ جو بھی حکم دیں گے۔ ہم بجا لائیں گے۔ لڑکیاں تو ویسے بھی جتنی... زیادہ ہوں ہمارے لیے کم ہی ہیں باس۔"

باس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے تنظیم کے حق میں اتنا دوررس منصوبہ بنایا لیکن اگر ہم ان سے مطلوبہ کام نہ لے سکے تو تم کو خود ان سب کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھانا پڑے گا۔ اس سلسلے میں ایک فیصد بھی رعایت دینے کو تیار نہیں ہوں میں۔"

"ایسا ہی ہوگا سر، آپ بے فکر رہیں۔ ہم نے اسی لیے منی بس بھی یہیں منگوا لی ہے۔ ہم اسے ان مسافروں سمیت کھائی میں پھینک دیں گے جو ہمارے لیے غیر ضروری ہوں گے۔ اسے حادثہ سمجھ لیا جائے گا اور ہمارا کام بھی پورا ہو جائے گا۔ صرف ایک گزارش ہے کہ مجھے اس لڑکی کو اپنے کمرے میں لے جانے کی اجازت دی جائے۔" عاصم نے اسکرین پر سدرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اجازت ہے۔ باقی قیدیوں کو بھی اس لڑکے والے کمرے میں بھیج دو اب۔" باس کی گونج دار آواز سنائی دی اور وہ نشست چھوڑ کر عقبی دروازے میں گم ہو گیا۔

عاصم نے فوراً فون پر کسی کو آرڈر دیا کہ تمام قیدیوں کو کمرا نمبر آٹھ میں بھیج دو۔ اس کے بعد اس نے یامین کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا پھر وہ مسکراتا ہوا اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں سدرہ، مریم اور عائزہ کو رکھا گیا تھا۔

یامین کنٹرول روم میں بیٹھا دونوں کمروں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے عاصم کو وہاں سے سدرہ کو لے جاتے ہوئے دیکھا جبکہ مریم کو اس پر چلاتا ہوا دیکھ کر ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ عاصم کو اس حرکت سے منع کر دے لیکن عاصم کو باس کی اجازت حاصل تھی اس لیے اس کی ہر حرکت برداشت کرنا مجبوری تھی۔ اسے اچانک حیرت کا جھٹکا لگا۔ وقاص والے کمرے میں جہاں دیگر قیدی بھیجے گئے تھے، ان میں یونیورسٹی کا کوآرڈینیٹر بھی موجود تھا۔ یعنی ان کا اپنا بندہ قید خانے میں تھا۔ اس نے جلدی سے ہاٹ لائن پر کسی سے رابطہ کیا۔

"ہیلو..... مجھے باس سے بات کرنی ہے۔"

دوسری طرف سے بتایا گیا کہ باس سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں۔ "آپ جو بتانا یا پوچھنا چاہیں، بتا دیں۔ آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔"

"قیدیوں کے درمیان ہمارا ایک اپنا بندہ موجود ہے۔ یونیورسٹی کا کوآرڈینیٹر ..... شاید اُسے غلط فہمی سے قیدیوں میں ڈال دیا گیا ہے۔"

"باس کو اس بات کا بخوبی علم ہے اور وہ کسی مقصد کے تحت ہی ان سب میں شامل ہوا ہے، آپ بے فکر رہیں۔" دوسری طرف سے یہ جواب دینے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

یامین نے گہری سانس لی جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔ عاصم اور دیگر لوگوں کو نہیں پتا تھا کہ ان میں سے کوآرڈینیٹر کون ہے ورنہ وہ ضرور چونک جاتے جیسے یامین چونک گیا تھا۔ کیونکہ باس کے علاوہ صرف یامین کو پتا تھا کہ یونیورسٹی کا کوآرڈینیٹر کون ہے۔ عاصم اور دیگر کو صرف موبائل پر خفیہ پیغامات یا لفافے ہی ملتے تھے اس کی جانب سے لہٰذا ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ مطلوبہ بندہ کون ہے۔ یامین نے دیکھا کہ وقاص غصے میں بے قابو ہو کر شیشے پر لاتیں اور گھونسے برسا رہا ہے۔ اس نے عاصم کو بھی دیکھ لیا تھا اور یہ بھی کہ سدرہ کو... زبردستی یہاں سے لے جایا گیا ہے۔ اس کا غصہ بجا تھا۔ یامین نے چند ثانیے انتظار کے بعد مائک پر اسے مخاطب کر کے وارننگ دے دی تھی کہ دوبارہ ایسی حرکت نہ ہو ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ وہ عاصم صاحب کی پسند ہے اور ہوسکتا ہے وہ اسے شادی کی پیشکش کریں۔ اسی دوران وہاں موجود دوسرے لوگوں نے بھی اسے سمجھا بجھا کر چپ کروا دیا تھا لیکن اسے وقاص کی آنکھوں میں موجود سرخی نے بے چین کر دیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے شروع سے ہی شک تھا کہ یہ سب تمہاری حرکت ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنے گھٹیا اور کمینے نکلو گے۔" کمرے میں آتے ہی سدرہ نے نفرت بھرے لہجے میں عاصم کو لتاڑا۔ اس وقت کمرے میں عاصم اور سدرہ کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ گارڈز سدرہ کو کمرے میں چھوڑ کر واپس اسی جانب چلے گئے تھے جہاں باقی قیدی موجود تھے۔

"اچھا ..... پھر تو تم کافی ذہین نکلیں۔ ویسے میرا انتخاب اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے افسوس رہتا۔" عاصم نے بیڈ پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا ذاتی موبائل اور ایک عدد پستول بھی تھا جو اس نے انتہائی بے فکری سے بیڈ کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ یہ موبائل فون خصوصی طور پر مرکز والوں کی طرف سے عنایت ہوئے تھے۔ جو کہ صرف مرکز کے اندر رہ کر استعمال کیے جا سکتے

تھے۔ ان کو باہر لے جانا کسی بھی ممبر یا رکن کے لیے ممنوع تھا۔

"میں تم جیسے انسان پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ایسے میں ڈر جاؤں گی؟ یہ تمہاری بھول ہے۔"

"بس میری جان! زیادہ نہ اچھلو..... میں تمہیں اپنی بیوی بنانے کا سوچ رہا ہوں..... کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے غصہ دلا کر میری داشتہ بن جاؤ ہمیشہ کے لیے۔"

"میں مر جانا پسند کروں گی لیکن تم سے شادی ہرگز نہیں کروں گی اور نہ ہی تم کو کسی ناپاک ارادے میں کامیاب ہونے دوں گی۔" سدرہ نے کہا لیکن وہ عاصم کے ارادے سن کر اندر تک کانپ گئی تھی۔

"مریں گے تو وہ لوگ جو ہمارے درمیان آ گئے تھے بلاوجہ..... آج میں سب کا حساب بے باق کر دوں گا......"

"تم کیا سمجھتے تھے کہ وقاص کی شرٹ پہن کر ہمارے خیمے میں آؤ گے اور میں وقاص کو قصوروار سمجھ لوں گی۔ اس حرکت کے بعد ہی میرا شک مزید یقین میں بدلتا گیا تھا کہ ان سب چیزوں کے پیچھے تمہارا ہی ہاتھ ہے۔" سدرہ نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔ اگر تم جان گئی تھیں تو تم نے سب کو بتایا کیوں نہیں ..... یا تمہارے دل میں بھی میرے لیے کچھ ہے جو تم نے سب سے پوشیدہ رکھا۔" عاصم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے دل میں تمہارے لیے صرف نفرت ہی تھی لیکن میں وہاں اپنا تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ ویسے بھی میرے پاس کوئی ٹھوس دلیل بھی نہیں تھی۔ کیونکہ تم تو سب کے سامنے بڑے حاجی بنے پھرتے تھے لیکن آج میں نے تمہارا اصلی اور مکروہ چہرہ دیکھ لیا ہے۔ اب تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔"

"وہ سب لوگ جن کو تم بتا کر مجھے کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑو گی..... اگر بچ گئے تو واقعی مجھے ان کے سامنے بڑی شرمندگی ہوگی لیکن مجھے شرمندہ ہونا ذرا پسند نہیں۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ ان میں سے کوئی زندہ نہ بچے۔ اگر کوئی بچ بھی گیا تو وہ ساری عمر ہماری غلامی ہی کرتا رہے گا۔"

سدرہ کو اس کے منصوبے سن کر خوف آ رہا تھا۔ وہ اس قدر سفاک ہوسکتا تھا؟ اس نے کسی وقت میں اس کے لیے دل میں ایک جذبہ محسوس کیا تھا لیکن جلد ہی کسی اور کی چاہت اس پر غالب آ گئی۔ یہ صرف ایک اچھے دوست کی حیثیت سے اس کے ساتھ رابطے میں رہا۔ وہ شاید دوست کی حیثیت سے بھی اس کی طرف مائل نہ ہوتی لیکن اپنی چاہت کے مسلسل نظر انداز کیے جانے پر اس نے یہ انتقامی رویہ اپنایا تھا۔ مگر اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ عاصم اتنا گرا ہوا شخص نکلے گا، اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بیٹی تھی۔ حالات و واقعات اور سیاست سے اس کی گہری دلچسپی نہ سہی لیکن اسے کافی حد تک آگہی ضرور تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس ساری بھاگ دوڑ کا صرف ایک مقصد مجھ سے شادی کرنا تو نہیں ہو سکتا..... یقیناً اس سارے معاملے اور منصوبے کے پیچھے کچھ اور محرکات بھی ہوں گے۔ اس کے والد ایاز قریشی ایک ایماندار کسٹم آفیسر تھے۔ اسی وجہ سے آئے دن کسی نہ کسی بڑے افسر یا سیاست دان کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ اس کے بعد وہ گھر آ کر اپنا دل جلاتے اور افسرانِ بالا کو کوستے تھے۔

سدرہ جانتی تھی بہت سے اعلیٰ افسران، حکومتی عہدہ داران اور صنعت کار اس کے والد کے اندرونِ خانہ دشمن تھے۔ وہ اب اس رخ پر سوچنا شروع ہو گئی تھی کہ اسے اصل معاملات کا کھوج لگانا چاہیے۔ اس نے عاصم کی طرف دیکھا جو مسلسل اس کی طرف دیدے پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں نفرت اور غصے کی ایک لہر اٹھی جو اس نے بمشکل دبائی۔

"باقی سب لوگوں کو یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟ مجھ سے شادی کرنے کے لیے اتنے انتظامات، یہ سمجھ نہیں آتی کہ ایک زیرِ زمین تہ خانہ جس میں کئی کمرے موجود ہیں اور باڈی گارڈز، یہ سب کیا ہے؟ مجھے نہیں لگتا یہ سب مجھ سے شادی کرنے کے انتظامات ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ یہ سب ہماری شادی کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ ایک اور عظیم معاملہ ہے جس کا تمہیں علم نہیں۔ لیکن اب جبکہ تم یہاں سے کبھی واپس نہیں جانے والی تو اچھا نہیں ہوگا تمہیں علم نہ ہو ان ساری باتوں کا۔ زندہ رہنا چاہو گی تو میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ ورنہ تمہیں بھی ہمارے منصوبے کا حصہ بنا دیا جائے گا۔ ہاں لیکن اپنے سارے ارمان پورے کرنے کے بعد۔" عاصم نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے سدرہ کو ایک مختصر سی کہانی سنائی کہ یہ سب اصل میں ہے کیا اور سدرہ بھی سننے کی منتظر تھی۔

☆☆☆

سدرہ کو جو کہانی عاصم نے سنائی، وہ کچھ اس طرح

سے تھی کہ آج سے قریباً ایک سال پہلے یونیورسٹی میں نئی کلاسز شروع ہوئیں تو ایک کلاس میں عاصم اور رجب کے درمیان گہری دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اکثر اوقات اکٹھے دیکھے جاتے اور اکٹھے ہی آتے جاتے تھے۔ حالانکہ عاصم اور رجب دونوں کے گھر مخالف سمتوں میں تھے لیکن وہ اکثر ایک دوسرے کو گھر چھوڑنے کے بعد ہی اپنے گھر جاتے۔ ان دونوں کی بہت سی عادتیں مشترک تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں گاڑھی چھنتی تھی۔ گھر والے ان کی حرکتوں اور عادتوں سے بے خبر تھے کہ یہ دونوں نشے کی لت میں مبتلا ہیں۔ لیکن وہ ابھی عادی نہیں ہوئے تھے صرف ایڈونچر کے طور پر نشہ استعمال کرتے تھے۔ اس لیے ان کی ظاہری حالت سے اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ پھر ایک دن جب وہ کینٹین میں بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے کہ ان کو کینٹین کا باورچی خالد اپنی جانب آتے دکھائی دیا۔

''تم دونوں کچھ نیا کرنا چاہو گے؟'' خالد نے اُن کے پاس آتے ہی آنکھ مار کے کہا۔

وہ اس بات کا مفہوم سمجھتے تھے۔ یقیناً کسی نئی چیز کا کہہ رہا تھا۔ کیونکہ اکثر اوقات ان کو چرس اور ایم وغیرہ خالد ہی دیتا تھا۔ وہ اس خریداری کے عوض مکمل ادائیگی بھی کرتے تھے لیکن کبھی کبھار خالد خود ان کے ساتھ شامل ہوتا تو پیسے نہیں لیتا تھا۔ وہ بڑی شاندار گھڑی ہوتی تھی۔ کیونکہ مالِ مفت دلِ بے رحم والا حساب ہوتا اور وہ دل کھول کر لطف اندوز ہوتے۔

''ہاں بتاؤ کیا ہے نیا... ہم ضرور کریں گے۔ پہلے کبھی منع کیا جواب کریں گے۔'' رجب نے کہا۔

''اچھا پھر ایسا کرو یونیورسٹی سے دو دن کی چھٹی لو اور ہفتہ اتوار ساتھ ملا لو، میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے کر جاؤں گا جو تم نے کبھی خواب میں نہیں سوچی ہوگی۔''

''کیا؟ کہیں دور جانا ہے کیا۔ دیکھ لینا یار کہیں مروا نہ دینا۔ اگر گھر والوں کو پتا لگ گیا تو چمڑی اُدھڑ جائے گی۔'' عاصم نے بیچارگی سے کہا۔

''تم کہہ دینا یونیورسٹی کی طرف سے ٹرپ جا رہا ہے۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا۔'' خالد نے مشورہ دیا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ان دونوں نے گھر والوں کو ٹرپ کا بتایا اور خالد کے ساتھ ایبٹ آباد والی بس میں بیٹھ گئے۔ بس ابھی ایبٹ آباد سے کافی دور تھی کہ ایک معروف تفریحی مقام پر وہ تینوں بس سے اتر گئے۔

خالد نے اترتے ہی کہا ''میں جہاں تم دونوں کو لے کر جا رہا ہوں، وہ ہم جیسے لوگوں کے لیے ایک ارضی جنت سمجھ لو۔ وہاں تمہیں سب کچھ میسر ہوگا لیکن ایک شرط پر...... نہ تم اس کا کسی سے ذکر کرو گے اور نہ ہی یہ راز کبھی کسی اور کو بتاؤ گے۔ اگر تم مرکز سے وفادار رہے تو تمہاری زندگی بدل جائے گی۔ لیکن مرکز پر جانا ہر انسان کی قسمت میں نہیں...... فی الحال ہم مدار کی طرف ہی جائیں گے۔ اگر کبھی غلطی سے تم نے مرکز سے غداری کرنے کا سوچا تو تمہارا حشر ایسا ہوگا کہ تمہاری روحیں تک کانپ اٹھیں گی۔''

ان دونوں نے خود کو کسی پُراسرار داستان کا کردار محسوس کیا۔ کیونکہ وہ باتیں ہی ایسی تھیں۔ وہ دونوں سر جھکائے خالد کی رہنمائی میں چل پڑے۔ راستے میں کئی افراد ملے جو یہاں سیر و تفریح کی خاطر آئے ہوئے تھے۔ ایک دو جگہ کیمپنگ کا سامان بھی موجود تھا۔ وہ ان سب سے گزرتے ہوئے اندر گھنے جنگل کی طرف چلتے جا رہے تھے۔ جوں جوں وہ جنگل کے اندر جا رہے تھے، تاریکی اور ٹھنڈک کا احساس غالب آتا جا رہا تھا۔ رجب اور عاصم ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں سوال کر رہے تھے لیکن جواب ان دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا مسلسل چلنے کے بعد ایک جگہ خالد اچانک رک گیا۔ ''اب ذرا احتیاط سے ہم مدار میں داخل ہو چکے ہیں۔''

وہ دونوں چاہنے کے باوجود بھی پوچھ نہ سکے کہ یہ مدار کیا ہے اور اس میں کیسے داخل ہوگئے۔

وہ درختوں کے بیچ ایک عجیب آسیب زدہ جگہ محسوس ہو رہی تھی۔ جہاں ایک عدد جھونپڑی اور... ایک دائرہ نما حصار بنا ہوا تھا۔ ابھی وہ یہ سب دیکھ ہی رہے تھے کہ دوسری جانب سے ایک بندہ آتا دکھائی دیا۔ اس نے آتے ہی خالد کو مخاطب کیا۔

''خوش آمدید عزیزم خالد... آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔''

''برادرم ظہیر...... میری خوش قسمتی کہ محترم جوشن نے مجھے دوبارہ یاد کیا۔ یہ میرے دوست ہیں... مقدس حصار کے مہمان۔'' خالد نے دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً محترم جوشن اس بات سے واقف ہیں اسی لیے انہوں نے مجھے پہلے ہی ہدایات دی تھیں۔ آپ مقدس حصار میں تشریف رکھیں... محترم جوشن جلد ہی آپ کے درمیان ہوں گے۔'' ظہیر عرف جیرا یہ کہہ کر واپس جھونپڑی

کی طرف چل پڑا۔

خالد نے ان دونوں کو حصار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ دونوں اُلجھن زدہ چہرے لیے حصار کے نشان پر بیٹھ گئے۔ وہ جو سوچ کر آئے تھے، یہ اس سے بالکل مختلف تھا...... وہ سمجھ رہے تھے کسی دور دراز کلب یا ہوٹل وغیرہ میں کوئی پارٹی ہوگی جہاں خالد لے کر جا رہا ہے لیکن یہ تو ایک خاموش اور پُراسرار جنگل تھا جہاں شاید ان لوگوں کے سوا دو اور افراد تھے بس...... اس کو جنتِ ارضی کیسے کہا جاسکتا ہے بھلا؟

انہوں نے اس وقت کو کوسا جب وہ خالد کو ہاں کر بیٹھے تھے یہاں آنے کے لیے۔ ان کے چہرے سے بیزاری عیاں تھی لیکن وہ ابھی پُرامید تھے کہ شاید ایسا نہ ہو جیسا وہ سوچ رہے ہیں۔ کچھ دیر گزری تھی کہ جھونپڑی سے جیرا برآمد ہوا اور اس کے ساتھ عقب میں ایک اور شخص بھی تھا۔

اس کی شخصیت رجب اور عاصم دونوں کے لیے انتہائی پُراسرار تھی۔ وہ ایک لمبے چوغے میں ملبوس تھا جو اس کے پیروں تک آ رہا تھا۔ جبکہ سر کو چھجا نما ٹوپی سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ متانت سے چلتا ہوا ان کے قریب آیا۔ پھر وہ حصار میں اس جگہ بیٹھ گیا جہاں سرخ رنگ کا ایک نشان لگا ہوا تھا۔ یہ گویا اس حصار کا نقطۂ آغاز تھا۔

''بہت جلد آپ لوگوں کو آپ کے سوالوں کے جواب مل جائیں گے اور مقدس حصار کے مہمان بن کر یقیناً آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ میرا نام جوشن ہے اور اسے میری جاگیر سمجھ لیں۔ جہاں آپ جیسے خوش خصال اور دنیا سے بیزار لوگ جمع ہوتے ہیں۔ آج رات چاند کی نصف تکمیل ہوگی۔ آپ مقدس حصار مکمل کرنے کے بعد مرکز کی طرف بھیج دیے جائیں گے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ حصار کا رکن سیدھا مرکز تک چلا جائے۔ لیکن آپ کے لیے ہمیں خصوصی احکامات موصول ہوئے ہیں۔'' نو وارد نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''یعنی آج رات ہم اس جنگل میں گزاریں گے؟'' رجب نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی اس رات آپ مقدس حصار کے مہمان رہیں گے۔ آپ کو حیات آفریں جام تھوڑس پلایا جائے گا جس کی تاثیر اور ذائقہ آپ کے لیے آبِ حیات سے کم نہیں ہوگا۔ آپ کو یہ جنگل اجنبی نہیں لگے گا۔'' نو وارد یعنی محترم جوشن نے کہا۔ محترم جوشن سے ان دونوں کا یہ پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔

''محترم جوشن، میرے دوست ذرا جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ امید ہے آپ کو گراں نہیں گزرا ہوگا۔'' خالد نے چاپلوسی سے کہا۔ جبکہ رجب اور عاصم حیران ہو رہے تھے کہ خالد جیسا نچلے درجے کا ملازم پیشہ شخص کتنی شستہ گفتگو کر رہا ہے بلکہ یہ ہی نہیں وہاں موجود باقی دونوں بھی ایسے ہی باتیں کر رہے تھے جیسے وہ کسی ادبی محفل میں شامل ہوں۔

اور یہ حصار، مدار اور مرکز جیسی اصطلاحات کیونکر استعمال کر رہے ہیں۔ جبکہ انہوں نے ایک حصار کے سوا یہاں کچھ نہیں دیکھا لیکن وہ حصار یا حصارِ مقدس کیسے ہوگیا بھلا۔ یہ سب سوال ان دونوں کے دماغوں میں چکرا رہے تھے لیکن محترم جوشن کی موجودگی اور آنکھوں کی ہیبت نے ان دونوں کے لب سی دیے۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتے تھے لیکن جیسے ان کی آواز ان سے چھین لی گئی ہو۔

''پانی ملے گا؟'' رجب نے بمشکل کہا...... اسے اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کو ابھی مقدس جام پیش کیا جائے گا... بس کچھ محصورین پہنچنے والے ہی ہیں۔'' جیرے نے میزبانی کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ کیونکہ وہ ابھی تک حصار میں نہیں بیٹھا تھا۔ اگر وہ ایک دفعہ بیٹھ جاتا تو پھر اس کی تکمیل تک نہیں اٹھ سکتا تھا۔ یہ صرف محترم جوشن کے اختیار میں تھا کہ وہ کسی بھی وقت حصار سے اٹھ کر جاسکتے ہیں۔

چند منٹ گزرے تھے کہ مدار میں مزید تین افراد داخل ہوئے۔ جن کو جیرے نے روایتی طور پر خوش آمدید کہا اور حصار کی سمت ان کی رہنمائی کی۔ وہ بھی جب حصار میں آکر بیٹھ گئے تو اس کے عین درمیان الاؤ جلایا گیا۔ دیکھنے میں ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب آگ کی پرستش کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ابھی شام کا وقت تھا لیکن اس حصے میں تاریکی اپنا ڈیرا جما چکی تھی۔ خنکی کا یہ عالم تھا کہ الاؤ کے جلتے ہی تمام لوگ راحت محسوس کرنے لگے۔

جیرا جھونپڑی کے اندر گیا اور چھے عدد چوغے لے آیا۔ یہ کم و بیش تھوڑے فرق کے ساتھ ویسے ہی تھے جیسا اس وقت محترم جوشن نے پہنا ہوا تھا۔ سب کو چوغے دیے گئے تاکہ وہ اپنے موجودہ لباس کے اوپر پہن لیں۔ حصار کے اندر کھڑے ہو کر سب نے چوغے پہنے اور دوبارہ وہیں براجمان ہوگئے۔

''ہم اب ارتکازِ توجہ کی ایک مشق کریں گے جس میں مسلسل آپ نے آگ کو دیکھنا ہے جو سامنے جل رہی ہے۔ کوشش کریں کہ آنکھ نہ جھپکنے پائے لیکن ایسی قید بھی نہیں۔ یہ آپ کی قوتِ ارادی کے لیے ہے۔ اس دوران آپ اپنے اردگرد سے بالکل لاتعلق ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو قریب

کسی وحشی جانور کی غراہٹ بھی محسوس ہو تو آپ اپنی توجہ اور ارتکاز نہیں ٹوٹنے دیں گے۔ یہی کامیابی کی پہلی منزل ہے لیکن ان سب سے پہلے آپ مقدس جام ''تھورس'' پئیں گے۔'' محترم جوشن نے مختصراً سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی جیرے نے سامنے موجود ایک گھڑے سے مٹی کے چھوٹے پیالوں میں الگ الگ وہ جام بھرا اور حصار کے تمام ارکان کو پیش کر دیا گیا۔ حصار میں موجود تمام ارکان نے تھورس کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ انہوں نے محسوس کیا، وہ ہواؤں میں تیر رہے ہیں۔ اتنا خوش ذائقہ اور لذت سے بھرپور مشروب تھا کہ ان سب کی تھکن دور ہو گئی۔ رجب اور عاصم کے اعصاب جو مکمل جواب دیتے جا رہے تھے اس ماحول اور باتوں کو دیکھ کر وہ بھی پُرسکون ہو گئے۔ یہ بھی بات تھی تھورس کی تاثیر نے ان کو یہاں اجنبی نہیں رہنے دیا تھا۔ انہوں نے جلدی سے باقی موجود جام ختم کیا اور ارتکاز توجہ کی مشق کے لیے تیار ہو گئے۔

''اب آپ کا دھیان اس الاؤ کی طرف سے کہیں اور نہ بھٹکے۔'' محترم جوشن نے گونج دار آواز میں کہا۔

اس کے بعد خاموشی سے وہ جلتی آگ کو گھورنے لگے۔ عاصم اور رجب کو چونکہ تجربہ نہیں تھا اس لیے ان دونوں کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہنے لگا۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ آنکھیں نہ جھپکیں لیکن کچھ ثانیے بعد آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی تھیں۔ پھر ان دونوں کو ایسا محسوس ہوا کہ زمین ہل رہی ہے اور شدید زلزلہ آ گیا ہے لیکن وہ محترم جوشن کی ہدایات پر حصار میں ہی بیٹھے رہے۔ پھر انہیں یاد نہیں کہ وہ کب اپنے حواس سے بیگانہ ہوئے اور کب ان کی گردنیں ایک طرف ڈھلک گئیں۔

انہیں ہوش آیا تو وہ ایک ہی کمرے میں دو الگ الگ بستروں پر موجود تھے۔ سفید بے داغ بستر اور معتدل درجۂ حرارت والے کمرے میں سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ پہلے ہوش عاصم کو آیا تھا۔ اٹھتے ہی اس نے اپنے ہاتھ پیر دیکھے جیسے ان کے سلامت ہونے میں کوئی شبہ ہو۔ پھر رجب کو ہوش آیا تو اس نے بھی کم و بیش خود کو اور عاصم کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ ''یہ سب کیا ہے یار..... کسی لمبے چکر میں تو نہیں پھنس گئے۔'' رجب نے رونے والے انداز میں عاصم سے پوچھا۔

''مجھے خود نہیں پتا یار۔ بس وہ خالد مل جائے تو اس کے ساتھ واپس چلتے ہیں۔'' عاصم نے بے چارگی سے کہا۔

وہ دونوں خوفزدہ ہو گئے تھے۔ پھر ان کو تھورس کا حیات آفرین ذائقہ یاد آیا۔ اس کے بعد کے کچھ دھندلے دھندلے واقعات۔

وہ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک سفاری سوٹ میں ملبوس شخص ان کے سامنے آ کر ان دونوں سے مخاطب ہوا۔

''خوش آمدید..... میرا نام یامین ہے۔ میں یہاں کا منتظم ہوں۔ تم دونوں اس وقت مرکز میں موجود ہو۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے کہ محصور پہلی دفعہ میں ہی مرکز کے لیے منتخب کر لیے جائیں۔''

''کیا مطلب؟ ہم یہ کہاں ہیں، کونسا مرکز؟ کس چیز کے مرکز میں؟ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ برائے مہربانی ہم کو واپس گھر بھجوا دیں۔'' عاصم بے چینی میں بھول گیا تھا کہ خالد نے آتے ہوئے بتایا بھی تھا کہ مرکز کیا ہے۔

''میرے عزیز جلد باز نہیں بنو۔ تم ایک عظیم الشان مقصد کا حصہ بننے جا رہے ہو۔ تم دونوں فی الحال پُرسکون رہو۔ یہاں تم قیدی کی حیثیت سے نہیں بلکہ دوست کی حیثیت سے موجود ہو۔ اس لیے کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بآوازِ بلند وہ چیز طلب کر لینا۔''

''بھائی آپ کون ہو یار اور ہمارے ساتھ ہمارا ایک اور دوست تھا خالد وہ کہاں ہے؟'' رجب نے گڑگڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ دل کا واقعی اتنا مضبوط نہیں تھا اسی وجہ سے وہ عاصم سے زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔

''شاید تمہیں علم نہیں تم دونوں خالد کے تجویز کرنے پر یہاں مرکز لائے گئے ہو۔ اس لیے تم دونوں سے میں سمجھ داری کی توقع کرتا ہوں۔ ابھی میں جا رہا ہوں مگر جلد ہی خالد تم دونوں کے پاس موجود ہو گا۔'' یامین یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

عاصم اور رجب دونوں ہونقوں کی طرح اسے جاتا دیکھتے رہے پھر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن دونوں کو ایک دوسرے کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات ہی نظر آئے۔

''یعنی یہ سب کیا دھرا خالد کا ہے۔ اسے شاید ہم پر اعتماد نہیں تھا۔ ورنہ ہم کو یوں بے ہوشی کی حالت میں یہاں نہ لایا جاتا۔ یہ حصار، مدار اور مرکز سب کیسی عجیب عجیب باتیں کی جا رہی ہیں یہاں جیسے ہم کسی پرانے دور میں جی رہے ہوں۔'' عاصم نے خیال آرائی کی۔

چند لمحے گزرے تھے کہ دروازے پر پھر آہٹ ہوئی۔ وہ خالد کے منتظر تھے اس لیے ان کا خیال خالد کی

طرف ہی گیا۔ لیکن دروازے کی اوٹ سے ایک انتہائی دلکش اور طرح دار حسینہ نکلی، اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس پر ایک انتہائی مہنگی اور نفیس شراب کی بوتل کے ساتھ دو عدد گلاس اور آئس کیوبز بھی تھے۔ ساتھ ہی ایک عدد لفافہ بھی موجود تھا جس کا حجم بتا رہا تھا کہ اس میں صرف ایک عدد کاغذ سے زیادہ کچھ نہیں۔

''سر یہ آپ کی بہترین شراب اور لفافے میں پانچ لاکھ کا چیک موجود ہے..... مرکز میں عام طور پر صرف ضرورت کے اخراجات کی رقم ہی رکھی جاتی ہے لیکن اگر آپ کو کیش درکار ہے تو اس کے لیے آپ کو دو گھنٹے مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ میں آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

اب دونوں بہت حد تک سنبھل چکے تھے اور اس واقعے کے بعد تو ان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی قیدی نہیں اور ان کے مطابق ایک ارضی جنت کے مہمان ہیں، جہاں شراب، شباب اور پیسہ سب کچھ موجود تھا۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ ان دونوں کی کمزوریاں تھیں۔ ہاں عاصم ایک اور معاملے میں بھی تھوڑا حریص تھا وہ تھا طاقت اور عہدہ تاکہ وہ لوگوں پر حکم چلا سکے۔

تھوڑی دیر بعد اس لڑکی نے اپنی ہم جولیوں کو طلب کر لیا۔

اور آخر کار وہاں شیطانی رقص شروع ہو گیا۔ وہ مادر پدر آزاد معاشرے کی ایک اعلیٰ ترین مثال تھی۔ ان میں سے صرف چند لڑکیاں ایسی تھیں جو کہ مرکز سے وفادار تھیں اور مرکز کے اندر ہونے والے معاملات کو جانتی تھیں۔ باقی سات آٹھ لڑکیاں اسے صرف ایک زیرِ زمین کلب سمجھتی تھیں کہ جہاں بلا روک ٹوک نشہ اور جنسی آزادی حاصل ہوتی تھی اور صبح ہوتے ہی یہاں سے واپس چلی جاتیں۔

یہ رقصِ ابلیس ایک گھنٹے تک بلا تعطل جاری رہا۔ عاصم اور رجب کو ارضی جنت کا مفہوم اب سمجھ میں آیا تھا۔ وہ دونوں گردن گردن تک غلاظت میں گرے ہوئے تھے۔ یہ محفلِ شراب و شباب خالد کے آنے پر ختم ہوئی۔

''باس تم دونوں سے براہِ راست بات کریں گے اس لیے اب ذرا احتیاط سے بات کرنا۔'' خالد نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں دروازے کی طرف دیکھنا شروع ہو گئے جیسے وہاں سے ابھی باس نے برآمد ہونا ہو لیکن انہیں کمرے میں ایک آواز سنائی دی۔

''خوش آمدید دوستو ..... مجھے امید ہے تم دونوں یہاں آ کر اچھا محسوس کر رہے ہو۔ میں تم دونوں کو ایک آفر دینا چاہتا ہوں ..... اگر تم نے ہاں کی تو تم دونوں کی زندگی بدل جائے گی...... اور یہ آج جیسی پارٹیاں روز ہوتی رہیں گی۔ بس مرکز کے وفادار بن جاؤ اور اس کے مقاصد کے لیے کام کرو۔ تم کو اس شہر، اس ملک میں لاتعداد مراعات حاصل ہوں گی لیکن اگر تم لوگ ہمارے مقصد سے متفق نہیں تو تم آزاد ہو۔ تم یہاں سے جا سکتے ہو لیکن کبھی زبان پر اس جگہ کا نام نہ آئے ورنہ تم لوگ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جاؤ، مرکز کی پہنچ وہاں تک رہے گی اور مرکز اپنے دشمنوں کو عبرت کا نشان بنا دیتا ہے۔''

یہ آواز کسی مخفیہ لگے اسپیکر سے آ رہی تھی۔ یقیناً بولنے والا ان کو دیکھ بھی رہا تھا۔ رجب تھوڑا تذبذب کا شکار تھا لیکن عاصم کو جیسے اس کے خوابوں کی تعبیر مل رہی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ''ہم مرکز کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ ہم ایسی زندگی گزارنے کا صرف خواب دیکھ سکتے ہیں اس لیے اس زندگی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔''

''لیکن میرے دوست تم نے یہ نہیں پوچھا ہمارے مقاصد کیا ہیں اور تمہیں کیا کرنا ہو گا؟'' اسپیکر سے دوبارہ آواز ابھری۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کیا کام ہے لیکن آپ ضروری سمجھتے ہیں تو بتا دیجیے۔ ویسے بھی اگر خالد نے ہمارا نام آپ کو دیا ہے تو اس کا مطلب ہے وہ کام ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔'' عاصم نے دوبارہ جواب دیا۔

''سمجھ دار ہو۔ کام کے متعلق تم کو یامین سب بتا دے گا۔ مرکز میں خوش آمدید۔'' وہ آواز ابھری اور معدوم ہو گئی۔

پھر اس کے بعد یامین نے عاصم اور رجب کو جو بتایا، وہ حیرت انگیز ہی نہیں، گھناؤنا اور انسانیت سوز کام تھا لیکن عاصم اور رجب کو پیسے اور عیاشی سے غرض تھی اس لیے انہوں نے یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ یہ منشیات فروش، لڑکیوں کی اخلاق باختہ فلمیں بنانے اور اسمگلنگ جیسے قابلِ نفرین کاموں میں ملوث ہیں، اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

تب سے لے کر آج تک یہ سلسلہ یونہی چل رہا تھا..... جوشن ان کا ابتدائی کردار تھا جو بھولے اور معصوم لوگوں کو روحانیت اور نفس کشی کی تعلیم دینے کے بہانے ان کی پریشانیاں اور گھریلو معاملات جان لیتا تھا۔ پھر پوشیدہ رہ کر مرکز کے لوگ ان لوگوں کی پریشانیوں کو دور کر دیتے۔

اس طرح وہ حصار کے قیدی بن جاتے تھے اور دل و جان سے حصار اور پھر مرکز کے لیے کام کرتے۔ عاصم اور رجب اس لحاظ سے بہت سینئر تھے کہ وہ مرکز میں ہونے والے اصل معاملات سے باخبر تھے لیکن بہت سے لوگ اسے ایک رفاہی اور اصلاحی تنظیم سمجھتے تھے۔

☆☆☆

جب یہ فلیش بیک ختم ہوا تو عاصم کے متعلق جان کر سدرہ کو صحیح معنوں میں عاصم سے خوف محسوس ہوا۔ جیسے وہ کوئی عفریت ہو جو عنقریب اُسے نگل جائے گا۔ عاصم نے اسے آسان لفظوں میں یہ بتا دیا تھا کہ اگر وہ نہیں مانی تو مریم اور عائزہ سمیت اس کی بھی کوئی ویڈیو پاکستان اور دوسرے ملکوں میں گردش کرنے لگے گی۔ بہتر یہی ہے وہ آرام سے مان جائے شادی کے لیے اور اس کے ساتھ عزت سے رہے۔

”تم اتنے گھٹیا انسان ہو۔ اتنا تاریک باطن ہے تمہارا۔ مجھے تو شرم آتی ہے کہ کبھی میں نے تمہارے متعلق بھی سوچا تھا۔“ سدرہ نے چلا کر کہا۔

”بس اب اور نہیں...... بہت لاڈ پیار ہو گیا۔ اب اگر آواز اونچی کی یا کوئی اور بکواس فرمائی تو میں اس کا بہت برا جواب دوں گا جو یقیناً تم کو پسند نہیں آئے گا۔“ عاصم غرایا۔

سدرہ اس توہین آمیز رویے پر اپنا آپ سنبھال نہ سکی۔ اس نے غصے اور جوش سے عاصم کی طرف چھلانگ لگائی اور اس کے چہرے کو اپنے تیز اور لمبے ناخنوں سے نشانہ بنا ڈالا۔

عاصم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سدرہ ایسی حرکت کر سکتی ہے۔ اسی لیے غفلت میں مارا گیا۔ لمبے ناخن اس کے چہرے کی جلد میں پیوست ہوئے تو اسے ایسا لگا جیسے کوئی گرم سلاخ گوشت میں اتر گئی ہو۔ اس نے چیختے ہوئے سدرہ کو خود سے دور پھینکا لیکن سدرہ کی ایک انگلی کا ناخن اس کی آنکھ کا مزاج پوچھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں اور مسلسل پانی بہنا شروع ہو گیا۔ اس کی بصارت دھندلی ہو چکی تھی اس لیے سدرہ نے فوری خیال کے تحت عاصم کا بیڈ پر رکھا ہوا موبائل اور پستول اٹھا کر دروازے کی طرف جست لگائی۔ عاصم نے کوشش کی کہ وہ سدرہ کو روک لے مگر سدرہ نے اپنے خالص زنانہ انداز میں پستول کو چلانے کے بجائے اس کی وزن دار مٹھی عاصم کے سر پر مار کر اسے تکلیف سے بلبلانے پر مجبور کر دیا۔ یہ لمحاتی توقف اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ عاصم کی اندر موجودگی کی وجہ سے یہ کمرا باہر سے مقفل نہیں تھا اور یہاں پرائیویسی کے خیال سے کیمرا بھی نصب نہیں کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عاصم اسے اس کمرے میں لے کر آیا تھا۔

سدرہ نے باہر نکلتے ہی دروازے کو باہر سے بولٹ کیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت باہر کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ دبے قدموں راہداری میں چلتے ہوئے باہر کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ حالانکہ اسے امید نہیں تھی وہ ایسا کر لے گی یا ان لوگوں سے بچ کر نکل سکے گی لیکن اس کے اندر جو بقا کا جذبہ تھا، وہ اسے مسلسل کوشش کرنے کا کہہ رہا تھا۔ ایک کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے اندر سے ایک غصیلی آواز سنائی دی۔

”میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔ مجھے یامین سے بات کرنی ہے۔“ یہ آواز دروازے کے دوسری طرف سے آئی تھی۔ سدرہ کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی، وہ کوئی اور نہیں بلکہ کیپٹن خان تھے۔

اس نے اپنے طور پر عاصم کو کمرے میں بند تو کر دیا تھا اور موبائل بھی اٹھا لیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ عاصم کے پاس دوسروں کو مطلع کرنے کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی انتظام ہو گا۔ وہ اس سے پہلے ہی کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتی تھی اس لیے اس نے کیپٹن خان کی موجودگی کو اپنے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جانا اور فوراً سے پیشتر دروازہ کھول دیا۔

یہ دروازہ بھی باہر سے صرف بولٹ تھا کوئی باقاعدہ تالا نہیں لگایا گیا تھا۔ یہ بے احتیاطی یا حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے سدرہ کا کام آسان کر دیا۔

دروازہ کھلتے ہی کیپٹن خان نظر آئے جو اس وقت حملہ کرنے کی نیت سے دروازے کی طرف بڑھے لیکن سدرہ کو دیکھتے ہی ان کا ہاتھ اور ٹانگ ہوا میں ہی رک گئے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم یہاں کیسے؟“

”سر میں بہت مشکل سے جان چھڑا کر بھاگی ہوں۔ یہاں آپ کی آواز سنی تو مجھے لگا اب آپ ہماری مدد کر سکیں شاید . اس لیے میں نے یہ دروازہ کھول دیا۔“

”عائزہ اور حسن کے متعلق جانتی ہو؟ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟“ کیپٹن خان نے بے تابی سے پوچھا۔

”سر وہ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے لیکن مجھے اُن سے الگ کر دیا گیا تھا اسی وجہ سے مجھے یہ موقع ملا اور بھاگ نکلی ہوں۔ آپ وقت ضائع نہ کریں پلیز..... جلدی کچھ کریں۔ وہ زیادہ دیر تک غافل نہیں ہوں گے۔“ سدرہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”اچھا تم میرے ساتھ چلو اور بہتر ہے یہ مجھے پکڑا دو۔“ کیپٹن خان نے پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سدرہ نے پستول بہت مضبوطی سے تھام رکھا تھا پھر کیپٹن خان کے کہنے پر اس نے پستول اور موبائل ایک ساتھ ان کو تھما دیا حالانکہ کیپٹن کا اشارہ صرف پستول کی طرف تھا لیکن سدرہ سے خوف اور بدحواسی میں یہ سب سرزد ہو رہا تھا۔ دوسرا وہ اس کے خطرناک وزن اور ٹھنڈے لمس سے ابھی تک دہشت زدہ تھی۔ کیپٹن خان کو قطعی علم نہیں تھا کہ یہ موبائل عاصم کا ہے یا سدرہ کا ہے بہرحال انہوں نے احتیاطاً موبائل جیب میں رکھ لیا اور پستول کو اچھی طرح چیک کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ یہ نائن ایم ایم پستول تھا جس کے میگزین میں نو عدد گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس وقت یہ کسی خزانے سے کم نہیں تھی۔

سدرہ نے اپنے اندازے کے مطابق اس کمرے کی طرف کیپٹن خان کی رہنمائی کی جہاں اس وقت مریم اور عائزہ موجود تھیں حسن کے ساتھ کیونکہ عاصم کے گارڈز نے جب سدرہ کو وہاں سے زبردستی نکالا تھا تو اس کی آنکھوں پر کوئی پٹی وغیرہ نہیں باندھی تھی۔

ایک راہداری میں دو دروازوں کے سامنے آ کر وہ رک گئی۔ دونوں دروازے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر تھے اور بالکل ایک جیسے تھے اس لیے سدرہ کو تھوڑی پریشانی ہوئی۔ اگر وہ غلط دروازہ کھولتے اور اندر سے وہ دو خطرناک گارڈز یا ان کے ساتھی برآمد ہوتے تو صورتِ حال خطرناک ہو سکتی تھی لیکن سدرہ نے اپنی یادداشت اور اللہ کے بھروسے پر پہلے دروازے کو باہر سے کھول کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ بے آواز طریقے سے اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

دروازہ کھلتے ہی سدرہ اور کیپٹن خان کو اندر کا منظر دیکھ کر حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔

☆☆☆

یامین کسی طور پر بھی عاصم سے خوش نہیں تھا لیکن اسے برداشت کرنے کی صرف ایک وجہ تھی کہ وہ یہاں کا رہنے والا تھا۔ اس لیے کبھی کوئی اونچ نیچ ہوتی تو اس سارے سیٹ اَپ کو ملکی سطح پر ہی دیکھا جاتا اور جوشن اور یامین جیسے لوگ صاف بچ نکلتے۔ اس دفعہ کا سارا منصوبہ بھی اسی کے مرہونِ منت تھا۔ اس نے یونیورسٹی میں موجود کوآرڈینیٹر سے ساز باز کر کے یہ اسپیشل ٹرپ کی منظوری لی تھی۔ ایک تو وہ وقاص پر تفتیش کرنا چاہتے تھے کہ وہ اصل میں ہے کون دوسرا زاہد خان کی خدمات حاصل کرنا۔ کیونکہ وہ قبائلی علاقوں اور طورخم بارڈر کی طرف ٹرک ڈرائیور کے طور پر آتا جاتا رہا تھا۔ اس لیے وہ وہاں کے تمام رستوں سے ایسے واقف تھا جیسے وہ اس کے ہاتھ کی لکیریں ہوں۔ وہ ان کے اسمگلنگ کے مال کی ترسیل میں بہت اہم مہرہ ثابت ہو سکتا تھا۔

پھر اس کے منصوبے کا دوسرا فیز شروع ہوا تھا جس کے لیے اسے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی جس میں لاکھوں کروڑوں نہیں بلکہ اربوں کی ضرورت تھی۔ مگر اس کے پیچھے دنیا کے طاقتور ترین اور امیر ترین ملکوں کی چند بدنام زمانہ ایجنسیوں کا ہاتھ تھا اس لیے اسے سرمایہ حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اس نے جگہ جگہ آسان قسطوں والی فرنچائز کھولیں۔ یہ ایک طرح سے کاروباری پردہ یعنی بزنس کور تو تھا ہی دوسرا وہ نئی نسل کو آسان اقساط پر اسمارٹ فون، لیپ ٹاپ اور موٹر سائیکل جیسی چیزیں فراہم کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ یہ کوئی ایک دو سال کا نہیں بلکہ پانچ سے دس سال کا منصوبہ تھا لیکن اس کے ثمرات حیرت انگیز طور پر پانچ سال مکمل ہونے سے پہلے ہی ملنے شروع ہو گئے تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دھڑا دھڑ اسمارٹ فون خرید اور استعمال کر رہے تھے۔ اب نوجوان نسل کے پاس ہر وہ چیز موجود تھی جس سے وہ اوائل عمری میں ہی ہر لذت اور برائی سے آشنا ہو جاتے۔ یہاں تک کہ اَن پڑھ لوگ اور مزدور طبقہ بھی اسمارٹ فون کا عادی ہو گیا۔

پھر دوسرا مرحلہ سوشل میڈیا کا استعمال اور موبائل کی دکانوں کا تھا۔ جہاں وہ سب فراہم کیا گیا کہ بہت سی پابندیوں اور حکومتی کوششوں کے باوجود غیر اخلاقی اور ممنوعہ مواد لوگوں کے موبائل، کمپیوٹرز اور لیپ ٹاپس تک پہنچ گیا۔ اس ملک کے بہترین دماغ اور ہونہار طالب علم پانچ انچ سے پندرہ انچ کی اسکرین کے قیدی بن کر رہ گئے۔ لوگوں کی اسی فیصد تعداد اس پر کوئی صحت مندانہ رجحان نہ اپنا سکی۔ یہی یامین اور جوشن کی کامیابی کا نکتہ آغاز تھا۔ ان کے بڑے ان دونوں کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ یامین کو کیپٹن خان کو یہاں تک لانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ کیپٹن خان نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کر لیا ہے لیکن وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مرکز کے کچھ وفاداروں نے کیپٹن خان کی تین چار ماہ مسلسل نگرانی کی تھی۔ کیپٹن خان اپنی تمام تر احتیاط

کے باوجود تین چار دفعہ ایک وفاقی ایجنسی کے دفتر میں آتا جاتا دیکھا گیا۔ حالانکہ یہ کوئی اتنی عجیب بات نہیں تھی لیکن یامین اتنی معمولی سی بات کو بھی غیر اہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا اسی لیے جب ان کو یہ اطلاع ملی کہ اس چھٹی والے دن کیپٹن خان اپنی فیملی سمیت ان کے اتنے نزدیک آرہا ہے تو اس نے کیپٹن پر ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنالیا۔ یہ ایک تیر سے دو شکار ہوگئے تھے کیونکہ اسی دن عاصم، رجب اور خالد یونیورسٹی کی ٹرپ کو لے کر اپنے ساتھ آرہے تھے۔ پھر اتفاق سے کیپٹن خان اور باقی سب لوگوں کو بھی انہوں نے آسانی سے اپنا شکار بنالیا تھا۔ لیکن یامین کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اسے یہ بھی سن گن ملی تھی کہ سرکاری ایجنسیاں ان لوگوں کے خلاف گھیرا تنگ کر رہی ہیں لیکن ابھی تک کوئی واضح منصوبے کی بھنک ان کو نہیں ملی تھی۔ ان کے بہت سے نمک خوار سرکاری اور غیر سرکاری عہدوں پر کام کر رہے تھے۔ اسی لیے ان کو سب پتا ہوتا تھا مگر یونیورسٹی میں سائرہ اور شائستہ کی خودکشی والے واقعے نے ان کو بہت محتاط کر دیا تھا۔ وہ سب بھی عاصم کی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا لیکن باس مسلسل اسے نظر انداز کر رہے تھے۔ وہ دونوں لڑکیاں محصور بھی تھیں اور مرکز سے وفادار بھی۔ انہیں وفادار بنانے کے لیے یامین نے عاصم سے مل کر ان کی یہاں غیر اخلاقی فلمیں ریکارڈ کرلی تھیں جب وہ نشے میں خود کو فراموش کیے ہوئے تھیں۔ لیکن جب ان کا نشہ اترا، اور عاصم نے ان کو وہ ویڈیوز دکھائیں تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ انہی ویڈیوز کے سبب وہ کافی دیر تک ان سے کام بھی لیتے رہے اور نئے لڑکوں کو بھی ورغلاتے رہے۔ مگر عاصم نے یونیورسٹی میں اپنی شیخی بگھارنے کے لیے چند مزید لڑکوں کو سائرہ اور شائستہ کے وہ ویڈیو کلپ دکھا دیے۔ ان لڑکوں نے جب ان کو بلیک میل کرنا چاہا تو وہ دونوں سیدھی ہوگئیں۔ انہوں نے عاصم کو دھمکی دے دی کہ اب وہ بدنام تو ہو ہی گئی ہیں لیکن وہ اس کے اور مرکز کے تمام راز کسی سرکاری ادارے کو جا کر بتا دیں گی۔

عاصم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک تو وہ نیا تھا، دوسرا اس کو ایسے معاملات ہینڈل کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ اس نے فوراً یامین سے رابطہ کیا تو جواب میں یامین نے اسے... پُرسکون رہنے کا کہا۔ لیکن اگلے ہی دن وہ دونوں لڑکیاں اپنے کمرے میں مردہ پائی گئیں۔ ان سے زبردستی خودکشی کا اقرار نامہ لکھوایا گیا اور پھر ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

کیپٹن خان اور دیگر قیدی یہاں صبح سے موجود تھے۔ اب پچھلا پہر ہونے کو تھا۔ یامین نے محترم جوشن اور جیرے کو بھی یہیں بلا لیا تھا اور یہاں سے تمام غیر ضروری اور غیر اہم لوگوں کو واپس بھیج دیا گیا تھا۔ کیونکہ آج ساری توجہ مرکز پر تھی۔ جبکہ حصار کو آج توڑ دیا گیا تھا۔ یہ بات یامین اور جوشن کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ کیپٹن خان سے مطلوبہ معلومات لے کر وہ دونوں اب یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانے والے تھے۔ ان کو اپنے اردگرد ایک نادیدہ جال دکھائی دے رہا تھا۔ جو بہت جلد ان کی طاقتِ پرواز ختم کر دیتا اس لیے وہ یہ سب عاصم اور رجب کے ہاتھ دے کر چلے جاتے۔ اگر حالات بہتر رہتے تو پھر کسی وقت وہ یا ان کے اور نمائندے آکر مرکز کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ ورنہ پکڑے جانے کی صورت میں عاصم اور اس کے مقامی ساتھیوں کا نام ہی آتا اور کوئی بھی یہ نہ جان پاتا کہ ان سب کے پیچھے یہودیوں کے اعلیٰ دماغ کارفرما تھے۔

یامین کے دماغ میں یہ ساری باتیں کسی ریل کے مانند چل رہی تھیں۔ اب وقت آگیا تھا کہ کیپٹن خان کی اصلیت معلوم کی جائے۔ اس لیے وہ کافی دیر سے ریسٹ روم میں بیٹھا انہی خیالوں میں گم تھا۔ وہ اپنی لمبی اور آرام دہ نشست سے اٹھا اور ملحقہ کنٹرول روم میں آیا تاکہ موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لے سکے۔

اس نے سامنے لگی اسکرین پر دیکھا جہاں خانوں کی صورت میں چھے مختلف کیمروں سے ریکارڈنگ موصول ہو رہی تھی۔ کیپٹن خان والے خالی کمرے کو دیکھ کر یامین کے دماغ کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔ پھر جیسے ہی اس نے باقی کمروں کا منظر دیکھا اس کی غصے سے مٹھیاں بھنچ گئیں۔ کیپٹن خان اس لڑکی سمیت ان لوگوں کے درمیان موجود تھا جس کو عاصم اپنے کمرے میں لے کر گیا تھا۔

یامین نے جوشن سے رابطہ کر کے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اس کے فوری بعد اس نے لاؤڈ اسپیکر پر کہا۔

''کوڈ ریڈ الرٹ۔ لیک اور ہائیجر۔'' پھر ساتھ ہی اس نے سائرن بجا دیا۔ یہ سائرن کسی طبلِ جنگ سے کم نہیں تھا۔ یامین اور جوشن ایک خفیہ راستے سے مرکزی شاہراہ کی طرف جا رہے تھے جو ایک بند مکان میں جا کر کھلتا تھا۔ وہاں ایک عدد تیار گاڑی ہر وقت موجود رہتی تھی۔ ان کو فوری طور پر ملک چھوڑنا تھا کیونکہ کیپٹن خان جیسے بندے کو اتنی دیر آزادی میسر آنے کا مطلب تھا، ان کی آزادی خطرے میں پڑنا اور وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔ کنٹرول

روم سے باہر دونوں گارڈز کے بھاری بوٹوں کی دھمک صاف سنائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

سدرہ کمرے میں وقاص اور دوسرے تمام لوگوں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئی تھی جبکہ کیپٹن خان صرف سرمد صاحب کو دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ پھر کمرے میں داخل ہوتے ہی شیشے کی دیوار کی دوسری طرف ان کو عائزہ، حسن اور مریم بھی دکھائی دی۔

سدرہ کو دیکھ کر وقاص کی لہو برساتی آنکھیں ایک دم پُرسکون ہوگئیں۔ اس سے اس دفعہ ضبط نہیں ہوا...... اس نے آگے ہو کر سدرہ کا ہاتھ تھام کر کہا ''سدرہ تم ٹھیک ہو؟ عاصم نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔''

سدرہ کو بالکل توقع نہیں تھی کہ وقاص ایسی بھی کوئی حرکت کر سکتا ہے۔ وہ گڑبڑا گئی اور اتنا ہی کہہ سکی۔ ''ٹھیک ہوں میں۔ تمہیں میری بڑی فکر ہے جیسے۔''

''صرف تمہاری ہی تو فکر ہے ورنہ کب کا یہاں کسی کو مار دیتا یا خود مر جاتا۔'' وقاص نے پُرشکستہ لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ آگاہ ہو جائیں۔'' کیپٹن خان نے کہا جو اُس وقت سے عاصم کے موبائل کے ساتھ مصروف تھے۔ یہاں تہ خانہ ہونے کی وجہ سے موبائل سگنل نہیں آتے تھے لیکن مرکز سارا وائرلیس نیٹ ورک سے جڑا ہوا تھا اور عاصم کا موبائل اس نیٹ ورک سے منسلک تھا۔ اس وجہ سے موبائل کمپنی کے سگنل نہ آنے کے باوجود بھی کیپٹن خان ایک اہم کام سرانجام دے چکے تھے۔ دو کام خوش قسمتی سے اچھے ہوئے تھے۔ ایک تو انٹرنیٹ چل رہا تھا دوسرا اس پر کسی قسم کا لاک نہیں لگا تھا ورنہ دشواری ہوتی۔

وہ سب قطار کی صورت کمرے سے باہر نکلے۔ کیپٹن خان کو اندازہ ہو چکا تھا دوسرے کمرے کا دروازہ کہاں ہے۔ انہوں نے فوراً وہ دروازہ کھولا تو سامنے عائزہ اور مریم موجود تھیں۔ ساتھ بیٹھا حسن دوڑ کر باپ کے گلے لگ گیا جبکہ عائزہ بھی دوڑتی ہوئی کیپٹن خان کے قریب آکر رک گئی۔ وہ سب کے سامنے اپنی جذباتیت کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا وہ گمان سچ ہوا کہ اس کا شوہر کسی ہیرو کی طرح یہاں آئے گا اور اسے بچا کر لے جائے گا۔

کیپٹن خان کا انداز بہت مشینی اور پروفیشنل تھا۔ وہ ابتدائی جذباتی مراحل سے گزر چکے تھے اس لیے انہوں نے فوری احکامات دینے شروع کر دیے۔ عورتوں کو حسن سمیت سب سے پیچھے رکھا گیا تھا۔ جبکہ فرنٹ پر کیپٹن خان خود تھے۔ وقاص ان کے پیچھے اور سجاد سائڈ پر چل رہا تھا۔ جن کے پیچھے زاہد خان، سر ندیم اور سرمد صاحب تھے۔ وہ راہداری سے ایک سہ راہے کی طرف مڑے ہی تھے کہ سائرن بج اٹھا۔

اس کی آواز اتنی ہولناک تھی کہ سدرہ اور مریم خوف سے تھرتھر کانپنے لگیں جبکہ عائزہ شوہر کی موجودگی کی وجہ سے بہت حد تک سنبھلی ہوئی تھی۔ سائرن کی وجہ سے ایک دم انہیں رکنا پڑا۔ کیونکہ تھوڑی ہی دور انہیں کچھ لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ یقیناً ان کی جانب ہی آرہے تھے۔ کیپٹن خان... پستول تھامے تیار حالت میں کھڑے تھے۔ انہوں نے زاہد خان اور سجاد کو دوسری جانب بھیجا تاکہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکیں۔

خواتین اور اساتذہ کو دوبارہ انہوں نے اندر بھیج دیا تاکہ کسی کارروائی کے دوران میں ان کو نقصان نہ پہنچے۔ وہ وقاص کو بھی اندر بھیجنا چاہتے تھے مگر وہ نہ مانا۔

''ینگ مین، میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن یہ ایک خطرناک صورتِ حال ہے۔ ایک اَن ٹرینڈ بندے کو ایسا رسک نہیں لینا چاہیے۔ وہ بہت تربیت یافتہ اور خونخوار قسم کے لوگ ہیں۔'' کیپٹن خان نے وقاص کو تنبیہ کی۔

''سر جی قسم سے میں بھی بہت خونخوار ہوں...... موقع ہی نہیں ملا کبھی کھل کے لڑنے کا۔ آج کسی طرح موقع آیا تو مجھے منع مت کریں، مہربانی ہوگی۔''

''ان کے ہاتھوں میں مہلک ہتھیار ہوں گے جبکہ میرے پاس صرف ایک پستول ہے۔ ہم اسلحے کے زور پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا ہوگا۔'' کیپٹن خان کے ماتھے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

قدموں کی دھمک اب انتہائی نزدیک تھی۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں آسکتے تھے۔ وہ تعداد میں شاید تین یا چار لوگ تھے۔ اچانک وقاص کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے فوراً سے پہلے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے دو پائپ اکھاڑ دیے۔ گیس کی تیز بو ایک دم سے اس کے نتھنوں اور منہ میں گھس گئی۔ وہ کھانستا ہوا نیچے بیٹھ گیا۔

''یہ کیا حرکت کی تم نے؟'' کیپٹن خان اس کی اچانک حرکت کو سمجھ نہ سکے۔

''سر اب کوئی بھی یہاں اسلحے کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکے گا۔ اگر ایسا کیا تو گیس آگ پکڑ لے گی۔''

''اوہ، یہ بہت رسکی کام ہے۔ ہمارے ساتھ عورتیں،

بزرگ اور ایک عدد بچہ بھی ہے۔''

''لیکن سر! اگر اسلحہ استعمال ہوا تو آپ جانتے ہیں ہم یہاں سے کبھی نہیں جا سکیں گے۔''

کیپٹن خان کو وقاص کی بات کا قائل ہونا پڑا۔ وہ ایک محفوظ آڑ میں کھڑے تھے۔ گیس کی بُو بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر دوسرے کونے سے ان کو وہی دو قوی الجثہ باڈی گارڈ نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ کرتے، کیپٹن خان اپنے ہاتھ اوپر کر کے ان کی طرف چند قدم چل کر کھڑے ہو گئے۔

''یہ کوریڈور گیس سے بھر چکا ہے اگر تم میں سے کسی نے فائرنگ کرنے کی کوشش کی تو سب کچھ ایک جھٹکے میں ختم ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر ہے اسلحہ رکھ کر ہاتھ سے ہم کو روک سکو تو روک لو۔'' کیپٹن خان نے انہیں آنکھوں میں تولتے ہوئے کہا.....

ان دونوں کے پیچھے رجب، خالد اور عاصم موجود تھے۔ عاصم کے ماتھے پر ایک عدد گومڑ نمودار ہو چکا تھا اور ایک آنکھ سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ سدرہ نے جب اسے دھکا دیا تھا تو اس کا سر کسی کونے سے ٹکرایا تھا اور وہاں ایک عدد گومڑ نکل آیا تھا۔ وہ خونخوار نظروں سے کیپٹن خان اور ان کے پیچھے کھڑے وقاص کو دیکھ رہا تھا۔

دونوں گارڈز کو بھی گیس کی بُو محسوس ہو گئی تھی۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں کوئی فیصلہ کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود آٹومیٹک گنز کو زمین پر ایک سائڈ میں رکھ دیا۔

''ہمیں باہر نکلنے کا راستہ مل گیا ہے سر۔'' سجاد نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ اور زاہد خان ابھی ابھی یہاں واپس پہنچے تھے۔

''ویری گڈ! تم سب کو لے کر یہاں سے جاؤ میں ان سے دو دو ہاتھ کرتا ہوں۔'' وہ وقاص سے مخاطب ہوئے تھے۔

''سجاد تم اور زاہد خان سب کو لے کر جاؤ یہاں سے۔ یونیورسٹی کی بس بھی یہیں آس پاس ہو گی کہیں۔ میں کیپٹن صاحب کے ساتھ آؤں گا۔'' وقاص نے چٹانی لہجے میں کہا۔

''دیکھ کیا رہے ہو، روکو ان حرام زادوں کو۔'' عاصم پوری طاقت سے چلّایا۔

اُدھر دونوں گارڈز نے بیک وقت کیپٹن خان پر حملہ کر دیا۔ وہ ماہر فائٹرز تھے اور ان کی فائٹ کا اسٹائل تائی کون ڈو سے کافی ملتا جلتا تھا۔ کیونکہ پے در پے تین چار ککس چلا کر وہ ایک ثانیے کو رک گئے تھے۔ کیپٹن خان نے انتہائی مہارت سے ان کو بلاک کیا تھا۔

ان کا مد مقابل بہترین فورسز میں سے ایک فورس کا تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔

اس دفعہ دونوں نے اپنی فائٹ کا انداز ایک دفعہ پھر تبدیل کیا۔ وہ اسٹریٹ فائٹنگ کے اصول پر کاربند نظر آ رہے تھے۔ کیپٹن خان کو اس دفعہ تھوڑی دقت ہوئی لیکن وہ ابھی اپنا دفاع کر رہے تھے۔ تاکہ عورتوں اور بزرگوں کو یہاں سے نکلنے کا موقع ملے۔ کیپٹن خان نے جانے والوں میں سے سر ندیم کو قدرے ایکٹو اور سینئر دیکھ کر عاصم والا پستول بھی تھما دیا تھا۔

ایک گارڈ نے کیپٹن کے چہرے کو اپنے طوفانی پنچ کا نشانہ بنانا چاہا۔ کیپٹن نے کراس بلاک سے اسے روک کر جوابی حملہ کیا جو وہ آسانی بچا گیا۔ لیکن دوسرا گارڈ ان کے پہلو سے اُڑتا ہوا دور جا گرا۔ کیپٹن خان نے حیرت سے مڑ کے دیکھا۔

وہ گارڈ وقاص کی جنونی ٹکر کا نشانہ بنا تھا۔ دوسرا گارڈ اصل میں کیپٹن کو اپنے ساتھی کے ساتھ مصروف دیکھ کر دروازے کی طرف جانے لگا تھا جہاں سے اس وقت سب لوگ نکل کر دوسری سمت جا رہے تھے کہ راستے میں وقاص آ گیا۔ اس نے یہ ٹکر اتنی شدت سے ماری تھی کہ اتنے بڑے ڈیل ڈول والا گارڈ خود کو پاؤں پر قائم نہ رکھ سکا اور تقریباً اُڑتا ہوا دور جا گرا۔

''واپس آ جا سوہنے۔ یہاں سے گزرنے کے لیے تجھے بچ بچ میری لاش سے گزرنا پڑے گا۔'' وقاص نے بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

پھر وہاں ایک ایک کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ جبکہ عاصم، رجب اور خالد راہداری کی دوسری طرف ڈری اور خالی خالی نظروں سے یہ لڑائی دیکھ رہے تھے۔ وہ خود تو کسی لڑائی بھڑائی میں نہ ماہر تھے نہ حصہ لینے کا سوچ سکتے تھے۔ دوسری طرف گیس وہاں اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اب آنکھیں جلنے لگی تھیں اور سانس لینے میں بھی دشواری آ رہی تھی۔

کیپٹن خان کو دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ وہ ابھی تک دفاعی حکمتِ عملی کے تحت فائٹ کر رہے تھے اور پھر سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ دوسری طرف وقاص تربیت یافتہ نہ ہونے کے باوجود دوسرے گارڈ کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔

کیپٹن خان کو وقاص کی صورت میں ایک اچھا ساتھی مل گیا تھا ورنہ وہ ان دونوں کو اکیلے اتنی اچھی طرح شاید نہ ہینڈل کر پاتے۔ جب کیپٹن خان کو اندازہ ہو گیا کہ سجاد اور زاہد خان یہاں سے باہر نکل گئے ہوں گے تو انہوں نے اپنی

حکمتِ عملی کو ایک دم تبدیل کر دیا۔

☆☆☆

زاہد خان اور سجاد بڑی احتیاط کے ساتھ لڑکیوں اور اساتذہ کو لے کر باہر نکل آئے تھے۔ پھر انہوں نے ارد گرد بس کی تلاش شروع کر دی۔ کیونکہ سدرہ ان کو بتا چکی تھی کہ بس یہیں قریب موجود ہو گی۔ کافی دیر کی بھاگ دوڑ کے بعد آخر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں ان کو بس مل ہی گئی۔ تہ خانے کے اوپر ایک غیر ملکی این جی او کا آفس تھا۔ آفس کو دیکھتے ہوئے کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے نیچے اس سے تقریباً دگنا تہ خانہ موجود ہے۔

''چلیں صاحب جی سب کو لے کر بس میں بیٹھیں۔ ہم اس خانہ خراب جنگل سے باہر نکلتے ہیں۔'' زاہد خان نے بس لاتے ہی سرمد صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

سب لوگ جلدی جلدی بس میں سوار ہو گئے جبکہ عائزہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ حسن بھی اس کے ساتھ تھا۔

''بیٹی کیا بات ہے۔ تم وہاں کیوں کھڑی ہو...... اندر آ جاؤ۔'' سرمد صاحب نے شفقت سے کہا۔

''میں اُن کے بغیر نہیں جا سکتی۔ آپ لوگ جانا چاہیں تو چلے جائیں۔'' عائزہ کو کیپٹن خان کی فکر لاحق تھی۔

''یہاں سے کوئی بھی نہیں جائے گا...... جب تک میں نہیں کہوں گا۔'' اچانک سر ندیم نے پستول لہراتے ہوئے کہا جو کیپٹن خان نے ان کو نکلتے وقت تھمایا تھا۔

سب کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ وہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو ندیم؟'' سرمد صاحب کی آواز غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

''وہی کہہ رہا ہوں جو تم سب سن رہے ہو، میں تم لوگوں کو اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔ تم سب یہیں مرو گے۔'' سر ندیم کی آواز غصے کی شدت سے بھیانک ہو گئی تھی۔

''سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا اچانک۔'' سجاد نے ڈرتے ڈرتے کہا جبکہ لڑکیاں تو ایسے خاموش تھیں کہ اگر بولیں تو شاید ابھی گولی ماردی جائے گی۔

''میں کوئی ندیم نہیں ہوں ..... میرا نام ڈیوڈ کوہن ہے۔ ندیم نام کا بندہ دس سال پہلے میرے ہی ہاتھوں مارا گیا۔ اس کی شکل و شباہت مجھ سے ملتی تھی اس لیے مجھے اس کی جگہ لینے میں بہت آسانی ہوئی۔ دوسرا وہ قبائلی تھا اور اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا لیکن اب مجھے یہ ملک چھوڑنا پڑ رہا ہے اور اس کے ذمے دار تم لوگ بھی ہو۔''

''کیا......؟ تم نے کس مقصد کے لیے ایسا بے ہودہ اور انسانیت سوز کام کیا۔'' سرمد صاحب نے حیرت اور صدمے کے ملے جلے تاثرات سے پوچھا۔

''عظیم اسرائیل کی خدمت کے لیے۔ تمہاری یونیورسٹی میں اس مشن کا کوآرڈینیٹر تھا۔ میں اور میرے نیچے کام کرنے والے بھی نہیں جانتے تھے کہ باس بن کر ان کو ہدایات بھی میں ہی دیتا تھا یا کبھی کبھار میرا نائب بن کر کوئی اور ہدایات دے دیتا تھا۔ میرا یہ بہروپ کامیابی سے چل رہا تھا لیکن تمہارے وہ دیسی ہیرو وقاص نے مجھ سے اُلجھ کر مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اس ہیرو اور اس کیپٹن کا کام تمام کرنا ہی تھا۔ اسی لیے میں نے یہ ٹرپ منظور کروایا تھا کہ سب کو ایک ساتھ ہی مار ڈالوں گا۔ سائرہ اور شائستہ بھی ہمارے لیے ہی کام کرتی تھیں لیکن جب انہوں نے ہمارے خلاف جانے کا سوچا تو مجھے انہیں راستے سے ہٹانا پڑا...... تم سب تو یہیں مر جاؤ گے اور نیچے تہ خانے میں وہ تمہارے نجات دہندگان لیکن میں آزاد رہوں گا اور یہاں سے جلد چلا جاؤں گا۔ میں نے اس عمارت کا خود کار نظام ایکٹیویٹ کر دیا ہے، ایک گھنٹے تک تم کو یہاں رکنے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ہم تمہارے ملک اور تمہاری قوم کو تباہی کے دہانے تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔'' سر ندیم یعنی ڈیوڈ کوہن زہر اُگل رہا تھا۔

''تمہارے ناپاک ارادے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ تمہارا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔ تم بھی کتے کی موت مرو گے جیسے اس ملک کے دشمن ہمیشہ مرتے رہے ہیں۔'' عائزہ نے ایک فوجی کی بیوی ہونے کے ناتے مقدور بھر جواب دیا۔

''کتے کی موت تو تمہارا شوہر مرے گا ..... اور یہ تمہارا لاڈلا بھی۔'' ڈیوڈ کوہن نے پستول کا رخ حسن کی جانب کر دیا۔

عائزہ نے چیخ مارتے ہوئے حسن کو اپنی گود میں چھپا لیا۔ لیکن ڈیوڈ کوہن کے سر پر موت سوار تھی۔ اس نے حسن اور عائزہ کی جانب پستول کر کے ٹریگر دبایا ہی تھا کہ کوئی اس سے ٹکرایا اور اسے لیتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ پستول سے ہونے والے فائر کی آواز دور تک گونجی تھی۔

یہ ظہیر احمد عرف جیرا تھا۔

اس نے نیچے تہ خانے میں جوشن کے نکلنے کے بعد کنٹرول روم کا رخ کیا تھا۔ وہ یہاں دوسری دفعہ آیا تھا۔ ورنہ اسے حصار اور مدار کی دیکھ بھال کے لیے ہی رکھا ہوا تھا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ اس نے کنٹرول روم میں آ کر وہاں سے کیپٹن خان اور وقاص کو گارڈز کے ساتھ لڑتے

دیکھا۔ اُسے لگا کہ اب یہاں رکنا ٹھیک نہیں اس لیے وہ چپ چاپ باہر کا راستہ تلاش کرتے ہوئے اسی جانب آنکلا تھا جہاں ڈیوڈ کوہن نے سب کو پستول کی زد پر لیا ہوا تھا۔

اس نے انتہائی توجہ اور خاموشی سے ڈیوڈ کوہن کی تمام باتیں سنی تھیں۔ وہ جوشن کے پاس صرف اپنے ذہنی اور قلبی سکون کی خاطر رہتا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ مقدس جام تھورس کے نام پر اسے نشہ آور اور خوش ذائقہ مشروب پلایا جاتا ہے۔ جس کے بعد انسان جز وقتی اپنی پریشانیاں اور غم بھول جاتا ہے۔ وہ اس کو روحانیت اور نفس کشی ہی سمجھتا رہا تھا۔ کیونکہ تھورس کے اجزائے ترکیبی اسے خود بھی معلوم نہیں تھے۔ لیکن جب اس نے ڈیوڈ کوہن کی باتیں سنیں تو اس کے اندر کا حُبُ الوطن شخص پوری طرح انگڑائی لے کر بیدار ہو چکا تھا۔

یہی سوچ کر اس نے ڈیوڈ کوہن پر چھلانگ لگا دی تھی۔ عین اسی لمحے ڈیوڈ کا پستول بھی چل گیا تھا اور وہ دونوں لڑھکتے ہوئے دور جا گرے۔ زمین پر جا بجا خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ گولی اپنے اصل ہدف یعنی عائزہ اور حسن کے بجائے ظہیر کے پہلو میں جا لگی تھی۔ جبکہ پستول ان دونوں سے کافی دور جا گرا تھا۔

اس سے پہلے کہ ڈیوڈ کوہن سنبھل کر دوبارہ پستول کی جانب جاتا، ظہیر احمد غراتا ہوا اس پر جھپٹ پڑا۔ اس نے ڈیوڈ کوہن کی گردن اتنی مضبوطی سے جکڑ لی تھی کہ اسے اسے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں۔

”خبیث انسان! تم نے ہمارا لباس اتروایا...... تم ہمارے ملک کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم تیری نسلوں کو تباہ کر دیں گے۔“ وہ ابھی تک اپنا لباس تبدیل کرنے والی بات نہیں بھولا تھا۔ اس کا پٹھانی خون جوش مار رہا تھا۔ وہ ایک سچا اور مخلص پاکستانی تھا جو اپنے ملک کے خلاف اتنی بھیانک سازش سن کر آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

اس سے قبل کہ ڈیوڈ جان سے جاتا، سجاد اور سرمد نے بہت مشکل سے اُسے روکا۔ پھر وہ اسے باندھ کر بس میں لے آئے۔

جیرا جاں کنی کے عالم میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ خون کے مسلسل اخراج نے اس کی حالت کافی خراب کر دی تھی۔ ڈیوڈ کوہن کو بس میں مضبوطی سے جکڑ کر وہ جیرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے اسے ابتدائی طبی امداد دینے کی کوشش کی تو جیرا منع کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے کسی علاج کی ضرورت نہیں جناب...... میں اسی میں خوش ہوں کہ اپنی مٹی پر جان دے رہا ہوں اور وطن کے دشمنوں کے ہاتھوں میری جان جائے گی۔ میں اتنا عرصہ ان لوگوں کے درمیان رہا لیکن مجھے علم نہ ہو سکا۔ ورنہ ایسے ملک دشمنوں کے ساتھ کبھی نہ رہتا۔ لیکن اب میں سکون سے مر سکوں گا۔ میں نے اپنے ملک کے لیے جان دی ہے۔ آپ مہربانی کریں اور نیچے سے اپنے دونوں ساتھیوں کو نکال لیں۔ میں جس طرف سے آیا ہوں، یہاں سب سے آسان راستہ ہے نیچے جانے کا...... دیر مت کریں اس سے پہلے کہ یہ جگہ دھماکے سے اُڑ جائے۔“

یہ تشویش بجا تھی۔ اس دفعہ سجاد نے ہمت کی اور جلدی سے اس رخ چلا گیا جہاں سے جیرا برآمد ہوا تھا۔ اسے جلد ہی وہ راستہ مل گیا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جا رہا تھا کہ یہاں جیرے نے کئی لمبے لمبے سانس لیے اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ سرمد صاحب سمیت وہاں سب مغموم ہو گئے۔ ان کی جیرے سے ایک معمولی سی شناسائی تھی لیکن اس کے کام اور ہمت نے ان سب کو اس کا قرض دار بنا دیا تھا۔ وہ دل گرفتہ ہو کر سجاد کا انتظار کرنے لگ گئے تاکہ وہ کیپٹن خان اور وقاص کو جلدی یہاں لے آئے۔

سدرہ کی بے چینی عروج پر تھی۔ اس نے وقاص کی آنکھوں میں وہ شدت دیکھ لی جو کب سے دیکھنے کی آرزو مند تھی۔ اب اسے وقاص کی سلامتی کی فکر سب سے زیادہ تھی۔ اپنی ذات سے بھی کہیں زیادہ...... اس کی بے چین نظریں اسی سمت مرکوز تھیں جہاں سے سجاد اندر گیا تھا۔

☆☆☆

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی وقاص کو علم ہو گیا تھا کہ یہ کنٹرول روم ہے اور یہاں کافی ریکارڈ بھی پڑا ہوا ہے۔ اس کے سامنے اسکرین پر مرکز یعنی اس تہ خانے کے سبھی کیمروں کی براہِ راست ریکارڈنگ نظر آرہی تھی۔ اس نے تجسس سے مجبور ہو کر ریکارڈز چیک کرنے شروع کر دیے۔ جیسے جیسے وہ ریکارڈ چیک کر رہا تھا اس کا دماغ گھومتا جا رہا تھا۔ وہاں فحش فلموں اور تصاویر کا انبار موجود تھا۔ اور یہ زیادہ تر مقامی اور علاقائی مواد تھا جس پر تصاویر کے ساتھ ساتھ ان کا نام پتا اور فون نمبر تک لکھا ہوا تھا۔ وقاص کے لیے یہ سب ایک بھیانک خواب سے کم نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے ملکی حالات اور نوجوان نسل کے رجحانات کا علم نہیں تھا لیکن یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ اسی دوران اسکرین پر نظر پڑی تو اسے عاصم نظر آیا۔ وہ شاید کسی دوسرے راستے سے کمرے

سے نکل کر کیپٹن خان کو پیچھے سے شکار کرنا چاہتا تھا۔ پھر اسے سجاد بھی نظر آگیا جو کسی راہداری میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے آرہا تھا۔

”اب یہ کارٹون کدھر چلا آیا ہے۔“ وقاص بڑبڑایا۔

یہاں کے خطرات کا اسے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا اس لیے سجاد کو یہاں دیکھ کر پریشان ہوا تھا۔ دوسرا کیپٹن خان کو آگاہ کرنا ضروری تھا۔ ورنہ عاصم اگر عقب سے ان پر حملہ کرتا تو ان کے بچنے کے امکانات بہت کم ہوتے۔ اس نے جلدی سے کنٹرول روم چھوڑا اور بھاگتا ہوا اسی جانب آگیا جہاں کیپٹن خان گھات لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے درمیان وہ دروازہ حائل تھا جس کے پیچھے رجب اور خالد پوزیشن لے کر بیٹھے تھے کیونکہ عاصم تو یہاں سے نکل کر کسی اور سمت سے آنے والا تھا۔

کیپٹن خان نے وقاص کو دیکھ کر اشارے سے پوچھا کہ وہ واپس کیوں آیا ہے۔

وقاص نے بھی اشاروں کی زبان میں بتایا کہ عاصم یہاں سے نکل گیا ہے اور ہو سکتا ہے وہ پیچھے سے حملہ کرے۔

اس سے پہلے وہ کچھ سمجھ پاتا کیپٹن نے طویل سانس لے کر گن جھکالی۔ وقاص پیچھے مڑا تو سجاد اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”یہاں کسی کا ولیمہ نہیں ہو رہا جو پھر آگئے ہو۔“ وقاص نے کڑوے لہجے میں کہا۔

”وقاص، جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل چلو، یہ جگہ دھماکے سے اُڑنے والی ہے۔ ہم کو ندیم صاحب...... میرا مطلب ہے ڈیوڈ کوہن نے بتایا ہے......“ سجاد نے کہا۔

”ڈیوڈ کوہن؟ یہ کون سا نیا سائنسدان پیدا ہو گیا تم لوگوں میں۔ واپس آجا باب...... اور جلدی جلدی جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جا...... ہم بھی بس آرہے ہیں......“ وقاص پر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا۔

لیکن ڈیوڈ کوہن کا نام سن کر کیپٹن خان کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ انہوں نے وقاص کی طرف گن پھینک کر کہا۔

”تم مجھے کور دو، میں تمہاری طرف آرہا ہوں۔ یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں گے بہتر ہو گا۔“

وقاص نے گن پکڑ کر ایک راحت محسوس کی۔ حالانکہ اس نے زندگی میں چھوٹے پستول کے سوا کچھ نہیں چلایا تھا۔ لیکن اسے آٹومیٹک گن چلانے کا کافی اندازہ تھا۔ وہ گن لوڈ بھی تھی اور تیار بھی، صرف ٹریگر دبانا باقی تھا۔ اس لیے اس نے کوئی پس و پیش نہیں کی۔ کیپٹن خان نے راہداری میں موجود ایگزاسٹ فین بند کیے اور ایک، دو، تین کے اشارے پر چند قدم پیچھے ہٹ کر دوڑنے کے انداز میں راہداری کو فرنٹ سمر سالٹ کرتے ہوئے عبور کیا۔ اس دوران میں وقاص نے دروازے کی طرف سات آٹھ سنگل شاٹ فائر کر دیے تھے۔

اندر سے فائرنگ کا جواب آیا تھا لیکن اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکا تھا۔ ایگزاسٹ فین بند کرنے کے پیچھے کیپٹن خان کی احتیاط شامل تھی۔

”سر مجھے راستے کا پتا ہے۔ آپ میرے پیچھے آئیں۔“ سجاد نے کہا اور بھاگنے کے انداز میں دوسری سمت چل پڑا۔

کیپٹن خان نے وقاص سے گن واپس لی اور سجاد کے پیچھے ہو لیے۔ وقاص درمیان میں تھا جبکہ کیپٹن سب سے پیچھے تھے۔ وہ محتاط انداز میں اپنے عقب سے بھی باخبر تھے کہ کہیں عاصم یا اس کے ساتھی باہر نکل کر فائرنگ نہ کر دیں۔

ان کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ انہیں اپنے عقب میں دوڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اب اس مقام کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں سے تنگ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔

کیپٹن خان آخری زینے پر تھے کہ عاصم راہداری سے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موجود گن کا رخ کیپٹن کی جانب تھا۔ کیپٹن خان کو بھی عاصم کی جھلک نظر آگئی تھی۔ اس کی ایک آنکھ ابھی تک معضروب حالت میں تھی۔

کیپٹن خان پہلے سے تیار تھے اس لیے نشست باندھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عاصم کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ واپس مڑتا اس لیے اس نے فائر کرنا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن کیپٹن خان جیسی برق رفتاری کا مظاہرہ اور نشانہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

کیپٹن خان کی گن سے نکلی ہوئی گولی اس کے ماتھے کے عین درمیان پیوست ہو گئی۔ جبکہ اس کی چلائی ہوئی گولی...... کیپٹن کی ٹانگ کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

اس کے پیچھے رجب اور خالد ابھی آرہے تھے لیکن کیپٹن نے اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جلدی سے اس تہ خانے سے باہر آئے اور اس جانب چل دیے جہاں سب لوگ موجود تھے۔

رجب اور خالد...... عاصم کے پاس پہنچے اور اس کی لاش کے قریب خوفزدہ ہو کر بیٹھ گئے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ یہاں سے باہر نکل کر دیکھتے کہ اوپر کیا ہو رہا ہے۔

ان کو ابھی بھی امید تھی کہ یامین یا جوشن میں سے کوئی آکر معاملات کو سنبھال لے گا مگر ان کے گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہ یہاں سے فرار ہو گئے ہوں گے۔

کیپٹن خان نے جیرے کی لاش کو بس کی سب سے پچھلی سیٹوں پر منتقل کیا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ڈیوڈ کوہن وہیں بندھا پڑا تھا۔ لیکن فی الحال اس پر توجہ دینے سے زیادہ اہم یہ تھا کہ یہ جگہ فوری طور پر چھوڑ دی جائے۔ کیپٹن خان گیس کمل چھوڑ کر آئے تھے اور وہاں دوسرا دھماکا بھی ہونے والا تھا۔

مرکزی شاہراہ ابھی چند قدم دور تھی کہ ایک فلک شگاف دھماکا سنائی دیا۔ یہ یقیناً مرکز کی تباہی و بربادی کا عندیہ تھا۔ وقاص نے یہ آواز سن کر ایک عجیب سی راحت محسوس کی۔ کیونکہ وہاں موجود ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کی فحش تصاویر اور فلمیں بھی اس دھماکے کے ساتھ خاک ہو گئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی وہ تینوں ننگِ آدمیت اور غدارِ وطن اور وہ دو عفریت نما گارڈز بھی لقمۂ اجل بن گئے۔ وہ سب کچھ تو تبدیل یا ختم نہیں کر سکے تھے لیکن اپنے حصے کا محاذ انہوں نے بخوبی جیت لیا تھا۔

وقاص نے اپنی محبت سدرہ کو بھی پالیا تھا۔

☆☆☆

دارالحکومت کے ائرپورٹ لاؤنج میں مسافروں کی قطار میں دو شخص ایسے بھی تھے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی جانب وقتاً فوقتاً دیکھ لیتے تھے۔ آخر کار بورڈنگ کا اعلان ہوا تو وہ دونوں دھیمی چال چلتے ہوئے بظاہر ایک دوسرے سے بے پروا ائرپورٹ کے اندرونی حصے کی طرف چل دیے۔ پاسپورٹ کاؤنٹر پر انہوں نے اپنا مقامی پاسپورٹ دکھایا جس پر ایک پڑوسی خلیجی ملک کا ویزا موجود تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی نے مسکرا کر سفر کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

چیکنگ اور دوسرے مراحل سے بخوبی گزر کر وہ طیارے میں سوار ہو گئے۔ ان کی سیٹیں ایک ساتھ تھیں۔ اس لیے سیٹوں پر بیٹھ کر انہوں نے کافی طمانیت محسوس کی۔

”کیسے ہیں مسٹر سالومن اینڈ مسٹر بن یامین۔“

انہیں عقبی سیٹ سے آواز سنائی دی۔ انہوں نے گھوم کر دیکھا تو کیپٹن افضال خان مسکراتے ہوئے نظر آئے۔

وہ جوشن اور یامین تھے۔ جن کے اصل نام سالومن اور بن یامین تھے۔ انہوں نے سیٹ سے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن اسی وقت دوسری سیٹوں پر موجود وفاقی ایجنسی کے اہلکار اٹھے اور ان کو قابو کر لیا۔ سب سے پہلے ان کی جامہ تلاشی اور منہ کھول کر دیکھا گیا کہ کہیں کوئی زہریلا کیپسول کھا کر اپنی جان نہ دے دیں۔ پھر ان کو انتہائی احتیاط اور رازداری سے گرفتار کر کے ایجنسی کی تحویل میں دے دیا گیا۔

یہ ایک ڈمی طیارہ تھا جس میں کوئی مسافر نہیں تھا صرف ایجنسی کے اہلکار ہی تھے۔ ڈیوڈ کوہن سے بہت سی کام کی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ چونکہ وہ ان کا باس بھی تھا اس لیے اسے معلوم تھا وہ کن پاسپورٹ اور کن ناموں سے سفر کریں گے۔ یہ ایگزٹ پلان وہ بہت پہلے طے کر چکے تھے۔ ڈیوڈ کوہن کی گرفتاری بھی پوشیدہ ہی رکھی گئی تھی اور کیپٹن خان نے یونیورسٹی کے تمام لوگوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس واقعہ کا کہیں ذکر نہ کریں۔ کیونکہ یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے۔ سب نے اس بات کی یقین دہانی کروائی تھی کہ مرتے دم تک اس راز کی حفاظت کی جائے گی۔ ظہیر احمد کو اس کے آبائی گاؤں پہنچا دیا گیا تھا جس.... کی تدفین عزت و تکریم سے ہوئی تھی لیکن اصل معاملات سے انہیں بھی بے خبر رکھا گیا تھا۔

ڈیوڈ کوہن اور بن یامین کے مشترکہ مشن کا نام دی سرکل تھا جو خصوصاً پاکستان میں لانچ کیا گیا تھا۔ یہ انتہائی کامیابی سے جاری تھا لیکن کیپٹن خان کے ونگ کی ان پر نظر پڑ گئی۔ یہ یونیورسٹی میں ہونے والی دو لڑکیوں کی اموات سے شروع ہوا۔ اور پھر آہستہ آہستہ ان کے گرد گھیرا تنگ ہوتا گیا۔ کیپٹن خان نے عاصم کے موبائل سے کافی معلومات حاصل کی تھیں اور اس کو ہیڈ کوارٹر بھی بھیج دیا تھا تاکہ اگر یہ دونوں فوری طور پر نکلنا چاہیں تو پکڑے جائیں۔ لیکن انہوں نے مرکز کی تباہی اور ڈیوڈ کوہن کی گمشدگی کو.. پُراسرار سمجھا اور ایک مہینہ انتظار کرنے کے بعد ملک چھوڑنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے مطابق ڈیوڈ کوہن یعنی ان کا باس انڈر گراؤنڈ ہو گیا تھا اسی لیے انہوں نے پہلے سے طے سیفٹی پروٹوکول پر عمل کرتے ہوئے وہی پاسپورٹ استعمال کیے جن کے متعلق ڈیوڈ کوہن بریفنگ دے چکا تھا۔

کیپٹن خان اور ان کی ٹیم نے مشن دی سرکل کو کاؤنٹر مشن اینٹی سرکل سے ناکام بنا دیا۔ ایک دفعہ پھر صیہونی سازش بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اپنا زہر جو اس معاشرے میں داخل کر چکے تھے، اس کا علاج کسی ایجنسی یا کسی سیکیورٹی ادارے نے نہیں بلکہ معاشرے کے ذمے دار لوگوں اور شہریوں نے کرنا تھا۔ یہی واحد صورت ہماری بقا کی تھی۔

چاہ کن را

اسما قادری

جھوٹ بولنا کوئی اضطراری غلطی نہیں... نہ ہی اسے اتفاقی حادثہ قرار دیا جاسکتا ہے...یہ کردار کی خاصیت ہوتی ہے...کسی شخص میں اس کی جڑیں گہرائی تک ہوتی ہیں...ایسی ہی ایک ہستی کے...کردار کے مختلف روپ...وہ ہر روپ میں مختلف نظر آتی تھی...دیکھنے والے اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ اس کا یہ روپ سراب ہے...فریب ہے...جھوٹ کی علامت ہے...جھوٹ اور سچ میں کتنا فاصلہ حائل ہے...اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا... مگر قدرت اپنے فیصلے اور حقیقت کو سامنے ضرور لاتی ہے...جس طرح وہ دن کو رات میں بدل دیتا ہے اور رات کی سیاہی کو صبح کے اجالے میں...ایسے ہی مکر و فریب میں ڈوبے فریب کاروں کے چہروں کو عیاں کرتی تحریر کے پیچ و خم...

چاہ کن را چاہ درپیش کی عملی تفسیر......نفرت و محبت کا چٹکھارتی تگ

اُس نے جیپ حویلی کے عقب میں روکی تو اس کا پورا وجود لالچ، انتقام اور حسد کی آگ میں جل رہا تھا۔ اگر ان تین جذبوں نے اس کے دل میں جنم نہ لیا ہوتا تو وہ کبھی اتنا بڑا فیصلہ نہ کر پاتا جسے کرنے کے بعد رات کے آخری پہر یہاں آیا تھا۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان تینوں جذبوں میں سے کون سا جذبہ زیادہ طاقتور تھا جس نے اسے قتل جیسے فعل کے ارتکاب پر راضی کر لیا تھا اور قتل بھی اپنے سگے چچا کا۔ ایسے

چچا کا جنہوں نے اس کے والد کی وفات کے بعد اس کی مکمل کفالت کی تھی۔ اس قابل بنایا تھا کہ آج وہ ایک بڑی فرم میں اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں ایک لگژری فلیٹ اس کی ملکیت تھا اور شائستہ جیسی پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی اس کی زندگی کی ساتھی تھی۔ زندگی میں حاصل ہونے والی ان ساری نعمتوں کے لیے وہ ہمیشہ اپنے چچا کا ممنون رہا تھا لیکن ایسا صرف اس وقت تک تھا جب تک کچھ حقائق اس کے علم میں نہیں آئے تھے۔ حقائق سے آگہی نے جہاں اُسے انتقام کے جہنم میں لاکھڑا کیا تھا وہیں اس لالچ نے بھی دل میں جنم لیا کہ اتنی وسیع و عریض جائداد کے ہوتے ہوئے وہ صرف اچھی نوکری، گاڑی اور لگژری فلیٹ پر کیونکر قانع ہوسکتا ہے جبکہ اس کے ہاتھوں کی لکیریں بھی کہتی ہیں کہ اس کے نصیب میں ایک بڑی دولت لکھی ہے۔ خیرہ کر دینے والی اس دولت کی چمک نے اسے خود سے تیرہ سال چھوٹے بھائی اور چچا کے اکلوتے بیٹے حسان کی محبت بھی بھلا دی تھی۔ پندرہ سالہ حسان جس سے وہ بھی بہت محبت کیا کرتا تھا، اس کے لیے بھی اس کے دل میں اب صرف حسد کے جذبات رہ گئے تھے اور جب جب یہ خیال آتا تھا کہ چچا کے نام پر موجود وسیع و عریض جائداد مستقبل میں حسان کو منتقل ہو جائے گی اور وہ جو آج چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کی عزت کرتا ہے، کل مضبوط مالی حیثیت کی وجہ سے خود کو اس کے مقابلے میں برتر محسوس کرنے لگے گا، تب حسد کا جذبہ مزید فزوں تر ہو جاتا تھا۔ تو لُبِ لباب یہ تھا کہ زوہیب علی ان تینوں جذبات سے مغلوب اپنے اکلوتے سگے چچا کو قتل کرنے کے ارادے سے وہاں آیا تھا۔

ہمیشہ کی طرح کھلے بندوں حویلی کے مرکزی گیٹ کے سامنے اپنی گاڑی روک کر ہارن بجا کر گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے کے بجائے عقبی سمت گاڑی لا کر روکی تھی۔ اسی حویلی میں پل بڑھ کر جوان ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ پچھلی طرف کے چھوٹے دروازے کا سال خوردہ تالا تھوڑی سی کوشش پر اپنی اصل چابی کے بغیر بھی کھل جاتا ہے۔ گاؤں میں اس کے چچا کی بڑی عزت تھی۔ وہ ایک مہربان زمیندار سمجھے جاتے تھے اور لوگ جانتے تھے کہ اگر وہ اپنی ضرورت لے کر زمیندار کے رُوبرو جائیں گے تو وہ ضرور ان کی حاجت پوری کریں گے اس لیے کسی کو ضرورت نہیں پڑی تھی کہ وہ زمیندار کی حویلی پر نقب لگاتا۔ نقب لگنے کا ڈر نہیں تھا اس لیے حویلی میں پہرے داروں اور حفاظتی تدابیر کی طرف بھی زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا تھا اور کبھی کسی نے خیال نہیں کیا تھا کہ عقبی دروازے کا کمزور تالا بدل دیا جائے۔ مکینوں کی یہ بے پروائی آج زوہیب کے لیے مددگار بن گئی تھی۔

دروازے کے قریب جیپ روک کر اترنے کے بعد اس نے اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور اندھیرے میں ہی اندازے سے تالے کے سوراخ میں لگائی۔ اس کے یقین کے مطابق تالے نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور ذرا سی کوشش کے نتیجے میں کھٹاک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ تالا کھلنے پر اس نے پہلے احتیاطاً اپنے چہرے پر نقاب چڑھایا اور پھر دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ جس حصے میں وہ تھا وہاں ایک قطار سے بنے ہوئے کمروں کی عقبی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ اس وقت تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اپنے مشاہدے کی بنیاد پر وہ بتا سکتا تھا کہ کن دو کمروں کے اے۔سی اس وقت چل رہے ہیں۔ یہ دو کمرے حسان اور اس کی ماں کے تھے۔ ان کمروں کے عقب سے گزرتا ہوا وہ آخری سرے پر پہنچا تو چھت کی طرف جانے والی سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ وہ آہستگی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اے سی کی سہولت کے باوجود اس کے چچا گرمیوں کی راتوں میں اپنے کمرے میں سونے کے بجائے اوپر چھت پر سونے کے عادی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کمرا بند کر کے اے سی چلا کر سونے میں انہیں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے سو اُن کی عادت سے واقف وہ انہیں قتل کرنے کے لیے چھت پر جا رہا تھا۔

اس نے اپنا پسٹل نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا اور ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ چچا کا وفادار ملازم غلام محمد بھی ان کے ساتھ ہی چھت پر ہوتا ہے اور ان کی چارپائی کے پائینتی اپنا بستر ڈال کر سوتا ہے تاکہ کسی بھی پہر مالک کو کوئی ضرورت پڑنے پر پہلی پکار میں حاضرِ خدمت ہو جائے تو یوں اسے ایک نہیں دو قتل کرنے تھے۔ چچا کو قتل کرنے کے بعد وہ ان کے نمک خوار ملازم غلام محمد کو چشم دید گواہ کی حیثیت سے زندہ تو نہیں چھوڑ سکتا تھا نا؟ تو وہ دو عدد انسانوں کے قتل کے ارادے سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔

”تم مجھے بہت پیارے ہو زوہیب! حسان تو دوسرے نمبر پر میری زندگی میں آیا ہے لیکن تم تو پہلے پیار کی طرح ہو جسے آدمی ہمیشہ سب سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہے۔“ آخری سے تیسری سیڑھی پر اس کے ذہن میں چچا کا یہ جملہ گونجا تو اس کے قدم رک گئے۔

”اونہہ پہلا پیار...... کون تھا ان کا پہلا پیار میں یا......“ محبت قدموں کی زنجیر بن جاتی اس سے قبل ہی ایک تنفر بھری سوچ ابھری اور اس نے اگلے قدم بھی پر رکھے۔

”میں اگر انہیں سب سے بڑھ کر عزیز ہوتا تو وہ مجھے نوکری کرنے کراچی جانے دیتے؟ وہ اتنے بحیثیت ہیں کہ اگر چاہتے تو مجھے کوئی مل لگا کر دے سکتے تھے لیکن وہ مجھ پر پیسا کیوں خرچ کریں گے۔ انہوں نے یہ ساری دولت اپنے سگے بیٹے حسان کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے لیکن میں بھی دیکھوں گا کہ کیسے ان کا بیٹا اس دولت پر عیش کرتا ہے۔“ نفرت بھری سوچوں کے ساتھ اس نے آخری زینہ بھی عبور کر لیا۔ اب وہ چھت پر کھڑا ہوا تھا اور چھت کے عین درمیان بچھی چچا کی چارپائی اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ غلام محمد بھی اپنی مخصوص جگہ پر چاروں ہاتھ پیر پھیلائے سو رہا تھا۔ وہ بلی کی سی محتاط چال چلتا ہوا چارپائی کی طرف بڑھا۔ وہاں روشنی نہیں تھی۔ چاند کی آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے آسمان خالی پڑا تھا اور تاروں کی مدھم روشنی میں منظر اتنا صاف نہیں تھا بس ہیولے سے ہی نظر آ رہے تھے۔

اپنے سائلنسر لگے پسٹل سے فائر کرنے کے لیے بالکل تیار وہ چچا کی چارپائی کے قریب پہنچا اور ان کے سینے کا نشانہ لیا۔ لیکن ایک بار پھر ڈگمگا گیا۔ اسی پل اس کی آنکھوں کے سامنے خون کی چادر سی تن گئی۔ وہاں وہ چچا کا خون تھا جو ان کے صحت مند جسم سے بہہ کر چارپائی سے نیچے ٹپک رہا تھا اور ان کی بے نور کھلی ہوئی آنکھیں گویا اسی کو تک رہی تھیں۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ ناکافی روشنی میں خون کی رنگت سیاہ نظر آ رہی تھی لیکن بہرحال وہ خون تھا جو اعلان کر رہا تھا کہ اس کے چچا مر گئے تھے اس کے اکلوتے سگے چچا جنہوں نے ہمیشہ اس سے مہربانی کا سلوک کیا تھا جن کی انگلی تھام کر اس نے چلنا سیکھا تھا، جن کے سینے سے لگ کر وہ اپنے باپ کے مرنے کا غم بھول گیا تھا اور جن کی ہر تھپکی اسے آگے بڑھاتی تھی، وہ چچا مر گئے تھے۔ اگرچہ وہ انہیں مارنے کے لیے ہی یہاں آیا تھا لیکن اب جبکہ وہ مر گئے تھے تو اسے لگ رہا تھا کہ اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ شدید دہشت کے عالم میں وہ پلٹ کر بھاگا تو غلام محمد کے جسم سے اس کا پیر اُلجھ گیا۔ اس نے خود کو گرنے سے تو بچا لیا لیکن یہ محسوس نہ کر سکا کہ اس کی ایک چیز وہیں گر گئی ہے۔ وہ بدحواس تھا اور جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا اس لیے آتے وقت جتنی احتیاط سے آیا تھا اب اتنی ہی بے احتیاطی سے بھاگتا ہوا وہاں سے نکل رہا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ ابھی غلام محمد اٹھے گا اور اپنے مالک سے وفاداری نبھانے کے لیے اسے پیچھے سے جکڑ لے گا۔ گرتا پڑتا نہایت تیزی سے وہ نیچے پہنچا تو کسی کی زوردار آواز گونجی۔

”کون ہے، کون ہے وہاں؟“ یقیناً یہ حویلی کا کوئی ملازم تھا جس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس پہلی آواز کے ساتھ ہی گویا ڈھیر ساری آوازیں جاگ اٹھیں۔ ہٹو، پکڑو، جانے نہ پائے کی صدائیں سنتا ہوا وہ برق رفتاری سے بھاگا۔ چوکیدار وغیرہ مین گیٹ پر حویلی کے اگلے حصے کی طرف ہوتے تھے اور ان کے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ عقبی دروازے سے فرار ہو سکتا تھا۔ کمروں کے عقبی حصے کی طرف سے گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ کسی کمرے کی کھڑکی کھلی ہے کس کمرے کی کھڑکی؟ پلٹ کر یہ دیکھنے کی اس کے پاس مہلت نہیں تھی۔ وہ بھاگتا ہوا عقبی دروازے سے باہر نکلا اور جیپ میں سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی جیپ ہوا سے باتیں کر رہی تھی اور چیختی چلاتی آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اسے فرار ہوتا دیکھ کر اس کے تعاقب میں حویلی سے بھی گاڑیاں نکلیں گی لیکن ڈرائیونگ میں اپنی مہارت پر اسے پورا اعتماد تھا، جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔ اس کا یہ اعتماد غلط ثابت نہیں ہوا اور کسی کو اپنے تعاقب میں نہ پا کر وہ پورے اطمینان سے اپنی طے شدہ منزل کی طرف مڑ گیا۔ اس نے جو چاہا تھا وہ ہو گیا تھا لیکن اُلجھن اور دکھ نے اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ چچا کے مرنے کے بعد اس پر ایک عجیب و غریب انکشاف ہوا تھا اور وہ یہ کہ لالچ، انتقام اور حسد کے شدید جذبات کے باوجود اسے چچا سے محبت تھی۔ ان کی موت نے اس کے دل کو دکھ سے بھر دیا تھا۔

☆☆☆

آئے گا، آئے گا، آئے گا وہ آنے والا۔

شراب کی کھلی بوتل اور مے نوشی کے دیگر لوازمات حشمت علی کے سامنے دھرے تھے۔ وہ بڑے اہتمام سے پیتا ہوا چمکتی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت لیے مسکرا رہا تھا۔ اس کے بشرے سے انتظار کی کیفیت جھلکتی تھی لیکن یہ انتظار کسی عاشق کا انتظار نہیں تھا جس میں تھوڑی سی بے چینی، تھوڑا سا خوف، تھوڑی سی امید اور تھوڑا سا جوش پنہاں ہوتا ہے۔ یہ ایک گھاگ شکاری کا انتظار تھا جو پھندا لگانے کے بعد پُریقین ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ شکار اس کے لگائے پھندے میں لازماً پھنسے گا۔ ایسے شکاری کے ذہن میں پورا منصوبہ

ہوتا ہے کہ وہ اپنے شکار کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا۔ وہ بھی اپنے شکار کے انتظار میں تھا اور انتظار کے اس لطف کو مدہوشی سے دوبالا کر رہا تھا۔ انتظار کی اس کیفیت میں اسے زیادہ وقت نہیں گزارنا پڑا اور اس کا خاص خادم کامیابی کی نوید لیے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اس کے دربار میں حاضر ہو گیا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی نا؟ خیال رکھا تھا کہ پیچھے کوئی نشان پتا نہ چھوٹے؟'' اس نے رعب سے پوچھا۔

''آپ فکر نہ کریں سرکار اور بے خطر ہو کر مزے کریں۔ آپ کا خادم ہے نا سب فکریں سنبھالنے کو۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کے بھائی کا کیا کیا؟'' یقین دہانی کے باوجود وہ اپنی مکمل تسلی چاہتا تھا۔

''بے ہوش کر کے نہر کے پاس ڈال دیا ہے۔ کسی نے تلاش نہ کر لیا تو صبح سے پہلے ہوش میں آنے کا نہیں ہے۔'' خادم نے اسے تسلی کروائی۔

''چل پھر اسے بھی دیکھ لیتے ہیں جس کے لیے یہ سارا بکھیڑا پھیلایا ہے۔'' وہ خباثت سے مسکرا کر بولا تو خادم نے بھی اس کی پیروی میں مسکرانا ضروری جانا اور ادب سے بولا۔

''حاضر جناب۔'' اور پھر اگلے لمحے ہی اس کے سامنے وہ شکار حاضر کر دیا گیا جس کے لیے آج اس نے اپنی حویلی سے دور ڈیرے پر شب بسری کا انتظام کروایا تھا۔ گہرے سبز کپڑوں میں ملبوس وہ کوئی انیس بیس سال کی لڑکی تھی جس کا حسن بلاخیز گالوں پر لگے غازے، ہونٹوں کی سرخی، آنکھوں کے کاجل اور کانوں میں پہنی سنہری بالیوں کی وجہ سے کچھ اور بھی دوچند ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی گوری کلائیوں میں سبز اور سنہری چوڑیاں پہن رکھی تھیں جس میں سے چند ایک ٹوٹ کر اس کی کلائی کو زخمی کر گئی تھیں۔ وہ اصغر عرف اجگر کی پہلوٹی کی اولاد تھی اور اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اپنی عزیز سہیلی کی مہندی میں شرکت کے لیے جا رہی تھی کہ راستے میں دھر لی گئی۔ فنی خوشی سہیلی کی مہندی میں شرکت کے لیے جانے والی اس نوخیز کلیوں کی سی لڑکی کو کیا علم تھا کہ شکاری اس کی گھات میں بیٹھے ہیں اور وہ کسی کے دل پر ایسی چڑھی ہے کہ وہ اسے سُولی چڑھانے کا فیصلہ کر بیٹھا ہے۔ کسی کی کمین کی بیٹی کا کسی صاحبِ اختیار امیر زادے کے دل پر چڑھنا اصل میں اس کے سولی پر چڑھنے کے مترادف ہوتا ہے کہ وہ گھر میں تو اپنی ہم پلہ عورت کو ہی بساتے ہیں لیکن کمی کمینوں کی بیٹیوں کے پھول جیسے جسموں سے اپنی راتوں کو مہکانے میں انہیں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ وہ بھی اپنے دل پر چڑھی اجگر مزارعے کی پھول ایسی بیٹی کے وجود سے اپنی رات کو مہکانے کا اہتمام کیے بیٹھا تھا۔ صغریٰ نامی یہ لڑکی پچھلے ہفتے ہی اس کی نظروں میں آئی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ان چاولوں کی صفائی کے لیے حویلی آئی تھی جنہیں اس کے چھوٹے بھائی کی ولایت سے واپسی پر دیگوں میں بریانی کا روپ دھارنا تھا۔ حویلی کی خوشیوں کے موقع پر ایسی پُرتعیش غذا کا مزہ چکھنے والے گاؤں والوں کے معدوں کو بھرنا تھا۔ خوشی کے ان مواقع پر گاؤں کی عورتیں بلامعاوضہ ایک بلاوے پر حویلی دوڑی آتی تھیں کہ حویلی والے ایسے موقعوں پر بڑے دیالو بن جاتے تھے۔ ان کا یہ دیالوپن غریبوں کی چند ایک چھوٹی موٹی ناآسودہ خواہشوں کو پورا کرنے کا بہانہ بن جاتا تھا یوں خدمت کے لیے آنے والی صغریٰ مالک کے بیٹے کی نظر میں آ گئی اور اس نے اپنے خادم خاص جس کا نام بھی خادم تھا، کو اشارہ کر دیا تھا کہ یہ لڑکی اسے درکار ہے۔ خادم جو اس کے ہر حکم کی بجا آوری دل و جان سے کیا کرتا تھا، صغریٰ کو مالک کی خلوت گاہ میں پہنچانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔ اپنے ہی گاؤں میں ایسی کارروائی کے لیے احتیاط کی ضرورت تھی کہ بڑے زمین دار اپنے مزارعوں سے کام لینے میں کتنا ہی سخت سہی، ان کی عزتوں سے کھلواڑ ہرگز پسند نہیں کرتا تھا اور اس کے راج میں اس گاؤں کی ہر عورت کی عزت محفوظ تھی۔

احتیاط کے پیشِ نظر اس کی خواہش کے پورا ہونے میں ہفتہ بھر کا عرصہ لگ گیا۔ مخبر کے ذریعے اس بات کا کھوج لگایا گیا کہ آج صغریٰ اپنی سہیلی کی مہندی میں شرکت کے لیے چھوٹے بھائی کے ساتھ جانے والی ہے۔ اب یہ صغریٰ کی بدقسمتی تھی کہ اس کا باپ اجگر مزارع گاؤں کے باقی گھروں سے ذرا الگ تھلگ رہتا تھا اور اسے سہیلی کی مہندی میں شرکت کے لیے شام ڈھلنے کے بعد سنسان راستوں سے گزر کر جانا تھا۔ اپنا گاؤں تھا اور کبھی کوئی ایسا ویسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لیے ماں باپ نے بے خطر اسے چھوٹے بھائی کے ساتھ روانہ کر دیا اور وہ معصوم چڑیا سی لڑکی کو اپنی ہنستی کھیلتی زندگی سے نکال کر ایک امیر زادے کے عیش کدے میں پہنچا دیا گیا۔ اس عیش کدے میں وہ اپنی عزت ہی نہیں جان کی بازی بھی ہار گئی کہ رات کی سیاہی میں اپنا منہ کالا کرنے والے لوگوں کے سامنے معزز بنے رہنے کے لیے ایسی قربانیاں لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ صغریٰ غریب کی لاش بھی اگلے دن گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر پڑی ملی۔ گاؤں

بھر میں دکھ اور خوف کی فضا قائم ہو گئی۔ لوگوں نے زمیندار کے سامنے دہائی دی کہ اس کے راج میں ان پر کیسی قیامت گزر گئی۔ زمیندار نے مجرم کی تلاش کا وعدہ کیا لیکن مجرم کبھی پکڑا نہ جا سکا اور صغریٰ کی موت کا واقعہ وقت کی دھول میں دب کر رہ گیا۔ ایک غریب اور کمزور آدمی کی بیٹی کی عزت اور زندگی کی وقعت ہی کیا تھی جو کوئی ہمیشہ اس واقعے کو یاد رکھتا لیکن شاید کوئی تھا جو اس واقعے کو نہیں بھولا تھا اور اس کے دل میں انتقام کی آگ جلتی رہی تھی۔

☆☆☆

چند برسوں کے فرق سے کبھی کبھی بہت کچھ بدل جاتا ہے جیسا کہ شوکت علی کے ماموں کی بیٹی زبیدہ بدل گئی تھی۔ وہ ولایت سے ہو کر آیا تھا اور گوریوں کے سحر زدہ کر دینے والے بے حجاب حُسن کے جلوے دیکھتا رہا تھا لیکن دل ایسا اسیر کبھی نہیں ہوا تھا جیسا زبیدہ کے حسنِ سادہ کی ایک جھلک نے کر ڈالا تھا۔ اس کی ولایت سے واپسی کی خوشی میں اس کی ماں نے حویلی میں میلاد رکھوایا تھا۔ سارے خاندان کے ساتھ ماموں کے گھر والے بھی اس محفل میں شریک تھے اور ان شرکا میں موتیا رنگ کے خوب صورت لباس میں سر سے دوپٹا اوڑھے زبیدہ بھی شامل تھی۔ زبیدہ نے بڑے سلیقے سے جھکی نظروں کے ساتھ اسے اس کی کامیابی پر مبارک باد دی تھی اور چند جملوں میں ہی اس نے پرکھ لیا تھا کہ اس کی یہ کزن خاصے سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ زبیدہ کو ہی اپنی زندگی کا ساتھی بنائے گا۔

ان کے ہاں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں تھا اور پردیس میں رہتے ہوئے اس نے اپنی ماں کی یہ ہدایت سختی سے یاد رکھی تھی کہ کسی گوری میم کو بیاہ کر نہیں لانا ہے۔ اسے یقین تھا کہ زبیدہ کو زندگی کا ساتھی بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی لیکن زندگی اتنی سادہ کب ہوتی ہے۔ ماں کے سامنے زبیدہ کا نام لینے پر انکشاف ہوا کہ بڑوں کے درمیان زبیدہ کا رشتہ اس کے بڑے بھائی اور اس کا رشتہ چچا کی بیٹی سے طے ہو چکا ہے اور زبان سے پھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ صابر مزاج انسان تھا اس لیے اس انکشاف کو بھی صبر سے سہہ گیا اور زبیدہ کی اپنی بھابی کی حیثیت سے حویلی میں آمد کو کشادہ دلی سے قبول کر لیا۔ والدین بڑے بھائی حشمت علی کے ساتھ اس کی شادی بھی کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے چند سالوں کی مہلت مانگ لی۔ دو سال بعد چچا کے اصرار پر یہ مہلت ختم ہوئی اور سکینہ اس کی بیوی کی حیثیت سے حویلی آ گئی۔ وہ ایک ایماندار آدمی تھا جو سکینہ سے اپنے رشتے کو خلوص سے نبھانا چاہتا تھا لیکن سکینہ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری جہالت نے اسے اس رشتے کو نبھانے میں نڈھال کر دیا۔ وہ دیکھتا تھا کہ زبیدہ اس کے بھائی کی بدمزاجی، بے پروائی اور لاابالی پن کے باوجود کتنے وقار اور صبر کے ساتھ اس سے نبھا کر رہی ہے اور سکینہ اس کی ہر طرح کی خیال داری کے باوجود مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ اسے اس سے ہمیشہ شکوے اور شکایتیں ہی رہتی تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر اس سے اُلجھ پڑتی تھی۔ اس نے اسے کئی بار نرمی سے سمجھایا اور بھابی زبیدہ کی مثال بھی دی کہ وہ کیسے خاموشی سے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتی رہتی ہیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ مثال جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہو گی۔ اپنے تئیں وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس نے زبیدہ سے شادی کے سلسلے میں ماں سے جو بات چیت کی تھی، وہ بس اس کے اور ماں کے بیچ ہی رہی ہو گی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ حویلی میں موجود ملازموں کی فوج میں سے چند کو کن سوئیاں لینے اور حویلی کے راز اِدھر سے اُدھر کرنے کی شدید بیماری تھی۔ ان ہی ملازمین میں سے ایک ملازمہ نے ماں بیٹے کی گفتگو سن لی تھی اور سکینہ سے مراعات اور نوازشات حاصل کرنے کے چکر میں اسے اس راز سے آگاہ کر دیا تھا۔ سکینہ جو اپنی جہالت اور بدمزاجی کے باعث پہلے ہی اس کے لیے ایک مشکل عورت تھی، اس حقیقت سے آگہی کے بعد بالکل ہی ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ فطری طور پر وہ اپنے بھتیجے سے بہت محبت کرتا تھا لیکن سکینہ اس محبت کو چچا کی بھتیجے سے محبت کے بجائے عاشق کی محبوبہ کے بیٹے سے محبت گردانتی تھی اور آنے بہانے اسے طعنے دیتی رہتی تھی۔ وہ کبھی نرمی سے سمجھا کر اور کبھی اس کی باتوں کو نظرانداز کر کے ٹالتا رہتا تھا لیکن جب ایک دن سکینہ نے اس کی موجودگی میں معصوم بچے کے منہ پر طمانچے مارے تو وہ برداشت نہیں کر سکا اور پہلی بار سکینہ کے ساتھ سختی سے پیش آیا۔

سکینہ کہاں کچھ برداشت کرنے والی تھی۔ اُس نے ہنگامہ بپا کر کے رکھ دیا اور عورتوں کے روایتی ہتھکنڈے کو استعمال کرتے ہوئے میکے جا بیٹھی۔ بڑوں نے کوشش کی کہ ان کے درمیان مصالحت کروا دیں لیکن وہ اس عورت سے بیزار آ چکا تھا۔ ماں باپ نے زیادہ زور دیا تو صاف کہہ دیا کہ اگر اس سلسلے میں اسے مجبور کیا گیا تو وہ ولایت جا کر وہاں نوکری کر لے گا۔ اولاد کا دور جانا کسی کو گوارا نہیں ہوتا، وہ لوگ بھی ڈر گئے۔ خاص طور پر اس لیے

بھی کہ وہی تھا جس نے زمینوں کا سارا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ بڑے بیٹے کو تو کوئی پروا ہی نہیں تھی کہ جس زمین کی کمائی پر عیش کر رہا ہے، اس کو تھوڑا سا وقت بھی دے دے۔ سو یوں ہوا کہ ماں باپ نے اس کا ولایت جانا گوارا نہیں کیا اور سکینہ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی لیکن سوال یہ تھا کہ کیا واقعی وہ چلی گئی تھی؟

☆☆☆

رنگ و نور کی اس محفل میں ہر چیز پر مسرت اور شادمانی تھی۔ زوہیب اور اس کی بیوی شائلہ بھی انجوائے کر رہے تھے۔ یہ محفل ہلے گلے کے شوقین اس کے ایک دوست شفیق نے سجائی تھی۔ ہر چار چھ مہینے بعد وہ ایسی کوئی محفل سجانے کا بہانہ ڈھونڈ لیتا تھا اور یار لوگ اس کی سجائی محفل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہو رہا تھا کہ شفیق کی بیوی ایک بنی سنوری خاتون کے ساتھ ان کی ٹیبل پر چلی آئی۔

"یہ رانی ہے میری دوست اور مشہور پامسٹ۔" شفیق کی بیوی نے پہلے اچھی میزبان کی طرح ان سے چند رسمی باتیں کیں پھر اپنے ساتھ موجود خاتون کا تعارف کروایا۔

"اوہ! میرا خیال ہے، میں نے انہیں ٹیلی ویژن پر بھی دیکھا ہے۔" اس تعارف پر شائلہ بے ساختہ بول پڑی۔

"جی ہاں! یہ ایک چینل پر مارننگ شو میں آتی ہے۔" مسز شفیق نے تصدیق کی اور پھر مسکرا کر بولیں۔

"اگر آپ لوگ چاہیں تو ان کی یہاں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر مفت ان کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔"

"مجھے تو بھئی ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہو، وہ طے شدہ وقت پر خود ہی سامنے آ جاتا ہے۔ خوامخواہ قبل از وقت سب کچھ جان لینے کا تردد کرنا مجھے بالکل فضول لگتا ہے۔" شائلہ نے مستقبل شناسی سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انکار کر دیا۔

"یہ تردد اتنا فضول بھی نہیں ہوتا مسز زوہیب! انسان کو پہلے سے آنے والے حالات کا علم ہو تو وہ تھوڑی سی پیش بندی کر لیتا ہے۔" رانی کو یقیناً اپنے علم کو فضول قرار دیا جانا ناگوار گزرا تھا جو شائلہ کی بات کے جواب میں فوراً بول پڑی۔

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں لیکن میری ذاتی رائے یہی ہے کہ مستقبل کے چھپے رہنے میں ہی زندگی کو جینے کا مزہ ہے۔" شائلہ نے اپنے ازلی دوٹوک انداز میں اس کی بات کا جواب دیا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ زوہیب کو یہ بات زیادہ اچھی نہیں لگی۔ وہ خود خوش دلی سے بولا۔

"آپ میری سڑیل مزاج بیوی کو جانے دیں مس رانی اور اگر اعتراض نہ ہو تو میرا ہاتھ دیکھیں۔"

"شیور۔" وہ مسکراتے ہوئے زوہیب کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم لوگ انجوائے کرو۔ میں دوسرے مہمانوں کو دیکھتی ہوں۔" مسز شفیق آگے بڑھ گئیں۔ رانی نے اپنی توجہ زوہیب کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی طرف کر لی۔ اب وہ اپنے ہینڈ بیگ سے ایک محدب عدسہ بھی نکال چکی تھی اور اس کی مدد سے بہت غور سے زوہیب کا ہاتھ دیکھ رہی تھی۔

"آپ ایک ذہین شخص ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کی ہوگی۔" زوہیب کا ہاتھ دیکھتے ہوئے اس نے پہلی رائے دی۔

"مجھ سے زیادہ نہیں۔ ماسٹرز کے فائنل میں، میں نے انہیں پیچھے دھکیل کر فرسٹ پوزیشن لی تھی۔" ان ہی کی طرف متوجہ شائلہ نے رانی کی رائے پر شرارت سے تبصرہ کیا تو زوہیب نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا اور ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"وہ تو تم نے چالاکی دکھائی تھی اور مجھے اپنے عشق میں مبتلا کر کے میری مت مار دی تھی ورنہ فرسٹ پوزیشن میری ہی ہوتی۔"

"آپ باپ کے سائے سے محروم ہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ آپ نے اپنی اب تک کی زندگی خاصی پرسکون گزاری ہے اور کبھی خود کو کسی بڑی دشواری میں محسوس نہیں کیا۔" ان دونوں کی نوک جھوک کو نظر انداز کر کے رانی نے اپنی دست شناسی کی مہارت کا مظاہرہ جاری رکھا۔

"یہ حقائق تو ایسے ہیں جو زوہیب کے ہر شناسا کے علم میں ہیں آپ کوئی نئی بات بتائیں۔" شائلہ نے گویا اسے چیلنج کیا۔

"نئی بات یہ ہے کہ زوہیب صاحب کی زندگی میں بہت کچھ ایسا ہے جو گہری دھند میں لپٹا ہوا ہے اور جب بھی یہ دھند چھٹی انہیں چند تکلیف دہ انکشافات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" رانی نے سنجیدگی سے اپنی بات کہی۔

"کیسے انکشافات؟" زوہیب نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ تکلیف دہ انکشافات لیکن ان سے

پہلے ایک بڑی خوش خبری آپ کی زندگی میں آنے والی ہے۔ اپنی مسز کا خیال رکھیے گا۔" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ سے بائے کا اشارہ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"مجھے تو یہ میکبتھ کی چڑیلوں میں سے ایک لگ رہی تھی۔ مستقبل کی الٹی سیدھی پیش گوئیاں کر کے ان چڑیلوں نے اچھے بھلے میکبتھ کو تباہ کر دیا تھا۔" اس کے جانے کے بعد شائلہ نے ناک سکیڑ کر تبصرہ کیا۔

"تم آج کل شیکسپیئر کو پڑھ رہی ہو اس لیے تمہیں میکبتھ کی چڑیلیں یاد آ گئی ہیں ورنہ دیکھا جائے تو بے چاری اچھی بھلی خاتون ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان کی خوش خبری والی پیش گوئی تو پوری ہونے ہی والی ہے۔" زوہیب نے شریر سے انداز میں اسے دیکھا تو وہ ذرا سا بلش ہوئی لیکن پھر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"اس بارے میں بھی مجھے یقین ہے کہ اس کو کہیں سے سن گن مل گئی ہوگی۔ کافی لوگ جانتے ہیں کہ آج کل میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی اور میں ڈاکٹر شازیہ کے کلینک پر کچھ ٹیسٹ کروا کر آئی ہوں جن کی رپورٹ ایک دو دن میں آ جائے گی یوں بھی چند ماہ کے بیاہتا جوڑے سے سب ہی کسی خوش خبری کی امید رکھتے ہیں۔"

"تم نے طے کر لیا ہے کہ بے چاری کی پامسٹری سے متاثر نہیں ہونا ہے۔ بعض اوقات تم بڑی ڑوڈ ہو جاتی ہو۔ کسی کا دل رکھنے میں حرج ہی کیا ہوتا ہے۔" زوہیب نے ہنستے ہنستے اسے اس کے رویے پر ٹوکا۔

"تم تھے نا اس کا دل رکھنے کے لیے۔ بیوی کی موجودگی میں کتنے مزے سے غیر عورت کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے رکھا تھا۔" اس نے زوہیب کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"تو تم جیلس ہو رہی ہو۔" وہ اس کے انداز پر ہنسا۔

"جلتی ہے میری جوتی۔" شائلہ نے خالص زنانہ انداز میں جواب دیا اور خود بھی ہنس پڑی۔ ساتھ ساتھ ہنستے وہ میاں بیوی بہت خوش لگ رہے تھے لیکن کبھی کبھی خوشیوں کو نظر بھی لگ جاتی ہے۔

☆☆☆

سکینہ کے جانے کے بعد زندگی کسی حد تک پرسکون ہو گئی تھی۔ وہ تنہا ضرور ہو گیا تھا لیکن یہ تنہائی سکینہ کے تلخیوں بھرے ساتھ سے بہتر تھی۔ تنہائی کو بہلانے کے لیے اس نے خود کو کام میں مصروف کر لیا تھا۔ زمینوں کے سارے بکھیڑے اسے ہی سنبھالنے ہوتے تھے۔ بڑے بھائی کو ان کاموں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ابا کی زندگی تک پھر بھی وہ مارے باندھے کبھی کبھار چکر لگا لیتا تھا لیکن ان کے گزرنے کے بعد تو بالکل ہی بے قابو ہو گیا۔ کام دھام کرنا تو ایک طرف رہا، اس نے اچھی خاصی زرخیز زمینوں کو بیچنا شروع کر دیا۔ اس کے سمجھانے پر اکڑ گیا کہ وہ اپنے حصے کی زمینیں فروخت کر رہا ہے۔ بھائی کی یہ روش دیکھ کر اس نے اسے ٹوکنے کے بجائے اس سے وعدہ لے لیا کہ وہ باہر کے لوگوں کو زمین بیچنے کے بجائے خود اسے فروخت کر دیا کرے۔ پھر ایسا ہی ہونے لگا۔ اس کے سمجھانے بجھانے کے باوجود بڑے بھائی کی عیاشیاں بڑھتی گئیں اور زمین کم ہوتی چلی گئی۔ بھائی کی زمین میں کمی کے ساتھ ساتھ اس کی زمین میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن وہ اس اضافے پر خوش نہیں تھا۔ اسے اپنے بھائی کی تباہی دکھ دیتی تھی اور زبیدہ کا ویران چہرہ دیکھ کر دل کڑھتا تھا۔ شوہر کی آوارگی اور بے اعتنائی نے پھول جیسی زبیدہ کو کملا کر رکھ دیا تھا۔ بیٹا الگ باپ کے پیار کو ترستا تھا۔ اس کے بس میں زبیدہ کا غم دور کرنا نہیں تھا لیکن بھتیجے کی محرومی دور کرنے کے لیے اسے ایک باپ کی سی... شفقت و محبت سے نوازتا تھا۔

زندگی اسی طرح چل رہی تھی کہ حویلی کو ایک حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا بڑا بھائی ایک روز شکار کا کہہ کر حویلی سے نکلا تو پھر اس کی لاش ہی گھر آئی۔ اس کی گاڑی کی بریکس فیل ہو گئی تھیں اور وہ راستے میں ہی حادثے کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس حادثے نے بوڑھی ماں کو بالکل ہی بستر سے لگا دیا اور زبیدہ کی آنکھوں کی ویرانی مزید بڑھ گئی۔ ساڑھے گیارہ سالہ بچہ بھی باپ کی تمام تر بے نیازی کے باوجود اس کی موت سے متاثر نظر آیا۔ غم اور اداسی کی کہر میں ڈوبے چند ماہ آگے کھسکے تو ماں نے اسے زبیدہ سے نکاح کا حکم دیا۔ وہ اس حکم کی تعمیل میں شش و پنج کا شکار تھا لیکن اسے زیادہ سوچ بچار کا موقع نہیں دیا گیا اور ماں کے ایما پر برادری کے دیگر بزرگوں نے بھی اس پر زور دیا کہ وہ زبیدہ سے نکاح کر کے اس کی اور بچے کی ذمے داری سنبھال لے۔ آخرکار نکاح ہو گیا اور زبیدہ جو اس کی اولین چاہت تھی، اس کی زندگی میں چلی آئی۔ شروع شروع کی جھجک کے بعد ان کے درمیان تعلق مضبوط ہوتا چلا گیا اور انہیں احساس ہوا کہ درحقیقت وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ زندگی مسکرانے لگی۔ زوہیب پہلے ہی ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ آنکھوں کی روشنی بڑھانے کے لیے حسان بھی ان کی محبت کی نشانی بن کر ان کی زندگی میں چلا

آیا۔ وہ دونوں کسی باغباں کی طرح اپنے گلشن کی آبیاری کرتے رہے اور اپنی محنت کا نتیجہ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ وہ ایک مثالی زندگی گزار رہے تھے۔ ایسی زندگی جو دیکھنے والوں کو رشک میں جلا کر دے لیکن سب ہی صرف رشک تو نہیں کرتے۔ کچھ حسد کرنے والے بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کی خوشیوں کو بھی حاسدین کے حسد کی آگ کھانے کے لیے لپکنے لگی۔

☆☆☆

زوہیب کافی دنوں بعد حویلی آیا تھا۔ جب سے شائلہ کی طرف سے خوش خبری ملی تھی، وہ بہت خوش تھا اور اس کا بے حد خیال رکھ رہا تھا۔ اس کا خیال رکھنے کے چکر میں وہ حویلی بھی نہیں جا سکا تھا ورنہ اس کا معمول تھا کہ پندرہ دن میں ایک بار تو ضرور ہی دو دن کے لیے حویلی کا چکر لگاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لوگ بھی اس کے پاس شہر آ جاتے تھے لیکن زبیدہ کو شہر میں رہنا پسند نہیں تھا۔ وہ گاؤں میں ہی رہنے کو ترجیح دیتی تھی اس لیے اس کی اور شائلہ کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ خود ہی پابندی سے ملاقات کے لیے جاتے رہیں۔ شائلہ کی حالت کی وجہ سے وہ فی الحال اسے سفر پر لے جانے سے گریز کر رہا تھا اس لیے ان کے معمول میں تبدیلی آ گئی تھی۔ شائلہ نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ خود دو دن کے لیے میکے رکنے چلی گئی اور اسے گاؤں روانہ کر دیا۔ وہ گاؤں جاتا تھا تو زمینوں کا چکر بھی ضرور لگاتا تھا۔ اس روز بھی وہ زمینوں کی طرف نکلا اور فصل کا جائزہ لینے کے بعد ڈیرے پر آرام کرنے لگا۔ چچا کسی عدالتی کارروائی کے لیے گئے ہوئے تھے اور اسے ہدایت کر گئے تھے کہ دوپہر کے کھانے کے بعد مزارعوں سے ان کے مسئلے مسائل سن لے۔ اس کے لیے ڈیرے پر ہی کھانا تیار ہو رہا تھا۔ راکنگ چیئر پر نیم دراز وہ ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کھڑکی سے آنے والی آوازوں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ شاید دو مزارع تھے جن کی گفتگو میں اپنا نام سن کر وہ گفتگو کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"یہ اپنے زوہیب صاحب تو بڑی نرم طبیعت کے مالک ہیں۔ میرا جی کرتا ہے کہ یہ گاؤں آ کر ادھر کا سارا کام سنبھال لیں۔ مالک نرم طبیعت کا ہو تو نوکری بھی چین سے گزرتی ہے۔" ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

"اپنے جی کی رہنے دے پگلے۔ بڑا مالک بھلا ایسا ہونے دے گا کہ اپنی جگہ کسی کو دے دے۔ جگہ دینی ہو گی تو اپنے بیٹے کو ہی دے گا۔ زوہیب صاحب کو تو اس نے شہری بابو بنا دیا ہے تاکہ نہ وہ ادھر رہے اور نہ ادھر کے معاملات میں اس کا دخل ہو۔" بوڑھی کھڑکھڑاتی آواز میں ادا کیے گئے الفاظ نے زوہیب کو چونکا دیا اور وہ زیادہ توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔

"کیا مطلب چاچا؟ مالک کیسے زوہیب صاحب کو زمینوں سے الگ رکھ سکتا ہے۔ آدھی زمین کا تو وہ بھی مالک ہو گا نا؟" جوان آواز نے حیرت کا اظہار کیا۔

"کدھر کا مالک؟ اس کے باپ کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر چچا نے اونے پونے ساری زمین ہتھیا لی۔ اب جو کچھ بھی ہے، وہ زوہیب صاحب کے چچا کا ہے۔" بوڑھے نے انکشاف کیا۔

"پھر بھی چاچا..... زوہیب صاحب کی ماں ان کے چاچا کے نکاح میں ہے۔ وہ اپنے پُتر کے حق میں کچھ تو بولے گی ناں۔" جوان مزارع کو اب بھی یہ ماننے میں تامل تھا کہ زوہیب کا جائداد پر کوئی حق نہیں ہے۔

"ناں..... وہ کیا بولے گی۔ وہ تو خود خاوند کے کہنے میں ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے میں نے تو یہ تک سنا ہوا ہے کہ مالک پہلے ہی سے اس سے بیاہ کرنا چاہتا تھا لیکن بڑے بھائی کی منگ ہونے کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ بزرگوں کے کہنے پر دونوں بھائیوں کی شادی ہو گئی لیکن مالک اپنی شادی نباہ نہ پایا اور بیوی تنگ آ کر اسے چھوڑ گئی۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ زبیدہ بی بی کی وجہ سے ہی سکینہ بی بی نے طلاق لے لی تھی اور دیکھ لو کیسے بھائی کے مرتے ہی مالک نے زبیدہ بی بی سے بیاہ کر لیا۔ زبیدہ بی بی کا اتنا بڑا بچہ تھا چاہتی تو نکاح سے انکار کر دیتی لیکن راضی ہو گئی۔ اب دیکھ لو دونوں جیسے راضی خوشی رہ رہے ہیں اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ یہ کوئی زبردستی یا مجبوری کا نکاح نہیں تھا اور دونوں کی پوری پوری مرضی شامل تھی۔" بڈھا انکشافات پر انکشافات کر رہا تھا اور زوہیب کے اعصاب بری طرح تن چکے تھے۔ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بیٹھے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کھڑکی میں ہی سے ہاتھ ڈال کر ان دونوں کی گردن دبوچ لے لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔ وہ ان معمولی مزارعوں کے سامنے کھڑا ہو کر خود کو مزید رسوا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ رسوائی ہی کی بات تھی کہ لوگ اس کی ماں اور چچا کے درمیان داستانِ عشق بیان کر رہے تھے۔

"میرے دل میں ایک خیال آ رہا ہے چاچا۔" اس کی کیفیت سے بے خبر ان دونوں کے درمیان گفتگو جاری تھی۔

"کیسا خیال پُتر؟"

"یہی کہ زن، زر اور زمین کے لیے اپنے خون کے رشتوں کا خون کر ڈالنا بڑی پرانی ریت ہے۔ زوہیب صاحب کے پیو گاڑی کی بریکیں فیل ہونے سے مارے گئے تھے تو کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ زن اور زمین کے چکر میں ان کے اپنے بھائی نے......"

"چپ کر جا پگلے! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ مالک کے کسی وفادار نے تیری ایسی باتیں سن لیں تو تیری خیر نہیں ہو گی۔ یہ بڑے لوگوں کے چکر ہیں۔ دولت کے لیے جو اپنے سگوں کو قتل کر دیں، ان کے لیے تیری میری کیا حیثیت ہے۔ چل اٹھ، اٹھ کر کام سے لگ۔ مالک کیا کرتے ہیں، کیا نہیں اس سے اپنا کیا لینا دینا۔ اپنی دو وقت کی ہی پوری ہو جائے تو کافی ہے۔ خبردار جو تو نے کسی کے سامنے میری بتائی کوئی بات دہرائی۔" بوڑھے نے جوان مزارع کو بات پوری نہ کرنے دی اور اسے گھرک کر رکھ دیا۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے وہ اٹھ کر وہاں سے جا رہے ہوں۔ زوہیب اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا اور سن بیٹھا رہا۔ چند انکشافات اور قیاس آرائیوں نے اس سے اس کی پُرسکون زندگی کا سکھ چین چھین لیا تھا۔

☆☆☆

"تو آپ کو میری باتوں کا یقین آ گیا؟" وہ اس کے مقابل بیٹھی مسکراتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"میں نے تو پہلے بھی آپ کی کسی بات کو ماننے سے انکار نہیں کیا تھا۔" اس نے جواباً مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکرا نہ سکا۔

"ہاں اپنی مسز کی طرح صاف انکار تو نہیں کیا تھا لیکن آپ کے انداز سے واضح تھا کہ آپ ایسے ہی شغلاً ہاتھ دکھا رہے ہیں ورنہ یقین آپ کو بھی نہیں ہے۔" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوئی لیکن وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے ٹھوس لہجے میں بولی کہ وہ اس کی بات کی تردید نہیں کر سکا اور آخرکار ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولا۔

"مجھے اعتراف ہے مس رانی کہ آپ کی اور میری پہلی ملاقات بالکل مختلف حالات میں ہوئی تھی لیکن اب میں آپ کی باتوں کو سنجیدگی سے لینے پر مجبور ہوں۔ خوش خبری کے حوالے سے آپ کی پیش گوئی درست ثابت ہو چکی ہے۔ اپنی پہلی اولاد کے حوالے سے میں اور شائلہ بہت خوش اور ایکسائیٹڈ ہیں لیکن میں اُلجھن کا شکار ہو چکا ہوں کیونکہ آپ کی دوسری پیش گوئی بھی درست ثابت ہو چکی ہے اور میں چند تکلیف دہ انکشافات کا سامنا کر چکا ہوں۔ ان انکشافات نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" اس کی اُلجھن اور پریشانی اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھی۔ جب سے وہ گاؤں سے واپس لوٹا تھا اسی کیفیت میں تھا۔ شائلہ بھی کئی بار اس سے دریافت کر چکی تھی لیکن وہ اسے اپنی حالت کی کیا وجہ بتاتا؟ وہ پڑھے لکھے مہذب خاندان کی لڑکی تھی اور وہ اس کے ساتھ اپنے خاندان کے ایسے گھٹیا راز شیئر نہیں کر سکتا تھا۔

"میں آپ سے ان انکشافات کے بارے میں نہیں پوچھوں گی جنہوں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے کیونکہ میں صرف ایک پامسٹ ہوں اور لوگوں کو ان کے ماضی، حال اور مستقبل کا حال بتا سکتی ہوں۔ میرے پاس کسی کے مسائل کا حل نہیں ہوتا ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میری پیش گوئیوں کی مدد سے کوئی خود ہی اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ نکالے۔ کیا آپ مجھ سے اپنے بارے میں مزید کچھ جاننا چاہتے ہیں؟" اب رانی کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

"شاید ایسا ہی ہے۔" اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا اور اپنا ہاتھ رانی کے سامنے پھیلا دیا۔ وہ سنجیدگی سے بہت دیر تک اس کے ہاتھ کا بغور جائزہ لیتی رہی پھر سر اٹھا کر بولی۔

"آپ کے ہاتھ کی لکیریں بہت عجیب ہیں زوہیب صاحب! ذہانت، کامیابی، عزت، دولت سب کچھ موجود ہے آپ کی قسمت میں لیکن یہ سب کچھ پانے کے لیے آپ کو کچھ غیر معمولی کرنا پڑے گا۔ کچھ ایسا جس کے لیے غیر معمولی جرأت اور تھوڑی سی خود غرضی کی ضرورت ہو گی لیکن آپ جو کچھ کریں گے، وہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہو گا۔ میں دنیاوی عدالت کی بات نہیں کر رہی لیکن آپ جو بھی کریں گے اس کے لیے خود کو ضمیر کی عدالت میں بے قصور پائیں گے اس لیے کہ حق کے لیے لڑنا اور موذی دشمن کو انجام تک پہنچانا ایک اصولی بات ہے۔" وہ بول رہی تھی اور زوہیب اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔

"مجھے کیا کرنا پڑے گا؟" رانی سے سوال کرتے ہوئے اسے اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔" اس نے اپنے شانے اچکائے۔ "یہ فیصلہ آپ کو خود کرنا ہو گا۔ میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ میں لوگوں کو مشورے نہیں دیتی۔ انہیں صرف وہ پڑھ کر بتاتی ہوں جو اُن کی لکیروں میں لکھا ہوتا ہے۔ اب یہ لوگوں کی اپنی مرضی ہوتی ہے کہ وہ کیا کریں اور کیا نہیں۔"

وہ کوئی بھی واضح مشورہ دینے سے مکمل گریزاں تھی۔

''او کے۔'' زوہیب نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''آپ کے ٹائم کا شکریہ۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی بتائی ہوئی باتوں کی روشنی میں کوئی بہتر فیصلہ کرسکوں۔''

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں مسٹر زوہیب۔ آپ نے میرے ٹائم کی فیس دی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر آپ وہ سب کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کی میں نے پیش گوئی کی ہے تو مجھے اس کی بہت خوشی ہوگی۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

زوہیب اس سے ملاقات کے بعد وہاں سے روانہ ہوا تو اس کا ذہن کچھ اور بھی اُلجھا ہوا تھا۔ وہ ان باتوں پر غور کر رہا تھا جو رانی نے اس سے کہی تھیں۔

☆☆☆

وہ بہت تکلیف دہ رات تھی۔ زوہیب دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے اس فارم ہاؤس پر آیا تھا۔ ان کا صبح شکار کے لیے نکلنے کا پروگرام تھا لیکن صبح ہونے سے قبل ہی زوہیب کو تیز بخار چڑھ چکا تھا۔ رات بھر چچا کی خون آلود لاش آنکھوں کے سامنے گھومتی رہی تھی۔ وہ جوان کی موت کا خواہاں تھا، ان کی موت پر عجیب سا دکھ محسوس کر رہا تھا۔ اسے قطعی یاد نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کی تھیں۔ اسے صرف ان کی مہربانیاں اور محبتیں یاد آ رہی تھیں۔ ان کا اسے کندھے پر بٹھانا، گھوڑا بن کر کمر پر سواری کروانا، انگلی تھام کر اسکول لے جانا، کانووکیشن کے موقع پر ڈگری لیتے ہوئے انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر وش کرنا اور اپنے ہاتھوں سے سہرا باندھ کر دولہا بنانا، ایک ایک منظر تھا اسے یاد آ رہا تھا۔ یہ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا تھا کہ آئندہ اس کی زندگی کی کسی خوشی میں اس کے چچا شوکت علی شریک نہیں ہوں گے۔ ہاں وہ زوہیب علی جو اپنے چاچا کو غاصب، بدنیت اور باپ کا قاتل سمجھ کر ان کا قتل کرنے ان کی حویلی جا پہنچا تھا اب ان کے قتل کے بعد ان کی موت پر تڑپ رہا تھا اور اتنے شدید صدمے میں مبتلا تھا کہ تیز بخار چڑھا بیٹھا تھا۔ اس کی حالت کی وجہ سے اس کے دوستوں کو شکار کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا اور اپنے طور پر اسے ایمرجنسی میں ٹریٹمنٹ دینے کے ساتھ ساتھ وہ واپس شہر لوٹنے کے بارے میں غور وفکر کر رہے تھے۔ ایسے میں اس کے دوست ساجد کے فون پر شائلہ کی کال آ گئی۔

''تیری مسز کا فون ہے یار! تو نے اپنا موبائل کیوں آف کر رکھا ہے۔ وہ بے چاری پریشان ہیں کہ تجھ سے رابطہ نہیں ہو رہا، لے بات کر۔'' ساجد نے اسے بتاتے ہوئے فون تھمایا تو اس نے اسے کان سے لگا لیا۔

''فون کیوں بند کر رکھا ہے زوہیب! معلوم بھی ہے کہ میں کتنی دیر سے تمہیں کال کر رہی ہوں۔'' شائلہ کی آواز سے بیک وقت پریشانی اور جھنجلاہٹ جھلک رہی تھی۔

''سوری ڈیئر! میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے اس لیے موبائل کا دھیان نہیں رہا۔ تم کہو اتنی صبح صبح کیوں کال کر رہی تھیں؟'' اس نے شائلہ سے پوچھا لیکن اندر سے وہ جانتا تھا کہ شائلہ کیوں اسے کال کر رہی تھی۔

''بہت بُری خبر ہے زوہیب۔ مجھے افسوس ہے کہ گھر سے دور تمہیں یہ خبر دینی پڑ رہی ہے۔ پلیز حوصلے سے سننا اور آگے بھی حوصلے سے کام لینا۔'' شائلہ کا لہجہ بہت نرم ہو گیا اور وہ اسے خبر سنانے سے قبل ہی حوصلے کی تاکید کرنے لگی۔ یقیناً وہ خود بھی خاصی ڈپریسڈ تھی اس لیے اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر بھی اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور اس موضوع پر بات کرنے لگی جس کے لیے اس نے کال کی تھی۔

''تم کہو، میں سن رہا ہوں۔'' وہ بدقت شائلہ سے اتنا کہہ سکا۔

''حویلی سے فون آیا تھا۔ رات سوتے میں کسی نے چچا شوکت علی اور ان کے ملازم غلام محمد کو قتل کر دیا ہے۔'' آخرکار شائلہ نے اسے وہ خبر سنا ہی دی جس کے لیے وہ پہلے ہی تیار تھا پھر بھی سن کر ایسا لگا کہ پہلی بار سن رہا ہے۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہ رہی کہ جواب میں شائلہ سے کچھ کہہ پاتا۔

''ہیلو... ہیلو زوہیب! آپ میری بات سن رہے ہیں۔ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟'' فطری طور پر دوسری طرف موجود شائلہ اس کی خاموشی پر پریشان ہو گئی۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے شاک لگا ہے۔'' اس نے بہ دقت شائلہ کو جواب دیا۔

''میں یہاں سے ڈیڈی کے ساتھ گاؤں کے لیے روانہ ہو رہی ہوں۔ آپ کب تک گاؤں پہنچ سکیں گے؟'' شائلہ نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے اس کے بارے میں پوچھا۔

''تم رہنے دو شائلہ! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سفر سے تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔'' اس نے شائلہ کو منع کیا۔

''نہیں، میں جاؤں گی۔ اتنے اہم اور نازک موقع پر میں حویلی سے دور نہیں رہ سکتی۔ یہ کسی طور مناسب نہیں ہوگا۔'' شائلہ نے دوٹوک اپنا فیصلہ سنایا۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ میں بھی جلد سے جلد وہاں پہنچتا ہوں۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے ساجد کو اس کا موبائل واپس کیا اور چچا کے قتل کے بارے میں آگاہ کیا۔

''میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم ڈرائیو کر سکو۔'' ساجد نے فیصلہ سنایا۔ باقی دوست بھی ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ شکار کا پروگرام ویسے بھی کینسل ہو چکا تھا اور اخلاقاً اب انہیں میت میں ہی شرکت کرنی چاہیے تھی۔ روانگی سے قبل اس نے اپنا موبائل فون تلاش کرنا چاہا لیکن وہ کسی طرح مل کر نہیں دیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ رات جب وہ چچا کے قتل کے ارادے سے حویلی گیا تھا تو اس کا موبائل اس کے پاس موجود تھا ہاں واپسی کے سفر میں اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ نہ ہی فارم ہاؤس واپس آنے کے بعد موبائل کا خیال آیا تھا اور اب موبائل غائب تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں گر گیا تھا۔ کہاں؟ اس سوال کے جواب میں بہت سے اندیشے تھے جن پر غور کرنے کا فی الحال وقت نہیں تھا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر حویلی تک کا سفر کرنا تھا۔

☆☆☆

تجہیز و تدفین کے مراحل بالآخر نمٹ گئے۔ ان مراحل سے گزرنا اس کے لیے ایک بہت تلخ تجربہ تھا۔ ایک ایسا شخص جس سے آپ شدید نفرت کرتے ہوں اتنی نفرت کہ اس کے قتل پر آمادہ ہو جائیں اس کے مرنے پر دکھی ہونا اور اسے قبر میں اترتے دیکھ کر درد سے بلبلا اٹھنا خلافِ عقل تھا۔ چچا کے بعد وہ حویلی کا بڑا مرد تھا اس لیے جنازے میں شرکت کے لیے آنے والے اس سے ہی تعزیت کر رہے تھے۔ طبیعت کی خرابی کے باوجود اسے خود کو سنبھال کر ہمت سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ حسان کی عمر کے حساب سے صدمہ بہت بڑا تھا۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا اور اسے بڑے بھائی کی حیثیت سے اسے سنبھالنا پڑا تھا۔ بعد میں بھی وہ ہر معاملہ اس پر چھوڑ کر خاموشی سے ایک طرف بیٹھا رہا۔ اس نے سب کچھ زوہیب پر چھوڑ رکھا تھا اور یہ وہ صورتِ حال تھی جس کے بارے میں زوہیب پہلے ہی سے باخبر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پندرہ سالہ حسان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ معاملات کو سنبھال سکتا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ سب کچھ اپنے حسبِ منشا ہونے کے باوجود خوش نہیں تھا۔ اسے یہ مقام اور یہ ذمے داریاں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ چچا کی تدفین کے بعد اس کے دوست رخصت ہو گئے۔ پھر بھی بہت سے لوگ تھے جو وہاں موجود تھے اور اسے شام ڈھلنے تک ان کے درمیان بیٹھنا پڑا تھا۔

وہ جب سے گاؤں آیا تھا صرف ایک بار زنان خانے میں گیا تھا۔ اس وقت خواتین کو میت کا آخری دیدار کروایا جا رہا تھا۔ آخری دیدار کرتے ہوئے عورتیں بری طرح رو رہی تھیں۔ ان خواتین میں دور قریب کی رشتے دار خواتین کے علاوہ گاؤں کی عورتیں بھی شامل تھیں جو اس بات پر چیخ چیخ کر رو رہی تھیں کہ ان کے سروں پر سے ایک مہربان شخص کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ ان عورتوں کے درمیان اس نے اپنی ماں کو بھی دیکھا تھا، سر پر سفید چادر اوڑھے وہ صبر وضبط کی تصویر بنی ہوئی تھیں اور صرف رخساروں پر بہتے آنسو تھے جو اُن کے غم کا اظہار کر رہے تھے۔ ماں کو اس حال میں دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگا۔ وہ دوسری بار انہیں اس حال میں دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار اس کی ماں نے بیوگی کی سفید چادر اوڑھی تھی تو وہ صرف ساڑھے گیارہ سال کا ایک خوف زدہ بچہ تھا۔ آج وہ جوان ہو چکا تھا اور خود باپ بننے والا تھا لیکن خود کو ماضی کی طرح ہی خوف زدہ محسوس کر رہا تھا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ کہ تب تو پھر بھی دل کو ایک ڈھارس تھی کہ چچا ہیں جو سب سنبھال لیں گے لیکن اب ایسی کوئی ڈھارس موجود نہیں تھی۔ ماں کو دیکھنے کے باوجود وہ ان کے قریب جانے اور انہیں دلاسا دینے کی ہمت نہیں کر سکا۔

جب سارے مراحل طے ہو گئے۔ جنازے میں شرکت کے لیے آئے مہمان رخصت ہو گئے اور رات کی سیاہی نے اپنے پَر پھیلانے شروع کر دیے تو اس کے لیے ماں کا بلاوا آ گیا۔ اب اس کے پاس مفر کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے ان کا سامنا کرنا ہی تھا۔ وہ خود کو گھسیٹتا ہوا زنان خانے کی طرف بڑھ گیا۔ شائلہ حویلی ہی میں رکی ہوئی تھی جبکہ اس کے والد تدفین کے بعد واپس جا چکے تھے۔ اس نے زوہیب کو بتایا کہ اس کی امی اپنے کمرے میں ہیں اور وہاں تنہا اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا تو وہ سامنے کرسی پر بالکل ساکت بیٹھی ہوئی تھیں۔

''امی!'' اس نے تھوک نگل کر حلق کو تر کرتے ہوئے بمشکل انہیں پکارا۔ اس کی پکار کے جواب میں انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بالکل خشک اور ویران تھیں۔ اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

''امی......'' اس نے دوبارہ انہیں پکارا تو اس کے لہجے میں عجیب سا اضطراب تھا۔

''میرے سامنے بیٹھ جاؤ زوہیب! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں اسے حکم دیا جس کی اس نے اُلجھے ہوئے انداز میں تعمیل کی۔ وہ اپنی ماں کو جانتا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والی اور نرم مزاج خاتون تھیں لیکن آج اسے ان کے اندر عجیب سی سختی اور سرد مہری محسوس ہو رہی تھی۔

''تمہارے لیے میرا یہ روپ نیا نہیں ہوگا زوہیب! تمہارے سامنے میں نے دوسری بار بیوگی کی چادر اوڑھی ہے لیکن تب اور اب میں یہ فرق ہے کہ پہلے میں بیوہ ہوئی تھی، بے سہارا نہیں۔ آج میں بے سہارا ہو گئی ہوں۔ لوگ مجھے دلاسا دیتے ہیں کہ میرے دو دو بیٹے ہیں اس لیے مجھے خود کو بے سہارا نہیں سمجھنا چاہیے لیکن میں جانتی ہوں کہ میں عمر بھر کے لیے بے سہارا ہی نہیں قلاش بھی ہو گئی ہوں اور میرے ہاتھ بالکل خالی ہیں۔ خالی ہاتھوں سے مراد تم یہ نہ سمجھنا کہ میں دولت و جائداد کی بات کر رہی ہوں۔ میں مادّی خوشیوں اور خواہشات کے پیچھے بھاگنے والی عورت نہیں ہوں پھر بھی آج مجھے لگا ہے کہ میرے حصے میں خسارہ ہی خسارہ آیا ہے کیونکہ میری اولاد ایک بے لوث انسان کے سائے میں پلنے کے باوجود خود غرض، لالچی اور احسان فراموش ہے۔'' دھیمے لہجے میں بولتے بولتے یک دم ان کی آواز میں شعلے لپکنے لگے اور انہوں نے اپنی گود میں سے کوئی شے اٹھا کر اس کی طرف پھینکی۔ زوہیب یہ دیکھ کر پوری جان سے کانپ گیا کہ وہ اس کا موبائل فون تھا جو وہ یقیناً پچھلی رات حویلی میں گرا گیا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا امی...... میں بے قصور......'' خشک حلق کے ساتھ اس نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی لیکن نہ دے سکا کہ وہ اس کی سن ہی نہیں رہی تھیں۔

''شوکت علی صرف تمہارے چچا ہی نہیں محسن بھی تھے جنہوں نے ہمیشہ ایک بیٹے کی طرح تمہیں چاہا۔ میں کسی مرنے والے کی برائی کرنا مناسب نہیں سمجھتی لیکن آج تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تمہارا سگا باپ حشمت علی ایک آوارہ، عیاش اور غیر ذمے دار انسان تھا جس نے کبھی میری یا تمہاری پروا نہیں کی اور اپنی ساری جائداد اپنی عیاشیوں میں اڑا دی۔ اس وقت شوکت علی نے تمہارے مستقبل کے خیال سے اصل قیمت سے بھی زیادہ قیمت دے کر تمہارے حصے کی زمینیں خود خرید لیں۔ ان کے دل میں تمہارے لیے بڑے خواب تھے۔ وہ کہتے تھے 'میرا زوہیب عام زمینداروں جیسا ذہن نہیں رکھتا۔ وہ بڑا ذہین لڑکا ہے اور میں اس کی ذہانت اور رجحان کے مطابق ہی اس کا مستقبل بناؤں گا۔ انہوں نے تمہیں گاؤں سے دور شہر میں رہنے اور ملازمت کرنے کی اجازت اس لیے دی کہ تم دوسری جگہ کام کر کے کچھ تجربہ حاصل کر لو تو وہ تمہیں تمہارا ذاتی کاروبار شروع کروا دیں گے۔ تمہارے حصے کی زمین پر انہوں نے بہت بڑا کارخانہ بنوانے کے لیے نقشہ بھی تیار کروا لیا تھا اور بہت خوش تھے کہ تمہارے ساتھ ساتھ گاؤں کے لوگوں کی بھلائی کے لیے بھی کچھ کرنے جا رہے ہیں۔ گاؤں والوں کو روزگار اور خوش حالی دینے کا بہت شوق تھا انہیں۔ کہتے تھے زوہیب کی پہلی اولاد کی آمد پر میں اسے اور گاؤں والوں دونوں کو مشترکہ تحفہ دینا چاہتا ہوں، لیکن تم نے...... تم نے سب کچھ ختم کر ڈالا۔ کیوں کیا تم نے ایسا......؟ کیا بگاڑا تھا انہوں نے تمہارا......؟ ان کے احسانوں کا یہ صلہ تھا تمہارے پاس؟''

''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتا ہوں امی لیکن پہلے آپ میرے اس سوال کا جواب دیں کہ میرے ابو کیسے مرے تھے؟'' اس میں نہ جانے اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ وہ ان سے یہ سوال کر بیٹھا۔

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے سب جانتے ہیں کہ ان کی گاڑی کی بریکیں فیل ہو گئی تھیں جس کے باعث وہ حادثے کا شکار ہو گئے۔'' غم میں ڈوبی زبیدہ بیگم نے قدرے حیرت سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بریکیں فیل ہو گئی تھیں یا کسی نے کروا دی تھیں؟ میرا باپ حادثے کا شکار ہوا تھا یا اسے قتل کروایا گیا تھا؟'' اس کی زبان ایک بار کھل چکی تھی اس لیے مزید سوالات کرنے میں بھی کوئی حجاب مانع نہ ہوا

''یہ...... تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کوئی کیوں قتل کرواتا انہیں؟ ان کے مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟'' زبیدہ اُلجھن کا شکار ہو گئیں۔

''میں مرے ہوئے لوگوں کی برائی کرنا پسند نہیں کرتا ورنہ یہ تو آئینے کی طرح صاف ہے کہ ابو کے مرنے سے کسے فائدہ پہنچا اور کس کی راہ کی رکاوٹیں دور ہوئیں۔''

''زوہیب......'' اس کے بے باکانہ جواب پر زبیدہ چیختی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں اور نہایت صدمے اور طیش کے عالم میں اُسے گھورنے لگیں۔

''ہو سکتا ہے آپ اِن باتوں سے انجان ہوں لیکن

افسوس کہ مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو چکی ہے۔'' اس کا لہجہ دھیما ہو گیا اور نظریں جھک گئیں۔ ماں کے رُوبرو بیٹھ کر وہ ان پر کوئی الزام عائد نہیں کر سکتا تھا۔

''اسی لیے...... اسی لیے تم نے انہیں قتل کر دیا۔ اوہ میرے خدا......'' زبیدہ اپنا سر تھام کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور بے یقینی کے عالم میں سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بولیں۔

''کل جب میں نے تمہیں پسٹل ہاتھ میں لیے یہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا تو تمہیں پہچان لینے کے باوجود خود کو یقین نہیں دلا سکی تھی کہ وہ تم ہی تھے۔ ماں اپنے بچے کو ہزاروں کے ہجوم میں بھی پہچان لیتی ہے پھر بھی میں نے خود کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ نقاب پوش قاتل میرا زوہیب نہیں ہو سکتا۔ میں نے تمہارے منہ پر موجود نقاب سے اپنی ممتا کی سچائی کو جھٹلا دیا تھا لیکن پھر غلام محمد کی لاش کے پاس سے تمہارا موبائل مل گیا۔ واقعے کی تفتیش کے لیے آنے والا انسپکٹر تمہاری سگی خالہ کا بیٹا نہ ہوتا تو تم اب تک سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔ میں نے اس سے کچھ گھنٹوں کی مہلت مانگ لی کہ اس حویلی کو ایک ہی دن میں دو بڑے صدمے نہ سہنے پڑیں۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ کوئی بڑی غلط فہمی ہے اور میں تم سے بات کروں گی تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی لیکن یہ تو اب پتا چلا کہ حشمت علی کا سورما بیٹا رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لینے آیا تھا۔'' وہ بہت بری طرح ٹوٹی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

''میں واقعی اسی نیت سے آیا تھا لیکن یہ کام میں نے نہیں کیا۔ میں یہاں پہنچا تو ان دونوں کو قتل کیا جا چکا تھا۔ میں ان کی لاشیں دیکھ کر گھبرا گیا اور یہاں سے بھاگ نکلا۔ آپ نے بھی سنا ہوگا کہ دونوں قتل چھرے کے وار سے کیے گئے جبکہ میں تو اپنے ساتھ پسٹل لے کر آیا تھا۔ آپ نے دیکھا تھا نا میرے ہاتھ میں پسٹل تھا۔'' اب وہ انہیں اپنے قاتل نہ ہونے کے بارے میں بتا رہا تھا لیکن وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتے ہوئے آنسو بہا رہی تھیں۔ انہیں گویا اس کی بے گناہی کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں امی! میں نے چچا اور غلام محمد کو قتل نہیں کیا۔ سوچنے کے باوجود مجھ میں ایسا کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ چچا کے قریب پہنچتے ہی مجھے اُن کے سارے احسانات اور محبتیں یاد آ گئیں اور میں نے سوچا کہ اگر یہ شخص میرے باپ کا قاتل ہے اور اس نے دھوکے سے میرے باپ کے حصے کی جائداد ہتھیائی ہے تو قدرت خود اس شخص سے انتقام لے لے گی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن سچ یہی ہے کہ بالکل آخری پل میں میرے اندر کے غصے، نفرت اور لالچ پر وہ محبت غالب آ گئی تھی جو میں نے ساری زندگی چچا سے پائی اور جواب میں ان کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا رہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب کبھی آپ لوگوں کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا لیکن سب کچھ الٹ ہو گیا۔'' اسے نہیں معلوم تھا کہ کیسے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اس شخص کے لیے رو رہا تھا جو اس کے نزدیک قاتل و غاصب تھا۔

''ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں زوہیب بھائی لیکن قانوناً مجھے آپ کو گرفتار کرنا پڑے گا۔'' یک دم کمرے میں گونجنے والی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پولیس کی یونیفارم میں وہ اس کا خالہ زاد شرجیل تھا جو یقیناً ان ماں بیٹے کی گفتگو کے دوران کمرے میں کسی گوشے میں روپوش رہا تھا اور اب اس نے اچانک انٹری دی تھی۔

''میں رات سے ہی پوری جانفشانی سے اس کیس پر کام کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ اس فارم ہاؤس کے چوکیدار سے بھی مل چکا ہوں جہاں آپ رات ٹھہرے ہوئے تھے۔ چوکیدار نے اعتراف کر لیا ہے کہ آپ نے اسے بھاری رشوت دی تھی کہ آپ کے رات کو فارم ہاؤس سے جانے اور آنے کی خبر کسی کو نہ ہونے دے۔ اپنے تئیں آپ موقع واردات سے اپنی غیر موجودگی کا ثبوت بنا رہے تھے لیکن یہ ثبوت ہی آپ کے خلاف ایک گواہی بن چکا ہے۔ میں نے آپ کی ساری باتیں سنیں۔ خود میرے ذہن میں بھی بہت سی الجھنیں ہیں۔ ایک اکیلا شخص دو افراد کو چاہے وہ سوئے ہوئے بھی ہوں خنجر کی مدد سے اتنی تیزی سے قتل نہیں کر سکتا کہ انہیں چیخنے کی بھی مہلت نہ مل سکے۔ لاشیں جس حالت میں ملی ہیں، ان کو دیکھ کر بھی یہی لگتا ہے کہ مرنے سے پہلے انہوں نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی تھی اور بالکل بے خبری میں مارے گئے تھے جبکہ میری اطلاع کے مطابق غلام محمد بہت کچی نیند سوتا تھا اور مالک کی معمولی آواز پر ہی بیدار ہو کر خدمت کے لیے حاضر ہو جاتا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ قتل سے پہلے انہیں کوئی نشہ آور چیز کھلائی گئی تھی۔ خالہ جان نے خالو کی لاش کے پوسٹ مارٹم کی اجازت نہیں دی لیکن میں نے غلام محمد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی ہے۔ جلد رپورٹ آ جائے گی۔ موقع پر ملنے والے چھرے کو بھی فنگر پرنٹس کے لیے بھجوا دیا گیا ہے۔ اس سے بھی اصل قاتل کی نشاندہی میں مدد مل سکتی ہے۔ میں اور میرا عملہ حویلی کے ملازمین سے بھی تفصیلی تفتیش کریں گے۔ ہاں ایک بات جس

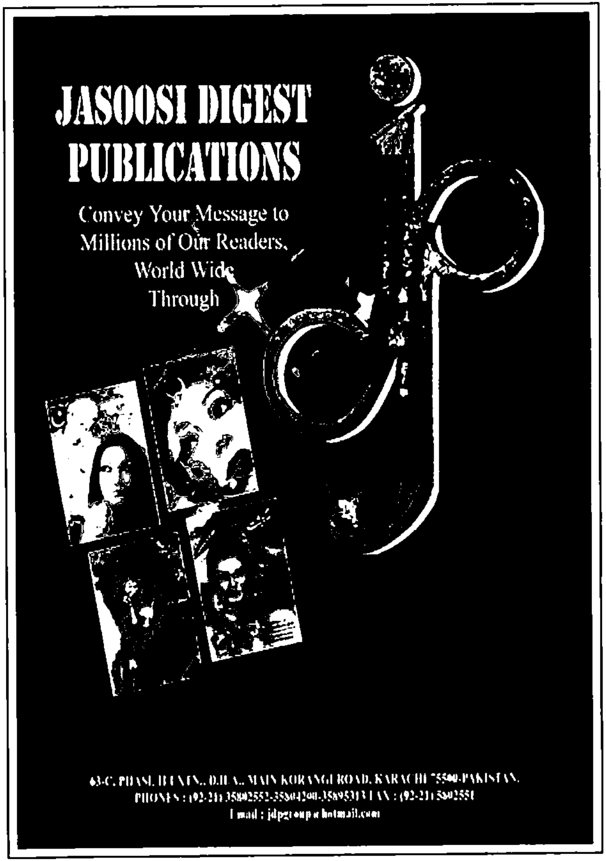

نے مجھے حیرت میں مبتلا کیا، وہ یہ ہے کہ آپ کے موبائل میں جی پی ایس ٹریسر لگا ہوا ہے۔ کیا آپ کو اس بات کا علم ہے؟'' شرجیل نے اسے اطلاع دیتے ہوئے دریافت کیا تو وہ چونک گیا۔

''نہیں، میرے موبائل میں اس ٹریسر کا بھلا کیا کام؟''

''کام تو اُسے ہوگا جس نے ٹریسر فکس کروایا ہوگا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کون کرسکتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اپنا موبائل کسی کو دیا تھا؟'' شرجیل نے اس سے پوچھا۔

''ویسے تو کسی کو نہیں دیا لیکن ایک بار کچھ پرابلم کررہا تھا تو ریپیئرنگ کے لیے ضرور دیا تھا۔ اصل میں یہ موبائل مجھے شائلہ نے گفٹ کیا تھا اس لیے میں نے اس کی جگہ دوسرا لینا پسند نہیں کیا اور اسی کو ریپیئر کروالیا۔'' اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے شرجیل کے سوال کا جواب دیا۔

''آپ مجھے اس شاپ کا پتا لکھوا دیجیے گا۔ ہوسکتا ہے یہ کام وہاں ہوا ہو۔ میں وہاں سے بھی تفتیش کرلوں گا.... فی الحال آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت سارے شواہد آپ کے خلاف ہیں اور آپ کی گرفتاری لازمی ہے۔ میں آپ کے لیے صرف اتنا کرسکتا ہوں کہ آپ کو ہتھکڑی لگا کر یہاں سے نہ لے جاؤں۔ خالہ جان چاہیں تو آپ کی گرفتاری کو چھپا سکتی ہیں اور کہہ سکتی ہیں کہ آپ تفتیش میں پولیس کی مدد کررہے ہیں اس لیے میرے ساتھ گئے ہیں۔'' شرجیل اس وقت قانون کا رکھوالا تھا لیکن کچھ نہ کچھ قریبی رشتے داری کا حق بھی ادا کرنا چاہتا تھا۔

''اگر امی نے ایسا کیا تو میں ان کا احسان مند ہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ شائلہ کو ایسی کوئی خبر ملے جس سے وہ ٹینشن کا شکار ہو۔'' اس نے ملتجی نظروں سے زبیدہ بیگم کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔ یوں بھی ابھی تمہاری حیثیت مجرم نہیں، ملزم کی ہے اور الزام ثابت ہونے سے قبل میں تمہیں کوئی سزا نہیں دینا چاہتی۔'' زبیدہ بیگم ایک بار پھر خود کو سنبھال چکی تھیں۔ سپاٹ سے لہجے میں اس کی درخواست قبول کرنے کا عندیہ دیا اور رخ موڑ گئیں۔

''چلیں زوہیب بھائی۔'' شرجیل نے اسے پکارا تو وہ بھاری قدموں کے ساتھ اس کے ساتھ چل پڑا۔

☆☆☆

اس کا ذہن بُری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ شرجیل نے اسے بہت رعایت دی تھی اور حوالات میں بھی اس کے لیے ممکنہ سہولیات فراہم کی تھیں لیکن قید بہرحال قید ہوتی ہے اور وہ تو قتل جیسے جرم کے الزام میں قید تھا۔ کوئی اور اس پر اعتبار کرتا یا نہیں لیکن وہ خود اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے اپنے چچا کا قتل نہیں کیا لیکن یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ عین اس رات قتل کردیے گئے جس رات وہ ان کے قتل کے ارادے سے حویلی پہنچا تھا۔ شرجیل کی تفتیش جانے کیا رنگ لاتی فی الحال تو یہ صورت حال تھی کہ اس وقت وہ واحد شخص تھا جس کے خلاف واقعاتی ثبوت اور گواہ بھی موجود تھے اور قتل کی ٹھوس وجہ بھی۔

وہ شرجیل کی موجودگی میں زبیدہ بیگم کے سامنے اعتراف کرچکا تھا کہ وہ اپنے چچا شوکت علی کو اس لیے قتل کرنا چاہتا تھا کہ اس کی معلومات کے مطابق وہ اس کے باپ حشمت علی کی موت کے ذمے دار اور ان کی جائداد ہتھیانے کے گناہ گار تھے۔ شرجیل نے اس حوالے سے اس سے تفصیلی بات کی تھی اور ان افراد کے بارے میں جاننا چاہا تھا جن کے درمیان ہونے والی گفتگو اس نے ڈیرے پر سنی تھی لیکن وہ ان دونوں کو نہیں جانتا تھا، اس نے ان کی صرف آوازیں سنی تھیں۔ ان کی شکلیں دیکھنے کا اسے خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے شرجیل کو رانی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ رانی کی دست شناسی اور پیش گوئیاں بھی چچا کے قتل پر آمادگی کا ایک محرک بنی تھیں۔ وہ واقعی اپنے علم میں باکمال تھی جس نے اس کے ماضی، حال اور مستقبل کے حالات، اس کے ہاتھ کی لکیروں میں پڑھ لیے تھے یا کسی سازش کا حصہ جو اس کے خلاف تیار کی گئی تھی۔

حالات و واقعات جس طرح پیش آئے تھے، ان کی روشنی میں وہ یہی محسوس کررہا تھا کہ اس کے خلاف کسی نے سازش کی تھی۔ کوئی تھا جو اُن کے خاندان کو تباہ کردینا چاہتا تھا۔ چچا کے قتل اور اس کے قاتل ہونے کے الزام میں قید ہونے کے بعد حسان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ جائداد کے انتظامات سنبھال سکتا۔ ان بکھیڑوں کو سنبھالنا کسی طرح بھی ایک پندرہ سالہ لڑکے کے بس کی بات نہیں تھی لیکن سامنے کوئی ایسا فرد بھی نظر نہیں آرہا تھا جسے اس سب کا فائدہ ہوتا۔ زبیدہ بیگم نے اسے بتایا تھا کہ شوکت علی نے اس کے باپ کے حصے کی زمینیں اس کے نام کردی تھیں اور باقی زمین کا مالک حسان تھا۔ خدانخواستہ حسان کے ساتھ بھی کچھ بُرا ہوجاتا تو جائداد کا کوئی اور وارث نہیں تھا۔ تھوڑا سا شبہ شوکت علی کی سابقہ بیوی سکینہ کے خاندان پر جاتا تھا کیونکہ

سکینہ کے والد شوکت اور حشمت علی کے سگے چچا تھے اور کوئی وارث نہ ہونے کی صورت میں وراثت کا دعویٰ کر سکتے تھے لیکن ان کے بارے میں بھی یہی اطلاع تھی کہ بے حد ضعیف ہو چکے ہیں اور بسترِ مرگ پر پڑے ہیں۔ ان چچا کی نرینہ اولاد ایک ہی تھی اور اس بے چارے کے ساتھ بچپن سے ذہنی معذوری کا معاملہ تھا۔ ایسے میں ان لوگوں کی طرف سے اتنے برسوں بعد سکینہ کی طلاق کے باعث نہ تو انتقامی کارروائی کا خیال جچتا تھا، نہ ہی لالچ ہی کارفرما نظر آتا تھا کہ جن کی اپنی جائداد سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا، وہ بھلا دوسروں کی جائداد پر کیا نظر رکھتے۔ سکینہ کے خاندان کے علاوہ اور کسی سے اسے اپنے خاندان کی دشمنی کی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ وہ حوالات کے کمرے میں پڑا پڑا الجھتا رہتا تھا۔ اسے شائلہ کی بھی بہت فکر تھی۔ اس کی درخواست پر شرجیل نے اس کی شائلہ سے بات کروا دی تھی۔ اس نے اپنے طور پر شائلہ کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ کچھ معاملات میں الجھا ہوا ہونے کے باعث فی الحال حویلی نہیں آسکتا لیکن وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کی یہ بات ماننے کے لیے راضی ہوئی تھی کہ واپس اپنے والدین کے پاس شہر چلی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ زوہیب کے ساتھ ہی واپس جائے گی اور ظاہر ہے زوہیب فی الحال کہیں بھی جانے سے قاصر تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دوبارہ شائلہ سے بات کر کے اسے میکے جانے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں رہتے ہوئے شائلہ کے علم میں کوئی بات آئے۔ والدین کے گھر جانے کے بعد بات کھلتی بھی تو وہ لوگ اسے سنبھال لیتے۔ وہ اسے ویسے ہی بہت پیاری تھی اور خوش خبری ملنے کے بعد سے وہ مزید اس کے لیے متفکر رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے شروع کے چند مہینے اس کا بے حد خیال رکھنے اور اسٹریس سے بچانے کی ہدایت کی تھی۔ شائلہ تھی بھی بہت نازک اور کامنی سی لڑکی جسے وہ کسی شیشے کی گڑیا ہی کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں شائلہ سے ہونے والا اس کا عشق شادی پر منتج ہونے تک وہ بہت سے واہموں سے گزرا تھا۔ شائلہ بہت شدت سے اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی اور اس کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ وہ اس کے بغیر بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ شروع میں تو اس کی شائلہ سے بات کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ خوب صورت اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی بولڈ بھی تھی جو کسی کو خود سے غیر ضروری طور پر فری ہونے کی کوشش کرتا دیکھ کر صاف صاف ٹوک دیتی تھی۔ شائلہ کی اس روش کے علاوہ اس کے ایک کزن اسلم کی وجہ سے بھی زوہیب اس سے راہ و رسم بڑھانے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔ اسلم ان کے شعبے کا طالب علم نہ ہونے کے باوجود اکثر وہاں پایا جاتا تھا اور شائلہ کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارتا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں چہ میگوئیاں بھی سننے میں آتی تھیں کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور مستقبل میں شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایسے میں زوہیب کے لیے شائلہ کی طرف پیش قدمی کرنا اور بھی مشکل تھا لیکن وہ بغیر کوشش کیے اس سے دستبردار ہونے کے لیے بھی راضی نہیں تھا چنانچہ بہت احتیاط، سلیقے اور دھیمے پن سے شائلہ سے دوستی کا آغاز کیا اور آخرکار اس کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہونے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ دوستی کو پسندیدگی اور پھر محبت میں ڈھلنے میں البتہ بہت زیادہ وقت نہیں لگا اور شائلہ نے اسے شرفِ قبولیت بخش دیا۔ محبت کے مراحل سے گزرتے ہوئے شائلہ نے اس کے سامنے اپنے اور اسلم کے تعلق کی بھی وضاحت کردی کہ وہ محض اس کا کزن اور اچھا دوست ہے اور وہ اسے ایک حفاظتی ڈھال کے طور پر استعمال کرتی رہی ہے تاکہ چھچھورے اور منچلے لڑکوں کی پیش قدمی سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔ بعد کے دنوں میں اسلم کے رویے سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی۔ اس نے زوہیب کو بہنوئی کی حیثیت سے خاصی عزت دی۔ شادی کے بعد بھی اسلم سے ان دونوں میاں بیوی کی دوستی برقرار تھی لیکن بہت زیادہ ملاقاتیں نہیں ہو پاتی تھیں کہ فی الحال اسلم اپنا مستقبل بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ مڈل کلاس کے بیشتر لوگوں کی طرح اسے ابھی خاصی جدوجہد کرنی تھی۔ یہ تو زوہیب خوش قسمت تھا کہ ایک طرف اپنے اچھے تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے بہترین ملازمت مل گئی اور دوسری طرف چچا کی سپورٹ کی وجہ سے رہائش، گاڑی اور شادی کے اخراجات کی پروا نہیں کرنی پڑی۔ درحقیقت دیکھا جائے تو حویلی کی طرف سے ملنے والی سپورٹ کی وجہ سے وہ اپنی ملازمت کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ شاہانہ زندگی گزار رہا تھا لیکن اس زندگی کی قدر اسے اس وقت ہو رہی تھی جب وہ سلاخوں کے پیچھے تھا اور بہت بے بسی کی کیفیت میں تھا کہ زندگی کے اس مرحلے پر جب وہ اپنا پل پل شائلہ کے قریب رہ کر گزارنا چاہتا تھا، اس سے دور رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اپنے ان حالات پر فکرمند اور سوچ میں ڈوبا ہوا وہ اپنی جگہ پر سر تھامے بیٹھا ہوا تھا کہ شرجیل کی طرف سے بلاوا آ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر یونیفارم

موجود تھی البتہ کیپ، اسٹک اور سروس ریوالور میز پر دھرے تھے۔ اس کے اشارے پر وہ کرسی پر اس کے مقابل بیٹھا تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ شرجیل کے چہرے پر معمول سے زیادہ سنجیدہ تاثرات ہیں۔

''خیریت، کوئی خاص پیش رفت؟'' اس نے مختصر الفاظ میں شرجیل سے سوال کیا۔

''کئی اہم خبریں ہیں اور آپ کے لیے زیادہ اچھی نہیں ہیں۔'' شرجیل نے جواب دیا۔

''سنا دو یار! آج کل میرا بُرا وقت ہی چل رہا ہے۔'' اس نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا اور منتظر نظروں سے شرجیل کی طرف دیکھنے لگا۔

''پہلے میں آپ کی ایک غلط فہمی دور کرنا چاہوں گا۔ آپ کو دو نامعلوم افراد کی گفتگو کے ذریعے یہ علم ہوا تھا کہ آپ کے والد حشمت علی کو آپ کے چچا شوکت علی نے قتل کروایا تھا تاکہ ان کے مرنے کے بعد اپنی ساجھہ پسند کو اپنانے کے علاوہ جائداد پر مکمل کنٹرول حاصل کر سکیں۔ میں اس کیس پر کام نہیں کر رہا تھا لیکن حویلی کے ملازمین سے تفتیش کرتے ہوئے اتفاقاً ایک ملازم خاور تک جا پہنچا۔ حویلی کے ایک دوسرے ملازم نے جو خاور کا بہت اچھا دوست بھی ہے، شک ظاہر کیا تھا کہ شوکت علی قتل کے پیچھے خاور ہو سکتا ہے۔ اس شک کی وجہ اس نے یہ بتائی تھی کہ کئی برس قبل آپ کے والد نے خاور کی بڑی بہن صغریٰ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ صغریٰ کے اغوا کے وقت خاور اس کے ساتھ تھا۔ آپ کے والد کے خاص آدمیوں نے اپنے طور پر اغوا سے پہلے خاور کو بے ہوش کر دیا تھا لیکن بے ہوش ہونے سے قبل اس نے خادم نامی آپ کے والد کے خاص ملازم کو پہچان لیا تھا۔ خاور اس وقت بہت کم عمر تھا اور دوسرے دن اپنی بہن صغریٰ کی لاش ملنے پر بہت خوف زدہ ہو گیا تھا اس لیے کسی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا لیکن اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ جب بھی موقع ملا حشمت علی سے اپنی بہن پر کیے ظلم کا بدلہ ضرور لے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے حویلی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسے آپ کے والد حشمت علی سے اتنی نفرت تھی کہ دوست کے سامنے صغریٰ والا راز کھول بیٹھا اور اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ موقع ملنے پر حشمت علی سے بدلہ ضرور لے گا؟ دوست نے اس بات کو ہمیشہ خاور کی بڑ جانا لیکن جس روز حشمت علی ایکسیڈنٹ میں مارے گئے، اس روز اس نے خاور کو ان کی گاڑی کے قریب دیکھا تھا اس لیے دل میں یہ شک پیدا ہو گیا کہ خاور نے ہی گاڑی میں کوئی گڑبڑ کی تھی۔ اس نے خاور سے اس بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی تائید یا تردید نہیں کی اور خاموش رہا۔ دوست بھی دوستی نبھانے کے لیے چپ سادھ گیا لیکن شوکت علی جیسے اچھے انسان کے قتل پر اسے خاموشی مناسب نہیں لگی اور دل میں شک پیدا ہوا کہ کہیں اس قتل میں بھی خاور ہی ملوث نہ ہو کیونکہ خاور اس کے سامنے اس بات کا اظہار کر چکا تھا کہ بڑے مالک اور چھوٹے مالک کو علم تھا کہ صغریٰ کی موت کے پیچھے حشمت علی کا ہاتھ تھا اس لیے وہ لوگ ہمیشہ ان کے خاندان پر مہربان رہے لیکن ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ اپنے مجرم بیٹے اور بھائی کو قانون کے حوالے کر سکتے اس لیے حقیقت تک پہنچنے کے باوجود خاموش رہے۔ باپ اور بیٹے کی اس خاموشی پر خاور ان کی تمام تر مہربانی کے باوجود ہمیشہ دل میں ان سے ناراض رہا۔ آپ کے دادا تو اپنی طبعی موت مرے لیکن شوکت علی صاحب کے قتل پر فدا حسین کو شک گزرا کہ خاور کے دل میں دبی نفرت ایک بار پھر ابھر آئی ہے اسی لیے اس نے رازداری کے وعدے کے ساتھ مجھے حقائق سے آگاہ کر دیا۔ میں نے فوراً خاور پر ہاتھ ڈالا اور اس سے تفتیش کی تو تھوڑی سی سختی کے بعد اس نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ حشمت علی کی موت میں اس کا ہاتھ تھا اور اسی نے ان کی گاڑی کے ساتھ گڑبڑ کی تھی لیکن شوکت علی کے قتل کے معاملے میں وہ بالکل انجان بن گیا ہے اور کسی طور پر ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ دوہرے قتل کی اس واردات میں اس کا کوئی ہاتھ ہے۔ ہمارے آدمی اس پر مزید محنت کر رہے ہیں لیکن میں اس سلسلے میں زیادہ پُرامید نہیں ہوں کیونکہ چند ایسی باتیں سامنے آئی ہیں جنھوں نے آپ کی ذات کو مزید مشکوک بنا دیا ہے۔''

وہ ساکت سا بیٹھا شرجیل کی زبانی ماضی کے حالات سن رہا تھا اور اسے اپنی ماں زبیدہ کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ انہوں نے اس کے باپ کو ایک آوارہ اور عیاش آدمی قرار دیا تھا اور اس کے سامنے ماں کے اس الزام کا ثبوت آنے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے آ گئی تھی کہ وہ بے جا اپنے چچا شوکت علی پر شک کرتا رہا تھا۔ بے شک، یہ شک اس کے دل میں ڈالا گیا تھا لیکن اس کے اپنے سامنے بھی تو چچا کا کردار تھا۔ وہ کیسے اتنی آسانی سے کسی کی سازش کا شکار ہو گیا تھا۔

''مزید انکشافات بھی کر دو یار۔ جو بھی بُرا بھلا ہے کم

از کم معلوم تو ہو۔'' تھکے تھکے سے انداز میں اس نے شرجیل سے فرمائش کی۔

''پہلے میں آپ کو اپنی تفتیش کے بارے میں بتاتا ہوں تاکہ آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ میں آپ کو یہاں قید کر کے خود اطمینان سے نہیں بیٹھا ہوا، پوری سرگرمی سے اس کیس پر کام کر رہا ہوں۔'' اپنی بات کہہ کر شرجیل نے ذرا سا توقف کیا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس سے کسی ردِعمل کی توقع کر رہا ہو لیکن وہ اپنی جگہ خاموش اور ساکت بیٹھا رہا۔

''میں نے کراچی سے معلومات حاصل کی ہیں جس موبائل شاپ سے آپ نے اپنا موبائل ٹھیک کروایا تھا، وہ فروخت ہو چکی ہے۔ نئے مالک سے سابقہ مالک کا پتا لے کر اس سے ملاقات کی کوشش کی گئی لیکن وہ شخص فی الحال اپنے گھر پر موجود نہیں تھا۔ گھر والوں کے مطابق وہ دو تین دن کے لیے اپنے کسی دوست کے ساتھ اس کے گاؤں گیا ہوا ہے۔ گھر والوں کو صحیح پتا وغیرہ معلوم نہیں تھا البتہ انہوں نے اس کا فون نمبر دے دیا تھا۔ فون پر معلومات حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی واپسی کا انتظار کر لیا جائے۔'' اتنا بتا کر شرجیل نے ذرا سا توقف کیا پھر مزید بتانے لگا۔

''خاتون پامسٹ رانی سے بھی ملاقات کی گئی ہے کیونکہ آپ کے مطابق ان خاتون کی پیش گوئیوں نے بھی آپ کے اندر چچا کے قتل کی تحریک پیدا کی تھی۔ خاتون نے اپنی پیش گوئیوں کے حوالے سے تصدیق کی اور کہا کہ اس نے آپ کو وہی کچھ بتایا جو اس نے آپ کے ہاتھوں کی لکیروں میں پڑھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ کوئی دوسرا ماہر دست شناس بھی وہی کچھ بتائے گا جو کچھ اس نے بتایا تھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس نے جائداد کے حصول کے لیے آپ کو غیر معمولی جرأت سے کام لینے کی تاکید کی تھی لیکن اس سے مراد اپنے حق کے لیے کھڑا ہونا اور قانونی مدد وغیرہ لینا تھا۔ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے کلائنٹس کو کسی غیر قانونی کام کی ترغیب دے۔ میں نے اس خاتون کو فی الحال شک کے دائرے سے خارج نہیں کیا ہے لیکن زیادہ دباؤ بھی نہیں ڈالا ہے کہ وہ خطرہ محسوس کرے اور اپنے بچاؤ کے لیے اپنے تعلقات کو استعمال کرے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے کلائنٹس میں کچھ بااثر افراد بھی شامل ہیں اس لیے میں کوشش کروں گا کہ بعد میں ذرا طریقے سے اس سے کچھ معلوم کر سکوں۔''

شرجیل نے اسے مزید معلومات فراہم کیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی ہے کیونکہ شرجیل کی اب تک فراہم کردہ معلومات قدرے مایوس کن ضرور تھیں لیکن یہ کوئی ایسی باتیں نہیں تھیں جنہیں بہت زیادہ سیریس سمجھا جاتا اور شرجیل کی حد سے زیادہ سنجیدگی بتا رہی تھی کہ کوئی ایسی سنگین بات اس کے علم میں آئی ہے جو زوہیب کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ آخر کار شرجیل نے وہ اہم بات چھیڑ ہی دی اور زوہیب سے نظر ملائے بغیر بولا۔

''غلام محمد کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور فنگر پرنٹس رپورٹ آچکی ہے۔ رپورٹ کے مطابق غلام محمد کو قتل کرنے سے قبل اس کے چہرے پر کسی بے ہوشی کی دوا کا اسپرے کیا گیا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں اس دوا کے اجزا پائے گئے ہیں۔ یقیناً شوکت خالو کے ساتھ بھی یہی کیا گیا ہوگا اسی لیے وہ دونوں بغیر آواز نکالے خاموشی سے قتل ہو گئے اور کسی کو کان و کان خبر نہیں ہوئی۔ موت کا وقت تقریباً وہی متعین کیا گیا ہے جب ملازمین نے آپ کو وہاں سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ملازمین میں سے تو خیر کسی نے آپ کو نہیں پہچانا لیکن آپ کی والدہ کا کہنا ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وہ کورٹ میں آپ کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ کے موبائل فون کی جائے وقوعہ پر موجودگی آپ کے خلاف پہلے ہی ایک اہم ثبوت ہے لیکن اب فنگر پرنٹس کی رپورٹ آنے کے بعد آپ کے خلاف ایک اور اہم ثبوت سامنے آگیا ہے۔ غلام محمد اور شوکت خالو کو جس چھرے سے قتل کیا گیا ہے اس کے دستے پر آپ کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ نشانات تھوڑے سے مدھم ضرور ہیں لیکن اسّی پچاسی فیصد میچنگ ہو گئی ہے اور اس اتنے بڑے ثبوت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔'' شرجیل کے اس آخری انکشاف نے اسے ہکا بکا کر دیا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' بہت مشکل سے وہ صرف ایک جملہ ادا کر سکا۔

''کیا آپ نے لاشوں کو دیکھنے کے بعد چھرے کو ہاتھ لگایا تھا؟'' شرجیل نے ایک امکان کے تحت سوال کیا۔

''بالکل نہیں، میں چچا کی لاش دیکھ کر بالکل بدحواس ہو گیا تھا اور بدحواسی کے عالم میں وہاں سے بھاگا تھا تو میرا موبائل وہاں گر گیا تھا جس کا مجھے اس وقت پتا بھی نہیں چلا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کا یہ بیان آپ کے حق میں نہیں جائے گا۔

گواہ اور ثبوت پہلے ہی آپ کے خلاف ہیں۔ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ اپنے لیے کسی اچھے وکیل کا انتظام کر لیں۔ میں کافی حد تک آپ کی بے گناہی پر یقین رکھتا ہوں لیکن مجھے اپنی ملازمت اور قانون کے تقاضوں کے مطابق آپ کے خلاف ایف آئی آر کاٹ کر آپ کو عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔ پہلے ہی میں آپ کو آؤٹ آف دا وے جا کے فیور دیتا رہا ہوں لیکن ظاہر ہے میری کچھ حدود ہیں۔'' شرجیل جھجکتا ہوا اس پر اپنی پوزیشن واضح کر رہا تھا۔

''میں اس بات کو سمجھتا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ اب مجھے شمائلہ کو حقیقت سے آگاہ کرنا پڑے گا۔ موجودہ حالات میں وہی ہے جو میرے لیے وکیل کا انتظام کر سکے۔ امی تو مجھے مجرم ہی مان چکی ہیں۔'' اس کے لہجے میں تکلیف تھی۔

''آپ خالہ جان کو غلط نہ سمجھیں۔ حالات کے مطابق ان کا ردِعمل فطری ہے پھر آپ خود ان کے سامنے اعتراف کر چکے ہیں کہ آپ شوکت خالو کو قتل کرنے ہی کی نیت سے وہاں گئے تھے۔ آپ نے ماضی میں ان دونوں کے تعلق کے حوالے سے جس شک کا اظہار کیا تھا، وہ بھی ان کے لیے باعثِ تکلیف ہے۔'' شرجیل نے زبیدہ بیگم کی صفائی پیش کی۔

''خیر جو بھی ہے اب مجھے شمائلہ ہی سے بات کرنی ہوگی۔'' بولتے بولتے اس کی نظر میز پر دھرے شرجیل کے سروس ریوالور پر جا رکی اور اچانک ہی ذہنی رو بہک گئی۔

''مجھے آپ کو بتانے کا خیال نہیں رہا۔ آپ کی مسز شہر واپس چلی گئی ہیں۔ وہ آپ کی طرف سے تشویش میں مبتلا تھیں لیکن ان کا اپنی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ وغیرہ کا چکر تھا اس لیے انہیں واپس جانا پڑا۔'' شرجیل اسے اطلاع دے رہا تھا لیکن اس کا ذہن کسی اور سوچ میں الجھا ہوا تھا۔ گواہ، ثبوت سب اس کے خلاف تھے اور بہت امکان تھا کہ وہ ایک ناکردہ جرم کے الزام میں سزا کا حق دار ٹھہرا دیا جائے ایسے میں یہاں قید میں پھنسے رہنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے خود ہی ہاتھ پیر مارے اور ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ حوالات سے باہر ہو۔ باہر نکلنے کا جو راستہ اُسے نظر آرہا تھا، اس کو اختیار کرنے میں زیادہ سوچ بچار سے کام لینے کے بجائے اس نے فوری طور پر حرکت کرنے کا فیصلہ کیا اور جھپٹ کر شرجیل کا سروس ریوالور میز پر سے اٹھا لیا۔

''یہ .... یہ کیا....؟'' اس کی اس حرکت پر شرجیل حواس باختہ ہو گیا۔

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو شرجیل! میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' اس پل وہ ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا جس کا لہجہ تک خونخوار ہو چکا تھا اور آنکھوں میں وحشت و سرخی تھی۔

''آپ یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں کر رہے ہیں۔ اس حرکت سے آپ کا کیس مزید بگڑ جائے گا۔'' شرجیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ خود تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔'' وہ گھوم کر شرجیل کے عقب میں پہنچ چکا تھا اور ہر لحاظ بالائے طاق رکھے غراتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔

ناچار شرجیل کو اس کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھائے وہ زوہیب کے ساتھ باہر نکلا تو عملے کے افراد چونک گئے۔ ایک آدھ نے اپنا ریوالور بھی نکالنے کی کوشش کی لیکن زوہیب پوری طرح چوکنّا تھا۔ بہ آواز بلند بولا۔

''اگر کسی نے میری راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو تمہارے افسر کے علاوہ کئی دوسرے افراد کی بھی جان چلی جائے گی۔ میں بہت ماہر نشانے باز ہوں اور تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ میرا ہر فائر ایک لاش گرا سکتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ایسی سردمہری اور سنگینی تھی کہ کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ جو کہہ رہا ہے اسے کرنے کی ہمت و قدرت نہیں رکھتا۔

ان لوگوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ باہر محکمے کی جیپ موجود تھی۔ یہ جیپ تھانے کی واحد سواری تھی جو سرکار کی طرف سے عطا کی گئی تھی۔ مختصر سے عملے کے افراد میں سے ایک کے پاس موٹر بائیک اور دو کے پاس سائیکلیں تھیں۔ سائیکلوں والوں سے تو اسے کوئی خطرہ نہیں تھا البتہ موٹر سائیکل کا ایک ٹائر گولی چلا کر برسٹ کر دیا۔ اب تھانے سے کوئی اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ تھانہ عام آبادی سے دور ایسے مقام پر تھا کہ جہاں دو تین دیہاتوں کی حدود لگتی تھیں اور یہ اکیلا تھانہ ان سارے دیہاتوں کو کور کرتا تھا۔ ان میں سے کسی بھی گاؤں دیہات میں جا کر سواری وغیرہ کا انتظام کرنے میں تھانے کے عملے کو وقت لگتا اور اتنی دیر میں وہ خاصی دور نکل سکتا تھا۔ شرجیل نے اس کے حکم پر جیپ اسٹارٹ کر کے چلا دی۔ وہ اس صورتِ حال پر خاصا ناراض نظر آرہا تھا اور بے بسی کے مارے اس کے ہونٹ بری طرح بھنچے ہوئے تھے۔

''آپ کو احساس ہے کہ آپ نے مجھے کتنی مشکل میں

ڈال دیا ہے۔ میرا اپنا عملہ میرے خلاف گواہ بن جائے گا۔ مجھ پر شک کیا جائے گا کہ اصل میں، میں نے خود آپ کو یہاں سے فرار کروایا ہے اور مجھے یرغمال بنانا صرف ایک چال تھی۔'' وہ یچ یچ بہت پریشان تھا۔

''مجھے اس صورتِ حال پر افسوس ہے لیکن تم پولیس والے ہو اور امید ہے اپنے بچاؤ کی کوئی راہ نکال لو گے۔ میری مجبوری ہے کہ موجودہ سچویشن میں میرے پاس کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ شاید آپ ہی مجرم ہیں اور اپنے خلاف کیس مضبوط ہوتے دیکھ کر آپ نے فرار کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔'' شرجیل نے تپے ہوئے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''تم کچھ بھی سمجھنے میں آزاد ہو۔ فی الحال مجھے یہاں سے نکلنا ہے کیونکہ میرے پاس اپنے بچاؤ کا یہی ایک راستہ ہے۔''

''آپ جلد یا بدیر گرفتار کر لیے جائیں گے اور پھر آپ کو قانون کی طرف سے کوئی رعایت نہیں ملے گی۔'' شرجیل نے اسے دھمکایا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ دورانِ گفتگو وہ شرجیل کو راستے کے سلسلے میں ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے جنکشن کے قریب اس نے جیپ رکوالی۔

''اپنا والٹ مجھے دے دو۔'' جیپ رکنے کے بعد اس نے شرجیل سے فرمائش کی جو اس نے خاموشی سے پوری کر دی۔ والٹ سے رقم نکال کر اس نے اپنی جیب میں رکھی اور والٹ اسے واپس کر دیا۔ اسی وقت گڑگڑاہٹ کی آواز سے اندازہ ہوا کہ ریل آ رہی ہے۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ شرجیل بھی چونک کر اس جانب دیکھنے لگا جہاں سے اندازے کے مطابق ریل گاڑی آ رہی ہے۔

''سوری کزن۔'' اس نے کہا اور اچانک ہی ریوالور کا دستہ شرجیل کے سر پر دے مارا۔ اچانک ضرب سے شرجیل کے ہوش اُڑ گئے اور اس کا سر اسٹیئرنگ پر لڑھک گیا۔ زوہیب کو اطمینان تھا کہ اس نے اتنی زوردار ضرب نہیں لگائی ہے کہ شرجیل کی جان کو نقصان پہنچ جائے چنانچہ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ جیپ سے اتر کر بھاگا۔ اس جگہ ریل زیادہ دیر نہیں رکتی تھی۔ زوہیب یہاں سے سوار ہونے والے کل دو مسافروں میں سے ایک تھا۔ دوسرا مسافر پہلے سے وہاں موجود تھا اور اپنے پیچھے جیپ میں ہونے والی کارروائی نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر بھی زوہیب احتیاطاً اس مسافر سے مختلف ڈبے میں سوار ہوا۔ اتفاق سے ریل کراچی ہی جا رہی تھی۔ اس نے کراچی تک کا ٹکٹ بنوانے کا سوچا لیکن پھر اپنا فیصلہ بدل دیا۔ شرجیل کو جلد ہی ہوش آ جاتا اور وہ اس ریل کا شیڈول معلوم کر کے اسٹیشن پر اس کی گرفتاری کا انتظام کروا دیتا۔ اتنی بات تو وہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ زوہیب وہاں سے فرار ہو کر کراچی ہی جائے گا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ اگلے اسٹیشن پر ہی اتر گیا۔ اسٹیشن سے بسوں کے اڈے پر جانے اور وہاں سے اپنی مطلوبہ بس میں سوار ہونے میں اس کا پون گھنٹا ضائع ہو گیا لیکن اس طریقے سے وہ خود کو قدرے محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ اس کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اب بھی اس نے کراچی جانے والی بس کے بجائے حیدرآباد جانے والی بس کا انتخاب کیا تھا۔ پتا نہیں شرجیل اتنا ذہین پولیس والا تھا یا نہیں لیکن خود وہ ہر پہلو سے سوچ رہا تھا اور اسے خدشہ تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے علاوہ بسوں کے اڈے پر بھی اس کی گرفتاری کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ بس کی سیٹیں آرام دہ تھیں اور ڈرائیور بھی ذرا مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا جس نے فل آواز میں ٹیپ ریکارڈر چلانے کے بجائے بہت دھیمی آواز میں گانے لگا رکھے تھے۔ اس نے قدرے سکون سے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا اور اسٹیشن سے خریدے جانے والے ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔ رسالے میں چھپے ہوئے مضامین غیر معیاری اور غیر دلچسپ تھے یا اس کا اپنا ذہن بے سکون تھا کہ اس سے کچھ بھی جم کر پڑھا نہ جا سکا اور بور ہو کر رسالہ بند کر دیا۔ اس وقت اس کی نظر اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے لڑکے پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں بھی وہی رسالہ بند حالت میں نظر آ رہا تھا۔ زوہیب سے نظریں ملیں تو وہ مسکرایا اور تبصرہ کرنے کے انداز میں بولا۔

''بہت بکواس رسالہ ہے۔ کسی باذوق آدمی کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ممکن نہیں۔''

زوہیب نے اس کی تائید میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کا ذہن اس لڑکے کے چہرے میں اُلجھ گیا تھا۔ اسے وہ چہرہ شناسا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یاد کرنے کے لیے وہ اپنے ذہن پر زور دے رہا تھا۔ آخر اسے یاد آ گیا کہ یہ تو وہی لڑکا ہے جس نے اس کا موبائل ٹھیک کیا تھا۔ اس لڑکے نے اپنا نام بھی بتایا تھا جو اسے وقت یاد آ گیا۔ اپنے جوش کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے لڑکے سے تصدیق کی کہ وہ موبائل شاپ کا مالک سبحان ہی ہے یا نہیں۔ لڑکے نے تصدیق کی

تو زوہیب نے اپنے موبائل کا نام اور ماڈل بتاتے ہوئے اسے یاد دلانے کی کوشش کی کہ اس نے اس سے اپنا موبائل ٹھیک کروایا تھا۔ اسے فوراً ہی یاد آ گیا اور بولا۔

''جی جی...... اس موبائل کو تو میں ابھی تک نہیں بھولا ہوں۔ اس میں معمولی سا ہی نقص تھا لیکن اصل میں وہ مجھے جی پی ایس ٹریسر کی وجہ سے یاد رہا۔ آپ صرف ایک بار شاپ پر آئے تھے بعد میں آپ کی مسز رسید دکھا کر موبائل واپس لے گئی تھیں اس لیے مجھے آپ کی شکل یاد نہیں رہی۔'' سبحان نامی وہ لڑکا پُرجوش سا ہو گیا۔

''یہ جی پی ایس ٹریسر کا کیا قصہ ہے؟'' اس نے کوشش کی کہ اس کے لہجے سے زیادہ تجسس نہ جھلکے۔

''آپ کے موبائل میں یہ ٹریسر لگا ہوا تھا۔ میں نے اس بارے میں آپ کی مسز کو بتا دیا تھا لیکن لگتا ہے انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔ میں نے بتایا تھا تب بھی انہوں نے سرسری ہی توجہ دی تھی۔'' اس کے تاثرات سے سبحان نے اندازہ لگایا۔

''شاید وہ بھول گئی ہوگی .... پڑھی لکھی ہونے کے باوجود میری بیوی ٹیکنالوجی سے متعلق زیادہ معلومات نہیں رکھتی ہے اس لیے میرے موبائل میں ٹریسر کی موجودگی کو اس نے خاص اہمیت نہیں دی ہوگی۔'' اس نے خود ہی شائلہ کے حق میں دلیل ڈھونڈ لی۔

''میں نے بھی ان کے بارے میں ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ میں نے انہیں پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو میں اس ٹریسر کو موبائل سے نکال سکتا ہوں لیکن وہ راضی نہیں ہوئیں اور جواب دیا کہ آپ کی اجازت کے بغیر وہ ایسا نہیں کروا سکتیں۔ ہمارے ہاں کی اچھی خاصی پڑھی لکھی خواتین بھی اکثر ہر معاملے میں شوہر کی مرضی اور رائے کی محتاج ہوتی ہیں اس لیے میں نے ان پر زیادہ زور نہیں دیا۔ مجھے امید تھی کہ آپ خود ٹریسر نکلوانے شاپ پر آئیں گے لیکن آپ نہیں آئے۔ ان دنوں میری شاپ سیل ہونے کا چکر چل رہا تھا۔ ہفتے بھر میں ہی وہ سیل ہو گئی اور میں سب بھول بھال گیا۔'' اس نے کافی تفصیل سے اسے ہر بات بتائی۔ زوہیب کو اتنے اہم معاملے میں شائلہ کی بے پروائی اور بھول پر غصہ تو آ رہا تھا لیکن ایک اجنبی کے سامنے اس کا اظہار فضول تھا۔ باقی کا سفر بھی اس نے زیادہ تر خاموشی سے گزارا۔ سبحان نے اسے پیشکش کی کہ وہ چاہے تو وہ یہاں بس میں بھی اس کے موبائل سے ٹریسر نکالنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن اس نے اس موبائل سیٹ کے کھو جانے کا کہ کر بات ہی ختم کر دی۔ اس کا موڈ بھانپ کر سبحان نے بھی گفتگو کے سلسلے کو زیادہ دراز نہیں کیا۔

حیدرآباد پر اترنے کے بعد اس نے اپنے ذہن میں ترتیب دیے منصوبے کے مطابق وہاں مقیم ایک دوست کے گھر کا رخ کیا۔ اچانک آمد پر حیران دوست کو اپنی چند ناقابلِ بیان مجبوریوں کا بتا کر اس نے اس سے گزارش کی وہ اسے اپنی ذاتی گاڑی میں کراچی چھوڑ دے۔ وہ اس کا یونیورسٹی کے زمانے کا اچھا دوست تھا جس نے اس کی پریشانی محسوس کر کے زیادہ تردد نہیں کیا اور اس کی فرمائش پوری کرنے پر راضی ہو گیا۔

دوست نے اسے مطلوبہ جگہ اتار دیا۔ جدید تراش خراش کے سوٹ میں ہونے کے باعث کسی کی نظر میں آنے کا امکان نہ تھا۔

دوست کے رخصت ہونے کے بعد اس نے ایک ٹیکسی لے لی۔ کئی گھنٹوں کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے وہ خاصا تھک چکا تھا لیکن ایک مفرور ملزم کی حیثیت سے اسے احساس تھا کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے اس لیے مسلسل حرکت میں تھا۔ اس کا ارادہ مس رانی کے پاس جانے کا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات خود بخود راسخ ہو گئی تھی کہ جو کچھ ہوا، اس میں مس رانی کی پیش گوئیوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ ایک بار اس سے مل کر اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ آیا وہ یچ یچ اتنی صاحبِ علم تھی یا اسے کسی نے اسے اس جال میں پھنسانے کے لیے ہائر کیا تھا۔

دوست سے وہ ایک موبائل بھی حاصل کر چکا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے کئی بار شائلہ سے رابطے کے لیے اس کا نمبر ملایا لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ فلیٹ کے لینڈ لائن نمبر پر بھی گھنٹی بجنے کے باوجود کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ شائلہ فلیٹ پر موجود نہیں تھی۔ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ شائلہ اکیلی فلیٹ پر رکنے کے بجائے اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہوگی لیکن اسے وہاں کا فون نمبر زبانی یاد نہیں تھا۔ موبائل فون استعمال کرنے والوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی .... لوگوں کے نمبر یاد رکھنے کا عادی نہیں تھا اور اس کا ذاتی موبائل فی الحال پولیس کی تحویل میں تھا۔ دوبارہ پولیس کی گرفت میں جانے سے پہلے وہ ایک بار شائلہ سے بات کرنا اور ملنا چاہتا تھا اور اس کے لیے یقیناً اسے اپنے سسرال جانا پڑتا۔ وہاں جانے سے قبل اس نے مس رانی سے دو دو ہاتھ کر لینا مناسب سمجھا اور اس کی رہائش گاہ کا رخ کیا جس کے ایک کمرے کو وہ

اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتی تھی۔

یہ اس سے ملاقات کے اوقات نہیں تھے لیکن اس کے اصرار پر گیٹ پر موجود چوکیدار نے اندر پیغام بھجوا دیا۔ حسبِ توقع اسے ملاقات کی اجازت مل گئی اور اسے کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا جو مس رانی کا دفتر تھا اور جہاں وہ اس سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد رانی بھی وہاں آگئی۔ اس نے سیاہ ٹراؤزر کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بال جوڑے کی صورت بندھے ہوئے تھے۔ عمر کے اعتبار سے وہ چالیس کے آس پاس تھی لیکن اس نے خود کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور اس وقت قدرے رف حلیے میں ہونے کے باوجود بھی پُرکشش لگ رہی تھی۔

''ہیلو مسٹر زوہیب!'' دفتر میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے زوہیب کو مخاطب کیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں اس وقت لوگوں سے ملاقات نہیں کرتی ہوں لیکن آپ کو اس لیے انکار نہیں کیا کہ میرے خیال میں آپ مشکل کا شکار ہیں۔ میں آپ کے کسی مسئلے کا حل تو نہیں نکال سکتی لیکن یہ ضرور جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کیا سوچ کر یہاں آئے ہیں؟''

''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھ سے ایسی باتیں کیوں کہی تھیں جنہوں نے مجھے جرم کی طرف دھکیلا اور میں قتل تک کرنے کے لیے راضی ہو گیا؟'' زوہیب نے اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

''ایکسکیوزمی! یہ آپ مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہیں اور کس خوشی میں اتنا بے ہودہ الزام لگا رہے ہیں؟'' رانی کے چہرے کے تاثرات یکدم بگڑ گئے اور لہجہ بھی سخت ہو گیا۔

''معصومت بنو مس رانی! مجھے اپنے حالات کی وجہ سے یقین ہو چکا ہے کہ اس روز شفیق کی پارٹی میں تم جان بوجھ کر مجھ سے اور شائلہ سے ملی تھیں اور ایسی باتیں کہی تھیں جن کی بعد کے حالات نے تصدیق کی اور میں تمہارا معتقد ہو گیا۔ اسی لیے جب میں نے تم سے دوسری ملاقات کی اور تم نے مجھ سے کہا کہ مجھے دولت کے حصول کے لیے کچھ غیر معمولی اقدامات کرنے ہوں گے تو میرا ذہن اپنے سگے چچا کے قتل کی طرف چلا گیا۔'' وہ بہت ڈسٹرب تھا اس لیے رانی سے بغیر لحاظ کے اور بنا سوچے سمجھے گفتگو کر رہا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ! تو کیا آپ نے اپنے چچا کا قتل کر دیا۔ اسی لیے وہ پولیس والا میرے پاس آیا تھا اور کرید کرید کر مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے آپ کے بارے میں جو پیش گوئیاں کیں ان کا محرک کیا تھا۔'' رانی نے اپنا سر تھام لیا۔

''اداکاری مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں تمہارا بہت ہاتھ ہے۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس پلان کا ماسٹر مائنڈ کون تھا؟ کیونکہ خود تم براہِ راست کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتیں۔ تمہیں یقیناً کسی نے رقم دے کر ہائر کیا ہوگا۔'' وہ تلخ سے تلخ ہوتا جا رہا تھا۔

''میں نے پولیس سے بھی کہا تھا اور تم سے بھی کہہ رہی ہوں کہ میں نے جو کچھ بتایا اپنے علم کی روشنی میں بتایا تھا۔ تم کسی دوسرے اچھے ماہر سے مل کر تصدیق کر سکتے ہو۔ ناؤ یو کین گو۔ میں مزید تمہارے فضول سوال جواب کا سامنا نہیں کر سکتی۔'' رانی کا اندازِ گفتگو بھی بدل گیا اور سخت لہجے میں کہتے ہوئے اس نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''میں اپنے سوال کا جواب لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' زوہیب نے غصے سے کہا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اس کی طرف جھپٹنے کی کوشش کی لیکن رانی کے ہاتھ میں موجود پسٹل کو دیکھ کر اسے رکنا پڑا۔ پسٹل یقیناً اس کی میز کی دراز میں موجود تھا۔

''اب تم شرافت سے یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میرا چوکیدار تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دے گا۔'' وہ دائیں ہاتھ میں پسٹل تھامے ہوئے تھی۔ بائیں ہاتھ سے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

''تمہاری اس حرکت سے ثابت ہوتا ہے کہ تم میرے خلاف سازش کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو۔'' زوہیب نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''گیٹ آؤٹ۔'' رانی نے تصدیق یا تردید کے بجائے نخوت سے کہا تو زوہیب کو نہ چاہتے ہوئے دروازے کا رخ کرنا پڑا۔ وہ اپنے پیچھے دروازے پر قدموں کی آہٹ محسوس کر چکا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ چوکیدار دھکے دے کر اسے یہاں سے نکالے۔ کیم شحیم چوکیدار خونخوار تاثرات کے ساتھ رائفل تانے بالکل چوکنا کھڑا تھا۔ زوہیب کے بیرونی گیٹ پار کر کے رانی کے گھر سے نکلنے تک وہ ان ہی تاثرات کے ساتھ اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اپنی اس ناکامی پر زوہیب بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ اسے اپنے پاس ہتھیار کی کمی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ شرجیل کا سروس ریوالور، اسے پریشانی سے بچانے کے لیے وہ اس

کی جیب میں ہی چھوڑ آیا تھا لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ رانی سے اس طرح ملاقات کرنا ایک غلط لائحہ عمل تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے پاس ہتھیار بھی رکھتی ہوگی اس لیے بھی مار کھا گیا تھا اور اب اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اپنے چچا شوکت علی کے قتل کا شبہ وہ صغریٰ کے بھائی پر بھی کر سکتا تھا اگر اس قتل میں اسے پھنسانے کی کوشش نہ کی جاتی۔ قتل کی ٹائمنگ، بے ہوشی کے اسپرے کا استعمال اور آلۂ قتل پر اس کی انگلیوں کے نشانات سے ظاہر تھا کہ قاتل کوئی ایسا شخص ہے جس کے سامنے وجۂ قتل چچا شوکت علی سے نفرت یا انتقام نہیں بلکہ خود زوہیب کی ذات تھی۔ وہ اسے اس قتل کے الزام میں پھنسانا چاہتا تھا لیکن وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے۔ وہ دوستانہ مزاج کا لڑکا تھا جس کی کبھی کسی سے دشمنی نہیں رہی تھی اور ہمیشہ بالکل سیدھی سادی زندگی گزارتا آیا تھا۔ حسان عمر میں تھوڑا بڑا اور شاطرانہ مزاج کا مالک ہوتا تو اسے شک کے دائرے میں داخل کیا جا سکتا تھا کہ اس کے راہ سے ہٹ جانے کی صورت میں سب سے زیادہ فائدہ حسان کو ہی ہوتا اور وہ کل مال و دولت کا مالک بن جاتا لیکن اس کو مجرم ماننے کے لیے اس کا دل راضی نہیں تھا۔ اتنا چھوٹا اور سادہ طبیعت لڑکا بھلا ایسا کام کیسے کر سکتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ دنیا میں سب کچھ ہی ہو رہا تھا۔ میڈیا کی تیز رفتاری کے دور میں کم عمر اور سادہ لوح بچے بھی مجرمانہ کارروائیوں میں ملوث پائے جا رہے تھے اور معمولی معمولی باتوں پر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں تک کو قتل کر دینے کے واقعات سامنے آتے رہتے تھے۔ ایسے میں اگر حسان...... نہیں نہیں حسان ایسا نہیں ہو سکتا...... اس کے دل میں ہر طرح کا خیال آ رہا تھا اور پھر وہ اسے رد بھی کرتا جا رہا تھا۔

اُدھیڑبُن کی اس کیفیت میں وہ رانی کے گھر سے آگے کچھ دیر تک پیدل ہی چلتا رہا پھر ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ مسلسل جاگنے اور حرکت میں رہنے سے ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس نے ٹیکسی والے کو شائلہ کے میکے کا پتا بتایا اور خود آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ آج کی رات اپنے سسرال میں رک کر آرام کرے گا اور شائلہ کے ساتھ اس مسئلے کو شیئر کر کے کوئی حل تلاش کرے گا۔ وہ اس کی طبیعت کی وجہ سے اب تک اُسے معاملے سے الگ رکھے ہوئے تھا لیکن اب وہی واحد ہستی رہ گئی تھی جس سے وہ کسی قسم کے تعاون کی امید رکھ سکتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی، باشعور لڑکی تھی اور ان حالات سے نمٹنے کے لیے اسے کوئی اچھا مشورہ دے سکتی تھی اور کچھ نہ ہوتا تو کم از کم اتنا تو ہوتا ہی کہ کچھ گھنٹے شائلہ کی قربت میں گزار کر اس کا اعصابی تناؤ کم ہو جاتا اور وہ کوئی بہتر حل سوچ سکتا۔ اسی طرح کی باتیں سوچتے ہوئے بالآخر راستہ کٹ گیا اور اس نے خود کو شائلہ کے میکے کے دروازے پر پایا۔ گھنٹی کے جواب میں اس کے سسر نے دروازہ کھولا اور داماد کو سامنے پا کر نہایت خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

''آہا زوہیب میاں آئے ہیں لیکن یہ کیا شائلہ تمہارے ساتھ نہیں آئی، کیا کسی میٹنگ سے سیدھے یہاں آ رہے ہو؟'' اسے اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے انہوں نے سوال و جواب کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

''میں اپنے گاؤں سے آ رہا ہوں انکل! میرا خیال تھا کہ شائلہ یہاں ہوگی اس لیے سیدھا یہاں آ گیا۔'' اس نے انہیں بتایا۔

''نہیں وہ یہاں نہیں آئی۔ اس نے فون پر اپنی گاؤں سے واپسی کا ذکر تو کیا تھا لیکن ملاقات کے لیے نہیں آئی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ تم دونوں ساتھ واپس آئے ہو گے لیکن تم بتا رہے ہو کہ تم ابھی اپنے گاؤں سے واپس آئے ہو۔'' وہ بے چارے خود الجھ گئے۔

''شائلہ کا موبائل بند جا رہا ہے اور فلیٹ کے لینڈ لائن نمبر پر بھی کال ریسیو نہیں ہو رہی اس لیے میں سمجھا کہ وہ یہاں موجود ہے۔ پلیز آپ آنٹی سے معلوم کریں کہ انہیں شائلہ کے کسی پروگرام کا علم ہے۔'' اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ شائلہ گاؤں سے آ کر اکیلی فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ کہیں وہ کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہو گئی۔ یہ سوچ کر ہی اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔

''تمہاری آنٹی ایک ڈنر میں شرکت کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ واپس آنے ہی والی ہوں گی لیکن تم ٹھہرو، میں کال کر کے اُن سے پوچھتا ہوں۔'' وہ بے چارے خود بھی گھبرا گئے تھے۔

''آپ آنٹی سے بات کر کے فون پر مجھے بتا دیجیے گا۔ میں فلیٹ پر جا کر دیکھتا ہوں۔'' اس کے لیے ایک لمحہ مزید وہاں رکنا محال ہو گیا اور ان سے کہتا ہوا باہر لپک گیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں شائلہ کی سلامتی کے سوا کچھ نہیں تھا اس لیے اس بات کا بھی خیال نہیں رہا کہ وہ جو موبائل نمبر استعمال کر رہا ہے اس کے سسر سمیت کسی کے پاس بھی وہ

نمبر موجود نہیں ہے۔ اس لیے وہ اسے کال کر کے کوئی اطلاع نہیں دے سکیں گے۔ وہ اس احتیاط کو بھی بھول گیا تھا کہ اس کے فلیٹ کا پتا پولیس ریکارڈ میں موجود ہے اور شرجیل کسی کی وہاں ڈیوٹی لگا سکتا تھا کہ اگر وہ وہاں آئے تو گرفتار کر لیا جائے۔

ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر ٹیکسی والے کو منٹ منٹ پر رفتار بڑھانے کا حکم دیتے ہوئے وہ کس عالم میں اپنی منزل تک پہنچا، یہ وہی جانتا تھا۔ لفٹ مصروف ہونے کے باعث وہ سیکنڈ فلور پر واقع اپنے فلیٹ تک جانے کے لیے سیڑھیاں تیزی سے پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا۔ دروازے کی چوکھٹ میں ایک معمولی سا خلا تھا اور وہ اپنی چابی ہمیشہ اس خلا میں چھپا کر رکھتا تھا۔ چابی اُسے اپنی جگہ پر مل گئی اور لاک کھول کر تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ فلیٹ خالی نہیں ہے۔ بیڈ روم میں سے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اتنا بدحواس تھا کہ غور کیے بغیر تیزی سے بیڈ روم کی طرف لپکا اور دروازہ دھڑ سے کھول دیا۔ اندر کے منظر نے اس کے چاروں طبق روشن کر دیے۔ وہ شائلہ تھی اس کی بیوی جو اس وقت اسلم کی بانہوں میں موجود اس کی محبت کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ وہ اس بے وفا عورت کے لیے اتنے تردد میں تھا کہ کچھ سوچنے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ فوری شاک سے سنبھلنے کے بعد اس کا پہلا ردِعمل شائلہ کی طرف جھپٹنے کا تھا۔ وہ اس بے وفا عورت کا گلا گھونٹ دینا چاہتا تھا لیکن اسلم اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس نے کوئی چیز اتنی زور سے اس کے سر پر ماری کہ وہ چکرا سا گیا۔ سنبھلنے تک اسلم اس پر حاوی ہو چکا تھا۔ اسے بے بس کرنے کے بعد دونوں نے مل کر اس کو اس طرح باندھ دیا کہ صرف اس کا دایاں ہاتھ آزاد تھا۔ اسے کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ رکھی کرسی سے باندھا گیا تھا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔

''یہ لو پین اور اس کاغذ پر لکھو کہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہی اپنے چچا شوکت علی اور ان کے ملازم غلام محمد کو انتقام اور دولت کے لالچ میں ہلاک کیا تھا لیکن اب جبکہ میرے خلاف ٹھوس ثبوت اور گواہ سامنے آ چکے ہیں، میں رسوائی اور بدنامی سے بچنے کے لیے خودکشی کر رہا ہوں۔'' اسلم نے اس کے ہاتھ میں زبردستی قلم پکڑایا اور ایک رائٹنگ پیڈ سامنے رکھ دیا۔ وہ غصے کی کیفیت میں زور زور سے دائیں بائیں نفی میں سر ہلانے لگا۔

''لکھنا تو تجھے پڑے گا ہی۔ آرام سے نہ سہی زبردستی سہی۔'' اسے انکار کرتے دیکھ کر اسلم نے بے رحمی سے کہا اور استری کا تار بیچ میں سے کاٹ کر پلگ ساکٹ میں لگا کر سوئچ آن کر دیا۔ اب کٹا ہوا ننگا تار اس کے ہاتھ میں تھا جس کو اس نے زوہیب کے پہلو میں رکھا تو وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ چند سیکنڈ کی اس اذیت نے اس کے جسم کا ہر رُواں کھڑا کر دیا تھا۔

''اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو اسی طرح اذیت دے دے کر تمہاری جان لے لوں گا۔ سوسائڈ نوٹ کا اتنا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ شائلہ کمپیوٹر پر بھی تیار کر سکتی ہے۔ ہم نے جہاں اتنا کچھ کیا ہے یہ مسئلہ بھی حل کر لیں گے۔'' اسلم جو ہمیشہ سے اس سے بہت تمیز و تہذیب سے پیش آتا تھا، آج بالکل بدلے ہوئے روپ میں اس کے سامنے تھا۔

''اسلم کی بات مان لو نا زوہیب ڈارلنگ! تم تو میرے لیے آسمان سے چاند تارے توڑ لانے کے دعوے کرتے تھے۔ کیا اب اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ایک نوٹ لکھ کر میرے راستے کے کانٹے ہٹا دو۔ تمہارے بعد میں اپنے من پسند شخص کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی گزاروں گی تو کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا۔'' شائلہ جو اپنا حلیہ درست کر چکی تھی، ایک ادا سے اس کے سامنے آ بیٹھی۔ کوئی خوب صورت عورت اتنی زیادہ سنگدل بھی ہو سکتی ہے، زوہیب کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ جو اس کی محبت تھی اس کے قاتل کے روپ میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو وہ لازماً اس عورت کے حسین مگر مکروہ چہرے پر تھوک دیتا۔ اب بھی وہ اپنی آنکھوں کے تاثرات سے نفرت کا اظہار کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ بجلی کا جھٹکا لگنے کے دوران میں پین اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا لیکن شائلہ اس سے محفوظ فاصلے پر تھی ورنہ وہ اپنے آزاد ہاتھ سے اس کا گلا دبانے کی کوشش تو ضرور کرتا۔ اب بھی کچھ بس نہ چلا تو ہاتھوں کی ساری انگلیاں کھول کر اس کی طرف لعنت کا اشارہ کر دیا۔ اپنی اس حرکت کے بدلے اُسے ایک اور بجلی کا جھٹکا سہنا پڑا۔

''میری بات مان لو جانو! مجھ سے تمہاری تکلیف دیکھی نہیں جا رہی لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ ہماری اتنی محنت ضائع چلی جائے۔ تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ میں اسلم سے محبت کرتی ہوں اور تم سے میں نے دولت کے حصول کے لیے شادی کی تھی۔ شادی کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارے نام کچھ نہیں ہے اور ساری دولت تمہارے چچا کے قبضے میں ہے تو میں بڑی ڈس ہارٹ ہوئی۔ ممکن تھا کہ

میں فوری طور پر تم سے طلاق لے لیتی لیکن تمہاری ماں نے اپنی سادہ لوحی میں مجھے بتا دیا کہ تمہارے چچا نے تمہارے باپ کی جائداد تمہارے نام ہی رکھی ہوئی ہے اور تمہاری پہلی اولاد کی پیدائش پر تمہیں تحفے میں وہ سب دینا چاہتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد میں نے اور اسلم نے اپنی پلاننگ تبدیل کر لی۔ براہِ راست تمہیں قتل کر کے تمہاری دولت ہتھیانے پر سب سے پہلا شک مجھ پر ہی جاتا اس لیے ہم نے گیم بدل دیا اور تمہارے والد کے ایکسیڈنٹ اور ماضی کے چند حقائق کا فائدہ اٹھا کر نیا پلان بنایا۔ رانی کو ہم ہی تمہارے سامنے لائے تھے۔ وہ ہمارے سارے پلان سے واقف نہیں تھی بس اُسے ایک اسکرپٹ دیا گیا تھا جس کے مطابق اس نے اچھا پرفارم کیا۔ میں تمہارا مشاہدہ کر رہی تھی کہ تم پر اس کی باتوں کا اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ دو آدمی جنہوں نے گاؤں کے ڈیرے میں تمہارے کانوں میں مشکوک باتیں ڈالیں، ہمارے ہی بھیجے ہوئے تھے۔ اس گفتگو کے بعد تم بہت مضطرب نظر آئے اور رانی سے ایک اور ملاقات کی۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ تم ضرور ہمارے پلان کے مطابق ہی عمل کرو گے۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو میں خود تمہیں سب کچھ کرنے پر اُکساتی لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ تمہارے موبائل میں موجود ٹریسر نے ہمیں تمہاری نقل و حرکت سے آگاہ رکھا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں تم سے تمہارے ماضی کا ہر قصہ بہت شوق سے سنتی تھی۔ اسی لیے مجھے علم تھا کہ حویلی کا پچھلا دروازہ کیسے کھلتا ہے۔ اسلم تمہارے حویلی پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچا اور اس چھرے سے دستانے پہن کر تمہارے چچا اور ان کے ملازم کو قتل کر دیا جس چھرے سے تم نے کچھ عرصے پہلے بقرعید پر بکرا ذبح کیا تھا اور میں نے بہت احتیاط سے وہ چھرا سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ باقی تمہاری قسمت کی خرابی تھی کہ تمہارے خلاف کچھ اور ثبوت بھی بن گئے۔ بہرحال اب جبکہ اتنا کچھ ہو چکا ہے اور تمہارے بچنے کا کوئی امکان نہیں رہا تو تم محبت کی ایک اور مثال قائم کرو اور اپنی محبوبہ کی خوشی کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے ڈالو۔ یقین کرو تمہارے بعد تمہاری اولاد کو ملنے والی دولت مجھے بہت خوشی دے گی اور میں تمہاری اولاد کی بڑی اچھی طرح پرورش کروں گی، آخر وہ تمہاری مجھ سے محبت کی نشانی جو ہو گی۔'' اپنی بات کے اختتام پر شائلہ نے بے رحمی سے قہقہہ لگایا تو زوہیب کو بے ساختہ میکبتھ کی چڑیلیں یاد آ گئیں۔ اس نے سوچا کہ شیکسپیئر کے ڈرامے کی وہ چڑیلیں شائلہ سے زیادہ بے رحم اور شقی القلب تو بہرحال نہیں ہوں گی۔ اُسے شدید افسوس ہوا کہ وہ ایسی عورت کی محبت میں مبتلا ہوا جو صاحبِ کردار ہی نہیں تھی۔

''چلو یہ لو پین اور وہی لکھو جو اسلم نے تمہیں بتایا تھا۔ تمہیں پتا ہے نا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور ڈاکٹر نے مجھے اسٹریس لینے سے منع کیا ہے۔'' مکاری سے کہتے ہوئے شائلہ نے جھک کر پین اٹھایا اور اس کے ہاتھ میں تھمانے لگی۔ زوہیب کی حالت دگرگوں تھی لیکن نفرت نے جانے کیسے اس میں اتنی طاقت بھر دی کہ اس نے شائلہ کا پین تھمانے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ زور سے پکڑ کر جھٹکے سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

شائلہ کو اس سے اس ردِعمل کی امید نہیں رہی ہو گی اس لیے وہ جھونک میں اس کے اوپر آ گری۔ زوہیب نے فوراً ہی اس کی گردن اپنے ہاتھ میں دبوچ لی۔ اس کی لمبی اور مضبوط انگلیاں شائلہ کے نرخرے میں پیوست ہوئیں تو اس کی آنکھیں اُبل پڑیں اور منہ سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔

''چھوڑ...... چھوڑ دے شائلہ کو۔'' اسلم غضب ناک ہو کر زوہیب کی طرف جھپٹا اور اس کے منہ پر پے در پے مُکّے رسید کرنے لگا۔ بجلی کے جھٹکے کھانے سے زوہیب کی طاقت پہلے ہی کم ہو چکی تھی۔ اسلم کے مُکّوں نے ناقابلِ برداشت تکلیف پہنچائی تو رہی سہی طاقت بھی جواب دے گئی اور شائلہ کا گلا اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

''بس اب بہت ہو گئی رعایت۔ میں اس کے پسٹل سے اس کے سر میں گولی مارنے لگا ہوں۔ تم بڑی سی چادر اوڑھ کر اپنا چہرہ چھپاؤ اور یہاں سے نکل کر اپنے میکے چلی جاؤ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ خودکشی کے وقت زوہیب یہاں اکیلا تھا۔ یہاں کی ساری سچویشن میں خود سیٹ کر دوں گا۔'' غصے میں بھرے اسلم نے شائلہ کو ہدایت دی۔ زوہیب کا پسٹل اس کے سامان میں سے نکال کر شائلہ حویلی سے لائی تھی۔

''ہینڈز اپ! کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سچویشن کنٹرول کرنے کے لیے پولیس خود یہاں موجود ہے۔'' اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور شرجیل اپنے آدمیوں سمیت دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔ تکلیف اور نقاہت سے نڈھال زوہیب نے شرجیل کو وہاں دیکھا تو بے ہوش ہونے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ شرجیل پر اُسے بھروسا تھا۔

☆☆☆

عدالت میں اسلم اور شائلہ کی پیشی تھی۔ دونوں کے اقبالِ جرم کے بعد شرجیل نے انہیں عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ اس روز وہ بہت موقع پر وہاں پہنچا تھا۔ زوہیب کے فرار

کے بعد وہ بچ بچ اسی طرح حرکت میں آیا تھا جس طرح زوہیب نے اندازہ لگایا تھا۔ کراچی پہنچنے والے داخلی راستوں پر پولیس نگرانی کررہی تھی کیونکہ وہ لوگ پبلک ٹرانسپورٹ سے اس کی آمد کی امید کررہے تھے اس لیے توجہ ٹرینوں اور بسوں وغیرہ کی طرف تھی جبکہ زوہیب اپنے دوست کی گاڑی میں وہاں آیا تھا۔ داخلی راستوں کے علاوہ شرجیل نے زوہیب کے فلیٹ پر بھی اپنا آدمی تعینات کیا ہوا تھا۔ جہاں اسلم اور شمائلہ سارے رابطے منقطع کیے رنگ رلیاں منارہے تھے۔

وہ دونوں اتنی خاموشی سے وہاں موجود تھے کہ کسی کو بھی ان کی وہاں موجودگی کا علم نہیں تھا۔ شرجیل کو اس کے ماتحت نے زوہیب کی وہاں آمد کی اطلاع دی تو اس نے ماتحت کو باہر ہی رہ کر نگرانی کرنے کا حکم دیتے ہوئے خود زوہیب کے فلیٹ کا رخ کیا۔ وہ خود کراچی آیا ہوا تھا اور کراچی کے ایک تھانے میں اپنے شناسا ایس پی کی مدد سے یہ کیس ہینڈل کررہا تھا۔ زوہیب کے فرار نے اس کی ساکھ داؤ پر لگادی تھی اور وہ ہر حال میں اسے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ فلیٹ پر پہنچنے کے بعد وہ دو ماتحتوں کے ساتھ کھلے دروازے سے خاموشی سے اندر داخل ہوا اور بیڈروم سے آتی آوازیں سن کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جس وقت وہاں پہنچا، شمائلہ زوہیب کو سوسائڈ نوٹ لکھنے پر آمادہ کررہی تھی۔ شرجیل پر یک دم ہی بہت کچھ منکشف ہوگیا لیکن فوری طور پر دخل اندازی کرنے کے بجائے وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ باہر کھڑا ساری باتیں سنتا رہا اور اس وقت انٹری دی جب پانی بالکل ہی سر سے اونچا ہونے لگا تھا۔ اس کے بعد ایک تجربہ کار پولیس آفیسر کے لیے کچھ بھی دشوار نہیں تھا اور آج اسلم اور شمائلہ اقبالی مجرم کی حیثیت سے پیشی بھگتا کر عدالت سے باہر نکل رہے تھے۔ پہلی پیشی میں ہی صاف نظر آرہا تھا کہ کیس کا فیصلہ کیا ہوسکتا ہے۔ شمائلہ کو حاملہ ہونے کی وجہ سے کچھ رعایت ملنے کی امید کی جاسکتی تھی لیکن اسلم دہرے قتل کی واردات میں کسی طرح نہیں بچ سکتا تھا۔ اسلم اور شمائلہ کی نشاندہی پر ان لوگوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا جنہوں نے ان کی کسی نہ کسی طرح معاونت کی تھی۔ ان افراد میں ہمس رانی اور اس ٹرک کا ڈرائیور اور کلینر شامل تھے جو پھلوں کی کھیپ اٹھانے شوکت علی کے گاؤں گئے تھے اور ستانے کا بہانہ بنا کر خاص اس کمرے کی کھڑکی کے پاس آبیٹھے تھے جہاں زوہیب موجود تھا۔ ہمس رانی سمیت ان میں سے کسی کو اصل منصوبے کا علم نہیں تھا۔ اس لیے انہیں ہلکی سزاؤں کی امید تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کیس کی میڈیا پر خاصی شہرت ہو گئی تھی اور شمائلہ کے والدین نے اپنی غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے بالکل قطع تعلق کرلیا تھا۔ یہاں تک کہ شمائلہ کی طرف سے کیس کی پیروی بھی سرکاری وکیل کررہا تھا جو خود بھی اسے بچانے میں زیادہ انٹرسٹڈ نظر نہیں آتا تھا۔

پیشی ختم ہوئی اور ملزمان کو پولیس کی تحویل میں عدالت سے لے جایا جانے لگا تو زوہیب نے بھی باہر جانے کے لیے سست روی سے قدم بڑھائے۔ ابھی اس نے عدالت کے کھلے احاطے میں قدم رکھے ہی تھے کہ فائرنگ کی آواز پر چونک گیا۔ پولیس کی نگرانی میں جاتی شمائلہ کو لڑکھڑا کر گرتے اس نے صاف دیکھا تھا۔ بے ساختہ ہی وہ اس طرف بھاگا۔ وہاں خاصا شور اور بھگدڑ مچ چکی تھی۔ ہجوم کے باوجود اُسے زمین پر خون میں لت پت پڑی شمائلہ نظر آگئی۔ اُسے تین چار گولیاں لگی تھیں جن میں سے ایک گولی اس کی دائیں آنکھ میں سوراخ بناتی ہوئی سر میں جا گھسی تھی اور اس کی خوب صورت شکل کو ایک بھیانک تصویر میں بدل دیا تھا۔ وہ جس انداز میں ساکت پڑی تھی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ چکی ہے۔ مختلف قسم کی آوازوں کے شور میں زوہیب کو ایک آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی کہ قاتل پکڑا جاچکا ہے۔ اس نے نظروں کو اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا تو تین، چار پولیس والے شمائلہ کے باپ کو گھسیٹ کر لارہے ہیں۔ اس منظر پر وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ لوگ زوہیب کے قریب سے گزرنے لگے تو شمائلہ کے والد قدوسی صاحب نے اپنے قدم روک لیے اور گلوگیر لہجے میں بولے۔

"شمائلہ نے جو کچھ کیا، اس کے بعد میں کہیں سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایسی ذلیل اولاد کو خود اپنے ہاتھ سے ختم کردوں اور تمہیں بھی اس اُلجھن سے نکال دوں کہ اپنی اولاد کی خاطر تمہیں اسے معافی دینی چاہیے یا نہیں۔ اب تم ہر طرح کے بوجھ سے آزاد ہو اور تمہاری اصل مجرم اپنے انجام تک پہنچ چکی ہے۔ اسلم کو اس کے حصے کی سزا قانون دے گا۔"

اپنی بات کہہ کر وہ پولیس کی تحویل میں آگے بڑھ گئے اور زوہیب اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ قدوسی صاحب کے مطابق بوجھ سے آزاد ہونے پر خوش ہو یا انسانیت کے ناتے اس معصوم وجود کے لیے دکھ محسوس کرے جسے دنیا میں آکر سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا تھا اور وہ ایک بدکردار عورت کی کوکھ میں جگہ پانے کے جرم میں پیدا ہونے سے پہلے ہی..... موت کا حق دار ٹھہرا تھا۔